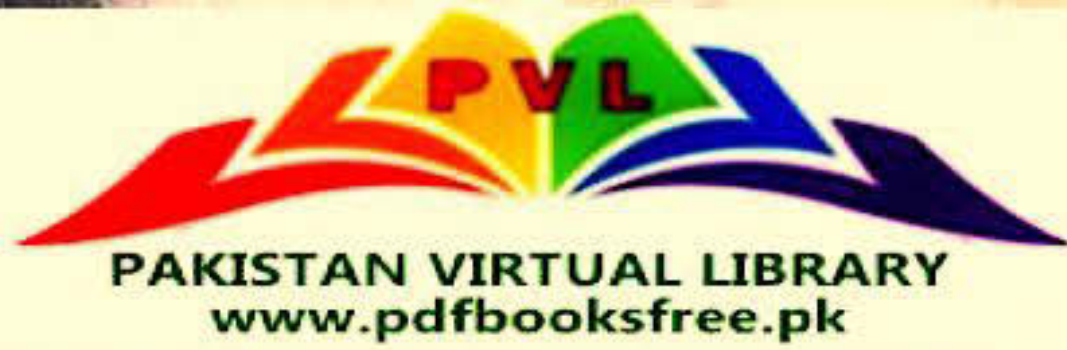
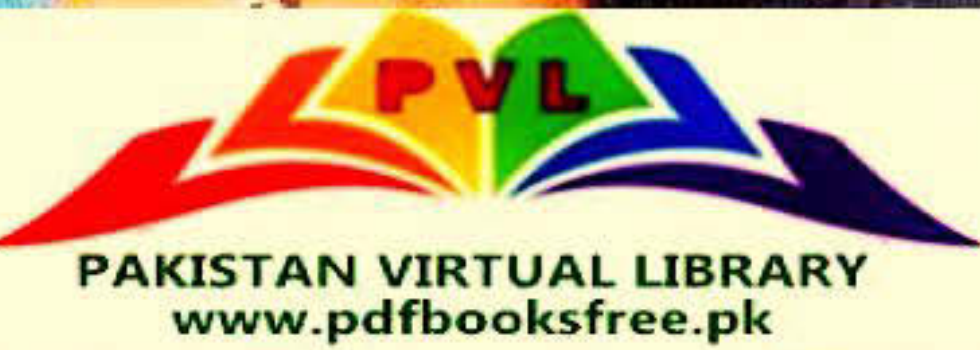


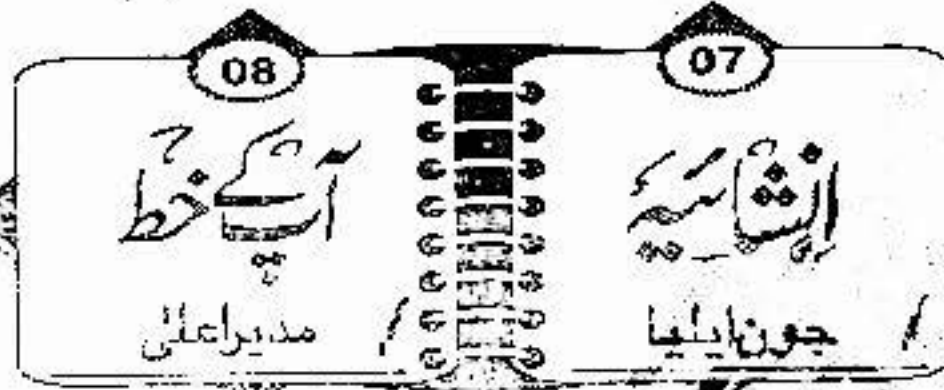
خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینئر ڈائجسٹ
ماہنامہ
اپریل 2016

PDFBOOKSFREE.PK

میراج رسول

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk





علم و دانش کے شہر کی بربادی
پرائیکہ دانش و در کا لوح

سینس جیٹس اور سائنس کی تاریخ
شیرین باتیں گلے شکوے اور پرخوش شورش



ماضی کا آئینہ یا اختیار اور بے اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

سفا کا سہ طرز عمل اختیار کرنے والی
ایک خود مختار شخص متغیر نازک کا قصہ



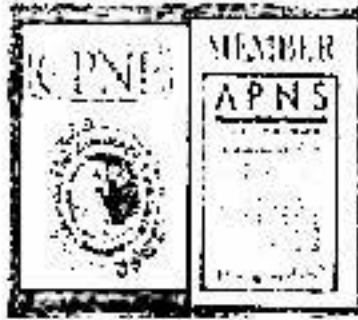
اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ
بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

بھولے بسیرے چہروں میں
رشتوں کی تلاش کا شخص مرحلہ



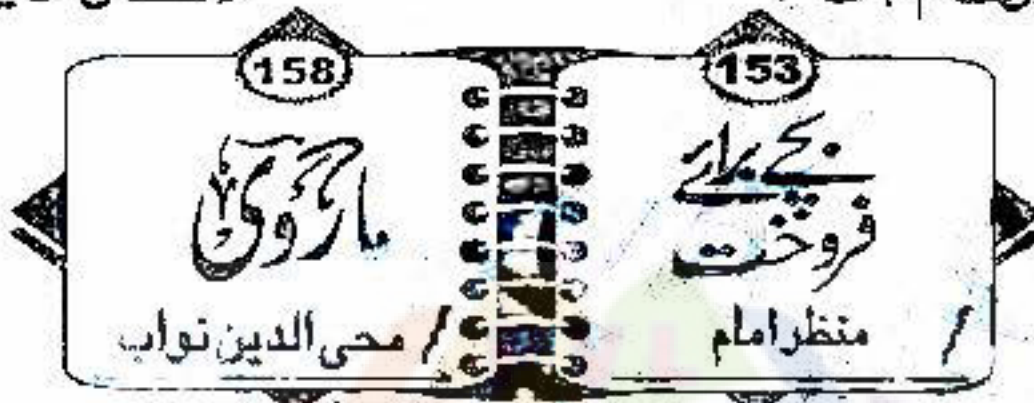
ماضی سے حصال کی جانب بکھلنے
والے داستانِ الم کے رنگ

بال برابر و منور سے مسیح اور عیسیٰ کی
پہچان کرنے والے مسیحا کا ماحیرا



پل صراطِ محاسن کو عبور
کرنے کی تکالیف کا اور ذک

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نغمہ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



ایک چوڑی روپ بھی چھاؤں بھی دھوپ محبت کی
عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل بیا سلسلہ

رشتوں کی تحسارت اور..... نرم
فطرت لوگوں کے مابین عجب تماشا



رب کائنات کا مترج
حاصل کرنے والے ایک ولی کا قصہ

زیں بننے والی ایک بے بس
دوشیزہ کی تہائیوں کا عکس



تلی سمجھ کر محبت سے کھیلنے والے ایک
عاقبت نا اندیش عاشق کی داستانِ لہو

کھیل تماشا کرنے والے
بہر ویا کا اصل روپ

نسخہ کیمیا

وہ سرزمین ہارگنی جس میں سب سے پہلی بار گیہوں بویا گیا تھا۔ وہ زمین ہارگنی جس میں پہلی ایجاد ہوا تھا۔ وہ زمین ہارگنی جس نے دنیا کو دانش سکھائی تھی اور پیغمبروں کو پرورش کیا تھا۔ وہ زمین ہارگنی جس نے انسانوں کو اپنی دانش پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ وہ زمین ہارگنی جس نے دنیا کو پہلی بار قانون کے ضابطے تعلیم کئے تھے۔ ہاں، جمہورانی ہارگنی۔ تو صورت حال یہ ہے کہ عراق ہارگنی۔ انسانوں کی بہترین ذہانتوں، کہانتوں اور خطابتوں کی پیش گاہ ہارگنی۔ جون ایلیا تم ہارگنی، تمہارا نسب نامہ ہارگنی۔ تمہارا ماضی اور ماضی کا ماضی ہارگنی۔ باطل ہارگنی، بغداد ہارگنی۔

ایستھنز کے بعد تاریخ نے بغداد سے زیادہ دانش افروز شہر پیدا نہیں کیا۔ اگر تاریخ پڑھتے ہوئے بغداد کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو مہذب انسانیت کا ذہن بیسویں صدی سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا تو دنیا کے عظیم ترین شاعر سعدی نے اس تباہی کا مرثیہ کہا تھا۔

آسماں راجع بود گر خوں بہ بارد بر زمیں
برز دال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آرد قیامت در میان خلق میں

اے میرے ہم نشین شام قیامت برپا ہوگئی ہے۔ بغداد اپنی بدترین سرلوشت سے دو چار ہوا ہے۔ تمہاری تہذیب کی سب سے بڑی علامت لہولہان ہوگئی ہے۔ شہروں کا وہ شہرتابہ و برباد ہو گیا ہے جس کے چوراہوں پر تاریخ کی سب سے اعلیٰ دانش، سب سے اعلیٰ بینش کام کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ بغداد تباہ و برباد ہو گیا اور کسی سعدی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس زمانے کا بغداد سعدی کے زمانے کا بغداد نہیں تھا۔ اس وقت بغداد کے پیچھے ایک درخشاں تاریخ تھی مگر اس بار بغداد کے پیچھے کوئی تاریخ نہیں تھی۔

سن لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کی جاسکتی اور اگر جنگ کی جائے گی تو شرمناک ترین شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تم نے تاریخ کے خلاف جنگ کی اور اپنے اندر اور اپنے باہر شکست کھا گئے۔ جو مستقبل کی طرف قدم نہیں اٹھائے گا، وہ ماضی کی طرف بری طرح دھکیل دیا جائے گا۔ تمہارے حریف اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ علم تھا، دانش تھی۔ حکمت اور عمل کا ایک طویل سلسلہ تھا اس لیے ان کی دھاندلی جیت گئی۔ تمہارے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا اس لیے تمہاری غلط کاری اور غلط کوشی کو تو سزا یا پ ہو نا ہی تھا۔ تم بتاؤ، جواب دو کہ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آخر تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمہیں راستہ دے دے۔ عراق کی شکست جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کی شکست ہے۔ علم کے مقابلے میں جہالت کی شکست ہے۔

کیا یہاں بھی یہ سوچا گیا کہ اسلحہ درآمد کرنے والے، اسلحہ برآمد کرنے والوں سے کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر مقابلہ کر بھی گزریں تو کیسے فتح پا سکتے ہیں؟

کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے، کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کر سکتی ہے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ بات کیوں نہیں سوچتے اور یہ نقطہ کیوں نہیں سمجھتے۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔

میں اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے؟ ہم تاریخ سے آخر کس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقت حال یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی معاملہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تاریخ سے کبھی کوئی سلیقے کا معاملہ نہیں کیا۔ تاریخ قوموں کی کوئی زر خرید لوٹڈی نہیں ہے کہ اس سے جو کچھ چاہا جائے، وہ منوالیا جائے۔

تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ علم، دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ علم کے سامنے ذلیل ہونا جہالت کا مقدر ہے۔ جمہوریت کے مقابلے میں شکست کھانا آمریت کا مقوم ہے اور کوئی قوم اپنے تاریخی مقدر اور مقوم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو قوم علم، دانش اور جمہوریت کے ساتھ زندہ رہنے کا شعور نہیں رکھتی، اسے رہنے کا کوئی حق نہیں۔ علم، دانش اور جمہوریت، یہی قوموں کے لیے اک نسخہ کیمیا ہے اور بس۔

☆...☆...☆.....

اسلام آباد کے پس منظر میں نئی نئی حقیقتوں کو لڑی میں پرو کر یوں پیش کیا جیسے سندھ کو کوڑے میں بند کر دیا ہو۔ یہ تحریر آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھی اور قصہ شہر شاہاں نے دل پر انٹ فٹوش چھوڑے۔ اپنی پسندیدہ ترین کہانی شیش محل پڑھی۔ جو لیٹ کے والد جوزف کی موت کا صدمہ جو لیٹ کے صدمات کی لہرست میں اضافہ کر گیا۔ قسط کی آخری سطر اس میں فاروق سے اچانک ملنے والی لڑکی یقیناً بھابیہ سیٹھ کی فیملی ممبر ہوگی۔

ہماری پیشین گوئی ہے کہ جو لیٹ جوزف اور جوزفین کی سنگی بیٹی نہیں ہوگی بلکہ کسی مسلمان گھرانے کی پھڑی ہوئی بیٹی ہوگی۔ اس کا قادی صاحبہ ہماری فرمائش ہے کہ جو لیٹ اور فاروق کے دکھوں کی طویل قطار میں خوشیوں کے لمحات فوراً شامل کریں۔ کارنامہ میں جان اور ڈیجیٹری بلیک میلر کم جاسوس ثابت ہوئے عام ڈگر سے ہٹ کر اچھی کہانی تھی۔ بدطینت میں حسب سابق اور حسب روایت مرزا احمد بیگ مظلوم یا سمن کو اس کے سوتیلے دیوراجمل شاہ کے چنگل سے بچانے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے شوہر شوکت علی کے کیس کو بھی اسی نشست میں حل کیا جاتا۔ چلتر، لٹیری عورت کی مہارت اور چالاکی پر مبنی مختصر تحریر کوئی خاص اثر چھوڑنے میں ناکام رہی، نارمل اسٹوری تھی۔ روٹیاں اس ماہ کی دوسری کہانی جس نے دل و ذہن کو چھینچوڑ ڈالا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کیا اس نئی سی جان نے جان، جان آفرین کے سپرد کرنے وقت یہ نہ پوچھا ہوگا کہ کیا میرا جرم اتنا بڑا تھا کہ قابل گردن زنی قرار پاتا، وہ بھی انہوں کے ہاتھوں۔ اگر محفل شعر و سخن میں انتخاب کا حق ہمارے پاس ہوتا تو زین آفریدی کا شعر اول نمبر پر، محمد شہباز اکرم نوٹی کا دوسرے نمبر پر اور قدرت اللہ نیازی صاحب کا تیسرے نمبر پر ہوتا۔ (پسند اپنی اپنی..... نصیب اپنا اپنا) حنفہ میں شیراگل کے حسن دادا کے خوشی عمل کو پڑھا۔ مصرکی مورتوں کی یاد تازہ ہوئی اور اس کے شوہر راسنٹ کو بھی سا لگرو پر عجیب حنفہ لینے کی لت تھی، حیرت انگیز اور اچھی کہانی۔ محی الدین نواب مرحوم کی ماری کی یہ قسط روایت کے برخلاف بہت اچھی لگی۔ مراد اور ہم زاد دونوں نے اپنے اپنے جیون سانچی ڈھونڈ لیے، دیکھتے ہیں چار گھنٹے بعد کیا ہوتا ہے۔ ہماری فرمائش ہے کہ ماری کے بعد نیا سلسلہ ظاہر جاوید فضل کے قلم سے شروع کیا جائے (آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے) بے رنگ میں ہر پور سسپنس پیدا کیا گیا۔ اسٹوری کا رتو قدرتی جاسوس نکلا۔ مگر انسان کو ڈکسن جتنا دیو اور ڈر پوک نہیں ہونا چاہیے۔ ضیا تسنیم کی اچھی اور عمدہ کوشش ابوالفضل قطب دوراں میں دوبارہ اکبر اور جہانگیر کے ادوار سے واسطہ پڑا۔ فتح پور سیکری ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی ابتدا اور وجہ تسمیہ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ زبردست اور اعلیٰ۔ محبوب مصنف کاشف زبیر صاحب لہوا لڑائے۔ رویہ کی جدوجہد پنڈہ کر دل سے برلا نکلا۔ شاعر اور آؤٹ اسٹینڈنگ کاشف زبیر صاحب..... تہی چھانگئے او۔ عبدالرب بھٹی صاحب نے سسپنس کے قیمتی آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ مجاہد شیر علی غازی رہا۔ کشمیر کے متعلق ایسی ایسی معلومات ملیں جو کسی تاریخی کتاب سے آج تک نہیں ملیں۔ کیا کہنے بھٹی صاحب۔ اس ماہ اکثر کتر میں بھی خوب تھیں مگر شفقت محمود کھیوڑہ کے لا جواب لطیفے نے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ طویل سلسلوں کے علاوہ چار ہیرے جیسی کہانیوں سے مزین تھا جو صدیوں نہیں بھلائی جاسکتیں گی۔ تمام ادارے کے انتھک ساتھی یونہی ہی بخیریت جھگمگاتے رہو۔“ (اتنی گہری نظر سے کیا جانے والا تبصرہ واقعی بہت جاندار تھا)

✽ رسول فیملی کی پرستار..... رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ مگر ان اعلیٰ محترم معراج رسول صاحب! رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ آپ کو لمبی عمر کے ساتھ صحت و تندرستی والی زندگی دے (آمین) آپ کی بیماری کا سن کر میں اور میرے گھر والے جو آپ کے رسالے بے حد شوق سے پڑھتے ہیں، سب بہت پریشان ہوئے۔ مجھے آپ کی بیماری کا بہت دیر سے پتا چلا اور دل بہت اداس ہو گیا۔ یقیناً آپ نے بہت بیماری کاٹی ہے (بس اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس آزمائش پر پورا اتارے، آپ کی پراثر دعا میں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں) آج آپ اپنے رب کے بہت نزدیک ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے ہر وقت یاد کرتے رہیں۔ (بے شک بیماری میں انسان اللہ کے نزدیک ہو جاتا ہے) آج آپ کی وجہ سے آپ کے والدین کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ جو بھی ان کے لیے دعا کریں گے، وہ ان کی بخشش کا ذریعہ بنیں گی۔ اچھی اور نیک اولاد بھی والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتی ہے آپ تو جس جس کے لیے دعا کریں گے وہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔ آپ کے رسالوں کے ذریعے ہمیں دنیا بھر کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ آپ نے ہمیں ہر اچھے برے کام کے بارے میں بتایا ہے۔ اچھے برے لوگوں کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ (ان معلومات سے مستفید ہونے کے لیے آپ نے بھی وقت نکالا۔ بہت شکریہ) آپ کی یہ نیکیاں قیامت تک ساری دنیا میں پھیلی رہیں گی اور لوگ قادمہ اٹھاتے رہیں گے۔ رب کائنات نے اس نیکی کے لیے آپ کی کو چنا ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کے رسالے بھی آپ کے لیے صدقہ جاریہ کا کام کر رہے ہیں۔ اچھی کتاب اور اچھی پڑھائی انسان کی تنہائی اور دکھ درد کا بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ آپ یوں بھی بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اتنی اچھی، نیک اور خدمت گزار شریک حیات ملی ہیں جو اپنا ہر کام گھر سے لے کر پبلی کیشنز تک بخوبی نبھا رہی ہیں۔ میری ان سے جب پہلی بار گفتگو ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری ان سے بات ہو رہی ہے۔ آپ پبلی کیشنز کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ میرے اس خط کا جواب ضرور دیں۔ میں نے آپ کو اپنی لائبریری کی تصویریں ای میل کی ہیں اور اپنی اس چھوٹی سی لائبریری کو آپ کا نام دیا ہے اور عذر رسول صاحب! آپ سے بات کرنا ہی ہمارے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ (بہت شکریہ اس عزت افزائی کا) میں نے تصویروں کے ساتھ جو کالم ای میل کیا ہے اسے دیکھ کر پہلی نظر میں آپ نے کیا محسوس کیا، ضرور لکھیں۔ اب کچھ آپ کے رسالوں کے بارے میں۔ رب کائنات آپ سب کو اس کام کو بڑھانے میں آپ سب کی مدد کرے اور آپ کو صحت دے۔“ (اتنی چاہت کا بے حد شکریہ۔ جی آپ کا ای میل کردہ کالم اور لائبریری کا ٹکس ہمیں مل گیا ہے۔ آپ نے اپنی لائبریری جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے روح رواں معراج رسول کے نام کی ہے۔ بہت مہربانی۔ آپ نے بے زبان جانوروں کے بارے میں کالم لکھا۔ اچھا ہے اور واقعی ہمیں ان بے زبانوں کا بے حد خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن سسپنس میں اشاعت کے حوالے سے ہم معذرت چاہتے ہیں مگر ان تمام باتوں میں ڈائجسٹ کی کہانیوں کے بارے میں آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ مزید آپ اس کے لیے کیا چاہتی ہیں۔ مصنف اور کہانی پر کوئی رائے نہیں دی۔ خیر آپ نے جو بھی کہا آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ فون پر

فردا فردا سب سے بات کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہذا خطوط کی یہ محفل آپ کی اور ہماری آسانی کے لیے رابطے کا خوب صورت ذریعہ ہے۔ جو بھی کہنا ہے خط لکھیں۔ آپ کے خطوط ہماری محفل کی زینت بنتے رہیں گے۔ ہمارے لیے تمام قارئین محترم ہیں اور سب ہماری محبت اور توجہ کے حق دار ہیں جن کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔



✽ اور ایس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "ماہ مارچ کا سہنس خوب صورت رنگوں کا استخراج آزاد فضا میں اڑتی ہوئی تتلیاں بہت عمدہ لگا۔ انشائیے میں عقل و خرد کے موتی چنے چنے جس میں انسانیت کا ذکر سرفہرست رہا۔ ادارے کا بھی اپنا الگ انداز تھا۔ ناموں کی دنیا میں محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا نام تھا۔ مبارکباد۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سلسلے بغاوت کے مغل حکمران اکبر اعظم کے حالات و واقعات بہترین و موثر انداز میں پیش کیے محبت و رقابت، اپنوں کی ریشہ و انیاں، غیروں کی بے اعتنائیاں خوب عکاسی کی گئی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ناہید سلطانہ آخر واقعی انسان کا ایسا ہے کہ وہ ساری عمر جدوجہد کرتا ہے ایک گھر بنانے میں مگر بیٹا لوگ زندگی بھر کاوشیں کرنے کے باوجود سر چمپانے کے لیے گھر نہیں بناتے اور دنیا سے گزر جاتے ہیں حسرت و یاس لیے ہوئے۔ شیش محل اسما قادری کی کہانی خوب صورتی و دلچسپی کا عنصر لیے جاری و ساری ہے۔ ہر ماہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے پھر کشمیری کا احساس لیے کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ کارنامہ تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی۔ بد طینت بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ چلتر میں ایک عورت نے پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور دولت لے اڑی۔ روٹیاں منظر امام کی تھی جس نے عبرت کا درس دیا۔ حقیقت سے قریب تر کہانی تھی۔ انسانیت سوز یہ واقعہ کہ گول روٹی نہ بنانے پر باپ و بھائی نے ایک بچی کو مار مار کر ختم کر دیا، انسانیت بھی کانپ گئی ہوگی۔ محفل شعرو سخن میں بھی اشعار نے مزہ دیا۔ بیچ بیچ میں کڑوٹوں نے..... لطائف و اقوال زریں نے آگہی کا دروا کیا۔ تحفہ اور بے رنگ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ابو العلیٰ قطب دوراں نے قلبی کیفیت کو نورانی جذباتوں سے ہمکنار کیا۔ اللہ کے ولی جب دنیا کو چھوڑ کر اللہ سے لو لگا لیتے ہیں تو ان کی زبان اللہ کی زبان بن جاتی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں اللہ ان کی خواہشوں کو پورا کر دیتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی صرف اور صرف اللہ کے لیے ہی وقف کی ہوتی ہے۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں لہوا اثر کا شرف زہیر کی بہترین کہانی تھی۔ دوسری کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی کفن بہ دوش تھی جو کشمیر کے پس منظر پر لکھی ہوئی پُر اثر تحریر تھی، بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔"

✽ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں "15 فروری کی شام کو مارچ کا شمارہ مسرور ہیں میں ملا۔ سرورق کو ایک خوب صورت ماڈل کے ساتھ رنگ کھیرتی تتلیوں سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم نیکی لے کر آئے بہت خوب کہا کہ بس دو ہی عقیدے ہیں، انسانیت اور انسانیت دشمن۔ چاہے مغرب ہو یا مشرق ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو نادان لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کا ادارہ یہ پڑھا 23 مارچ تو پاکستان کے سنگ بنیاد میں ایک اہم قدم تھا جس سے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ افسوس کہ قائد اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کوئی ایسا لیڈر اور سچا ہمدرد نظر نہ آیا جو پاکستان کے لیے اچھا ثابت ہوتا۔ اپنی محفل میں آئے تو اپنے ہم شہر بھائی قدرت اللہ کو کرسی صدارت پر عمدہ تبصرہ کرتے ہوئے براجمان پایا۔ بہت ہی عمدہ تبصرہ مبارک ہو۔ شا کر لطف کی شکایت محمد خواجہ کی و نذر قل تبصرہ نگاری کمال کا تبصرہ لکھا۔ رانا حبیب کی سینٹرل جیل لاہور سے شرکت آپ کی ہمت ہے کہ جیل میں بند کر پڑھنا اور لکھنا اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل سے شروع کیا۔ جولی کو باپ کی موت کا پہاڑ جیسا غم بھی اٹھانا پڑا۔ اب وہ دلدار آغا سے انتقام کو وقتی طور پر بھول کے اپنے والدین کی ہسٹری پڑھ رہی ہے۔ قاروق شملہ جا پہنچا تحریر میں ہندو مسلم فسادات کے بارے میں بتایا گیا۔ ہندوستان کا بنوارا ہو کے رہے گا کیونکہ مسلم قوم کے لیے ایک الگ ملک ضروری تھا جہاں وہ اپنی زندگی سکون سے گزار سکیں۔ اس کے بعد ماروی تک پہنچے جس کے لکھاری محترم محی الدین نواب منوں مٹی تلے جا سوئے جو لوگ لوگوں کے دلوں میں اور کتابوں میں اتر جائیں وہ کبھی مرا نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ لفظوں اور دعاؤں میں زندہ رہتے ہیں۔ ماروی کی یہ قسط بھی ایکشن سے بھرپور رہی۔ اس کے بعد پہنچے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی وادی کشمیر پر لکھی کفن بہ دوش کے دوسرے اور آخری حصے پر جہاں بھارتی ظلم حد سے گزر گئے تو کفن بہ دوش مجاہدین نے ان کو ناکوں چنے چبوا دیے پتا نہیں ادھر کتنے ہی کیپٹن بھگوت جیسے جہنم واصل ہو گئے مگر کبھی کشمیر پر غلبہ نہ پاسکے۔ تاریخی کہانی سلسلے بغاوت کے بادشاہ اکبر نے جو حکومت کی سو وہ تو کی لیکن اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھ کر رب تعالیٰ کا مجرم ٹھہرا۔ ناہید سلطانہ قصہ شہر شاہاں لے کر آئیں۔ صرف میثروہ فلائی اور اور دیگر منصوبوں سے ترقی ممکن نہیں بلکہ لوگوں کو خصوصاً غریبوں کو مفت علاج کی سہولت تعلیم و تربیت کی سہولت اور نظم و ضبط پر چل کر ملک و قوم ترقی پاتے ہیں۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہونے سے جرم اور ظلم ترقی کرتے ہیں۔ تنویر ریاض کی کارنامہ میں جان نے اچھا کارنامہ انجام دیا۔ مرزا امجد بیگ کی بد طینت بیگ صاحب نے کیا جکڑا قانون کی رسی میں شاہ جی کو جڑا آگیا۔ عمدہ تحریر۔ سلیم انور کی چلتر گزارہ کر گئی۔ محفل اشعار بھی عمدہ رہی۔ شرعباس کی تحفہ بہت ہی اچھی تحریر۔ مقبول حسین کی بے رنگ میں اسٹورٹ کار نے ڈکسن کو بچا یا اور نہ وہ تو مرنے کے راستے پر تھا پر اسٹورٹ نے بروقت ذہانت سے کام لے کر اصل مجرم کو پکڑ دیا۔ ضیا نسیم کی قطب دوراں ابو العلیٰ پڑھ کر دل کو سکون میسر ہوا۔ کاش ہم بھی نیک لوگوں کے نقش قدم پر چل کے اپنی زندگی آسان بناتے۔ کاشف زہیر کی لہوا اثر میں روچینہ کا کردار بہت عمدہ رہا۔ اس نے جس ہمت سے زندگی کی کنجیوں کا سامنا کیا وہ قابل داد ہے۔ منظر امام روٹیاں لے کر آئے۔ میں نے کئی دفعہ اس تحریر کو پڑھا تو میری آنکھوں سے ہر دفعہ آنسو ٹپکے۔ روٹی گول نہ بنا سکتے پر دس گیارہ سالہ بھول جیسی بچی کو مار ڈالا۔ یہ پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ غضب الہی اب کے تب آنے کو ہے۔ ہم سیدھے راستے پر نہ چلے ظلم کی حد کو پہنچے یقیناً سزا تو بھگتی ہے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اللہ ہم کو اعمال نامہ درست کرنے کی توفیق دے۔" (آمین..... بے شک ہمیں اپنے اعمال پر غور و فکر کی ضرورت ہے)

✽ محمد یوسف سانول لنگڑیال، نور پور قلعہ خورشاب سے سے تشریف لائے ہیں "شمارہ اپنی روایات کے مطابق 19 کو ہی مل گیا۔"



حق کے پیامبر کا پیغام، نیکی پڑ جائے پڑھ کر یہ سمجھ آئی کہ جبروں کو برا کہنا اور سمجھنا ہی بہت بڑی نیکی ہے۔ ادارہ یہ پڑھا جہاں حسب روایات نا انصافیوں کا رونا روتا گیا اور ایک عظیم سانحے کی اطلاع ملی، دل بہت اداس ہوا۔ دیوتا جیسے دیو مالائی سلسلے کے خالق جناب محی الدین نواب صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ نواب صاحب جیسے لوگ مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ایک زندہ یاد بن کر۔ خداوند کریم نواب صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ مرحا گل بہن جی آپ تبصرہ کرتی رہا کریں۔ آپ کا تبصرہ میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ رضوانِ حقوی صاحب بھی کافی عرصے سے غائب ہیں۔ پلیز آپ آتے رہا کریں۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اس کا قوری کی تحریریں قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ ربین دادا اور قاروق کا کردار بہت پسند ہے اور جو لیت کی ماں کی ڈائری دیکھو کیا اسرار کھولتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا موڑ کہانی میں آنے والا ہے۔ اس کے بعد ماروی پڑھی اور یہ جان کر دل بوجھل ہوا کہ اختتام تشنہ تکمیل رہے گا۔ کفن بدوش میں کشمیری نوجوان شیر علی کا کردار بہت پسند آیا اور بہت سے حقائق جو تقسیم برصغیر کے تھے ان سے آشنائی ہوئی۔ سکھ، ہندو گورکھا کے مظالم پر دل خون کے آنسو ر دیا اور عبدالرحمان جیسے کمانڈر کا کردار بہت پسند آیا۔ سلسلے بغاوت کے دور اکبری کا مکمل احاطہ اور نصف صدی تک حکومت کرنے والے بے دین مسلمان بادشاہ کا احوال اور بغاوت کے اسرار و رموز سمجھ آئے۔ بدطینت بیگ صاحب کے ایک اور کامیاب کیس کی کہانی ادارے سے پُر زور ریکوئسٹ ہے۔ ایک ایسی تحریر شائع کریں کہ جس میں بیگ صاحب مقدمہ ہار گئے ہوں کیونکہ بندہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے اور کوئی بھی فرد اپنے فن میں مکمل نہیں ہوتا کہیں نہ کہیں خامی رہ جاتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں اسلام آباد کی مکمل عکس کشی کی گئی۔ تاہم سلطنتِ اختر بھی ایک معاشرتی جراح ہیں۔ ان کے قلم کی کاٹ بھی بہت تیز ہے۔ میں عرصہ دس سال سے ان جڑواں شہروں میں رہائش پذیر ہوں یعنی کہ جاب کرتا ہوں اور ان دس سالوں کا منظر مصنف کی تحریر میں حقیقی طور پر نظر آیا۔ سلیم انور کی چلترا ایک عورت کی چلترا کاری کا منظر کارنامہ جہاں ایک کارکن اپنے فرض سے کوتاہی کرتا نظر آیا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے جو اپنے فرض میں کوتاہی برتیں اور دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں۔ منظر امام صاحب کی روٹیاں نے خون کے آنسو ر لایا۔ بہت پُر درد اور پُر اثر کہانی تھی۔ تحفہ ایک میاں بیوی کی محبت کا نہ سمجھ آنے والا قصہ، لہذا اثر معاشرتی کہانی ہمارے ارد گرد بکھرے کرداروں سے کاشفِ زہیر صاحب نے جو دیکھا، وہ لکھا اور بہت عمدہ لکھا۔ بے رنگ ایک عمدہ مغربی کہانی۔ ابو الحسنی قطب دوراں اسلامی سلسلے کی ایک اور ہیرے کھیرتی مالا جس کا ہر دانہ لا جواب اور مصنف کی کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ محفل شعرو سخن میں عمران عارف، محمد قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ باقی کتر میں بھی اچھی تھیں اور ہاں ٹائٹل کی تعریف تو بھول ہی گیا عمدہ، لا جواب ٹائٹل جہاں حسینہ ماہ، جینہہ قلیوں کے سنگ تھمکتی نظر آئی اچھا لگا۔“ (دلچسپ تبصرہ..... شاعر ارا انداز)

✽ بشریٰ افضل، بہاولپور سے محفل میں شریک ہیں۔ ٹائٹل انتہائی خوب صورت اور دلکش تھا۔ مرحوم جون ایلیا کی (نیکی) پڑھی۔ خود تو ملے گئے ہمارے لیے علم کا خزانہ ایک ملٹی انداز میں چھوڑ گئے۔ ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ اپنی محفل میں بچے انگل کی باتیں نہیں۔ جناب محی الدین نواب کی موت کا بڑا دکھ ہوا۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) کری صدارت پر محمد قدرت اللہ نیازی کو براہمان پایا جنہوں نے شعر سے ابتدا کی۔ تبصرہ قابل ستائش تھا۔ ہمارا خط تیسرے نمبر پر تھا شکریہ ہمیں یاد رکھنے کا۔ شا کر لطف چلیں روٹا بند کر دیں اور کہانی لکھ ڈالے، ناراض نہیں ہوتے اچھے بچے۔ محفل شعرو سخن میں باکمال اشعار تھے۔ شعروں کی کیکیشن بہترین تھی، مزہ آ گیا پڑھ کر۔ جنید احمد ملک پہلا نمبر مبارک ہو۔ لوگ کتنے روپ بدل کر چوریاں کرتے ہیں جس طرح چلترا میں اس لڑکی نے بوڑھی عورت کا روپ دھار کر چوری کی اور صاف نکلتی۔ منظر امام نے روٹیاں کے عنوان سے حقیقت بیان کی ہے ہمارے معاشرے میں یہی تو ہو رہا ہے۔ ہمارے معاشرے کی منظر کشی خوب صورت الفاظ میں کی ہے یہی تو ان کا خاصہ ہے۔ شرعباس کی کہانی تحفہ، بہت خوب صورت کہانی۔ شیراٹل تو اپنے شوہر سے زیادہ چالاک نکلتی۔ بڑی خوب صورتی سے خود کو بچا لیتی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی بدطینت، اندازِ بیاں خوب صورت تھا۔ سسپنس اتنا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ کتر میں بھی بہت خوب صورت تھیں۔“ (تبصرہ اچھا لگا..... آپ کی شمولیت محفل کی رونق ہے)

✽ صادق معاویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ مارچ 2016ء کا سسپنس زیب نظر ہوا۔ سرورق کی دو شیزہ جانے کو نسا پر فیم لگاے مجھو ستراحت گئی کہ جن کی ساری حسین تیلیاں دیوانہ وار اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ زبردست ذاکر انکل..... جون ایلیا نے ٹھیک کہا کہ برے کو برا کہنا اور برا سمجھنا بھی نیکی ہے۔ آپ ادارہ میں بے قاعدگی پر تھماتے نظر آئے۔ خدا کرے بھی تو غریب عوام کے امیر حکمران، غریبوں کے لیے سنجیدگی سے سوچیں اور دکھ دینے والی خبر کہ ہمارے محبوب کلم کار محی الدین نواب جہاں قانی سے دار بقا کو سدھار گئے۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ 3 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر انکل نواب کو ایصالِ ثواب کریں۔ براورم قدرت اللہ نیازی مارچ 2016ء کے لیے صدر بزم یاراں ٹھہرے (مبارکال سامیں مبارکال) طرزِ تحریر اور مضمون شاندار۔ آپ کے ساتھ ہم بھی شریک دعا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دہشت گردی کے صغریٰ سے نجات دے۔ اشفاق شاہین اور بشریٰ افضل مختصر مگر جامعہ تحریر کے ساتھ وزارت اور مشاورت کی کرسی پر جلوہ فگن اور پھر آپ نے مجھے خوش آمدید کہا تو جناب میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب ہماری اپنایت دیکھیے کہ تین دن میں سارا سالہ پڑھ ڈالا۔ اب سوچتا ہوں باقی 27 دن کیا کروں گا۔ (سید میاں بات ہے انتظار) محمد صغور

سانحہ ارتحال

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ کی ایڈیٹر یعنی احمد کی ہمیشہ حنا عروج طویل علالت کے بعد 21 فروری 2016ء کو رضائے الہی سے انتقال کر گئیں۔ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں جگہ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے)



معاویہ آپ نے ٹھیک کہا کہ پاکستانی ذہانت کا جواب نہیں مگر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی اور 3 مرتبہ پڑھی۔ پہلی مرتبہ شوق سے۔ دوسری مرتبہ تسکین کے لیے اور تیسری مرتبہ تبصرہ کرنے کے لیے (کمال ہے) کیا تبصرہ کروں سچ تو یہ ہے کہ شیش محل پر تبصرہ کرنے کے لیے میرے حاضریہ خیال میں الفاظ نہیں ہیں۔ ربین دادا کا ہر جگہ معاملات سلجھانا اور ہر ایک کی خیر خواہی دیکھ کر دل میں خواہش اٹھی کہ کاش ہمارا کرتا دھرتا بھی کوئی ربین دادا ہی بن جائے پھر ماروی پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ آنکھیں جھپک گئیں کہ نواب انکل اب ہم میں نہیں رہے لیکن دلوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ باقی کہانیوں پر تبصرے کی صورت میں یاران محفل کی حق تلفی کا خطرہ ہے لہذا بس کرتا ہوں۔ حیات باقی۔ ملاقات باقی۔“ (کافی سمجھدار ہیں)

✽ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے چلے آ رہے ہیں۔ ”موسم گل کی دوسک دیتا سسپنس ہمارے دل میں بھی بہا رہی کھلا گیا۔ رنگ برنگی تیلیوں سے سجا سردرق، خوب صورت سے خوب صورت ترین تھا۔ ٹائٹل گرل پر نوٹس۔ جون ایلیا کی کڑوی باتیں سن کر میٹھی سی محفل میں داخل ہوئے۔ محمد قدرت اللہ نیازی محبتوں کی صدارت کرتے نظر آئے۔ خاص کر ان کا انتخاب کردہ شعر دل کو چھو گیا۔ اشفاق شاہین بھائی دعاؤں کے لیے بہت شکر یہ۔ بشری افضل کیا کریں، دوستوں کے دیے زخم بھولتے نہیں ہیں نا۔ اب کچھ پرانے دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ بھی محفل میں آئیں ورنہ ہم بھی جا رہے ہیں۔ اسما قادری یہ کیا کر رہی ہیں۔ شیش محل میں چاند بانو موجودہ قسط میں غائب تھی۔ ماجد علی جیسے لوگ معاشرے میں رشتوں کے اعتبار کو گوارہ دیتے ہیں۔ میں تو سسپنس بس شیش محل کی وجہ سے لیتا ہوں..... ماروی کے رائٹر اس جہاں کو الوداع کہہ گئے، بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت نصیب فرمائے۔ اپنے محبوب رائٹر کی کہانی کفن بہ دوش پڑھی، بہت اچھی لگی۔ شیر علی کے ہمت اور حوصلے کی داد دینی چاہیے۔ زینو جیسی سوچ ہر لڑکی کو آجائے۔ جان جائے پر عزت نہیں۔ کشمیری بھائیوں کے لیے دل میں درد اٹھتا ہے۔ خدا غارت کرے ان بھارتیوں کو۔ کچھ شگفتگی وہ گئی پتا نہیں کیوں۔ کاشف زبیر کی کہانی لبو اثر پراثر تحریر تھی۔ منظر امام تو ہر دفعہ اداس کر کے چھوڑتے ہیں۔ روٹیاں ایک زبردست اور سبقت آموز تحریر تھی۔ غریبوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ نبیلہ کو کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ وہ امیر گھرانے کی بیوہ تھی اور اس بچی کو بس اللہ معاف کرے۔ سلسلے بغاوت کے نسل نہیں پڑھ پایا۔ شعر و سخن میں سعید عباسی کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ میرے والد صاحب غلیل ہیں ان کے لیے دعا کی درخواست ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ..... اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین)

✽ ایم عمران جوٹانی، رچھوڑ لائن، کراچی سے محفل میں حاضر ہیں۔ ”پچھلے ماہ بلیک لسٹ ہونے کے باوجود ایک سچی اور سچی۔ (ہوں.....) یہ ہوئی تاباں..... (اچھا لگا) دو چھٹیاں ایک ساتھ ہوں تو سارے کام نمٹا کر مطالعے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جامع و مختصر ادارے میں آپ نے 23 مارچ اور نواب صاحب کو خوب صورتی سے یاد کیا۔ میرا محفل نیازی صاحب! تبصرہ خوب صورت ہے۔ صادق معاویہ! خوش آمدید، تفصیلی تبصرے کی امید ہے اب زرین نے دوران سفر کلاسک خط لکھا۔ کورنگی کی تمنا سجد کی بڑھتی جا رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے پورا شمارہ خوب صورتی سے کور کیا۔ مرحا گل کا طویل تبصرہ بہترین سے بھی بلند ہے۔ ایک رات میں رسالہ ختم کر کے عہدگی سے خط لکھا۔ ڈاکٹر ساجد کی تحریریں تو معلومات کا خزانہ ہیں۔ اچھا تو جناب ہندو چند توں نے حسین عورتوں کی سب سے خوب صورت قسم ”پد منی“ کو قرار دیا۔ پد منی کو لبو پوری یاد آگئی۔ کل بھی سورج نکلے گا، کل بھی پچھلی گائیں گے اور جی یہ کہ میرے اجداد کے وطن گجرات کا پرانا نام ”مالوہ“ تھا۔ کیا منظر نگاری ہے اور یہ جملہ دیکھیں ”فتوحات اکبر کا پچھا انسان کے رزق کی طرح کر رہی تھیں۔“ بیدل کی دانائی کے بڑے قصبے سے تھے۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کا کیا انجام کیا، یہ آج پتا لگا۔ چاند بی بی کی ہمت و شجاعت نے لبو گرما دیا۔ وہیں اس کی بے بس موت نے دل اداس کیا، اکبر کے پچاس سالہ دور کی اس جامع داستان نے مظہر سلطنت کے زوال کے اسباب کھول کھول کر بیان کئے۔ آگے چل کر ناہید سلطانہ اختر کی خالص معاشرتی کہانی قصہ شہر شاہاں سے ملاقات ہوئی۔ منفرد پلاٹ نے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ اونچے خواب آنکھوں میں سجائے بڑے شہروں کی طرف کوچ کرنے والوں کے دل کی آواز ہے یہ۔ میرا ایک قریبی دوست حال ہی میں دو سال دار حکومت کی خاک چھان کر کراچی یہ کہتا ہوا واپس آ گیا کہ بھی اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ نئے لکھاریوں کو ضرور موقع دیا جائے۔ انگریزی، فرنچ، بنگالی، روسی اور ہندی زبان کی کہانیوں میں ایسے ایسے نگ موجود ہیں کہ قاری اش اش کراٹھے۔“

✽ مرحا گل، دہلی، ڈیرہ اسماعیل خان سے شریکو محفل ہیں۔ ”مارچ کا ٹائٹل بہاروں کا ساتھ تھا۔ رنگ برنگی تیلیوں کی طرح خوش شکل حسینہ بھی گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ ادارہ سے مستفید ہوئے۔ وہاں اس خبر نے دل دکھ سے بھر دیا کہ مکی الدین نواب ایک بہترین مصنف رضائے الہی سے وفات پا گئے۔ ان کی کہانی دیوتا نے ایک عرصے سے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ مصنفین اپنی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔ خدائے رب ذوالجلال انہیں مغفرت عطا فرمائے۔ آمین۔ ٹاپ آف دی لسٹ قدرت اللہ نیازی تھے، منفرد تبصرہ تھا۔ حساسیت لیے ہوئے تھا۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ بشری افضل ایک چھوٹے سے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ صادق معاویہ کی سچی باتیں اچھی لگیں۔ کڑوی محفل آف صنف مونیچ میں ہم بطور سویت ڈش بن کر اترتے ہیں۔ محمد خواجہ کورنگی کا تبصرہ پسند آیا جیسے ٹھنڈی میٹھی پھوار۔ رانا حبیب الرحمن کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ خصوصاً نازک صنف کو عزت کے ساتھ پکارے جانے کا اعزاز ویلڈن۔ گاؤں میں 19 کو ڈائجسٹ پہنچتا ہے اور ہم ایک رات میں پڑھ کر 20 کو لیسر شائع کر دیتے ہیں اتنی محنت سے لکھتے ہیں مگر..... حالانکہ ایک رات میں پڑھنے کا مزہ بھی نہیں آتا مگر محفل کی محبت میں کچھ چلے آتے ہیں اور آپ ہیں کہ (ارے ارے اس میں دل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے۔ ذرا دل بڑا رکھیں) سب سے پہلے کفن بہ دوش پڑھی۔ روح تک میرا ب ہوگئی، اسکی زبردست تحریر پڑھ کر ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ شیش محل بور سے بور تر ہوئی جا رہی ہے۔ سب سے بیٹ کہانی منظر امام کی تھی۔ کہانی پڑھ کر دل بو محفل ہو گیا۔ باقی کہانیوں پر تو تبصرہ۔ ہمارے قیمتی الفاظ تو یوں بھی کاٹ دیتے ہیں۔ پہلے محفل کی باتیں پوری شائع ہو جائیں پھر اگلے ماہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اپریل کے شمارے کو دیکھیں کچھ بچی ہو جائے گی کیونکہ اپریل میں ہمارے ایگزیم ہیں۔“



اس دفعہ بھی باتیں اور کتروں میں محمد جاوید چھائے رہے۔ (شکر یہ جناب تبصرے کا..... آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا)

✽ معراج محبوب عباسی، ہری پور، ہزارہ سے حاضر ہیں "مارچ کا سسپنس ڈائجسٹ تھوڑا جلدی 19 کو حاصل ہو گیا۔

ٹائٹل "حسین زنگوں کا عکاس تھا۔ سب سے پہلے ماروی پڑھی (اللہ تعالیٰ اس شاہکار کے خالق جناب نواب صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور مرحوم کو اعلیٰ درجات اور روٹا کو صبر جمیل دے کیونکہ جانا تو سب نے ہے) مراد علی منگی دشمنوں کو ناکوں پٹنے چہوار ہا ہے، وہ بھی مثل باڈی کے ساتھ دلکش و دیدہ زیب ڈیزائن والے اور ساتھ میں گھر بھی بسالیا ہے۔ لہذا اثر، کاشف زیر ایک حساس تحریر کے ساتھ آئے..... خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ رضا مراد کے کتوت جس طرح کے تھے تو خون کا اثر تو ہوتا تھا۔ مقبول حسین صاحب کی بے رنگ، خاصی دلچسپ تحریر تھی۔ سیکنڈ لاسٹ صفحے تک قاتل ڈکسن تھا۔ پھر اچانک شک کو مات ہوئی۔ سکے کا دوسرا رخ سامنے آیا مگر یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ ارے نہیں، بہت اچھا بے وقوف بنایا مسٹر قاتل کو۔ منظر امام کی روٹیاں ہمارے بے حس معاشرے کا بھیا نک رخ اجاگر کرتی حساس تحریر تھی۔ احساس نامی جذبے کو ہم نے بے حس کے تاج محل کے اندر دفن کر دیا ہے۔"

✽ بلقیس خاں، واہ کینٹ سے چلی آرہی ہیں "محی الدین نواب کی یوں اچانک رحلت کی خبر آرزوہ کر گئی۔ یہ وہ قلم کار تھے جن کی تحریروں سے اختلاف رکھتی تھی۔ میں نے بھی یہ نہ سوچا کہ راسخ جب کچھ لکھتا ہے تو بقول منو، اپنے گھر کا روزنامہ نہیں لکھتا۔ ہو سکتا ہے ہی آپ کی ہو اور آنسو آپ کی کسی دہلی بہن کے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر نواب صاحب جیسے بڑے لکھاری اگر قلم کی مار مارتے ہیں تو ہمیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ میرا دل بہت دکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر فضل و کرم کے دروازے کھولے اور تمام منزلیں آسان کرے۔ میری گزارش ہے کہ نواب صاحب کے سابقہ قلمی ناموں سے قارئین کو آگاہ کیا جائے۔ شکر یہ۔ نکلی، جون ایلیا کی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ اگر صرف اس ایک جملے پر لوگ عمل کر لیں۔ انسانیت ایک خاندان ہے نہ اس میں کوئی امتیاز ہے نہ کوئی تفریق..... تو میں سمجھتی ہوں دنیا سے ساری کدورتیں، عداوتیں، تفرقے اور انتشار ختم ہو جائے۔ ادارے میں باوردی شخص کے کالے کتوت پر وردی والوں کے لیے دل میں جو نفرت تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ کرسی صدارت پر خانیوال کے ایم کیو نیازی (جو اکثر اس کرسی پر قابض رہتے ہیں) براجمان تھے۔ خوب صورت شعر نے خوب سے تبصرے کو کئی چاند بڑ دیے۔ اشتقاق شاہین کے ہاتھ وزارت اور بشری افضل کو سفارت کا ٹکٹ ملا۔ صادق معاویہ سعیدی کی پہلی شرارت لگتا ہی نہیں کہ پہلی ہے۔ اس دفعہ اسے دن تبصرہ تھا۔ زرین آفریدی کی دوسری پوزیشن، محمد خواجہ اور تیسری پوزیشن محمد صفدر معاویہ کی رہی۔ مرزا گل اور سید عبادت بھی لیے ہاتھ مار رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ خوب لکھ رہے ہیں۔ شیش محل سے آغاز کیا۔ فیورٹ کردار رین دادا ہیں اگر اس طرح کے دو چار دادا پاکستان میں پیدا ہو جائیں تو سارا کچر اسی صاف ہو جائے۔ انتہائی مضبوط کردار خوش رو قاروق بھی کم نہیں ہے۔ جولیت، جوزف کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ شک تو جوزفین اور جوزف کی سوگوار آنکھوں نے پہلی قسط ہی سے دل میں بٹھا دیا تھا۔ اب قاروق سے کیا رشتہ لکھا ہے جوزفین کا..... انتظار ہے۔ اسما قاروق کی یہ تحریر گرداب سے زیادہ سحر انگیز ہے جو پڑھتے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں 70 فیصد افراد کی نمائندہ ایسی درد انگیز تحریر جس نے بہت سوں کو میری طرح رلا رلا دیا ہوگا۔ لہذا اثر کا اینڈ جلدی میں لکھا گیا۔ رضا مراد کو اتنا "وختہ" کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بدطینت، حسام بیٹ کی یاد رہ جانے والی کہانی ہے جس میں مظلوم کو اس کا حق ملا اور ظالم انجام رسید ہوا۔ بے رنگ، دوستی کے تقاضوں کو پورا کرتی ایک دلورہ انگیز کہانی تھی۔ ابوالفضل قطب دوراں سے روح سیراب ہوئی۔ کارنامہ، چلتر اور روٹیاں گزرا رہے لائق تھیں۔ آج کل بہت ساری پریشانیوں نے گھیراؤ کیا ہوا ہے ہمارا۔ اس لیے بغاوت کے سلسلے، ماروی اور کفن بدوش نہ پڑھ سکی۔ محمد جاوید، نجی رحمان، رضوان تنولی، مرزا گل، ریاض بیٹ اور اختر عارف شاہ کے مراسلے اچھے تھے۔ اشعار جنید احمد ملک، ظفر اقبال ظفر، محمد کمال انور، جبران احمد ملک اور اشتقاق شاہین کے خوب رہے۔"

✽ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں "مارچ کا شمارہ نورانی ہاتھ میں آ موجود ہوا۔ سرورق پر ایک خاتون شاید اپنے آنچل کی مہک پر مدھوش نظر آرہی ہے اور مہک بھی شاید ایسی کہ تلیاں بھی اس پر منڈلا رہی ہیں۔ جون ایلیا کی پُر مغز اور معنی خیز تحریر کو مختصر سی لیکن دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے۔ اس دفعہ انہوں نے انسانیت اور انسانیت دشمنی اور اقدار کی کشمکش پر اتنی سیر حاصل کرار کی ہے کہ ذہن روشن کر دیا۔ خطوط کی محفل دوستوں نے خوب سجائی۔ میرے خط پر آپ کی پسندیدگی کا شکر گزار ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی اس دفعہ میرا کارواں ہونے پر مبارکباد قبول کریں۔ آپ کے شعر کا جواب نہیں۔ رانا حبیب اللہ آپ کو اس مشکل سے آزادی دلانے۔ سلسلے بغاوت کے گوکہ زمین پر عذاب ہی زن، زن، زمین کے وجود سے ہے۔ چاہے وہ عام آدمی ہو یا بادشاہ۔ مظہر دور کی یہ کہانی گوکہ کئی داستان گو لکھتے ہی رہے ہیں لیکن ڈاکٹر ساجد امجد نے بڑی شیرینی سے تحریر کی ہے۔ بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ قصہ شہر شاہاں، خاتون نے ہمارے ملک کے دار الخلافہ کے ماضی اور حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے ذہن میں اس خوب صورت شہر کی جو تصویر تھی، اس میں دھندلاہٹ آگئی ہے۔ کاش وہ شہر ہمارے سیاستدانوں کی گرفت سے آزاد ہو اور پہلے جیسا خوب صورت ہو جائے۔ شیش محل، بڑی روانی اور چابکدستی سے رواں دواں ہے۔ کہانی قدم قدم پر نئے موڑ لیتی ہے لیکن مصنفہ دلچسپی اور یکا گت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو دلچسپ بنادیتی ہیں۔ کارنامہ، ایک قتل کی داستان اور سراغ رساں کی انتھک کوشش۔ کامیابی کے نشہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا داداؤ آزمایا جیسے کوئی استاد اپنا کوئی گر چھپا کر رکھتا ہے۔ بدطینت، وکیل صاحب کے کارنامے اس رسالے کی جان ہیں۔ بیگ صاحب اپنے کام کے مرد میدان ہیں۔ ایک ستم رسیدہ عورت جو ایک معصوم چڑیا کی طرح ایک سیاہ و سفید اور مکار شخص کے جال میں پھنس کر الجھ گئی تھی لیکن بیگ صاحب اور ایک نیک شخص نے رحمت کا فرشتہ بن کر اس کو آزاد کیا۔ چلتر، بہت مختصر لیکن اچھی تحریر۔ ایک عورت کی کمال چالاکی جس نے اپنا جرم نہ صرف چھپالیا بلکہ مال بھی کما کر لے اڑی۔ روٹیاں، نظیر اکبر آبادی کا شعر جو روٹی پر کہا گیا ہے۔ اس کا اتنا بہترین ترجمہ اور تشریح اس مضمون میں مختلف انداز اور کہانیوں کے ذریعے کیا گیا ہے کہ روٹی اور جاندار کے تعلق کو بہت خوب صورتی سے اجاگر



کر دیا گیا۔ تحفہ میاں بیوی کا سجایا ہوا گودہ دھندا جس میں لوگ اپنی ہی انگلیاں گنوا بیٹھتے ہیں۔ کہانی گو کہ بڑی معمولی ہے لیکن شرعاً اس کے قلم نے اس میں روح پھونک دی۔ محی الدین نواب جیسے عظیم کہانی نویس کا دایر قافی سے کوچ کر جانا بڑا اندوہناک ہے۔ ایسے لوگ کہاں بار بار پیدا ہوتے ہیں اور ادب کے معراج تک پہنچتے ہیں۔ ایک شخص جو سارے شہر کو ویران کر گیا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ (بے شک ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے) بے رنگ، دو دوست۔ ایک کی محبوبہ کا قتل جو کیا کسی اور نے اور پھنس گیا ایک دوست جو مقتولہ کا محبوب تھا لیکن دوسرے دوست نے اپنی ذہانت اور ایک معمولی سراغ ڈھونڈ کر دوست کو بچایا اور دوستی کی لاج رکھ لی۔ امیر ابو الیٰ قطب دوراں، مظہر دور میں ایک باکمال خدا کی بزرگ ہستی کی داستان حیات جو ایمان کو تازگی اور زندگی کی راہنمائی کرتی ہے۔ لہذا اثر، ایک عورت کی کہانی جو قدم قدم جیتی اور مرنے لگی لیکن پاک دامنی، نیک نیتی اور ذمے داریوں کا بوجھ احسن طریقے سے اٹھاتی رہی۔ کئی جھول بھی نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کہانی نے بے حذر نہ کیا۔ کفن بہ دوش، کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور حریت پسندوں کی جنگ کی ایک زندہ حقیقت کا پس منظر۔ ہندوستان کی ظلم و بربریت سے بھرپور داستان اور کشمیریوں کی مظلومیت اور جدوجہد آزادی۔ بہترین پس منظر واقعات کی ترتیب اور جنگی چالوں کی بے مثال عکاسی لیکن یہ کہانی تو اختتام پذیر ہوئی۔ مگر جدوجہد آزادی تقسیم برصغیر سے جاری ہے۔ کترنیں اور اشعار، ہمیشہ کی طرح چٹکارے دار، حکایتیں، لطائف اور رنگارنگ تحریریں۔ اگلے شمارے کے خوب سے خوب تر ہونے کی امید اور آس۔ (آپ کے منفرد تبصرے نے ایک بار پھر دل موہ لیا)

ابرار وارث، سندیلانوالی سے تشریف لائے ہیں اس دفعہ کا شمارہ تو بہت ہی لیٹ ملا۔ ہلکے سبز رنگ پر بھورے رنگ میں لمبوس صف تازک ہمیشہ کی طرح اپنی حشر سامانیوں سے صنف کرخت پر قیامت ڈھار ہی تھی۔ جلدی سے سرورق سے جان چھڑائی اور سیدھا آپ کی باتوں میں آئے تو آپ نے مختصر حال احوال بتا کے ایک بری خبر سنائی کہ محی الدین نواب جو کروڑوں دلوں کی دھڑکن دیتا کے تخلیق کار تھے، وہ ہم میں نہیں رہے۔ سنی تو یہ خبر پہلے بھی تھی لیکن انواہ کے طور پر لی تھی لیکن یہ کیا؟ میں تو اتنی دیر تک سکتے میں رہ گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔ بے شک ہم سب نے ہی اللہ کی طرف جانا ہے۔ کاش کہ ایسا نہ ہوا ہوتا لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بہت دیر بعد رسالے کی ورق گردانی کی حالانکہ پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ساتھیوں کے تبصرے بوجھل دل کے ساتھ پڑھے۔ ان میں قدرت اللہ بھائی اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ محی الدین نواب کو اللہ جلد شفا یاب کرے تو بے اختیار آنسو آ گئے۔ ماروی کا کیا بنے گا وہ تو اب ہم سب میں مقبول ہو چکی تھی۔ ہم سب بشمول میں کب سے درخواست کر رہے تھے کہ نواب اکل ماروی کو ایڈ کر دیں لیکن یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اختتام ہوگا۔ فہرست میں نظر دوڑائی تو تاریخی کہانی کے بعد کاشف زبیر غائب، آگے دیکھا تو سیکنڈ لاسٹ اسٹوری پر تھے۔ میری پسند کے رائٹر ہیں تا۔ ناہید سلطانہ کا قصہ شہر شاہاں پڑھا۔ ملکی حالات میں گھرے بے کس و معصوم لوگوں کی داستان۔ اسلام آباد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہا۔ لوگ بھوک پیاس سے مر رہے ہیں اور ان لوگوں کو میٹروپس کے بعد اب اور خچ ٹرین سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔ کیا ان کو ستم رسیدہ، مفلوک الحال، غریب عوام کیوں نہیں دکھائی دیتے؟ ہمیشہ کی طرح حساس دلوں پر چوٹ کرتی پڑا اثر تحریر ہی پڑھی تھی کہ بھائی کبیر عباسی کی کال آئی کہ کاشف زبیر صاحب بھی ہم میں نہیں رہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ ایک مہینے میں ادارے کے دو گویا نایاب کیے بعد دیگرے کیسے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ کاشف زبیر تو جاسوسی ڈائجسٹ کی جان تھے۔ ہر دفعہ جاسوسی اور سسپنس میں ان کی تحریر نہ ہوتی تو مجھے تو یہ رسالے بالکل خالی لگتے تھے سچ میں..... یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟ بس اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحومین کی روحوں کو سکون و قرار پہنچائے کہ انہوں نے ہم سب کے لیے اتنی زیادہ سبق آموز تحاریر لکھیں..... اللہ پاک ان لوگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ باقی سب قلم کاروں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

اشفاق شاہین، کراچی سے حاضر ہیں "موسم بہار کے آغاز کی مناسبت سے ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ تلی، پھول، ہلکی، موسم اور سسپنس، واہ جی خوش ہو گیا۔ جون ایلیا کے انشائیے نیکی میں جھلک مگر پر مغز باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی، من حیث القوم ہم میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن جب تک ہم سچ کا پرچار نہیں کریں گے، غلام ہی رہیں گے ذہن۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں پہلی خبر محی الدین نواب کی وفات کی خبر نے دل کو دھکی کر دیا، بلاشبہ وہ سسپنس کے قارئین کی نبض کو اچھی طرح سمجھتے تھے، قارئین مدتوں انہیں فراموش نہ کر پائیں گے۔ کاشف زبیر کے لیے بھی دعائے صحت۔ (آپ کی دعائیں آخرت میں کاشف کے لیے اجر کا سبب ہیں) قدرت اللہ نیازی و کٹری اسٹیڈ پر تھے۔ مخطوط کے آخر میں ایڈیٹر کے ریمارکس، مزہ دو بالا ہو گیا ہے، رونق اور مزید بڑھے گی۔ صادق سعیدی محفل میں آمد پر خوش آمدید۔ زرین آفریدی، محمد انعام، منفرد خط پسند کرنے کا شکر ہے۔ بلاشبہ سب سے پہلے شیش محل کا مطالعہ کیا۔ مخصوص ردھم سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ ماجد انجام کو پہنچا، ٹھنڈا کا معاملہ سلجھا۔ جو لیٹ دکھ درد کھوں کی لپیٹ میں ہے، اس کے دن جانے کب پھریں گے اور فاروق جس خیال کو رگ جاں بنائے بیٹھا ہے، جانے کب اس کے سامنے جلوہ نما صورت مجسم ہوتا ہے اور ایڈ پر ایک نئی اسٹری، دیکھیں اب کیا برآمد ہوتا ہے اس انتظار سے۔ سلسلے بغاوت کے، بہت شاندار تاریخی کہانی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ایک دلچسپ کہانی تھی گڈ ناہید سلطانہ اختر۔ تنویر ریاض کا کارنامہ شاندار تھا۔ بدھینت، مرزا امجد بیگ کا لازوال شاہکار تھا۔ اجمل شاہ جیسے کردار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں اور موقع کی ناک میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ناخبراروں سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ سلیم اختر کی چلتر واقعاتی بہت تیز اور شاطر لکھی۔ گڈ۔ روٹیاں سبق آموز اور دلچسپ حیرائے میں لکھی گئی تحریر ہے بہت زبردست۔ محفل شعرو سخن سب انتخاب لا جواب خصوصاً انعم کمال اور عروہ۔ شرعاً اس کا تحفہ خوفناک اور عجیب تھا۔ ماروی ہم زاد کے ساتھ محفل سے ماوراء مجوسفر ہے اور دیکھیں اب مراد کیا نیا لے کر آتا ہے۔ مقبول حسین کی بے رنگ عنوان کی مناسبت سے بہترین مکی۔ ابو الیٰ قطب دوراں، ضیا تنیم ہمیشہ بہت اچھے اور خوب صورت انداز میں روح میں اتر جانے والے واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔ ابو الیٰ قطب کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ لہذا اثر، کاشف زبیر کی پڑا اثر تحریر تھی۔ آخری صفحات پر کفن بہ دوش کے ساتھ عبدالرب بھٹی براجمان تھے اپنے رنگ کے ساتھ، بہت خوب۔ اس ماہ کترنیں بھی لا جواب تھیں۔ (دلچسپ تبصرہ تھا..... اچھا لگا)



﴿رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "سب سے تعزیت، میرے پسندیدہ قلم کار محترم جناب محی الدین

نواب صاحب کی رحلت کی اطلاع پڑھ کر دل کو ایک دھچکا لگا۔ اتنا صدمہ تو میرے استاد محترم کے انتقال پر بھی نہیں ہوا تھا، دعا ہے اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو جنت میں بہترین جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ابھی تو مرحوم کو بہت کچھ کرنا باقی تھا، ماروی کو مکمل کرنا تھا اس کے بعد آج کا راجھا شروع کرنا تھا مگر افسوس سب لائحہ عمل ادھورا رہ گیا۔ باروی کی یہ قسط بہت زبردست تھی، کفن بدوش بھی دل دہلانے والی تھی۔ چھوٹی طبع زاد کہانیوں میں لہو اثر نے بہت متاثر کیا۔ قصہ شہر شاہاں یہ سرے سے کوئی کہانی ہی نہیں تھی یہ تو ایک آرٹیکل مضمون تھا کہ پہلے اسلام آباد ایک حسین و جمیل شہر تھا، بعد ازاں اس کے برعکس ہو گیا۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ نے اس بار بہت مایوس کیا۔ البتہ اساقاوری کی کہانی شیش محل نے کافی لطف بہم پہنچایا۔ کارنامہ بھی اچھی نہیں لگی۔ مرزا امجد بیگ کو اس بار ایک منفرد کس ملا سو وہ بھی انہوں نے جیت ہی لیا۔ وہ ہارنے کب ہیں؟ چلتے، ہائے ری عورت، تو نے پولیس افسروں کو خوب الو بنایا، وہ بھی امریکن پولیس والوں کو۔ منظر امام کی کہانی کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کفایت یروٹیاں۔ تحفہ، یا اللہ دنیا میں ونسٹ جیسے ظالم انسان بھی ملتے ہیں۔ اشعار کی محفل میں رعنا رضوی، اور یس احمد خان، زرین آفریدی کے اشعار قابل داد تھے۔ زرین آفریدی صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس ناچیز کا شعر پسند فرمایا۔ آخر میں میری جانب سے سپنس کے عملے کے تمام افراد کو درجہ بدرجہ دعا کریں اور سلام۔" (بہت شکریہ)

﴿سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے محفل میں شریک ہیں "میرے والد مرحوم دیوتا کو طویل عرصہ پڑھتے رہے۔ ان سے یہ شوق

ہمارے اندر بھی پروان چڑھا اور دیوتا کا سر ہمارے پورے گھر پر طاری رہا تا دم اختتام۔ اندھیر گھری، آدھا چہرہ، مقدر، واپسی اور ان کے ابتدائی اور اختتامی صفحات کے ناول کی تعداد ان گنت ہے۔ وہ حقیقت میں قلم کے نواب تھے اور درحقیقت ان کو پوری دنیا میں جو نام و مقام نصیب ہوا، اس میں ادارے کے بانی جناب معراج رسول کا بہت بڑا کردار ہے۔ ہزار رسول صاحبہ جو کہ ادارے کی ذمہ داریاں بڑے احسن انداز میں نبھاتے ہیں، ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ محی الدین نواب کی ان قلمی کامیابیوں میں، ایک عظیم کہانی کار کے جانے کا دکھ تو ہے ہی مگر یہ فخر ہے کہ وہ ہمارے ادارے کے سب سے بڑے لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ ماروی ان کا آخری ناول ہے اس امید پر کہ اس کو ضرور مکمل کیا جائے گا۔ ادارہ اور نواب مرحوم کے گھر والوں کو اور ان کے چاہنے اور پڑھنے والوں کو خدا مبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ ٹائٹل گرل اداس تھی مگر بہار آنے کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ جون ایلیا ایک اور زندہ تحریر کے ساتھ نکل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔ مدیرہ اعلیٰ بھی ملک کو گھر قرار دے رہی تھیں۔ سچ بات ہے کہ اگر ہم سب ایک قوم بن جائیں، تمام اصول و قوانین کی پاسداری کریں تو ہمارا ملک جلد ہی ترقی یافتہ اور دہشت گردی سے پاک ملک بن جائے گا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب نے اے پی ایس اسکول کے بچوں کو ایک اچھا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کفن بدوش ہی پڑھ پایا ہوں بہت اچھی تحریر تھی۔" (دیگر کہانیوں کے بارے میں آپ کی اپنی رائے ہے۔ البتہ مصنف کے خیالات میں مشابہت ہو سکتی ہے مگر انداز جدا ہوتا ہے)

﴿محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ناؤن خانوالا سے تہرہ کر رہے ہیں "ابھی نواب محی الدین کی وفات کی خبر سن کر ملال کم نہ ہوا تھا کہ

محبوب ترین مصنف کاشف زبیر کی وفات کی خبر ملی۔ اللہ پاک فریق رحمت کرے۔ کسی بھی تحریر کے ساتھ ان کا نام دلچسپی، معلومات، تجسس اور سسپنس کا ضامن ہوتا تھا۔ ان کی وفات نہ صرف ان کے عزیزوں بلکہ ادارے اور قارئین کے لیے بھی ناقابلِ حلاقی نقصان ہے۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اس صاحبہ جو لیٹ کی تنہائی دور کرنے میں معروف نظر آئیں جبکہ ہمیں جو لیٹ کے ساتھ فاروق کے خاندانی پس منظر جاننے کا بھی اشتیاق ہے۔ قیام پاکستان کا پس منظر بھی اس بار شامل رہا جو یقیناً معلوماتی رہے گا۔ تاریخی صفحات پر اکبر کے حالات زندگی پیش کیے گئے۔ نئے دین کی ایجاد کے سبب سب سے بدنام ترین ٹھہرنے والے اکبر نے بڑے کروفر سے حکومت کی۔ بعض تاریخی کتب میں ہے کہ مرنے سے پہلے وہ تائب ہو گیا تھا اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر چکا تھا۔ کاشف زبیر کی لہو اثر پڑھتے ہوئے مرحوم کی یاد آتی رہی۔ مصنف نے شہزاد کی مجرمانہ حرکت کو خون کے اثر سے منسوب کیا جو درست لگا۔ قصہ شہر شاہاں میں ناہید سلطانہ اختر نے پاکستان کے حالات کی حقیقت سے قریب ترین عکاسی پیش کی۔ کبھی ہل بنانے کے لیے عوام کو مصیبت میں ڈالا گیا تو کبھی میٹر اور اورنج ٹرین کے نام پر عوام کے گھروں کو مسمار کیا گیا اور اس سب میں کتنا کیشن کھایا گیا، فرشتے ہی بتا سکتے ہیں۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح مزاح کے پیرائے میں نثر زنی کرتے نظر آئے۔ جس طرح رویوں کی کارستانی بیان کی گئی، وہ قابلِ تعریف ہے۔ سچ کہا کہ امیر کے گھر میں ٹیڑھی میڑھی روٹیاں بھی انعام کی حقدار ٹھہرتی ہیں اور غریب کے گھر میں اس کی سزا تشدد ہے۔ تحفہ میں شیر اُتل اور ونسٹ لوگوں کو بے وقوف بناتے نظر آئے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ ان کو کوئی سوا سیر ٹکرائی دیتے۔ مقبول حسین کی بے رنگ کچھ زیادہ ہی رنگ دار رہی۔ نیلا پیلا اور کئی دوسرے رنگ شامل تحریر رہے۔ اسٹورٹ کار کی بھاگ دوڑ کا رآمد رہی اور ڈکسن بچ جانے میں کامیاب رہا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر صاحب کی کفن بدوش کا آخری حصہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کشمیریوں کی مشکلات اور بے بسی کی بہت خوب صورتی سے وضاحت کی۔ محفل خطوط میں داخل ہوئے تو خود کو کرسی صدارت پر دیکھ کر عجیب مسرت سی ہوئی۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے ہماری تجویز کو نوٹ کر کے رسپانس دیا ہے۔ صادق معاویہ! یہ ہمارے لیے اطلاع ہے کہ آپ کو 16 تاریخ بھی 3 دن لیٹ محسوس ہو رہی ہے ورنہ ہمارے یہاں تو 18 تک ہی ملتا ہے۔ زرین آفریدی! محفل شعرو سخن میں تبدیلی کی وضاحت نہیں کی آپ نے؟ محمد خواجہ! آپ کی آنکھوں کا آپریٹن کامیاب رہے اور اللہ آپ کو صحت دے۔ مرزا گل! آپ کی بات سچا کہ یہ شوخیاں ہی محفل کے حسن کی ذمہ دار ہیں۔ رہی بات ٹیڑھے میڑھے الفاظ کی تو آپ کو غلط بھی ہوئی ہے۔ میرے الفاظ تو چلبلی کی طرح سیدھے ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

قاسم عسکری، رنچھوڑ لائن، کراچی۔ حاجی محمد اسحاق انجم، قصور۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ احسان سحر، میانوالی۔ آصف محمود، گوجرانوالہ۔ سید یوسف رضا کاظمی، لیہ۔ شا کر لطف، لاہور۔ صداقت حسین ساجد، شورکوٹ۔ مشال اینڈ نوال، جہلم۔ اکرم محمود، لاہور۔

گریہ پیٹم

ایسا سیتا پوری

یہ اللہ کی مصلحت ہے کہ اس پاک ذات نے گزرے کل میں ہمیشہ آنے والے کل کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام پوشیدہ رکھ چھوڑا ہے جسے سمجھنے کے لیے انسان کو شعور عطا کیا۔ تاکہ اس کی شان کو پہچان کر اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکیں... قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا ایسا کلام ہے جس میں اس نے نہ صرف مکمل ضابطہ حیات دیا بلکہ اپنے پیغمبروں کی زندگی کا بھی ایسا احاطہ کیا جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے... انہی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی ذکر مبارک ہے... آپ کی تمام حیات اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن رہی اور ایسی آزمائش سے گزرتی رہی جس پر پورا اتر کر آپ نے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ درج ذیل داستان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات وہی ہیں جس میں رشک و حسد اور پھر کسی کا خاص طور پر اللہ پر توکل... بس یہی وہ نقطہ ہے جس سے اللہ کے عام اور خاص بندوں میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

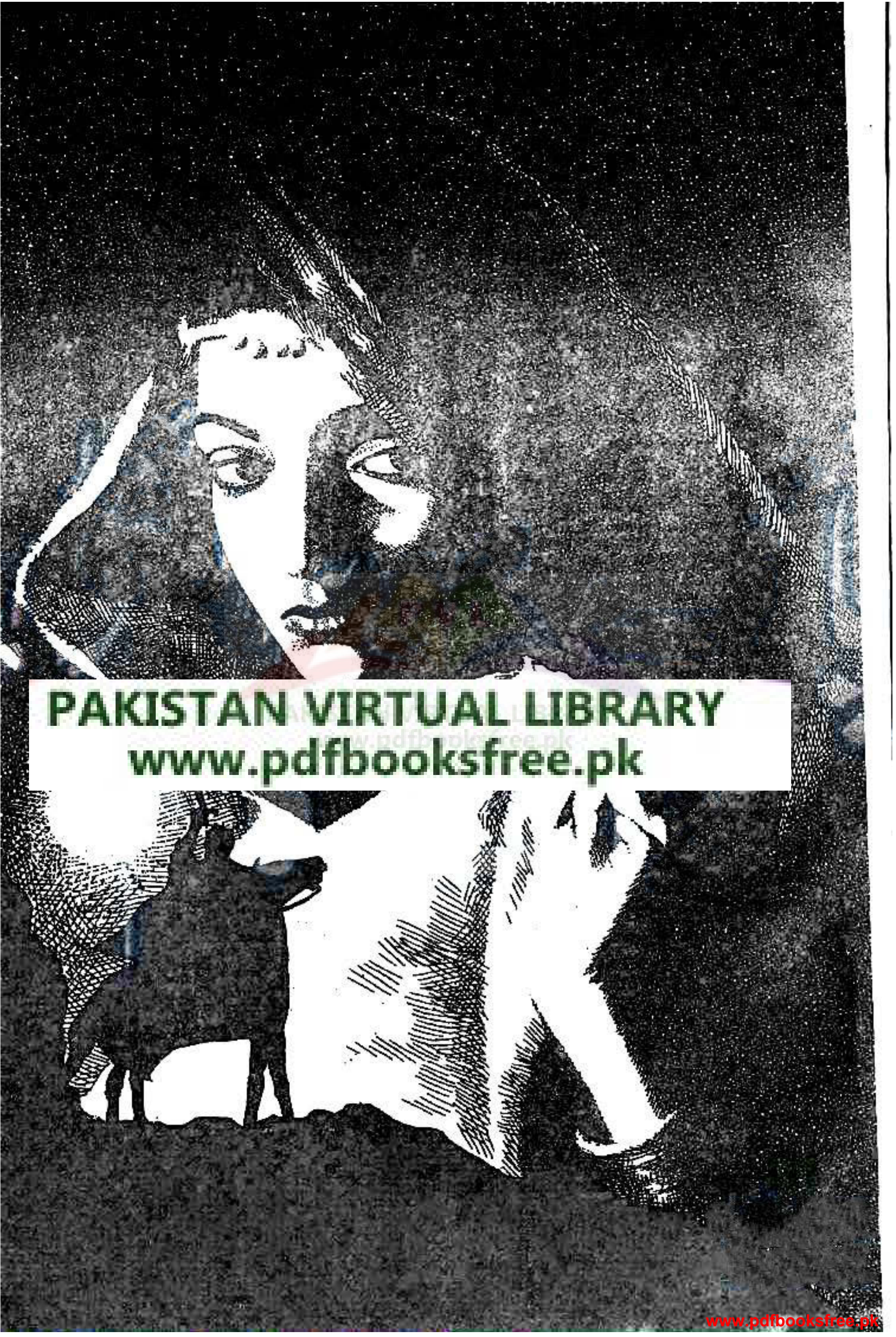
ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

حاران میں ایک بستی فدان ارم نامی ہے، اس بستہ میں تیرا باموں لا بن رہتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں، تو ان میں سے کسی ایک سے شادی کر سکتا ہے۔

کنعان میں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن باپ کی ہدایت پر سعادت مند بیٹے نے حاران کی راہ لی۔ جس اونٹ پر یعقوب سفر کر رہے تھے، اس پر اپنے آگے پیچھے کچھ ضروری سامان بھی رکھ لیا تھا۔ اونچے نیچے، سرسبز و بنجر، آباد اور غیر آباد علاقوں سے گزرتے ہوئے جب آپ فرات

باپ نے اپنے بیٹے یعقوب کو خاص طور پر یہ نصیحت کر دی تھی کہ وہ کسی کنعانی لڑکی سے شادی نہ کرے۔ شریف بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ ”پھر میں کس سے اور کہاں شادی کروں گا؟“

بوڑھے باپ نے کھڑے ہو کر اپنی گھنی ابرو اور بڑی بڑی پلکوں والی آنکھوں سے شمال مشرق میں دیکھا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے یعقوب! تو ادھر چلا جا، یہاں تک کہ تو فرات کو عبور کر کے حاران میں داخل ہو جا۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



کے کنارے پہنچے تو اسے پار کرنے میں خاصی زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ فرات کے کنارے انہی کی طرح کچھ اور لوگ بھی کشتی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

صبح سے سہ پہر تک کشتی کے انتظار میں کھڑے رہنے کے بعد جب وہ نظر بھی آئی تو یہ مشکل پیش آگئی کہ کشتی والے ان کے اونٹ کو دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یعقوب نے اپنا اونٹ ہمیں چھوڑا اور خود دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے فدان ارم کی راہ لی۔ یہ سفر بڑا دلچسپ تھا۔ انہوں نے جگہ جگہ کنوؤں پر عورتوں اور لڑکیوں کا جھنگٹا دیکھا اور آسودہ حال امیرزادوں اور شوقین مزاج نوجوانوں کو اپنے گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا۔ کنوؤں پر موجود لڑکیاں انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھتیں اور آپس میں سرگوشیاں کر کے بے معنی اشارے کرتی لگتی۔

راہ میں زیون کے درختوں کی بھرمار تھی اور کھجور کے اونچے اونچے، سیدھے اور خمیدہ درخت تیز ہوا کے جھکڑوں سے مل جل کر یعقوب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اس وقت آپ کو بھوک اور پیاس مل کے پریشان کر رہی تھیں۔ آپ نے ایک چھوٹے سے نخلستان میں بیٹھ کر چند کھجوریں کھائیں اور پانی پی کر اپنی منزل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نخلستان سے ایک عورت نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں کھجوروں سے بھرا ہوا ٹوکرا تھا۔ اس نے یعقوب کو ذرا غور سے دیکھا اور جھکتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تو مسافر ہے؟“

یعقوب نے نرمی سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں مسافر ہوں اے مہربان خاتون! جہانوں کا رب تجھے نیکی کی ہدایت دے، کیا یہ نخلستان تیرا ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”یہ میرا تو نہیں، میرے ماموں کا ہے۔“

”خوب!“ یعقوب کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ ”میں بھی اپنے ماموں لابن کے پاس جا رہا ہوں۔“

عورت نے نہایت اشتیاق سے یعقوب کو دیکھا اور پوچھا۔ ”تیرا ماموں لابن وہی تو ہے جو فدان ارم میں رہتا ہے اور جس کی دو بیٹیاں بھی ہیں، لیاہ اور راحیل۔ لیاہ شاید بڑی ہے اور راحیل چھوٹی۔“

یعقوب کا چہرہ خوشی سے تھما اٹھا۔ جوش میں کھڑے ہو گئے، بولے۔ ”بخدا تو تو ان سے بہت زیادہ واقف معلوم ہوتی ہے۔ تو تو ان کے نام اور عمروں تک سے واقف ہے۔ اب ذرا یہ تو بتانا کہ لیاہ اور راحیل میں اچھی کون ہے؟ واقعہ

در اصل یہ ہے کہ میں اپنے باپ کی ہدایت پر ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

عورت نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔ ”لیاہ ذرا چندھی ہے، ہاں راحیل البتہ خوب صورت ہے لیکن کیا تو چندھی لیاہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”پہلے میں ان دونوں کو دیکھوں گا اس کے بعد جو پسند آئے گی اس سے شادی کر لوں گا۔“

عورت نے طنزاً کہا۔ ”خدا تجھے تیرے ارادوں میں کامیاب کرے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تو جیسا سوچ رہا ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو۔“

یعقوب نے چلنے کی تیاری کی۔ اپنا سامان اٹھالیا اور عورت سے پوچھا۔ ”ہاں تو خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے، اب یہ اور بتا دے کہ فدان ارم یہاں سے کتنی دور ہے؟“

عورت نے شمال کے افق میں نظر آنے والی سبز پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو حد نظر پر درختوں کی پٹی نظر آرہی ہے، یہی فدان ارم ہے۔ اس خوب صورت بستی کو چاروں طرف سے باغات نے گھیر رکھا ہے۔“

یعقوب نے اسے خدا حافظ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہاں ایک اور مرد آگیا۔ یعقوب نے نخلستان سے نکل کر شمالی افق کی سبز پٹی پر نظریں جما کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

شام سے ذرا پہلے یعقوب نے شمالی افق کی سبز پٹی کو پایا لیکن اب یہ سبز پٹی بڑے بڑے گھنے درختوں کے طویل سلسلے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس سے گزر کر یعقوب ایک کنوئیں پر پہنچ گئے۔ اس وقت کنوئیں پر بڑی بھیڑ تھی۔ ہر عمر اور اچھی بری شکل کی عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے یعقوب کے گرد آلود لباس، دھواں دھواں چہرے اور خاک اور دھول سے اٹے پیروں سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ یہ اجنبی مسافر کسی لمبے سفر سے چلا آ رہا ہے۔

یعقوب نے ان بہت سارے چہروں کو سرسری نظر سے دیکھا اور ان سے پوچھا۔ ”اے فدان ارم کی عورتو اور لڑکیو! میں تمہارا مہمان ہوں، ذرا یہ تو بتاؤ یہاں لابن کہاں رہتا ہے؟“

ایک نہایت حسین و جمیل، مجسمہ حسن و رعنائی، ان عورتوں اور لڑکیوں کے ہجوم سے باہر نکلا اور موسیقی جیسی ریلی آواز میں پوچھا۔ ”تو لابن کے پاس کہاں سے آیا ہے اور اس سے تیرا کیا کام اٹکا ہے؟“

کہ ماموں لابن کی دو بیٹیاں ہیں، راحیل اور لیاہ۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ راحیل بہت خوب صورت ہے لیکن لیاہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔“

لیاہ کے دل کو سخت تکلیف پہنچی اور وہ منہ بنا کر سامنے سے ہٹ گئی۔ راحیل نے کہا۔ ”لیاہ تیری باتوں سے مارا ض ہو کر چلی گئی ہے۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”پھر کیا ہوا؟ اب تو میں یہیں رہوں گا، کبھی نہ کبھی من بھی جائے گی۔“

اس گھر نے یعقوب کو نہایت عزت اور محبت سے رکھا۔ یعقوب ان لوگوں سے بہت جلدی کھل مل گئے۔ رات کو کام دھندوں سے فرصت پانے کے یہ سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے اور دیر تک خاندانی تذکرے چھڑے رہتے۔ لابن کو اپنی بہن، یعقوب کی ماں کی یاد آ جاتی اور وہ بتاتے کہ ان دونوں بھائی بہن میں کتنی زیادہ محبت ہوا کرتی تھی۔ لابن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انہوں نے گلو گرفتہ آواز میں کہا۔ ”اور جب وہ تیرے باپ اسحاق سے وابستہ ہو کر کنعان چلی گئی تھی تو میں کافی عرصے تک اس کے لیے بہت پریشان اور مضطرب رہا تھا۔“ پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ ”جہانوں کے رب نے ہمیں نسیان کی خوبی عطا فرما کر بڑا کرم کیا ہے ورنہ انسان اپنے ماضی کے غموں کے بوجھ ہرگز نہ اٹھا سکتا اور یہ پہاڑ اسے کچل کر رکھ دیتے۔“

یعقوب کچھ بولنے کے بجائے اپنے ماموں کی باتیں سنتے رہے۔ دونوں بیٹیاں بھی بے دلی سے اپنے باپ کی داستان سن رہی تھیں اور انہیں اس میں ذرا بھی مزہ نہ آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماموں لابن نے خود بھی یہ محسوس کر لیا کہ ان کے سوا کبھی خاموش ہیں، انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”ارے یہ صرف میں ہی بول رہا ہوں، یعقوب! تو بھی تو کچھ کہہ، کچھ اپنے ماں باپ کے قصے سنا، کنعان کے تذکرے چھیڑ۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ماموں! جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ آپ کی بہن اور میری ماں رقبہ ایک عرصے تک اولاد کی نعمت سے مایوس رہی تھیں۔ شادی کے بیس سال بعد میرے باپ اسحاق نے جب رورور خدا کی بارگاہ میں گریہ و زاری کی تو انہیں دو جڑواں بیٹے عطا کیے گئے۔ وہ جڑواں بیٹے میں اور میرا بڑا بھائی عیسو اور دم تھے۔“

ماموں نے کہا۔ ”ہاں، میں یہ ساری باتیں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے باپ نے تیرا نام یعقوب کیوں رکھا تھا؟“

یعقوب کے دل پر اس حسین لڑکی نے پہلی ملاقات اور پہلی نظری میں قبضہ جما لیا۔ یہ مہبوت گم صم اس کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں آپ کی محویت پر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ آپ نے لڑکی کا سوال تو سن ہی لیا تھا، جواب دیا۔ ”اے مہربان لڑکی! میں لابن کی بہن کا بیٹا ہوں اور کنعان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

لڑکی کا چہرہ شرم و حیا سے گلنار ہو گیا، کچھ اور قریب چلی گئی، بولی۔ ”میں لابن کی بیٹی راحیل ہوں، آمیرے ساتھ گھر چل۔ میرا باپ تجھ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔“

کنوئیں کی دوسری عورتیں اور لڑکیاں ایک دم سنجیدہ ہو گئیں، کیونکہ وہ لابن کے بھانجے پر ہنسنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔

راستے میں یعقوب سے نہیں رہا گیا، راحیل کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرط جذبات میں اسے چوم لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”راحیل! تو یقین کر، میں نے تیرے حسن کا چہ چاندان ارم میں داخل ہونے سے پہلے ہی سن لیا تھا اور اب میں اپنے رب کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے، جتنی تیری تعریف کی گئی تھی۔“

راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یعقوب کو اپنے گھر لیے چلی گئی۔ یعقوب کے بوڑھے ماموں نے اپنے خوب صورت بھانجے کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور کہا۔ ”یعقوب! اب تو یہیں رہ۔“

اس نئے مہمان کو دیکھنے اور ملنے کے لیے گھر کے دوسرے لوگ بھی وہیں آگئے۔ ان میں راحیل کی بڑی بہن لیاہ بھی شامل تھی۔ یعقوب نے دیکھا لیاہ کی آنکھیں واقعی بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ انہیں کچھ دبا کر دیکھ رہی تھی۔ یعقوب نے ہنستے ہوئے لیاہ کو مخاطب کیا۔ ”غالباً تیرا نام لیاہ ہے اور تو راحیل کی بڑی بہن ہے؟“

ماموں لابن، اپنے مہمان بھانجے کی رہائش کے لیے جگہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔

چھوٹی آنکھوں والی لیاہ نے ناگواری سے تیوریاں چڑھالیں اور پوچھا۔ ”تو نے مجھے کس طرح پہچانا کہ میں لیاہ ہوں؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”تیری چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے، کیونکہ مجھے راستے کے ایک نخلستان میں ایک عورت ملی تھی۔ جب میں نے اس سے ماموں لابن کا پتا دریافت کیا تو اس نے تفصیلی پتا بتاتے ہوئے یہ بھی بتا دیا تھا

یعقوب کی دونوں ماموں زاد بہنوں نے بھی اب دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ راحیل تیز مشعل کی روشنی میں یعقوب کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ راحیل کی بڑی بہن لیاہ اب دونوں کو رشک و حسد سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

ماموں کہہ رہے تھے۔ ”اور چونکہ تو اپنے بھائی کے بعد پیدا ہوا تھا، یعنی تو اس کے عقب میں تھا اس لیے تیرے باپ نے تیرا نام یعقوب (بعد میں نے آنے والا) رکھ دیا۔“ یعقوب نے کہا۔ ”اور آپ کو میرے باپ اسحاق کی اس پیش گوئی کا بھی ضرور علم ہوگا کہ جب ہم دونوں بھائی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے میری ماں سے کہا تھا کہ دو تو میں تیرے پیٹ میں ہیں۔“

ماموں نے پوچھا۔ ”تو کہنا کیا چاہتا ہے، ذرا صاف صاف بات کر۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”دو قوموں سے میرے باپ کی یہ مراد تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی سلسلیں آخر کار قوموں کی شکل اختیار کر لیں گی۔“ وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئے۔

ماموں نے کہا۔ ”ہاں ہاں کہو کہو، جو کچھ کہتا ہے صاف صاف کہہ دو۔“

یعقوب نے کرتے کا دامن پکڑ کے پلٹنا شروع کر دیا، بولے۔ ”میں چاہتا تو کنعان ہی میں شادی کر لیتا کیونکہ وہاں بھی نہایت حسین لڑکیاں موجود ہیں لیکن میرے باپ نے کہا کہ مجھے اپنی ماموں زاد۔۔۔۔۔ سے شادی کرنا چاہیے اور اس سے جو قوم پیدا ہوگی وہ نہایت نامور اور اعلیٰ قوم ہوگی۔“

ماموں نے اپنے بھانجے کو ذرا غور سے دیکھا۔ مشعل کی روشنی میں یعقوب کے چہرے کی شرم و حیا کو اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا تھا۔ دونوں لڑکیاں وہاں سے ہٹ کر ذرا دور جا بیٹھیں۔

ماموں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔ ”تو میری کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“

یعقوب نے غیر ارادی طور پر دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور راحیل پر مستقل نظریں ٹکا دیں، آہستہ سے جواب دیا۔ ”راحیل سے۔“

لیاہ غصے میں اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ماموں کچھ دیر خاموش کچھ سوچتے رہے، پھر کہا۔ ”اگر تو راحیل کی جگہ لیاہ کو

پسند کر لے تو اچھا ہو۔“

ماموں کو فکروں نے گھیر لیا تھا اور یعقوب کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، آخر کچھ سوچ کر کہا۔ ”لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ تجھے میری ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔“ یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں، اپنی شرط بیان کیجیے۔“

ماموں نے کہا۔ ”تجھے سات سال تک میری خدمت کرنا ہوگی۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔“ جب اس معاملے کی دونوں بہنوں کو خبر ہوئی تو راحیل کو تو بہت خوشی ہوئی مگر لیاہ حسد و رقابت کی آگ میں جلنے جھلنے لگی۔ یعقوب نے حسب وعدہ اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں اور اپنے ماموں کی سپرد کی ہوئی ذمے داریاں پوری کرنے لگے۔

☆☆☆

یعقوب نے جس لگن اور محبت سے اپنے ماموں لابن کی خدمات انجام دیں، اس سے کبھی خوش اور متاثر ہوئے لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، لیاہ کی آتش حسد بھڑکتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی چھوٹی بہن راحیل پر گرم ہو جاتی اور تلخ و ترش سنا دیتی۔ راحیل سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کر جاتی۔ یعقوب راحیل کو تسلیاں دیتے۔ ”بس تھوڑے دنوں کی اور بات ہے، میں شادی کے بعد تجھے کنعان لے جاؤں گا جہاں تو نہایت آرام اور سکھ سے رہے گی۔“

سات سال پورے ہو گئے۔ یعقوب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے راحیل سے کہا۔ ”راحیل! سات سال پورے ہو چکے ہیں اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں، جس نے مجھ سے میرا عہد پورا کر دیا۔“

راحیل نے کہا۔ ”لیکن گنتی قیامت کے تجھے یہ سات سال! یعقوب نے ہنس کر جواب دیا۔ ”مگر مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا یہ سات سال پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔“

ماموں اپنے مویشیوں کے باڑے میں ان کی گنتی کر رہے تھے، ان کے پیچھے یعقوب کھڑے تھے۔ ماموں نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور کہا۔ ”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟“

یعقوب نے پوچھا۔ ”کیا کوئی مویشی کم ہے؟“

ماموں نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

یعقوب نے کہا۔ ”ماموں! ایک بات اور بتائیے۔“

کیا۔ ”شادی تو راحیل سے ہوئی تھی۔“
 ”نہیں، تیری شادی مجھ سے ہوئی ہے۔“
 وہ رات یعقوب نے نہایت بے چینی میں گزاری۔
 صبح ہوتے ہی اپنے ماموں لاین کے پاس پہنچ گئے اور
 نہایت خفگی سے پوچھا۔ ”ماموں! یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے
 میری شادی کس سے کر دی؟“

ماموں نے جواب دیا۔ ”لیاہ سے۔“
 یعقوب نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن میرا آپ سے
 طے تو ہوا تھا راحیل سے شادی کا، اور میں نے آپ کی سات
 سال خدمت راحیل کی خاطر کی تھی۔“

ماموں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”لیکن یعقوب
 میں بھی بہت مجبور تھا، اگر میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔“
 یعقوب نے پوچھا۔ ”آخر وہ مجبوری کیا تھی؟“

ماموں نے کہا۔ ”یعقوب! میں اپنے خاندانی رسم
 و رواج سے مجبور تھا۔ میرے لیے ضروری یہ تھا کہ میں پہلے
 اپنی بڑی لڑکی لیاہ کی شادی کرتا، اس کے بعد راحیل کی۔“
 یعقوب نے کہا۔ ”لیکن ہم دونوں کا عہد و پیمان تو
 راحیل کے سلسلے میں ہوا تھا۔“

”ہاں!“ ماموں نے تاسف زدہ آواز میں کہا۔
 ”لیکن بعد میں جب میں نے اس کے نتائج پر غور کیا تو میں
 نے یہ فیصلہ کیا کہ راحیل کی جگہ لیاہ کو تم سے وابستہ کر دوں۔“
 یعقوب نے صدمے سے سر جھکا لیا۔ ماموں کچھ دیر
 تک یعقوب کی شکل دیکھتے رہے، آخر کہا۔ ”تو ایک ہفتہ لیاہ
 کے ساتھ ہنسی خوشی رہ، اس کے بعد میں اپنا سابقہ وعدہ بھی
 پورا کر دوں گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اب لیاہ میری بیوی ہے
 اور خدا کے سامنے اس بات کا پابند ہوں کہ لیاہ کا پورا پورا
 خیال رکھوں لیکن راحیل مجھے ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔“
 ماموں نے کہا۔ ”کیا مجھے تیرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے
 اپنی بیٹی لیاہ کا بھی بڑا خیال ہے، وہ تیرے پاس سکون سے
 ہنسی خوشی رہے گی۔ میں نے تم دونوں کے آرام کی خاطر لیاہ
 کو ایک کنیز بھی دی ہے۔ کنیز زلفہ، وہ تم دونوں کی خدمت
 کرے گی۔“

یعقوب نے سکوت اختیار کیا۔ ماموں بھی کچھ سوچتے
 رہے، آخر انہوں نے ایک عجیب و غریب فیصلہ سنا دیا۔
 ”یعقوب! جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا تو لیاہ کے ساتھ
 ایک ہفتہ رہ، اس کے بعد میں راحیل کی شادی بھی تجھ سے
 کر دوں گا۔“

ماموں نے کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم دونوں
 یہاں سے چل کر، کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔“
 یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“
 یہ دونوں وہاں سے نکل کر گھر کے اس چبوترے پر
 جا بیٹھے جہاں بیٹھ کر گھر اور بستی کے مسائل پر گفتگو ہوا کرتی
 تھی۔ شام تیزی سے رات میں بدلتی جا رہی تھی۔ ماموں نے
 مشرقی افق سے دوڑتی ہوئی سیاہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، اب پوچھ تو کیا جاننا چاہتا ہے؟“

یعقوب نے پوچھا۔ ”میں اپنے سات سالہ عہد میں
 کس حد تک کامیاب رہا ہوں؟“
 ماموں نے جواب دیا۔ ”تو نے جس لگن اور محنت
 سے اپنی ذمے داریاں پوری کی ہیں، میں اس سے بہت
 خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔“
 یعقوب نے کہا۔ ”اب وہ مدت پوری ہو چکی ہے،
 آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے۔“

ماموں نے جواب دیا۔ ”میں اپنا وعدہ ضرور پورا
 کروں گا..... تو بالکل مطمئن رہ۔“

شادی کا اعلان ہو گیا۔ رشتے داروں کو مطلع کر
 دیا گیا۔ اس خوشی کے موقع پر یعقوب نے راحیل کو بہت
 اداس دیکھا لیکن اس کی بڑی بہن لیاہ بہت خوش تھی۔
 یعقوب کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خوشی کے موقع پر راحیل
 اداس کیوں ہے؟

اس موقع پر لیاہ کا رویہ بڑا جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ
 راحیل کو دیکھ کر طنز سے مسکراتے لگتی تھی۔

یعقوب نے راحیل سے پوچھا۔ ”آخر تو اس کیوں ہے؟“
 راحیل نے نہایت کرب سے یعقوب کو دیکھا اور کوئی
 جواب دیے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ ایک سادہ سی تقریب ہوئی
 اور یعقوب کی شادی کی رسم انجام پا گئی۔ یعقوب انتہائی
 اشتیاق سے جب اپنی بیوی کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر
 پریشان ہو گئے کہ راحیل کی جگہ لیاہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔
 یعقوب نے غصے میں لیاہ سے پوچھا۔ ”لیاہ! تو یہاں کیا کر
 رہی ہے؟ راحیل کہاں ہے؟“

لیاہ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یعقوب کی
 طرف دیکھا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔ ”میں
 تیری بیوی ہوں۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”اور راحیل کہاں ہے؟“
 لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل اپنے بستر پر ہوگی۔“
 ”لیکن یہ ہوا کیا؟“ یعقوب نے پریشان ہو کر سوال

یعقوب نے اس فیصلے پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا سچ؟“
 ماموں نے جواب دیا۔ ”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے لیکن اس کی شرط بھی سن لے۔“
 یعقوب ماموں کی شرط سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

ماموں نے کہا۔ ”لیاہ کی شادی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد راحیل بھی تیری بیوی بن جائے گی لیکن اس کے لیے تجھے مزید سات سال میری خدمت کرنا ہوگی۔“
 یعقوب نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے تیار ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنے عہد پر پہلے پورا اتر اہوں۔ میرے رب نے چاہا تو ایک بار پھر پورا اتروں گا۔“

یہ ایک ہفتہ بھی جیسے تیسے گزر گیا اور یعقوب سے راحیل کی شادی بھی کر دی گئی اور جس طرح بڑی بہن کو کنیز زلفہ عطا ہوئی تھی، ماموں نے ازراہ عدل و انصاف راحیل کو بھی ایک کنیز عطا فرمائی۔ اس کا نام بلہاہ تھا اور یعقوب اس کنیز کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو انہیں نخلستان میں مل چکی تھی اور جس نے انہیں لابن کے گھر کا پتا بتایا تھا۔

اس نے یعقوب سے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا میں نے تجھے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ لابن کی بڑی بیٹی لیاہ کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور راحیل بہت خوب صورت ہے۔“
 یعقوب نے جواب دیا۔ ”تو نے تو یہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن اب تجھے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لیاہ بھی میری بیوی ہے اور تو نے اس وقت مجھ سے ایک بات چھپائی تھی۔“

کنیز بلہاہ نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“
 یعقوب نے جواب دیا۔ ”یہ بات کہ تو راحیل کی کنیز بھی ہے۔“

کنیز بلہاہ نے کہا۔ ”لیکن راحیل کی کنیز تو میں اب ہوئی ہوں، پہلے تو نہیں تھی۔“
 یعقوب نے کہا۔ ”لیکن اب لیاہ اور راحیل دونوں ہی میری بیویاں ہیں اور تجھے ان دونوں کا خیال رکھنا ہے۔“
 کنیز بلہاہ نے جواب دیا۔ ”میں راحیل کی کنیز ہوں اس لیے میں راحیل ہی کی خدمت کروں گی اور اسی کا خیال بھی رکھوں گی اور زلفہ چونکہ لیاہ کی کنیز ہے اس لیے حق اور انصاف کی رو سے زلفہ کو لیاہ کا وفادار اور خدمت گزار رہنا چاہیے۔“

یعقوب، لیاہ اور راحیل کے ساتھ خوش خوش رہنے لگے۔ اب ان کے سامنے ماموں کی خدمت گزاری کے سات سال اور تھے لیکن یہ سات سال ایسے تھے کہ مشروط چیز انہیں پہلے مل گئی تھی اور شرط بعد میں پوری کرنا تھی۔

☆☆☆

موسیٰ یوں کو چراتے اور دوسری خدمات انجام دیتے ہوئے انہیں کنعان کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ گھر میں ایک تنازعہ بھی رہتا تھا۔ لیاہ اور راحیل میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ یعقوب اکثر و بیشتر ان دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر اور بیزار دیکھتے۔

لیاہ کو شکایت تھی کہ یعقوب کو راحیل سے بڑی محبت ہے اور راحیل کا خیال تھا کہ یعقوب کو لیاہ سے بھی محبت ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ یعقوب کو راحیل سے بڑی محبت تھی۔

دن بھر کی محنت کے بعد رات کو یعقوب نے راحیل کو سامنے بٹھا کر بڑی پیاری پیاری باتیں کیں۔ اسے کنعان کے قصے سناتے رہے، اپنی ماں کی محبت کی داستانیں سناتے رہے اور یہ بھی بتایا کہ ان کے بوڑھے باپ اسحاق نے انہیں کیسی کیسی دعائیں دی ہیں۔ وہ راحیل کو کنعان کی فضا سے مانوس کر رہے تھے۔ لیاہ کی کنیز زلفہ دیوار کے پیچھے کھڑی یہ پیار و محبت کی باتیں سن رہی تھی، وہ بھاگی بھاگی اپنی مالکہ کے پاس پہنچی اور اسے پوری داستان سنا کے کہنے لگی۔ ”میری آقا زادی! میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ راحیل نے تیرے شوہر کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جتنا راحیل کو چاہتا ہے تجھ کو نہیں، کیا یہ نا انصافی نہیں ہے؟“

لیاہ نے صدمے سے جواب دیا۔ ”یقیناً میرے حق پر ڈاکا پڑا ہے اور میں خود بھی اپنے خلاف اس زیادتی کو برابر محسوس کر رہی ہوں۔“

اسی وقت راحیل کی کنیز بلہاہ، لیاہ کے پاس پہنچی اور کہا۔ ”تیرا شوہر تجھے بلارہا ہے۔“

لیاہ کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اپنے آقا سے کہہ دے کہ لیاہ کہہ رہی ہے تو پہلے میرا شوہر ہے، بعد میں راحیل کا لیکن اپنے طور طریقوں سے تو یہ ثابت کر رہا ہے کہ تو راحیل کا شوہر پہلے ہے، بعد میں میرا اور اب میں اس زیادتی کو مزید نہیں برداشت کر سکتی۔“
 جب کنیز نے لیاہ کا یہ جواب یعقوب تک پہنچایا تو یعقوب نے ہنس کر کہا۔ ”جا اپنی آقا زادی سے میری طرف

سے پوچھ کہ جب میں اس کی بستی قدان ارم میں داخل ہوا تھا تو یہاں میں سب سے پہلے کس سے ملا تھا؟ اور یہ بھی دریافت کر کہ میں نے پہلے سات سال تک جو اپنے ماموں لایم کی خدمت کی ہے وہ کس کے لیے کی تھی؟ اس طرح میری پہلی بیوی تو راحیل ہی ہے دوسری لیاہ۔“

جب کنیز نے یعقوب کا یہ جواب لیاہ کو پہنچایا تو اس نے کہا۔ ”جا، میرے شوہر سے کہہ دے، اب میں اس سے کوئی شکایت نہ کروں گی، میں تو اپنے اللہ سے انصاف طلب کروں گی اور پھر جو حق پر ہوگا میرا رب اسی کو عزت بخشے گا اور جو حق پر نہیں ہوگا خدا اسے دنیا کے سامنے سبک سار کر دے گا۔“

کنیز نے یہ پیغام بھی یعقوب تک پہنچا دیا۔ یعقوب نے اٹھ کر لیاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن راحیل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”ابھی نہیں، تو لیاہ کا بھی شوہر ہے، اس نے تیرا حکم نہ مان کر تیری بے عزتی کی ہے۔ کیا تو اس کے پاس جا کر مزید بے عزت ہونا گوارا کر لے گا؟“

یعقوب نے راحیل کی بات مان لی کیونکہ وہ راحیل سے واقعی محبت کرتے تھے۔ دوسرے دن یعقوب ٹھکے ہارے جب گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج لیاہ کے پاس وقت گزاریں گے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع راحیل کو بھی ہو گئی۔ اس نے آپ کا راستہ روکنا چاہا لیکن آپ نے جواب دیا۔ ”تجھے لیاہ کے پاس جانے سے مجھے روکنا نہیں چاہیے، وہ بھی میری بیوی ہے اور ایسا کر کے میرے انصاف کی راہ میں تو رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کر۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے حسد کرتی ہے۔“

”اور تو؟ کیا تو اس سے نہیں حسد کرتی؟“

راحیل نے کہا۔ ”نہیں، میں اس سے ذرا بھی حسد نہیں کرتی۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اگر تو اس سے حسد نہیں کرتی تو پھر مجھے اس وقت اس کے پاس کیوں نہیں جانے دے رہی؟“

”لیکن کیا تو نے کل نہیں کہا تھا کہ حق اور انصاف کی رو سے میں تیری پہلی بیوی ہوں۔“

”میں اس سے انکار کب کرتا ہوں لیکن لیاہ بھی میری بیوی ہے۔“

راحیل ناراض ہو گئی۔ اس نے یعقوب کی راہ چھوڑ دی، بولی۔ ”جا، میں تجھے نہیں روکوں گی۔ جا، لیاہ کے ساتھ

حق و انصاف کر۔“

یعقوب نے جب یہ دیکھا کہ راحیل ناراض ہو کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی ہے تو اس پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے لیاہ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ سجدے میں پڑی آہ وزاری کر رہی تھی۔ ”اے ابراہیم کے رب! تو میرا انصاف کر۔ میں یعقوب سے انصاف کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ میں تجھ سے کہوں گی کہ راحیل اور میری طرف انصاف کی نظر سے دیکھ اور پھر جو زیادتی کر رہا ہے اسے سزا دے اور جو مظلوم ہے اسے اپنے کرم سے نوازدے۔“

یعقوب نے اس کے بائیں طرف کھڑے ہو کر آواز دی۔ ”لیاہ! میں تیرے پاس آ گیا ہوں، آخر تو اتنی پریشان کیوں ہے؟“

لیاہ گڑ گڑاتی رہی۔ ”اے میرے رب! میں نے اپنے باپ سے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ تو راحیل کے بجائے یعقوب سے میری شادی کر دے لیکن میرے باپ نے دنیا کی شرم اور دستور کے مطابق بڑی بہن ہونے کی وجہ سے میری شادی یعقوب سے کر دی۔ اب یعقوب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اس کی پہلی بیوی اصولی طور پر راحیل ہی ہے، میں اس کی دوسری بیوی ہوں۔ اگر یعقوب درست کہتا ہے تو تو راحیل کو اپنے لطف و کرم سے نوازنا رہ لیکن اگر اس میں کسی قسم کی زیادتی کا عنصر موجود ہے تو میں تجھ سے درخواست کروں گی کہ اس معاملے میں جو زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے، اسے زمانے کے سامنے شرمندہ کرادے۔“

یعقوب نے پھر آواز دی۔ ”لیاہ! کیا میں چلا جاؤں؟“

لیاہ نے بیچروائی سے جواب دیا۔ ”تیری مرضی، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

یعقوب نے کہا۔ ”لیکن اس وقت تو میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔“

لیاہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”تیری خوشی۔“

یعقوب لیاہ کا دل بہلانے کی خاطر دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر کہا۔ ”لیاہ! میں تجھ سے بھی محبت کرتا ہوں، اب تو اس پر یقین کرے یا نہ کرے۔“

لیاہ نے آزر وکی سے جواب دیا۔ ”میں نے اپنا معاملہ اپنے رب کے سپرد کر دیا ہے، وہی میرا انصاف کرے گا۔“

یعقوب نے کہا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ انصاف ہی

کنیز نے جواب دیا۔ ”لیاہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر یہ بچہ لڑکا ہوتا تو لیاہ کو خدا کی طرف سے وہ عزت حاصل ہو جائے گی جس کی وہ ایک مدت سے تمنا کر رہی ہے۔“

راحیل کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر ٹپکنے لگی۔ راحیل کے باپ لابن نے جو راحیل کو پریشان اور افسردہ دیکھا تو قریب آ کر دریافت کیا۔ ”راحیل! کیا بات ہے، تو اتنی پریشان کیوں ہے؟“

راحیل کا دل بھر آیا، وہ اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ باپ نے شفقت سے راحیل کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، پوچھا۔ ”راحیل! آخر ہوا کیا؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ کیا یعقوب نے کوئی بات کہہ دی؟“

راحیل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”باوا جان! ہم دونوں بہنیں یکے بعد دیگرے ایک ایسے جھولے میں ڈال دی گئی ہیں جس کے ایک سرے پر خوشیاں ہیں، سر تیں ہیں، لطف و انبساط ہے مگر اس کے دوسرے سرے پر حسد ہے، رقابت ہے، کڑھن ہے جلن ہے، دکھ ہے اذیتیں ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ جب ہم دونوں بہنیں اس جھولے میں جھولتی ہیں تو ہمیں جلدی جلدی ان دونوں کیفیتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔“

باپ نے نرمی سے کہا۔ ”صبر کر راحیل، صبر کر..... کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

راحیل کی ہچکیاں بندھ گئیں، بولی۔ ”اے کاش ہم میں سے کسی ایک کی یعقوب سے شادی نہ ہوئی ہوتی۔“

باپ نے ڈھارس بندھائی، پوچھا۔ ”آخر تجھے تکلیف کیا پہنچی ہے؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ میں تیرے ساتھ ہوں، تیری مدد کروں گا، اپنی تکلیف مجھے بتا تو سہی۔“

”باوا جان! اس تکلیف کا مداوا آپ کے بس میں نہیں ہے۔“

”لیکن تو بتا تو سہی، مجھے بھی تو تیری تکلیف کا علم ہو!“

راحیل نے شرما کے جواب دیا۔ ”کیا لیاہ پر خدا نے واقعی مہربانی کی ہے اور آپ مانا بننے والے ہیں؟“

باپ نے محبت سے بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”بس اتنی سی بات! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہی خوشی تیرے گھر میں بھی آ سکتی ہے۔ تو افسردہ کیوں ہے، اپنے خدا سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟“

راحیل نے شرما کے اشارے پر کہا۔ ”میرے گھر میں اللہ کے اس کرم کا بہت کم امکان ہے کیونکہ دایہ نے یعقوب کو

کر رہا ہوں، کیا مجھے اپنے خدا کا خوف نہیں ہے؟“ لیاہ نے اسی اداس لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کب کہتی ہوں کہ تو میرے ساتھ انصاف نہیں کرتا، مجھے تو اپنی بہن راحیل سے شکایت ہے جو خود کو حسین اور مجھے حقیر سمجھتی ہے۔ وہ تجھ پر مجھ سے زیادہ اپنا حق سمجھتی ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”راحیل کیا سمجھتی ہے، تجھے یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ میں تو تیری اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی راحیل کی۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں تو اپنے رب سے عزت چاہتی ہوں۔ وہ جس کو چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے۔“

یعقوب نے ہر ممکن کوشش سے لیاہ کے دل پر چھائے ہوئے غبار کو دور کرنے کی راہ اختیار کی لیکن لیاہ کے دل سے غموں کی ٹنگی دور نہ ہو سکی۔

☆☆☆

لیاہ اور راحیل کا عناد بڑھتا ہی رہا اور اس عناد نے ان کی دونوں کنیزوں میں بھی حسد و رنج کی آگ بھڑکا دی۔ زلفہ، لیاہ کی طرف دار تھی اور بلہاہ راحیل کی۔ یہ دونوں اس فکر میں بھی لگی رہتیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور ان میں ایک دوسرے کے خلاف کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔

ایک دن صبح ہی صبح راحیل کی کنیز بلہاہ نے نہایت افسوس سے اسے مخاطب کیا، بولی۔ ”میری آقا زادی! اب تو جتنا بھی غم کرے تیرے لیے کم ہے۔ تو ہار گئی اور تیری بڑی بہن لیاہ جیت گئی۔“

راحیل بہت زیادہ گھبرا گئی، پوچھا۔ ”کیا ہو گیا؟“

کنیز نے کہا۔ ”آج صبح ہی صبح میں نے ایک ایسی خبر سنی ہے جس سے اب مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تیرا شوہر یعقوب اب لیاہ کو زیادہ چاہنے لگے گا اور اس کے دل میں تیری محبت کچھ کم ہو جائے گی۔“

راحیل کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کے جسم سے جان نکلی جا رہی ہے، بولی۔ ”یعقوب مجھے بے حد چاہتا ہے اور میں یہ یقین کرنے کو تیار نہیں کہ اس کے دل میں میری محبت کم ہو جائے گی۔“

کنیز نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اب تو خود اپنے شوہر یعقوب سے یہ بات سن لے گی۔“

راحیل بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”کہیں تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ تو صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتی..... آخر ہوا کیا؟“

میری طرف سے مایوسی کی خبر پہلے ہی سنارکھی ہے۔“
 باپ نے پیار سے اس کے دونوں گال تھپتھپائے
 اور کہا۔ ”لیکن دایہ خدا نہیں ہے، تو خدا سے مایوس کیوں
 ہوتی ہے۔ خدا میں اتنی قدرت ہے کہ انسانوں کے تمنینوں کو
 غلط کر دے اور وہ کچھ ہو جائے جس کا کسی کے دل میں وہم
 و شبہ تک نہ ہو۔“

باپ کے تسلی دلا سوں نے راحیل کے دل میں کسی حد
 تک صبر و برداشت کی قوت پیدا کر دی۔ ان دنوں لیاہ کے
 چہرے پر ہر وقت مسرت و سرشاری کی کیفیت چھائی رہتی۔
 وہ اپنی کنیز زلفہ سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ موبیشیوں
 کے باڑے میں چلی جاتی اور ان سے ہنسی مچھلیاں کرنے لگتی۔
 وہ راحیل کے سامنے سے اتر کر گزرتی، کبھی کبھی وہ کوئی طنز
 بھی کر جاتی اور راحیل کے دل میں ایک نشتر اتر جاتا یا پھر
 کانٹے کی نوک ٹوٹ جاتی۔

رات کے کھانے پر لیاہ کی طبیعت میں بڑی جولانی
 تھی۔ یعقوب، راحیل، لیاہ اور لابن ایک ہی جگہ بیٹھے کھانے
 میں مصروف تھے۔ دونوں کنیزیں ان کے قریب ہی ادب
 سے کھڑی ان کے احکامات کی منتظر تھیں۔ لیاہ کی خوشی کا یہ
 حال تھا کہ وہ بات بات پر ہر ایک سے ہنسی مذاق کرنا چاہتی۔
 راحیل اس کی خوشیوں اور چہلوں سے جل کڑھ رہی تھی۔
 اس سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ ان دونوں کا باپ لابن،
 راحیل کی اندرونی کیفیات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔
 اس سے راحیل کی بے بسی نہیں دیکھی گئی، لیاہ کو سمجھایا۔ ”لیاہ!
 بیٹی کیا تو جانتی ہے دنیا کا بدترین گناہ کیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میں نہیں جانتی لیکن اگر آپ
 یہ پوچھیں کہ دنیا کی سب سے بڑی خوشی کیا ہے تو میں ابھی بتا
 سکتی ہوں۔“

لابن نے پوچھا۔ ”اچھا بتا دنیا کی سب سے زیادہ
 خوشی کس چیز میں ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اس بات میں کہ خدا کسی مجبور
 اور کمزور کو اپنی قدرت سے اچانک طاقتور بنا دے اور وہ
 کمزور اپنے طاقتور حریف کو کمزور اور بے بس بنا دے۔ اس
 میں جو خوشی اور لذت پنہاں ہے شاید یہ لفظوں میں بیان نہیں
 کی جاسکتی۔“

باپ نے کہا۔ ”اب تو یہ بھی تو پوچھ کہ دنیا کا بدترین
 گناہ کیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”بادا جان! میری سمجھ میں اس
 کے سوا کوئی بات نہیں آتی کہ اس گھر میں مجھ پر بہت ہنسا

گیا، میرا بڑا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنے
 خدا کو منصف اور حاضر ناظر جان کر برداشت کر لیا تھا لیکن
 میں اپنے خدا کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے دکھ کا
 احساس کر کے مجھے سرخرو اور شادماں کر دیا۔ اب میں کسی کی
 بھی پروا نہ کروں گی۔ مجھے میرے رب نے جو خوشی بخشی
 ہے، اس کے مزے میں تنہا لوٹوں گی۔“

لابن نے لیاہ کو ڈانٹا۔ ”تجھے خوش ہونے سے کوئی بھی
 نہیں روک سکتا لیکن تیری خوشی میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کو
 جلانے کا جذبہ نہیں شامل ہونا چاہیے۔ یاد رکھ، خدا دل
 آزاری نہیں پسند کرتا، تو اس گناہ کا ارتکاب نہ کر۔“

لیکن لیاہ خوش ہو ہو کے راحیل کو ذہنی اذیت پہنچاتی
 رہی۔ کچھ عرصے بعد لیاہ سے لڑکا پیدا ہوا۔ لیاہ نے اس کا
 نام رابن رکھا۔ بیٹے کی پیدائش نے لیاہ کو فخر و غرور سے کچھ
 زیادہ ہی بے خود اور مدہوش کر دیا۔ یعقوب کو بھی بے انتہا
 خوشی ہوئی تھی۔ لیاہ کی کنیز زلفہ بھی بہت خوش تھی لیکن راحیل
 پر غم کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بہت زیادہ اداس رہنے لگی
 تھی۔ وہ اپنی بہن لیاہ کے سامنے جانے سے کتراتے تھی۔
 اس کی کنیز بلہاہ اسے تسلی دلا سے دیتی رہتی لیکن راحیل پر
 اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

راحیل اور لیاہ میں حسد و رقابت کی خلیج بڑھتی جا رہی
 تھی۔ بیٹے کی پیدائش نے اسے کچھ اور بڑھا دیا۔ لیاہ نے
 راحیل کو جلانے کے لیے اپنے بیٹے رابن کو اس کی گود میں
 لا کر ڈال دیا، ہنستے ہوئے بولی۔ ”راحیل! تو کیوں کڑھتی
 ہے، اگر تیرے اولاد نہیں ہوتی تو اس میں فکر مند ہونے کی
 کیا بات ہے، تو میرے رابن سے دل بہلایا کر۔“

راحیل نے رابن کو گود میں لے تو لیا لیکن اسے گم
 گرم جوشی اور محبت سے کھلا نہیں سکی، کیونکہ وہ خوب اچھی طرح
 محسوس کر رہی تھی کہ لیاہ کی پیشکش اور گفتگو میں اسے جلانے
 کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ راحیل نے رابن کو دو چار بار
 انگلیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے کھلانے کی کوشش کی، جس میں
 ایک قسم کا تکلف اور محرومی کا کرب شامل تھا۔

لیاہ کی کنیز زلفہ نے جو یہ منظر دیکھا تو اس نے حیرت
 سے آنکھیں پھاڑیں اور لیاہ کو علیحدہ لے جا کر پوچھنے لگی۔
 ”راحیل کو یہ بچہ کس نے دیا؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”خود میں نے..... کیوں؟“ پھر
 خوشی سے بولی۔ ”اس طرح میں راحیل کو جلانا چاہتی ہوں
 اور اسے یہ جکھلانا چاہتی ہوں کہ تیرا وہ غرور کہاں گیا کہ تو
 حسین ہے اور اصولی طور پر تو یعقوب کی پہلی اور پسندیدہ

راہن ابھی ایک سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ لیاہ ایک بار پھر امید سے ہو گئی۔ خوشی نے لیاہ کو پاگل کر کے رکھ دیا۔ اب اس کے قدم زمین پر نہیں، گویا آسمان پر پڑتے تھے۔ دایہ ہر روز لیاہ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے آتی تو گھر میں خوشی کی لہریں دوڑ جاتی اور لیاہ اپنی کنیز زلفہ سے اتر اتر کر اور زور زور سے اس قسم کی باتیں کرتی کہ راحیل کا برا حال ہو جاتا۔

راحیل اپنی کنیز بلہاہ سے کہتی۔ ”بلہاہ! کچھ تو ہی مشورہ دے کہ اب میں کیا کروں؟ یہ لیاہ تو مجھے جینے نہ دے گی۔“ بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی! اس نازک معاملے میں، میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ میری اور ہر ایک کی نظر میں اس کا ایک ہی علاج ہے۔“

”وہ کیا؟“

بلہاہ نے جواب دیا۔ ”وہ یہ میری آقا زادی کہ آپ کوشش کیجیے کہ آپ بھی اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب ہوں۔“

راحیل نے ٹھنڈی سانس بھری اور بے بسی سے کہا۔ ”افسوس کہ اگر یہ بات میرے بس میں ہوتی تو میں اتنی شرمندگی ہرگز نہ اٹھاتی۔ میں بے بس اور مجبور ہوں۔ ویسے اللہ جو چاہے کرے، میں اس کی رحمت سے مایوس بھی نہیں ہوں۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”آپ اپنے شوہر یعقوب سے کیسے کہہ دے کہ آپ کو بھی صاحب اولاد کریں۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”یعقوب کے اختیار میں ہوتا تو میں اتنی شرمندگی کبھی بھی نہ اٹھاتی۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”پھر دایہ کو حکم دیجیے کہ وہ آپ کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرے اور اگر اولاد کا امکان ہے تو پھر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس خدا نے لیاہ کو سرخرو کیا ہے وہی ہمیں بھی شرمندگی اور عداوت سے بچائے گا۔“

راحیل نے بے دلی سے کہا۔ ”اچھا، ذرا دایہ کو بلا کے میرا معائنہ اپنی نگرانی میں کرادے اور مجھے سچ بتا دے کہ میں کبھی اولاد پیدا کرنے کے لائق ہو سکوں گی یا نہیں؟“

بلہاہ نے تائید میں سر ہلا دیا، بولی۔ ”بہر حال میں آپ کی جتنی مدد کر سکتی ہوں اس سے گریز نہیں کروں گی اور اس سلسلے میں، میں اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔“

اس دن دایہ جیسے ہی لیاہ کو دیکھنے آئی، بلہاہ نے اس سے کہا۔ ”دایہ! جب تم واپس جانے لگو تو اپنی آقا زادی سے ضرور مل لینا، انہیں تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

بیوی ہے اور میں نے تیرا حق غصب کرنا چاہا تھا۔“

کنیز زلفہ نے مشورہ دیا۔ ”لیکن اے میری آقا زادی! آپ ایسا نہ کیجیے۔ آپ راہن کو راحیل کی گود سے فوراً لے لیجیے۔“

”کیوں؟“ لیاہ نے کہا۔ ”مجھے میرے رب نے راحیل کے مقابلے میں اونچا کیا ہے، اب یہ میرا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“

کنیز زلفہ نے جواب دیا۔ ”جس چیز نے آپ کو اپنی بہن راحیل پر برتری دلائی ہے، راحیل حسد سے اسے نقصان تو پہنچا سکتی ہے۔“

لیاہ ایک دم چونک گئی۔ وہ فوراً مڑی اور راحیل کی گود سے راہن کو چھین لیا اور نفرت سے بہن کو دیکھنے لگی۔

راحیل نے پوچھا۔ ”کیا ہوا لیاہ؟ تو پریشان کیوں ہو گئی؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل! مجھے ایک بات تو بتا، کیا تو راہن کو دیکھ کر واقعی خوشی محسوس کرتی ہے یا پھر.....“

راحیل نے غمزہ آواز میں کہا۔ ”لیاہ! میں شرمندہ ہوں کہ ماضی میں، میں نے تیرے خلاف کچھ تندو بخ باتیں کی تھیں اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، میں سمجھتی ہوں مجھے اسی کی سزا دی جا رہی ہے۔“

لیاہ نے انتہائی غرور سے کہا۔ ”میں نے راہن کو پیدا کیا ہے، اب میں تجھ پر برتری رکھتی ہوں اور اب میں دیکھتی ہوں کہ اپنے شوہر یعقوب کی نظر میں تو زیادہ محترم رہتی ہے یا میں؟ یعقوب تجھے زیادہ چاہتا ہے یا مجھے؟“

راحیل نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”خدا جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ میں تو اب رب پر شاکر ہوں اور اس سے توبہ و استغفار کرتی ہوں۔“

لیاہ نے کلکاری مارتے ہوئے راہن کو اپنی کنیز زلفہ کے حوالے کر دیا۔ بولی۔ ”زلفہ! تو اس کا خیال رکھ، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے حاسدوں کی نظر کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور یا خود حاسد ہی اس کے خلاف کوئی الٹی سیدھی حاسدانہ حرکت کر گزریں۔“

زلفہ راہن کو لے کر سامنے سے ہٹ گئی اور لیاہ اور راحیل دونوں تھوڑی دیر آمنے سامنے کھڑی رہ کر کچھ سوچتی رہیں۔ ان میں سے ایک کے انداز اور تیور میں برتری اور تکبر شامل تھا اور دوسرے کے چہرے پر بے بسی کے آثار، اعترافِ شکست اور محرومی کا دکھ۔

☆☆☆

زلفہ نے لیاہ کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔
”آقا زادی ذرا ہوشیار۔ کچھ دال میں کالا ہے، ورنہ راحیل
کا اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”تو نگرانی کر اور دیکھ کہ یہ
راحیل سے یا راحیل اس سے کس قسم کی باتیں کرتی ہے؟“
”آپ مطمئن رہیں، یہ میں معلوم کر لوں گی۔ یہ کوئی
مشکل کام نہیں ہے۔“

دایہ دیر تک لیاہ کے پاس موجود اس کی خدمت کرتی
رہی اور اس دوران راحیل کی کنیز بلہاہ مستطاب وہیں موجود ادھر
ادھر کے چکر لگاتی رہی اور زلفہ بلہاہ کی نگرانی کرتی رہی۔

جب دایہ، لیاہ کے پاس سے رخصت ہو کے جانے
لگی تو لیاہ نے دایہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”دیکھ یہ مجھے معلوم
ہو چکا ہے کہ تو یہاں سے راحیل کے پاس جائے گی۔“

دایہ نے جواب دیا۔ ”میری آقا زادی! پھر اس میں
تعجب کی کیا بات ہے۔ راحیل بھی تو آپ ہی کی بہن ہے۔“
لیاہ نے کہا۔ ”ہاں، وہ میری بہن ہے لیکن تو یہ نہیں
جانتی کہ وہ مجھ سے کس قدر حسد رکھتی ہے۔“

”میری آقا زادی! آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“
لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ راحیل سے
تیری جتنی باتیں ہوں تو انہیں میرے علم میں ضرور لا۔“

دایہ نے وعدہ کر لیا۔ بلہاہ دایہ کو لے کر راحیل کے پاس
پہنچ گئی اور کہا۔ ”ذرا میری آقا زادی کا خوب اچھی طرح
معائنہ تو کر اور یہ بتا کہ یہ اپنے پھل سے کیوں محروم ہے؟“

دایہ نے راحیل کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور منہ
لٹکا کے یہ مایوس کن فیصلہ سنا دیا۔ ”اے میری آقا زادی!
افسوس کہ انسانوں کی قسمت لکھنے والے نے شاید تیرے

شوہر کی اولادیں تیری بڑی بہن کی قسمت میں لکھ دی ہیں
اور شوہر کی بے پناہ محبت تیری قسمت میں لکھ دی ہے۔“
راحیل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں
تلے اندھیرا چھا گیا۔

بلہاہ نے پوچھا۔ ”تو جو کچھ کہہ رہی ہے کیا تجھے اس پر
پورا یقین ہے؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تجھے اپنی
باتوں کی صداقت پر پورا یقین ہے؟“

دایہ نے جواب دیا۔ ”میرا خاندانی تجربہ شاید مجھ
سے کوئی غلط بات نہیں کہلو رہا ہے۔“
بلہاہ نے کہا۔ ”اگر تو ایک بار اور اطمینان کر لے تو
بہتر ہو۔“

دایہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں دس بار معائنہ کروں

گی تو یہی کہوں گی جو ابھی پہلے معائنے کے بعد کہا ہے۔“
راحیل بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگی۔ اس
نے بلہاہ سے کہا۔ ”اب کیا ہوگا بلہاہ؟ کیا میری بڑی بہن
لیاہ میرے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب اور سرخرو رہے گی؟ کیا
میں اپنے پھل سے ہمیشہ محروم رہوں گی؟“

بلہاہ نے ڈھارس بندھائی۔ ”اے میری آقا زادی!
اپنے رب کی مہربانیوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں
ہے۔ دایہ انسان ہے اور انسانی تخمینے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔“

راحیل نے دایہ اور بلہاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔
بلہاہ، دایہ کو ایک طرف لے گئی اور ترشی سے کہا۔
”اگر یہ بات تو نے واقعی سمجھ لی تھی کہ میری آقا زادی راحیل

کی قسمت میں اس کا پھل نہیں لکھا گیا تو تجھے یہ بات ان کے
بجائے مجھے بتانی تھی، کیونکہ اچھے معالج اپنے مریض کے منہ
پر اس کے خطرناک مرض کا ذکر نہیں کرتے۔ اس سے مرض

میں، مریض کا خوف کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ تو نے اچھا
نہیں کیا۔“
دایہ سہم گئی، بولی۔ ”اگر میں نے غلطی کی ہے تو میں
اس پر شرمندہ ہوں۔“

بلہاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، اب تجھے
ایک بات کا پوری طرح خیال رکھنا ہے۔“
دایہ نے پوچھا۔ ”کس بات کا؟ میں اس کے لیے
تیار ہوں۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”اس کا علم زلفہ اور اس کی چھوٹی چھوٹی
آنکھوں والی آقا زادی کو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس خبر سے
ان دونوں کو اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی مجھے اور میری آقا زادی کو

اس سے دکھ پہنچا ہے۔“
دایہ یہ وعدہ کر کے چلی گئی اور بلہاہ اپنی آقا زادی
کے غم میں شریک ہو کر اسے تسلیاں دیتی رہی۔

اس دن رات کو راحیل اپنے شوہر یعقوب کے
کاندھے پر سر رکھ کر خوب روئی۔ یعقوب حیران تھے۔
انہوں نے رونے کا سبب پوچھا تو راحیل نے دایہ والی بات

اپنے شوہر کو نہیں بتائی۔ یعقوب نے سسکیاں لیتی ہوئی
راحیل کا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور پوچھا۔ ”آخر
تو رو کیوں رہی ہے؟“

اس پرسش نے راحیل کو اور زیادہ غمزدہ کر دیا اور
زیادہ رونے لگی۔ یعقوب نے اصرار کیا۔ ”راحیل! تو جانتی
ہے کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں، آخر تو اپنا غم مجھے کیوں

نہیں بتاتی؟“

راحیل نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ میری بہن لیاہ ایک بار پھر اپنی قسمت کا پھل پانے والی ہے؟“

یعقوب نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں یہ درست ہے لیکن اس سے تو کیوں خوفزدہ ہو رہی ہے؟“

راحیل نے جواب دیا۔ ”اگر لیاہ نے راہن کے بعد ایک بیٹا اور پالیا تو تیری محبت کا زیادہ حصہ لیاہ کی قسمت میں چلا جائے گا اور میں اس سے محروم ہوتی چلی جاؤں گی۔“

یعقوب نے کہا۔ ”تو بالکل غلط سوچ رہی ہے۔ تیرے اندیشے بیکار اور بے سرو پا ہیں۔ مجھے اللہ نے تم دونوں کے معاملے میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے پھر میں ظالم کیونکر بن سکتا ہوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”معلوم نہیں کیوں، اندر سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور مجھ پر وحشت کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔“

یعقوب نے اطمینان دلایا۔ ”راحیل! تو میری محبت پر یقین رکھ، میں ظالموں میں سے نہیں ہوں۔“

راحیل نے التجا کی۔ ”تب پھر تو میرے ساتھ انصاف کر۔“

”بتا، میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”جس طرح تو نے میری بڑی بہن لیاہ کو اس کا پھل دیا ہے، اسی طرح میرا پھل مجھے بھی دے۔ میں اپنی قسمت کا پھل تجھ سے مانگ رہی ہوں، اب میں مزید تاخیر اور محرومی کو نہیں برداشت کر سکتی۔“

یعقوب نے پھر تسلی دی۔ ”راحیل! تو مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہے، تو اپنی باری کا انتظار کر۔ اس باری کا، جو تیرے پھل کے لیے تیرے رب کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب تجھے زیادہ دنوں تک محروم نہیں رکھے گا۔“

راحیل نے دایہ کا فیصلہ اپنے شوہر کو سنا دیا، بولی۔ ”دایہ نے آج مجھے بتا دیا ہے کہ قسمتیں لکھنے والے نے میری قسمت میں کوئی پھل لکھا ہی نہیں۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”دایہ خدا نہیں ہے، تو اپنے رب کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟“

راحیل نے اصرار کیا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد چاہتی ہوں، میں بیٹا چاہتی ہوں۔“

یعقوب نے ذرا ناراضگی سے کہا۔ ”راحیل! تو کتنی نادانی اور نا سمجھی کی بات کر رہی ہے۔ آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟“

راحیل کسی بچے کی طرح ہلکے ہلکے کر رہ گئی،

بولی۔ ”میں بار بار یہی کہوں گی کہ میں کچھ نہیں جانتی، مجھے بھی اولاد دے، ورنہ میں مرجاؤں گی۔“

یعقوب کو غصہ آ گیا، بگڑ کر جواب دیا۔ ”راحیل! تو نادانوں میں سے نہ بن، کیا میں خدا کی جگہ ہوں جس نے تجھے اولاد سے محروم رکھا ہے۔ میں ایسی باتیں تیری زبان سے نہیں سننا چاہتا۔“

راحیل نے خاموشی اختیار کی۔ لیاہ نے دایہ سے یہ معلوم کر لیا کہ راحیل کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خبر نے دونوں بہنوں میں حسد و رقابت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی۔

لیاہ سے دوسرا بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ یہ بھی لڑکا تھا۔ لیاہ نے اس کا نام شمعون رکھا۔ خاندان کے لوگوں نے یعقوب کو دوسرے لڑکے کی پیدائش پر مبارکبادیں دیں اور لیاہ سے پیار و محبت کی باتیں کیں۔ اس موقع پر راحیل اور اس کی کنیز بلہاہ اپنے کمرے میں روپوش رہیں۔

مبارکباد دینے والوں میں سے ایک بڑی بی بی نے پوچھا۔ ”یہ راحیل کہاں ہے؟ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔“

لیاہ کی کنیز زلفہ نے جواب دیا۔ ”خدا کی یہ مہربانیاں جو میری آقا زادی کے حال پر ہیں، راحیل کو گراں گزر رہی ہیں اس لیے وہ اپنی کوٹھری میں منہ چھپا کر بیٹھ رہی ہے۔“

لیاہ کے انگ انگ سے خوشی ٹپک رہی تھی، بولی۔ ”جب میرے خدا نے یہ دیکھا کہ مجھ سے نفرت کی جارہی ہے تو اس نے مجھے یکے بعد دیگرے دو لڑکے عطا فرمائے اور دایہ سے یہ مایوس کن اعلان کرا دیا کہ خدا نے اس کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں۔“

اس وقت راحیل کی حالت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر وہ کرے کیا؟

☆☆☆

شمعون کے بعد لیاہ کے ایک لڑکا اور ہوا اور اس نے اس کا نام لادی رکھا۔ اس نے فخر یہ کہا۔ ”لوگو! اب میں تین بیٹیوں کی ماں ہوں اور اب میں پوری طرح مطمئن ہو کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرا شوہر مجھ سے بہت زیادہ محبت کرے گا، اتنی کہ لوگ حسد اور رقابت سی محسوس کریں گے۔“

راحیل پر قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ اپنی اس غلطی پر بہت نادام تھی جب اس نے اپنے حسن و خوبصورتی پر ناز کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی بڑی بہن لیاہ اس کے مقابلے میں یعقوب کی محبت جیتنے میں ناکام رہے گی۔ اب خدا اسے برابر شرمندہ

کیے جا رہا تھا۔ وہ ہر بار اپنی کنیز بلہاہ سے یہی سوال کرتی۔
”بلہاہ! اب کیا ہوگا؟“

بلہاہ جواب دیتی۔ ”اے میری آقا زادی! اپنے رب کے نام پر آپ صبر کریں، یہاں تک کہ آپ کا صبر آپ کا رب خود بھی محسوس کرے اور صبر کرنے والوں کے لیے رب کے پاس عظیم اجر ہے۔“

راحیل کہتی۔ ”بلہاہ! غم اور صدمے سے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ برداشت اور صبر کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ تو اس غم کی شکار نہیں ہے جس میں، میں مبتلا ہوں اس لیے تیری عقل صحیح کام کر رہی ہوگی۔ تو اپنی صحیح عقل سے مجھے یہ مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟“

بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی! میں پریشان ہوں کہ صبر کے سوا میں آپ کو کیا مشورہ دوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”اگر لیاہ کے چوتھی بار بھی لڑکا ہی ہوا تو پھر میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ میں اپنے لیے کسی بھی قیمت پر اولاد حاصل کر کے رہوں گی۔“

بلہاہ نے تعجب سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“
”یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی، ذرا صبر کر۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”اے میری آقا زادی! میں آپ کی رازدار ہوں، آپ کی کوئی تکلیف یا کوئی مصیبت مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے پھر آپ اس میں بھی مجھے اپنا رازدار کیوں نہیں بناتیں؟“

راحیل نے جواب دیا۔ ”بس تو چند دن تک خاموش رہ اور اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کر میں کیا چاہتی ہوں یا کون سا قدم اٹھاؤں گی، تجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ہاں میں اس معاملے میں اک ذرا تیری مدد ضرور چاہوں گی۔ اگر تو نے میری مدد کر دی تو میں تجھے دکھلا دوں گی کہ میں بھی اولاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔“

بلہاہ نے کچھ ایسا محسوس کیا گویا شدت غم نے راحیل کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، خود اسے بھی پتا نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔

بلہاہ نے پوچھا۔ ”اے میری آقا زادی! آپ مجھے ابھی سے وہ بات کیوں نہیں بتا دیتیں، جس کا کل بتا دینا ناگزیر ہوگا۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”نہیں بلہاہ! اگر وہ بات میں قبل از وقت بتا دوں گی تو اس کی افادیت مجروح ہو جائے گی

اور میرے حاسد اسے بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔“

بلہاہ خاموش ہو گئی اور لیاہ کے گھر میں چوتھی ولادت کا انتظار کرنے لگی۔ یعقوب کی شب و روز کی محنت اور دیانت خوب رنگ لارہی تھی۔ ماموں لابن کے موبیشیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی جب ان موبیشیوں میں سے کوئی موبیشی کسی درندے کی خوراک بن جاتا تو ماموں لابن کسی نہ کسی طرح یعقوب سے یہ نقصان پورا کرا لیتا۔ ایک دن یعقوب کے ریوڑ سے کوئی درندہ ایک بھیڑ دو بچ کر لے گیا۔ شام کو جب ان کی تعداد گنی گئی تو اس میں ایک بھیڑ کم تھی۔ ماموں لابن نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”یعقوب! ایک بھیڑ کہاں چلی گئی؟“
یعقوب نے جواب دیا۔ ”ماموں! اسے ایک بھیڑ یا اٹھالے گیا۔“

ماموں لابن کو ایک دم غصہ آ گیا، بولے۔ ”ارے بھائی! یہ بھیڑ یا پہلے کیوں نہیں اٹھالے گیا تھا؟“
یعقوب نے محسوسیت سے کہا۔ ”ماموں! یہ تو وقت وقت کی بات ہے لیکن میں ایک بات آپ کو ضرور بتا دیتا چاہتا ہوں۔“

”بتا بتا، ذرا جلدی بتا۔“
یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں ہر اس نقصان کا ذمے دار ہوں، جو میرے ذمے سوئے ہوئے کاموں میں ہوگا اس لیے اس گمشدہ بھیڑ کی قیمت میں ادا کروں گا، آپ فکر مند نہ ہوں۔“

ماموں لابن کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں، بولے۔ ”تو کتنا سعادت مند ہے یعقوب! تو نے میرا دل خوش کر دیا۔“

یعقوب نے ایک بھیڑ کا نقصان واقعی پورا کر دیا۔ جب راحیل کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے ہمدردی سے کہا۔ ”اگر تو میرے باپ کے موبیشی چراتا ہے اور ان کی خدمت کرتا ہے تو اس میں اس قسم کے نقصان بھی ہوں گے اور ان نقصانوں کا ذمے دار میرا باپ اگر تجھے ٹھہراتا ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں نے صرف تیری خاطر مصیبتیں گوارا کی ہیں اور آئندہ بھی انہیں جھیلنے کو تیار ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ تو ادا اس اور پریشان سی رہتی ہے..... آخر یہ کیوں؟“

راحیل نے کہا۔ ”یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے لیکن

اگر تو نے یہ ذکر چھیڑا ہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لے۔
میں اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتی جب تک کہ میں خود بھی
صاحبِ اولاد نہیں ہو جاتی اور ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔“
یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”خدا کے ہاں ناممکن کچھ بھی
نہیں، تو مایوس کیوں ہوتی ہے؟“

راحیل نے کہا۔ ”میں مایوس نہیں ہوں لیکن اپنے
رب کی رحمت میں تاخیر سے تنگ ضرور آگئی ہوں۔“
باہر سے یعقوبؑ کے کسی ایک بچے کے رونے کی
آواز سنائی دی۔ یعقوبؑ نے بے چین ہو کر کہا۔ ”راحیل!
میں ابھی آتا ہوں، میرا کوئی بچہ رو رہا ہے۔“
یعقوبؑ وہاں سے چلے گئے اور راحیل اپنے غم کی
آگ میں جلتی بھلستی رہی۔

☆☆☆

لیاہ کو خدا نے ایک بار پھر نواز دیا اور اس کے گھر میں
چوتھا بیٹا پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام یہوداہ رکھ دیا۔ راحیل
پر ایک بار پھر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیاہ نے راحیل کو جلانے کی
خاطر اس کو اپنی خوشی میں شریک ہونے کی دعوت دی،
بولی۔ ”راحیل! تو کیوں اداس اور پریشان ہوتی ہے؟ تو
خدا کی حمد و ثنا اور ستائش کر کہ اس نے تجھے حسن کی دولت
سے مالا مال کیا ہے اور میں بھی خدا کی حمد و ثنا اور تعریف
کروں گی کہ اس نے مجھے یکے بعد دیگرے چار بیٹوں سے
نواز دیا۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”اے کاش! میں خوب
صورت ہونے کے بجائے صاحبِ اولاد ہوتی۔“
لیاہ نے کہا۔ ”تو کیا تو اپنے رب سے گلہ کر رہی ہے؟
مجھے دیکھ کہ میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے عیب کے باوجود ہر
وقت اپنے رب کی شکر گزار رہتی ہوں۔“
راحیل سے باتیں نہیں کی جا رہی تھیں، ایک طرف
جاتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنے رب سے اپنی محرومی کا گلہ
ہرگز نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں، اس کی رحمت کی تاخیر سے گھبرا
ضرور رہی ہوں۔“

راحیل چلی گئی تو لیاہ نے طنزاً کہا۔ ”تو گویا تو ابھی
تک یہ امید رکھتی ہے کہ تو اولاد پیدا کر سکے گی حالانکہ وہ یہ یہ
بتا چکی ہے کہ تیری قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔“
اس رات یعقوبؑ سے ایک بار پھر تلخ کلامی
ہو گئی۔ راحیل کی آنکھیں مسلسل روتے رہنے سے سرخ
ہو گئی تھیں، اس نے یعقوبؑ سے کہا۔ ”آخر میں کب تک
انتظار کروں گی؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو مجھ سے نہیں،
اپنے رب سے کر، وہ شاید جواب دے دے۔“

راحیل نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد
چاہتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو میری بڑی بہن لیاہ، طعنے
دے دے کر اور جلا جلا کر مجھے مار ڈالے گی۔ میں مرجاؤں
گی۔ کیا تو بھی یہی چاہتا ہے کہ میں مرجاؤں؟“
یعقوبؑ نے آگ بگولا ہو کر جواب دیا۔ ”راحیل! تو
کیسی باتیں کرتی ہے، یہ لین دین تو آسمانوں میں رب کی
طرف سے ہوتا ہے۔ کیا میں تیرا رب ہوں جس نے تجھے
اولاد کی نعمت سے محروم کر رکھا ہے؟“

راحیل نے اسی وقت اپنی کنیز بلہاہ کو آواز دی۔ وہ
بھاگی بھاگی آئی تو راحیل نے یعقوبؑ سے کہا۔ ”میں نے
یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بہر قیمت اولاد حاصل کر کے رہوں
گی۔ میں اب زیادہ دنوں تک محرومیت کی شکار نہیں
رہوں گی۔“

بلہاہ نے پوچھا۔ ”آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟“
راحیل نے جواب دیا۔ ”ہاں، تو ایک طرف بیٹھ جا۔
میں نے تجھے ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔“ پھر یعقوبؑ
سے پوچھا۔ ”میں جو فیصلہ سنانے والی ہوں کیا تو بھی اسے
منقول کر لے گا؟“

”پہلے تو اپنا فیصلہ تو سنا، اس کے بعد میں کوئی جواب
دوں گا۔“

راحیل نے بلہاہ سے کہا۔ ”بلہاہ! تجھے یاد ہے کہ ایک
دن میں نے تجھ سے کوئی وعدہ لیا تھا؟“

بلہاہ نے جواب دیا۔ ”تجھے خوب اچھی طرح یاد ہے،
آپ فرمائیں میں ہر طرح آپ کے کام آنے کو تیار ہوں۔“
راحیل نے یعقوبؑ اور بلہاہ کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔
”تم دونوں جانتے ہو کہ میں نے اپنے رب کی رحمت کا۔۔۔

بے حد انتظار کیا لیکن اس میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے اور ادھر
میری بڑی بہن لیاہ کے گھر میں اولاد کی بارش سی ہو رہی
ہے۔ ان حالات میں، میں جس کرب و اذیت میں مبتلا ہوتی
جا رہی ہوں اس کا تم دونوں کو معمولی سا احساس تک نہیں
ہو سکتا۔“ پھر بطورِ خاص یعقوبؑ سے کہا۔ ”اس لیے میں نے
یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھ سے اولاد حاصل کر کے رہوں۔“
اس کے بعد بلہاہ سے کہا۔ ”اور بلہاہ تو میری کنیز ہے،
میرے جملہ دکھ درد میں شریک۔ میں تیری مرضی جانے بغیر
تجھے اپنے شوہر یعقوبؑ کے حوالے کر رہی ہوں، آج سے
یعقوبؑ کو تیرے جسم پر تصرف کا حق بھی حاصل ہوگا اور اس

لیا ہ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے مہمانوں سے کہا۔ ”راہیل خواجواہ اتر رہی ہے، لڑکا بلہاہ سے ہوا ہے، اس میں راہیل کے خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تو تب جانوں جب راہیل کے لڑکا ہوتا۔ وہ تو وہی بے اولاد ہی رہی۔“

راہیل نے اکڑ کر جواب دیا۔ ”بلہاہ کو میں نے اپنے شوہر کے حوالے کیا تھا اس لیے اس کی اولاد میری اولاد ہے۔ میری بڑی بہن لیاہ خواجواہ تکبر میں مبتلا تھی۔ بلہاہ کو پیٹا دے کر خدا نے میری فریاد سنی اور میرے ساتھ انصاف کیا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کا نام دان رکھ رہی ہوں۔“

اس دن دونوں بہنوں میں خاصی نوک جھوک رہی اور دیکھنے والے خوب اچھی طرح یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب لیاہ کی باتوں میں ایک قسم کی شکست خوردگی پائی جاتی تھی اور راہیل کا انداز قاتحانہ بلکہ جارحانہ تھا۔

لیاہ نے کہا۔ ”راہیل! تو زیادہ نہ اتر، اب بھی میری چار اولادیں ہیں اور میں آج بھی اپنے شوہر کی نظر میں تجھ سے زیادہ برگزیدہ اور چہیتی ہوں۔“

راہیل نے جواب دیا۔ ”جب میں نے غرور کیا تھا تو خدا نے مجھے بے اولاد رکھ کر بڑی کر بنا کر شکست دی تھی لیکن بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں اپنے کیے پر تادم ہو کر اپنے رب سے توبہ و استغفار کرنے لگی اور پھر میرے رب نے ہی میرے دل و دماغ میں یہ تجویز ڈالی کہ میں اپنی کنیز بلہاہ سے اپنے لیے بیٹا طلب کروں، چنانچہ میں اس اشارے پر عمل کر کے صاحب اولاد ہو چکی ہوں اور بلہاہ کا بیٹا دان میرا اپنا بیٹا ہے۔“

لیاہ ناراض ہو کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی اور راہیل اپنی کنیز بلہاہ سے محبت کی باتیں کرنے لگی۔ یعقوب نے لیاہ کو سمجھایا کہ راہیل اور بلہاہ کے مقابلے میں بہت زیادہ جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن لیاہ کا یہ کہنا تھا کہ وہ چونکہ یعقوب کے چار بیٹوں کی ماں ہے اس لیے بلہاہ اور راہیل کے مقابلے میں اس سے زیادہ ترجیحی سلوک ہونا چاہیے۔ یعقوب یہ کہتے تھے کہ ان کے نزدیک سبھی برابر ہیں۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔

لیاہ مہینوں اس انتظار میں رہی کہ خدا اس کی قسمت کو کھول دے اور وہ پانچواں بیٹا پیدا کر کے راہیل اور بلہاہ کو شرمندہ کر دے لیکن اس کے بے جا تکبر سے خدا اس سے روٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بلہاہ سے دوسرا بیٹا بھی پیدا ہو گیا

طرح تجھ سے جو اولاد ہوگی، وہ میری اولاد ہوگی۔ اسے میں اپنی اولاد کہوں گی۔ شاید میں اسی طرح اپنی بہن لیاہ کے مقابلے میں سرخرو ہو سکوں۔“

یعقوب اور بلہاہ نے ایک دوسرے کو سرسری نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد دونوں راہیل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت راہیل کی حالت واقعی بڑی قابلِ رحم تھی۔

راہیل نے یعقوب سے پوچھا۔ ”کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے.....؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ بلہاہ تیرے فیصلے کو کس حد تک مانتی ہے؟“

راہیل نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا۔ ”بلہاہ سے میں نے پہلے ہی سے یہ وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ میرے لیے قربانی دے گی۔“ پھر بلہاہ کو مخاطب کیا۔ ”کیوں بلہاہ! کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں ہے؟ کیا تو میرے لیے یعقوب کے اشتراک سے اولاد نہیں پیدا کر سکتی؟“

بلہاہ نے سر جھکا لیا، آہستہ سے بولی۔ ”میں لیاہ کے مقابل آپ کو بھی خوش دیکھنا چاہتی ہوں اے میری آقا زادی۔“

راہیل نے یعقوب سے کہا۔ ”بلہاہ کو لے جا اور اس سے مجھے اولاد دے۔“

جب لیاہ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی چھوٹی بہن راہیل نے بلہاہ کو یعقوب کے حوالے کر دیا ہے اور اس سے اولاد حاصل کرنے کی فکر میں ہے تو خوب ہنسی اور راہیل کا مذاق اڑایا۔ ”واہ! خود تو ناکام رہی، اب اپنی کنیز کے ذریعے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ میں بلہاہ کو بھی شکست دے دوں گی، پھر دیکھوں گی کہ راہیل اور کون سا قدم اٹھاتی ہے۔“

بلہاہ کی حوا لگی کے بعد کا عرصہ پورے خاندان میں سب کے لیے تجسس اور سنسنی کا مرحلہ بنا ہوا تھا۔ ادھر لیاہ کو پانچویں بیٹے کا انتظار تھا لیکن راہیل اس دوران پورے اعتماد سے ایک بات کہنے لگی تھی، وہ کہتی تھی۔ ”اب میرا رب مجھے اور زیادہ شرمندہ نہیں کرے گا۔“

لیاہ کو یقین تھا کہ اس کے ہاں پانچویں اولاد بھی ہوگی لیکن اس وقت یہ غرور چکنا چور ہو گیا جب بلہاہ سے ایک لڑکا پیدا ہو گیا۔ اس دن راہیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور لیاہ خفت میں مبتلا ہو گئی۔ راہیل اکڑتی ہوئی بلہاہ کے پاس پہنچی۔ وہاں خاندان کے اور لوگ بھی موجود تھے اور یہ لوگ بلہاہ کے بجائے راہیل کو مبارکباد دے رہے تھے۔

اور ایک بار پھر راحیل کو زبردست خوشی حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں خاندان والوں کی شاندار ضیافت کی۔ اس میں قریب اور دور کے بہت سارے رشتے دار شریک ہوئے۔ ایک کھلی جگہ میں ان سب کو جمع کر کے مزے مزے کی باتیں کی جانے لگیں۔ لیاہ اور اس کی کنیز زلفہ اس ضیافت میں شریک نہیں ہوئیں۔ یہ دونوں اپنی کوٹھری میں، اپنے چاروں بچوں سمیت بند بیٹھی رہیں۔ جب یعقوب نے ان لوگوں کو محفل میں نہیں دیکھا تو وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے ان کی کوٹھری تک پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ لیاہ کی کنیز زلفہ نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ منہ چھپائے بستر پر دراز ہے اور اس کے آس پاس اس کے چاروں بچے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ یعقوب نے دریافت کیا۔ ”تم لوگ محفل سے الگ تھلگ یہاں منہ چھپائے کیوں پڑے ہو؟ آخر عزیز رشتے داروں میں کیوں نہیں بیٹھتے؟“

لیاہ نے ترشی سے کہا۔ ”راحیل نے یہ محفل مجھے، میرے بچوں اور زلفہ کو جلانے کے لیے منعقد کیا ہے کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ راحیل اور اس کی کنیز بلہاہ کو خوش ہونے کا موقع فراہم کیا جائے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”تیرے چار لڑکے ہیں اور اگر عورت کی برتری اور کمتری کا مرتبہ اس کی اولادوں ہی سے متعین ہوتا ہے تو تو ان دونوں پر اب بھی فوقیت رکھتی ہے، کیونکہ بلہاہ کے تو ابھی دو ہی لڑکے ہیں اور راحیل کے ایک بھی نہیں۔“

لیاہ نے بہت زیادہ تندہی سے لہجہ میں کہا۔ ”اگر راحیل یہ سمجھتی ہے کہ میں اس طرح سے ہار مان لوں گی تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ میں چاہوں تو اب بھی اس کی اس معمولی سی فتح کو اس کی ہار میں بدل دوں۔ میرے رب نے مجھے بھی عقل دی ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”اچھا تو تقریب میں تو چل، یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے ایک بار یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اور زلفہ اپنے بچوں سمیت اس تقریب میں نہیں بیٹھیں گی تو اس میں شمولیت کے لیے کوئی ہمیں مجبور بھی نہیں کر سکتا۔“

یعقوب نے افسوس سے کہا۔ ”لیاہ! میں جبر سے بھی کام نہیں لے سکتا اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور بھی نہیں کر سکتا لیکن میری دور بین نظریں ایک بات

ضرور دیکھ رہی ہیں۔ ایک خطرناک بات ایک افسوسناک منظر۔ تم لوگوں کی یہ باہمی منافرت، رنجشیں اور حسد، تمہاری اولادوں میں پیدا ہو جائیں گی اور ایک زمانہ آئے گا جب تمہارے بیٹے، بلہاہ کے بیٹوں سے برسر پیکار ہو جائیں گے لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔“

یعقوب کے مایوس چلے جانے کے بعد لیاہ کا باپ لابن، لیاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت لابن کے ساتھ اس کے دونوں بیٹے بھی آئے تھے۔ لیاہ اور راحیل کے دونوں بھائی ایک عرصے بعد اپنے گھر فدان ارم واپس آئے تھے اور انہوں نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

لابن نے پوچھا۔ ”لیاہ! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، باہر کیوں نہیں چلتی؟ کیا تقریب میں شرکت سے تجھے کسی نے روک دیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں بادا جان! میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنے حاسدوں سے دور ہی رہوں تو زیادہ سکون سے رہوں گی۔“

”نہیں بیٹی!“ لابن نے کہا۔ ”تیرا اس طرح کوٹھری میں چھپ کر بیٹھ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔“

دونوں بھائیوں نے کہا۔ ”نہیں بہن! ہم دونوں بھی تو وہاں موجود ہوں گے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ آپ کو پریشان کرے یا کسی قسم کا دکھ پہنچائے۔“

لیاہ نے سکتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے بھائیو! تم اس معاملے میں مت پڑو۔ ہم بہنوں اور کنیزوں کے معاملوں میں تم دونوں کو نہیں پڑنا چاہیے۔ میں خود ہی مقابلہ کر لوں گی اور انہیں نیچا دکھا کے رہوں گی۔“

لابن اور اس کے بیٹوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ لیاہ اس کے چاروں بیٹوں اور کنیز زلفہ کو لے کر اس تقریب میں شریک ہوں لیکن لیاہ نہیں مانی۔ ضیافت بہت شاندار رہی اور بلہاہ کے دونوں بچوں کو ان کے رشتے داروں نے خوب خوب پیار کیا۔

عزیز رشتے داروں نے محفل میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کنیز زلفہ کو نہ دیکھ کر، ان کی عدم شرکت کی وجہ پوچھی تو راحیل نے چند عورتوں کو ساتھ لیا اور ان سے کہا۔ ”میں نے تو بڑی کوشش کی کہ میری بہن لیاہ، اس کے بچے اور اس کی کنیز زلفہ بھی میری اس خوشی میں شریک ہوں لیکن وہ معلوم نہیں کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ ذرا تم لوگ میرے ساتھ چل کر محفل میں شریک نہ ہونے کا سبب خود ہی معلوم کر لو۔“ راحیل نے دروازہ تھپتھپایا اور ہنستے ہوئے کہا۔

گریہ پیہم

”لیاہ! دروازہ کھول، میں تجھے لینے آئی ہوں۔ کیا تو ہماری خوشیوں میں نہیں شریک ہوگی؟“

لیاہ نے اندر سے جواب دیا۔ ”راہیل! تو زیادہ نہ پریشان کر، کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں تیری اور بلہاہ کی موجودگی میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں شرمندگی اٹھاؤں؟“

راہیل نے ہنس کر کہا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی بلکہ سارے رشتے دار تجھے اور تیرے بچوں کے لیے طرح طرح کے سوالات کر رہے ہیں اس لیے اس تقریب میں تیری شرکت ضروری ہے۔“

لیاہ نے غصے میں جواب دیا۔ ”راہیل! تو چلی جا۔ میں نہیں آؤں گی، مجھے تنگ نہ کر۔“

راہیل نے ساتھ کی عورتوں سے کہا۔ ”دیکھا تم نے، میری بڑی بہن لیاہ حسد سے اندر بند ہے۔ جب اس کے کپے بعد دیگرے چار بیٹے ہوئے تو وہ میرے ساتھ حسد سے پیش آئی اور میں پانچ چھ سال تک اس کے حسد کی آگ میں جلتی رہی۔ آخر میں نے یہ محسوس کر کے کہ میں خود بیٹا نہیں دے سکتی تو میں نے اپنی کنیز بلہاہ کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیا اور اس سے میں نے دو بیٹے حاصل کر لیے۔“

لیاہ نے اندر سے چنچ کر کہا۔ ”راہیل! تو اسی وقت یہاں سے چلی جا، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گی۔“

راہیل نے اپنی بہن کی دھمکی پر کوئی توجہ ہی نہ دی، ہنس ہنس کے مہمان عورتوں سے کہنے لگی۔ ”اے معزز عورتو! میں نے اپنی بڑی بہن لیاہ سے نہایت زور مار مار کر کشتی لڑی ہے اور تم سب دیکھ رہی ہو کہ آخر کار میں نے فتح پالی ہے۔ میں اپنے دوسرے بیٹے کا نام نفثالی رکھتی ہوں۔“

اندر لیاہ نے اپنی کنیز زلفہ سے کہا۔ ”زلفہ! تو دیکھ رہی ہے کہ راہیل میرے ساتھ کس طرح پیش آرہی ہے۔“

زلفہ نے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی! میں خوب دیکھ رہی ہوں، ہم سب کے رب کی مرضی یہی ہے کہ راہیل ہم پر ہنسے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

لیاہ نے غصے سے کہا۔ ”لیکن میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتی۔“

زلفہ نے کہا۔ ”آخر آپ کی بہن راہیل بھی تو ایک عرصے تک اس آگ میں جلتی رہی ہے۔“

لیاہ نے اسے ڈانٹا۔ ”تو چپ رہ، اپنی زبان بند رکھ۔ کیا تو بھی راہیل اور بلہاہ سے مل گئی ہے؟“

زلفہ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات

موسم کی بدلتی دل ربا ادائیں
مارچ کے شمارے کی منفرد کھانیں

خوب صورت جزیرے پر کھیلے جانے والے کھیل کے خطرناک
موڑ **محی الدین نواب** کے قلم سے پراسرار رموز

شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عمار کی یکجائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی۔۔۔
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرواز کی کہانیاں
دو گروپوں کے سنسنی خیز ٹکراؤ سے جنم لینے والی کہانی
کے زاویے۔ **سلیم فاروقی** کا انداز نگارش

ایسی مثلث جو براہِ ریت جوڑ کے ساتھ اپنی جگہ مستحکم تھی۔
محمد فاروق انجم کا تیکھا سرواز

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

● اولین سوغات

● انگارے

● آوارہ گرد

● پھلا رنگ

● دوسرا رنگ



آپ کے تہرے...
مشوے... محبتیں... شکایتیں...
اور غمی دھچک باتیں... کھائیں

نہیں اے میری آقا زادی! میں تو اس طرح آپ کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہی ہوں۔“

لیاہ نے پوچھا۔ ”زلفہ! کیا تو میرا ساتھ دے گی؟“
زلفہ نے جواب دیا۔ ”بالکل ساتھ دوں گی اے میری آقا زادی!“

باہر راحیل اور دوسری مہمان عورتیں، لیاہ کی شرکت کی طرف سے مایوس ہو کر واپس جا رہی تھیں کہ یعقوبؑ نے راحیل کو ڈانٹا۔ ”راحیل! تجھے لیاہ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“
راحیل نے کہا۔ ”پھر وہ میری خوشیوں میں شریک کیوں نہیں ہوتی؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”اچھا تو مہمانوں میں واپس جا، میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کنیز زلفہ کو اپنے ساتھ لے کر تیرے پاس آتا ہوں۔“

راحیل چلی گئی اور یعقوبؑ کوٹھری کا دروازہ کھلوا کے اندر داخل ہوئے۔

لیاہ نے کہا۔ ”آج مجھے راحیل نے بہت زیادہ شرمندہ کیا ہے۔ میری کنیز زلفہ اس بات کی گواہی دے گی۔“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم سب مل جل کر رہو اور حسد و رقابت سے توبہ کر لو۔“

لیاہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”راحیل کہتی ہے کہ اس نے مجھ سے نہایت زور مار مار کر کشتی لڑی ہے اور اس نے آخر کار مجھ پر بیچ پالی ہے۔ اب میں بھی اس سے اسی طرح زور مار مار کر کشتی لڑنا چاہتی ہوں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گی جب تک کہ میں اسے شکست نہ دے دوں۔“

لیاہ کے چاروں بچے اپنی ماں کی آزر دگی سے خود بھی آزر دہ ہو رہے تھے۔

یعقوبؑ نے کہا۔ ”ایک تو یہ طریقہ ہے کہ تم دونوں آپس کے اختلافات اور حسد دور کر دو اور مل جل کر رہنے کی کوشش کرو اور اگر تم اس پر عمل کرنے سے قاصر ہو تو وہ دوسری تدبیر کیا ہے جس سے تمہاری آزر دگی دور ہو سکتی ہے؟“

لیاہ نے زلفہ کو مخاطب کیا۔ ”زلفہ! ادھر آ میرے پاس۔“
زلفہ، لیاہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اب لیاہ نے یعقوبؑ کو مخاطب کیا۔ ”جس طرح میری بہن راحیل نے اپنی کنیز بلہاہ کو تیرے حوالے کر کے یہ جنگ جیتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی کنیز زلفہ تیرے حوالے کرتی ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا رب کسی وجہ سے مجھ سے ناراض

ہو گیا ہے جس سے میں پانچواں بیٹا نہیں پیدا کر سکی۔ اب میں بھی اپنی کنیز زلفہ کے ذریعے پانچویں اولاد حاصل کروں گی۔ تو زلفہ کو بیوی بنا اور اس سے اولاد پیدا کر۔“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”لیاہ! تو جیسا چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا لیکن تو بٹاش رہ اور دل سے کدورتیں نکال دے۔“

لیاہ خوشی خوشی اٹھی اور یعقوبؑ کے ساتھ راحیل کی ضیافت میں شریک ہوئی۔ اس کے چاروں لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی کنیز زلفہ اس طرح یعقوبؑ کے ساتھ کھڑی تھی جس طرح بیوی شوہر کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔

راحیل کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایک دم اٹھی اور بھاگ کر یعقوبؑ کے پاس آئی، پوچھا۔ ”یہ زلفہ تیری کون ہے؟ کیا میری بہن لیاہ نے اسے تیری دلہن بنا دیا ہے؟“

یعقوبؑ نے جواب دیا۔ ”ہاں، بالکل اسی طرح، جس طرح تو نے اپنی کنیز بلہاہ کو میری دلہن بنا دیا تھا۔“
راحیل نے اپنی بہن لیاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تو

تو میری ہی تدبیر سے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے؟“
لیاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، لیکن یہ یاد رہے کہ پہل تیری ہی طرف سے ہوئی تھی۔“

راحیل نے کہا۔ ”بہر حال کچھ بھی ہو، میں تو اپنے رب پر بھروسہ کروں گی، کیونکہ عزت اور ذلت اسی کی طرف سے ملتی ہے اور وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔“

☆☆☆

اگلے سال زلفہ سے بھی ایک لڑکا ہوا۔ لیاہ نے مارے خوشی کے نعرہ بلند کیا۔ ”زے قسمت!“

راحیل اور بلہاہ کو افسوس تو ہوا لیکن پہلے جیسا نہیں کیونکہ وہ دونوں اس مقابلے سے عاجز آگئی تھیں۔ لیاہ نے اس لڑکے کو اپنے باپ لابن اور بھائیوں کی خدمت میں باری باری پھرایا اور عزیز رشتے داروں کو بلا کے مبارکبادیں وصول کیں۔ لیاہ نے اس کا نام جدر رکھا۔

دوسرے سال زلفہ سے ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اب لیاہ کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا، اس نے کہا۔ ”آہ! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ عورتیں مجھے خوش قسمت کہیں گی۔“

لیاہ نے اس کا نام آشر رکھا۔ اس دوران لیاہ کے اپنے بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور سب سے بڑا بیٹا رابن اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ کھیتوں میں جانے لگا تھا۔ راحیل اور بلہاہ نہایت صبر و شکر سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اب پانسا پلٹ چکا تھا اور لیاہ جس انداز میں رہ رہی تھی اور اس نے جو روش اختیار کر رکھی تھی، اس سے ایک شانِ مملکت جھلکتی تھی۔ وہ کسی

کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ وہ ہر ایک سے اس طرح پیش آتی گویا وہی گھر کی بڑی اور اہم شخصیت ہے۔

لیاہ کا بڑا بیٹا راہن گیہوں کے کھیت میں گھسا ہوا معلوم نہیں کیا کر رہا تھا کہ وہاں سے ایک خاص قسم کی گھاس مل گئی۔ اس گھاس کی شکل آدمی سے ملتی جلتی ہے اس لیے اسے مردم گیاہ کہتے ہیں۔ راہن مردم گیاہ لے کر گھر میں جو داخل ہوا تو اس پر راحیل کی نظر پڑ گئی۔ وہ راہن سے تو کچھ بولی نہیں لیکن اپنی بڑی بہن لیاہ سے کہا۔ ”دیکھ، میں نے تجھ سے مفاہمت کر لی ہے اور اب میرا تیرا کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا۔“

لیاہ نے چڑ کے پوچھا۔ ”آخر تو کہنا چاہتی ہے؟ اپنا مطلب بیان کر۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”تیرا بیٹا راہن مردم گیاہ لے کر آیا ہے، یہ مجھے بہت اچھے لگے، کیا تو ان میں سے چند مجھے بھی دے دے گی؟“

لیاہ نے غصے میں جواب دیا۔ ”راحیل! اب تک تو میں خاموش تھی اور تو طعنے دے دے کر مجھے چپ ہو رہے پر مجبور کیے ہوئے تھی لیکن اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ کیا یہ معمولی بات ہے کہ تو نے میرے شوہر پر پہلے ہی قبضہ جما رکھا ہے، اب تو میرے بیٹے کے مردم گیاہ سے بھی حصہ بخر کرنا چاہتی ہے۔“

راحیل نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ اب میں تجھ سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔ میں یہاں تک مفاہمت پر آمادہ ہوں کہ اگر تو مردم گیاہ میں سے کچھ مجھے دے دے تو میں آج کی اپنی باری تجھے دے سکتی ہوں۔“

لیاہ نرم پڑ گئی، اس نے اپنے بیٹے کے لائے ہوئے مردم گیاہ میں سے کچھ راحیل کے حوالے کر دیا اور شام کو آتے ہوئے یعقوب کو راستے ہی میں روک لیا، بولی۔ ”آج تو میرے پاس رہے گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”یہ انصاف کے خلاف ہے، آج کی رات راحیل کی ہے اور میں عدل کے خلاف نہیں کر سکتا۔“

لیاہ نے پورا واقعہ سنا کے جواب دیا۔ ”میں نے راحیل سے تجھے آج کی رات مانگ لیا ہے اور اسے اس کی اجرت ادا کر دی ہے اس لیے اب انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ تو میرے ساتھ رہ۔“

تحقیق کے بعد جب لیاہ کی بات کی تصدیق ہو گئی تو وہ لیاہ کے ساتھ چلے گئے۔ یعقوب کی یہ شب ب سری لیاہ کے

حق میں بہت بڑی خوشی کا باعث بن گئی کیونکہ اس شب کے عوض اسے پانچواں لڑکا عطا ہوا۔ اس لڑکے کا نام لیاہ نے اشکار رکھا۔ اس نے راحیل اور بلہاہ کو چڑانے کی خاطر بہ آواز بلند کہا۔ ”لوگو! خدا نے میری اجرت عطا فرمادی۔ میں نے اپنے شوہر کو اپنی کینز زلفہ دے دی تھی۔ آج ایک عرصے بعد خدا نے مجھے پانچویں بیٹے سے سرفراز کیا جبکہ راحیل ابھی تک محروم ہے۔“

گویا راحیل کو ایک بار پھر ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب اس نے صبر کو اپنا شعار بنالیا تھا اور اپنی بڑی بہن سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے خدا سے کہا۔ ”اے میرے رب! میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تو مجھے جس حال میں بھی رکھے گا، خوش رہوں گی۔ میں اپنی قسمت اور قسمت لکھنے والے سے نہیں لڑ سکتی۔“

بلہاہ کو سو گوار دیکھ کر اسے بھی تسلی دی، کہا۔ ”بلہاہ! تو اپنے دونوں بچوں میں ٹک رہ، تو کیوں اداس ہوتی ہے۔ میری طرح تو بھی صبر و شکر کو اپنا شعار بنالے اور دیکھ کہ اس میں کتنا سکون ہے۔“

پانچویں بیٹے اشکار کے بعد لیاہ کے چھٹا بیٹا بھی پیدا ہو گیا۔ لیاہ نے اس کا نام زیولون رکھا۔ اس بار وہ بہت زیادہ اترائی۔ اس نے زور زور سے اعلان کیا۔ ”لوگو! کان کھول کر سن لو، میں اپنے چھٹے بیٹے کو اپنے مہر کی جگہ سمجھتی ہوں، جو خدا کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔ اب مجھے یہ حق خدا کی طرف سے مل چکا ہے کہ میں اپنے شوہر کو اپنے پاس ہی رکھ لوں۔“ پھر اس نے فخریہ کہا۔ ”لوگو! یہ کوئی مستمولی بات نہیں ہے کہ میں یعقوب کے چھ بیٹوں کی ماں ہوں۔“

ان تیز اور ترش باتوں سے تنگ آ کر بلہاہ نے اپنی آقا زادی راحیل سے کہا۔ ”اے میری آقا زادی! ہمارے مقابلے کی دوڑ میں لیاہ اتنا آگے نکل گئی ہے کہ اب یہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ اس نے ہم چاروں کے شوہر کو محض اپنا شوہر کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے حسد اور غرور کو توڑنے کے لیے کوئی تدبیر کیجیے، کوئی راہ نکالے۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”اب تک میں نے جتنی تدبیریں کی ہیں ان سے میں نے بھی کبھی وقتی فتح حاصل کی ہے۔ شاید میرے رب کو میری یہ بات ناگوار گزرتی رہی ہو اس لیے اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لیاہ جو کچھ کہتی یا کرتی ہے میں اس کا کوئی جواب نہ دوں اور اپنے رب پر تکیہ کیے رہوں کیونکہ میں خوب جانتی ہوں کہ میرا رب

مظلوموں کا ساتھی ہے۔ اگر میں حق پر نہیں ہوں تو مجھے میرا رب ہمیشہ مایوس رکھے گا لیکن اگر میں حق پر ہوں تو پھر میرا رب مجھے ہمیشہ مایوس بھی نہیں رکھے گا۔“

بلہاہ نے سوچا کہ یہ اس کی آقا زادی کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ سرد کیوں پڑتی جارہی ہے؟ اپنے چھ بیٹوں کو لے کر لیاہ جب راحیل کے سامنے سے اکڑتی ہوئی گزرتی تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے رب کو پکارتی کہ تو کہاں ہے؟ یعقوبؑ نے لیاہ کو سمجھایا کہ دیکھ تو راحیل کو مت ستا، ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا تجھ سے ناراض ہو جائے۔

لیاہ اور راحیل کے بھائی سمجھاتے۔ ”لیاہ! تو اپنی اولاد پر اتنی زیادہ نہ پھول، اپنے رب سے ڈر، جو مظلوموں کا ساتھی ہے اور بڑبڑولوں اور سرکشوں کا دشمن ہے۔“ اسی دوران میں ان کا باپ لابن بھی آگیا اور اس نے اصل معاملے سے واقفیت حاصل کر کے لیاہ کو ڈانٹا۔ ”لیاہ! آخر تو یہ کیا کرتی ہے؟ اب راحیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور خود کو صبر و تحمل کے حوالے کر دیا ہے۔ تو نے دیکھا کہ اس سے پہلے جب تو جھگڑتی تھی اور تجھ سے راحیل بھی بولتی تھی تو ہم سب خاموش رہتے تھے لیکن اب راحیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے تو اس کی طرف سے ہم سب بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیاہ اپنے رب سے ڈر کہ کہیں وہ تجھ سے ناراض ہو کر راحیل کا مددگار بن جائے۔“

لیاہ نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”باوا جان! میں کس طرح خاموش رہ سکتی ہوں۔ راحیل میرے شوہر کی جھڑپوں میں گئی مگر میں خاموش رہی، پھر میرے خدا نے مجھے چھ بیٹے دیے۔ کیا خدا یہ نہیں سمجھ رہا کہ کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ اس نے کس خطا میں راحیل کو اس کے پھل سے محروم رکھا؟ آپ لوگ میری طرح کیوں نہیں سوچتے۔“

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ ”میں نہیں کہہ سکتا کہ کس نے کس سے زیادتی کی، یہ سارا معاملہ تیرے سامنے کا ہے۔ تو خود ہی بتا کہ یعقوبؑ نے پہلے سات سال جو میری خدمت گزاری میں صرف کر دیے تھے تو وہ کس کی خاطر کیے تھے، کیا اس نے یہ خدمت راحیل کے لیے نہیں کی تھی لیکن میں نے زمانے کے دستور کے مطابق، یعقوبؑ کو لا علم رکھ کر اس سے تیری شادی کر دی جس پر یعقوبؑ ناراض بھی ہوا، مجھے اس پر رحم آگیا اور مزید سات سالہ خدمت گزاری کا عہد لے کر میں نے راحیل کی شادی بھی اس سے کر دی۔ اب تو ہی ایمانداری سے بتا دے کہ یعقوبؑ نے چودہ سالہ

خدمت گزاری آخر کس کے لیے گوارا کی؟ راحیل یہ کہتی ہے کہ تو اس کے حق میں بلا وجہ سا اچھی بنا دی گئی اور اب تو اپنے چھ بیٹوں کے زعم میں راحیل کو اپنے شوہر کا زبردستی کا حصہ دار سمجھنے لگی ہے لیکن جہاں تک ہم سب کے رب کا معاملہ ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس نے کس کے ساتھ زیادتی کی اور اب کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔“

لیاہ اپنے باپ سے بھی ناراض ہو گئی کہ وہ بھی راحیل کی طرف داری کر رہا ہے۔

☆☆☆

چھ بیٹوں کے بعد لیاہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیاہ نے اس کا نام دینہ رکھا۔ بلہاہ نے اپنی آقا زادی راحیل کو یہ خوشخبری سنائی کہ شاید خدا لیاہ کی طرف سے منہ پھیر رہا ہے کیونکہ اس بار اسے بیٹی دے کر ٹال دیا گیا ہے۔

راحیل نے جواب دیا۔ ”بلہاہ! میں نے قسم کھالی ہے کہ اب میں اپنی بہن لیاہ سے نہیں الجھوں گی۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ لیاہ کو لڑکا دے یا لڑکی، میں اس سے حسد کروں گی نہ شامت۔ میں اپنے رب کے فیصلوں میں دخل دے کر گناہ گار کیوں بنوں۔“

لیاہ کے بھائیوں نے لیاہ کو متنبہ کیا۔ ”دیکھ تیری زیادتیوں نے خدا کو کچھ کچھ تجھ سے ناراض کر دیا ہے ورنہ وہ اس بار بھی تجھے بیٹا ہی دیتا۔“

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ ”لیاہ! تو بھی میری بیٹی ہے اور راحیل بھی۔ میں کسی کی بے جا طرف داری نہیں کرتا لیکن اگر تو میری سچی بات سننا گوارا کرے تو میں یہی کہوں گا کہ خدا تجھ سے خوش نہیں ہے۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اگر خدا مجھ سے خوش نہیں ہے تو پھر راحیل سے بھی وہ خوش نہیں ہے۔ اس نے مجھے ساتویں بار بیٹے کی جگہ بیٹی مرحمت فرمائی لیکن راحیل کو تو کچھ بھی نہیں دیا۔ اگر وہ مجھ سے ناخوش اور راحیل سے خوش ہے تو وہ راحیل کو اس کا پھل کیوں نہیں دیتا؟“

لابن کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ مزید کوئی بات کیے بغیر لیاہ کے پاس سے چلا گیا اور لیاہ خوشی سے پھولی نہ سہائی کہ اس نے باپ کو لا جواب کر دیا ہے۔

راحیل کی اداسی اور صبر کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو خدا کو اس پر رحم آگیا۔ پھر پورے خاندان میں ایک ایسی خبر گشت کرنے لگی جس کے سننے کی وہ امید تک نہ کر سکتے تھے۔ دایہ نے یہ حیرت انگیز خبر سنائی کہ راحیل کو اس کا پھل ملنے والا ہے اور کسی کو اس خبر پر یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن لیاہ نے

گریہ پیدہ

کیا تو لیاہ، راحیل، زلفہ، بلہاہ اور ان کی اولاد، سبھی کو کنعان لے جائے گا؟“

”ہاں، میں ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، کیونکہ میں نے انہی کی خاطر آپ کی چودہ سال تک خدمت کی ہے اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے آپ کی کیسی خدمت کی ہے۔“

لابن نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ”یعقوب! اگر تو پسند کرے تو ابھی کچھ اور رہ جا میرے پاس، کیونکہ میں ایک عرصے سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ تو بہت ہی بابرکت ہے۔ خدا نے تیری وجہ سے مجھے بھی برکت بخشی ہے۔ اگر تو اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہے کہ تیری نظر کرم میرے حال پر رہنی چاہیے تو میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ تو یہیں رہ، اب میرے پاس کوئی بیٹی بھی نہیں ہے ورنہ میں وہ بھی تیرے حوالے کر دیتا لیکن پھر بھی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو مزید رہنا گوارا کرے گا تو میں اس کی اجرت ضرور دوں گا۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”اگر میں چند سال اور رہ جاؤں تو آپ اس کی کیا اجرت دیں گے؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”اجرت تو ٹھہرائے گا، جو کہے گا میں دیا کروں گا۔“

یعقوب نے کہا۔ ”یہ تو آپ مانتے ہی ہیں کہ میرے آنے سے پہلے آپ کے پاس تھوڑے سے جانور تھے لیکن اب یہ بہت ہو چکے ہیں لیکن اب چونکہ میں خود بھی ایک خاندان والا بن چکا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ اپنے خاندان کے لیے بھی کچھ کروں۔“

لابن نے فراخ دلی سے اجازت دی۔ ”وہی تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ میں تجھے کیا دوں؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میری تجویز مان لیں گے تو میں آپ کی مزید خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

لابن نے سوالیہ نظروں سے یعقوب کو دیکھنا شروع کیا۔ یعقوب نے ذرا تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”میں آپ کے مویشیوں میں گھوم پھر کر اپنا معاوضہ الگ کر لوں گا۔ اگر آپ نے اس معاوضے کو پسند فرمایا تو میں آپ کی خدمت کروں گا، ورنہ پھر اپنے خاندان کو لے کر کنعان چلا جاؤں گا۔“

اس کے بعد یعقوب نے اپنے سر لابن کو ساتھ لیا اور مویشیوں کے گلے سے چٹلی، چکبری اور کالی بھیڑیں اور بکریاں الگ کر کے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”یہ میرے مویشی ہیں

وایہ کا مذاق اڑایا۔ ”ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جب خدا نے راحیل کی قسمت میں اس کا پھل لکھا ہی نہیں تو یہ صاحب اولاد کس طرح ہو جائے گی۔“

اپنی بڑی بہن لیاہ کی یہ بات جب راحیل نے سنی تو اس نے نہایت صبر و تحمل سے جواب دیا۔ ”میرا رب تو پتھر کی جوف تک میں جاندار اور اس کی غذا کا انتظام کر دیتا ہے پھر میں تو اس کی ایک بندی ہوں۔“

اور جب یہ بات وثوق سے معلوم ہو گئی کہ راحیل اپنا پھل پانے ہی والی ہے تو یعقوب، راحیل کے باپ لابن اور اس کے بھائیوں کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ”خدا نے راحیل پر رحم کیا ہے اور اس نے اسے محسود ہونے کا صلہ عطا فرمایا۔“

راحیل سے ایک نہایت حسین بچہ پیدا ہوا، پورا گھر مسرت کدہ بن گیا۔ لیاہ نے جب اس حسین ترین بچے کو دیکھا تو حسد سے کہا۔ ”بچہ تو واقعی بہت خوب صورت ہے لیکن بات تو جب کی ہے، جب یہ بڑا ہو کر بھی حسین نکلے۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”لیاہ بہن! میں یہ نہیں جانتی کہ میرا بچہ بڑا ہو کر کیسا نکلے گا، میں تو اپنے رب سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ جس طرح تو نے اسے حسن و جمال کی دولت سے نوازا ہے، اسی طرح جب یہ بڑا ہو جائے تو اسے دولت کردار سے بھی نوازا دیجیو۔“

خاندان کی عورتوں نے راحیل کو مبارکبادیں پیش کیں تو اس نے ان سب سے کہا۔ ”میں تو اپنے رب کی اس لیے بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ سے رسوائی دور کر دی۔“

راحیل نے اپنے اس حسین بچے کا نام یوسف رکھا۔ اب یعقوب کو لابن کی خدمت کرتے ہوئے چودہ سال پورے ہو چکے تھے۔ انہیں کنعان کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ جب راحیل کے بچے کی خوشی میں سارا خاندان ایک جگہ جمع ہوا تو یعقوب، راحیل کے باپ لابن کو تھیلے میں لے گئے اور کہا۔ ”جناب! اب مجھے رخصت کیجیے، میں اپنے وطن کنعان واپس جانا چاہتا ہوں۔“

لابن نے جواب دیا۔ ”تو شوق سے کنعان واپس جا، میں نے تجھے روکا تو نہیں ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے بیوی بچے، جن کی خاطر میں نے اب تک آپ کی خدمت کی ہے، میرے حوالے کر دیجیے۔ میں انہیں اپنے ساتھ کنعان لے جاؤں گا۔“

لابن نے ذرا تشویش سے کہا۔ ”تیرے بیوی بچے؟“

اور ان سے جو بچے پیدا ہوں گے، وہ میری اجرت ہوں گے ان کے علاوہ جو بچے ہوں گے وہ آپ کے ہوں گے۔“
 لابن نے وضاحت چاہی۔ ”ان کے وہی بچے جو انہی کی طرح چٹکے، چمکبرے اور کالے ہوں گے، وہ تیرے ہوں گے باقی میرے۔“
 یعقوب نے تائید کی۔ ”بیشک، بیشک، میں اس کی تائید کرتا ہوں۔“

یعقوب نے اسی دن سے اپنی خدمات سنبھال لیں اور وہ اپنے سرلابن کی خدمت گزاری میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆

اس معاہدے کے بعد موسیٰوں کے بیشتر بچے اسی رنگ میں پیدا ہونے لگے جو معاہدے کی رو سے یعقوب کے حصے میں جاتے تھے۔ چند سالوں میں یعقوب کی مالی حالت اتنی مضبوط ہو گئی کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہ رہی۔ نوکر چاکر، موسیٰوں کے ریوڑ غرض ہر چیز یعقوب کے پاس آگئی۔
 اس آرام اور آسائش کے باوجود راحیل مطمئن نہیں تھی۔ خوش تو لیاہ بھی نہیں تھی لیکن اپنی ناخوشی کا اظہار بھی نہ ہونے دیتی تھی۔ راحیل نے لیاہ سے کہا۔ ”لیاہ! میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تو ذرا خلوص کے ساتھ ان پر غور کر اور بتا کہ میں غلطی پر ہوں یا میرے بھائی وغیرہ۔“
 لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل! تو میرے شوہر کی دوسری بیوی اور میری بہن ہے۔ ہم دونوں میں شدید اختلاف بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھے خود سے بہت قریب محسوس کرتی ہوں، بول، تو مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟“
 راحیل نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”کیا تو نے اپنے بھائیوں کی باتیں سنیں؟“

”کیسی باتیں؟“ لیاہ نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”بھائیوں نے کیا باتیں کیں اور کس کے خلاف کیں؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”آج وہ ہم دونوں کے شوہر کے خلاف کچھ باتیں کر رہے تھے۔“

لیاہ بھونچکا رہ گئی، پوچھا۔ ”راحیل! تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دے، مجھ سے کچھ چھپا نہیں۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”آج میرے بھائی ہم دونوں کے شوہر کے خلاف یہ کہہ رہے تھے کہ یعقوب نے ہمارے باپ کا سب کچھ لے لیا ہے اور اس کے سارے ٹھکانے اور اس کی پوری شان و شوکت ہمارے باپ کے مال کی بدولت ہے۔ تو جانتی ہے کہ ہمارے شوہر نے ہمارے باپ کی ایسی خدمت کی ہے، اس کی ان خدمات کے بعد

بھائیوں کا یہ کہنا بہت افسوس ناک ہے۔“
 لیاہ بھی فکر مند ہو گئی، پوچھا۔ ”پھر ہمیں کرنا کیا چاہیے؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”اب ہم دونوں آپس کے اختلافات دور کرتے ہیں اور ان حالات میں ہمارا جو قدم بھی اٹھے گا، اتفاق رائے سے اٹھے گا۔“
 لیاہ نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”ہم دونوں یعقوب کو آمادہ کریں کہ وہ یہاں سے کنعان واپس جائے، ہم بھی اس کے ساتھ ہی جائیں گے۔ بس یہی ایک فرار کی راہ رہ گئی ہے۔“
 لیاہ نے پوچھا۔ ”یعقوب سے یہ بات تم کہو گی یا میں کہوں؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہی لیکن الگ الگ وقتوں میں تاکہ یعقوب پر ہماری باتوں کا زیادہ اثر ہو۔“
 یعقوب نے بھی اپنے سرلابن اور لیاہ اور راحیل کے بھائیوں کی بدلی ہوئی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے طور پر ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کنعان واپس چلے جائیں گے۔

چودہ سالہ خدمت گزاری کے بعد چھ سال اور گزر گئے۔ اس طرح یعقوب نے اپنی بیویوں کے باپ لابن کی بیس سال خدمت کی۔

صبح طلوع آفتاب سے قبل یعقوب موسیٰوں کو لے کر چراگاہ کی طرف چلے گئے۔ چند ساعتوں بعد یعقوب کا ایک غلام لیاہ اور راحیل کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”تم دونوں کو یعقوب نے اپنے موسیٰوں کے پاس بلایا ہے۔“
 لیاہ اور راحیل ایک ساتھ یعقوب کے پاس پہنچ گئیں۔ یعقوب نے پوچھا۔ ”اس وقت تمہارا باپ لابن کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اپنی بھیڑوں میں گھسا ان کی اون اتار رہا ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”لیاہ اور راحیل! اس وقت میں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“
 یعقوب نے لیاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیاہ! یہ مسئلہ لابن اور میری ذات سے تعلق رکھتا ہے، کیا تو اس پر آمادہ ہے کہ اپنے باپ کے بارے میں تلخ حقیقتیں بھی برداشت کر لے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہمیشہ ہر طرح آمادہ ہو کر آئی ہیں، تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے آزادی سے کہو۔“
 یعقوب نے دونوں کو باری باری دیکھا اور ان سے

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کے مثال مجموعہ

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ اپریل 2016ء

کی جھلکیاں

صاحبِ دل

برصغیر میں فردغ تعلیم کے لیے زندگی وقف
کر دینے والی شخصیت کا زندگی نامہ

دلہا

فلمی دنیا کی پہلی سہارا کا تذکرہ،
اس پر الزام تھا ہیرو کی جان لینے کا

دیوانی کرکٹ

کرکٹ کی دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا ذکر
خاص کہ کس طرح کھیل تجارت میں بدلا

شمال سے ٹورانٹو

سیر پاکستان کے حوالے سے انتہائی دلچسپ تحریر

اس کی عمارت

”سراب“ جیسی طویل سرگزشت اور چھوٹے
بڑے بہت سارے تپتے واقعات، دلچسپ قصے،

آنکھیں نم کر دینے والی سچ بیاباں

بس ایک بار سرگزشت پر صبر پھر آپ
خود ہی اس کے اسیر ہو جائیں گے

نظریں ہٹا کر کہنا شروع کیا۔ ”لیاہ اور راحیل! تم دونوں جانتی ہو کہ میں نے تمہارے باپ کی کیسی خدمت کی ہے لیکن میں نے ہی نہیں، شاید تم دونوں نے بھی یہ محسوس کیا ہوگا کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس نے بدرجہ مجبوری چودہ سال کے بعد میری جواہرت مقرر کی تھی، وہ اسے بہت پہلے دے دینی چاہیے تھی۔ اب میں نے اپنی چھ سالہ محنت اور خدمت کے عوض جو کچھ حاصل کیا ہے تمہارے باپ اور بھائیوں نے اس کے لیے آپس میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میں نے انہیں لوٹ لیا ہے۔ میں ان سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں سے تنگ تھا کہ رات خواب میں، میں نے دیکھا کہ میرا رب مجھے حکم دے رہا ہے کہ یعقوبؑ اپنی بیویاں، مولیٰ اور اپنا سب کچھ لے کر کنعان واپس جا۔“

اتنا کہہ کر یعقوبؑ نے سکوت اختیار کیا اور دونوں کے اشارات جاننے کی کوشش کی۔

لیاہ نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟“
یعقوبؑ نے کہا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ سے کہاں تک متفق ہو؟“

لیاہ اور راحیل نے ایک ساتھ کہا۔ ”اب ہم دونوں کا اپنے باپ کے گھر میں کوئی حصہ یا میراث ہے بھی یا نہیں؟“
اور پھر رک کر بولیں۔ ”شاید کچھ بھی نہیں۔ ہمارے باپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، بھائیوں کا ہے۔ ہم دونوں ہی ایک مدت سے یہ محسوس کر رہی ہیں کہ ہم اپنے ماں باپ کے گھر میں گویا دوا جھنی ہیں۔“

یعقوبؑ نے خوش ہو کر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ مجھے تم دونوں کو زیادہ سمجھانا نہیں پڑا۔“

لیاہ نے کہا۔ ”میرے باپ نے تو ہم دونوں بہنوں کو اپنی سات سات سالہ خدمات کے عوض تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور اجرت میں سے ہم دونوں کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس لیے تمہارے پاس اب جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا ہے، ہماری اولاد کا ہے۔“

یعقوبؑ نے ان دونوں سے دریافت کیا۔ ”تب پھر میں اپنے خدا کے حکم کی تعمیل کروں؟“

لیاہ اور راحیل نے بیک آواز جواب دیا۔ ”ہاں، ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔“

یعقوبؑ نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تب پھر ادھر آؤ، میرے ساتھ..... میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔“

وہ دونوں یعقوب کے ساتھ چراگاہ کے اس یاڑے میں داخل ہوئیں جہاں دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے آسودہ مویشیوں کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہاں کا منظر بالکل اس قافلے جیسا تھا جس نے پڑاؤ کو چھوڑنے کی تیاریاں مکمل کر لی ہوں۔ یعقوب نے کہا۔ ”میں تمہارے باپ اور بھائیوں کو بتائے بغیر اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر انہیں میرے ارادے کا علم ہو گیا تو وہ رخنہ ڈالیں گے اور میرے سامان میں سے معلوم نہیں کیا کچھ روک لیں اور نہ لے جانے دیں۔“

لیاہ اور راحیل نے کہا۔ ”ہم دونوں اپنے بچوں کو لے کر اسی وقت تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“

چنانچہ اسی وقت ان دونوں نے اپنی اولاد، زلفہ، بلہاہ اور کنیزوں غلاموں کو ساتھ لیا اور یعقوب کے ساتھ ہی اپنے باپ کی سرزمین فدان ارم کو چھوڑ دیا۔

لیاہ اور راحیل کے باپ لابن کو بھیڑوں کی اون کترنے میں تین دن لگ گئے۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اسے یہاں کا نقشہ ہی عجیب دکھائی دیا۔ وہ تین کوس دور اس چراگاہ میں پہنچا جہاں یعقوب کے مویشی رہتے تھے تو وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ اس نے کھان جانے والی راہ پر اپنا گھوڑا ڈال دیا تو اس پاس کے بستی والوں نے اسے بتایا کہ ہاں، ہم نے ایک ایسا قافلہ جنوب میں جاتے دیکھا ہے جس میں انسانوں سے زیادہ مویشی تھے۔

لابن نے واپس آ کے اپنے رشتے کے بھائیوں اور بیٹوں کو ساتھ لیا اور تیز رفتار گھوڑوں پر یعقوب کا تعاقب شروع کر دیا۔ لابن سخت مشتعل تھا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یعقوب کو کوئی سخت سزا دے گا۔

☆☆☆

یعقوب نے ساتویں منزل پر پہنچ کر، کوہ جلعاد پر ڈیرا ڈالا اور یہاں ذرا سی دیر میں ایک چھوٹی سی بستی قائم ہو گئی۔ لابن ان کا پیچھا کرتا ہوا جب کوہ جلعاد کے نشیب میں پہنچا تو اس نے بلندی پر ایک ایسی بستی فروکش دیکھی، جس کے سامنے مویشی چلتے، چکبرے اور کالے تھے تو اس نے پورے یقین سے یہ سمجھ لیا کہ یہ یعقوب ہی کا قافلہ ہے۔ وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ کوہ جلعاد پر چڑھ گیا اور یعقوب کے خیموں کے مقابل ذرا فاصلے پر اپنے خیمے نصب کرنے لگا۔

راحیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بہن

لیاہ سے کہا۔ ”لیاہ! کیا یہ نیا قافلہ تجھے اپنے باپ لابن کا نہیں محسوس ہو رہا؟ میں تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائیوں کو بھی دیکھ رہی ہوں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو ان کے خیموں ہی سے پہچان لیا کہ یہ میرے باپ کے گھر کے خیمے ہیں۔“ ان دونوں کے ساتھ ان کی کنیزیں بھی کھڑی ہو گئیں۔ ان سب نے لابن اور ان کے ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔

یعقوب نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم دونوں کا باپ میرے ساتھ الجھنے آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی میں خوفزدہ نہیں کیونکہ میں نے اپنے رب کے حکم سے یہ سفر شروع کیا تھا اور اس وقت بھی وہ میرا اور میرے متعلقین کا محافظ ہے۔“

یہ لوگ ان نئے آنے والوں کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ انہوں نے لابن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یعقوب نے چند قدم چل کر لابن کا استقبال کیا۔ اس نے ترجمانی نظروں سے یعقوب کو دیکھا اور نہایت درشت لہجے میں کہا۔ ”یعقوب! یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟“ یعقوب نے نرمی سے جواب دیا۔ ”کیا اس طرح میرا گھر بے باتیں کرنا مناسب ہے؟ میرے ساتھ میرے خیمے میں چلے تاکہ وہاں ہم دونوں تفصیلی باتیں کر سکیں۔“

لابن نے کہا۔ ”چل اپنے خیمے میں چل۔ میں یہ باتیں ہر جگہ کرنے کو تیار ہوں۔“

دونوں ایک خیمے میں جا بیٹھے۔ ان کے آس پاس دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ لابن نے انہیں حکم دیا۔ ”میری بیٹی لیاہ اور راحیل کے علاوہ ہر کوئی باہر چلا جائے۔“ اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔

لابن نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ”یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟ اگر تو فدان ارم سے اتنا ہی اکتا گیا تھا اور تجھے اپنے آباؤ اجداد کی زمین اتنی ہی یاد آ رہی تھی تو، تو تنہا چلا آتا اور میری بیٹیوں کو وہیں چھوڑ آتا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”لیاہ اور راحیل اب آپ کی بیٹی سے زیادہ میری بیٹیاں ہیں۔“

لابن اور زیادہ گرم ہو گیا، بولا۔ ”مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ تو ان دونوں کو اس طرح کیوں لایا گویا یہ تلوار کے بل پر اسیر کر لی گئی ہوں۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں انہیں اپنے ساتھ

گریہ پیہم

یعقوب نے تلخی سے پوچھا۔ ”میرے سامان میں سے آپ کو کوئی اپنی چیز ملی؟“
لابن نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

یعقوب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”ابھی تک تو میں خاموش تھا لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر میرا وہ کیا قصور تھا جس کی وجہ سے آپ نے میرا پیچھا کیا، مجھ سے کلامی کی اور میرے سامان کی تلاشی لی؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے میرے سامان میں سے اپنی کوئی چیز ڈھونڈ نکالی ہے؟ اگر ایسی کوئی چیز آپ کو ملی ہے تو اسے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے سامنے رکھیے تاکہ وہ انصاف کریں۔“ پھر افسوس ناک لہجے میں کہا۔ ”میں نے بیس سال تک آپ کی خدمت کی ہے اور آپ ہی کے بقول، میں آپ کے لیے بہت ہی بابرکت ثابت ہوا۔ میں نے گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی جھیلی اور آپ کو نقصانات سے بچاتا رہا۔ کیا میری ان خدمات کا یہی صلہ ہے جو آپ دے رہے ہیں؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”اچھا اب بس بھی کر۔ یہ جو کچھ بھی تیرے پاس نظر آ رہا ہے، سب میرا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھ سے ایک عہد کرنا چاہتا ہوں۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”کیسا عہد؟“
لابن نے جواب دیا۔ ”پہلے عہد کا پتھر تو کھڑا کر، پھر عہد کی تفصیل بھی بتا دوں گا۔“

یعقوب نے کوہِ جلعاد کا ایک پتھر لے کر اسے سیدھا سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی بہت سارے پتھر اس کے گرد جمع کر دیے، پھر اس ڈھیری کے گرد بیٹھ کر سب نے کھانا کھایا۔

آخر میں لابن کھڑا ہو گیا اور اس نے یعقوب سے کہنا شروع کیا۔ ”یعقوب! یہ پتھر میرے اور تیرے درمیان اس عہد نامے کے گواہ رہیں گے جو ہم دونوں ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔“

یعقوب نے کہا۔ ”عہد نامے کے الفاظ دہرائیے تاکہ اس کی تفصیل معلوم ہو؟“

لابن نے کہا۔ ”یعقوب! ہم دونوں یہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوں گے، تو ہمارا خدا ہماری نگرانی کرے گا۔ یعقوب! تو قسم کھا کر یقین دلا کہ تو میری بیٹیوں کو دکھ نہیں دے گا اور ان کے علاوہ اب اور شادیاں نہیں کرے گا۔“

لانے کا حق رکھنے کے باوجود ان کی مرضی سے لایا ہوں۔ یہ دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں، آپ ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔“

لابن نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا بھی نہیں، کہا۔ ”میں تو اس پر برہم ہوں کہ تو چوری سے کیوں آیا؟ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں، اگر تو مجھے بتا دیتا تو میں ان دونوں کو تیرے ساتھ ڈھول اور بربط کی آوازوں کے ساتھ خوشی خوشی رخصت کرتا۔ تو نے مجھے اپنی بیٹیوں کو الوداعی پیار بھی نہیں کرنے دیا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”مجھے اندیشہ تھا کہ.....“
لابن نے طیش میں کہا۔ ”اندیشہ وندیشہ کچھ نہیں، تو نے بہت غلط کام کیا۔ اب جبکہ میں نے تجھے پالیا ہے، میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ تجھے نقصان پہنچاؤں لیکن میں کل رات سے خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں۔“
یعقوب نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”میں نے کل رات خواب میں دیکھا، خدا مجھے منع کر رہا ہے کہ میں تجھے کوئی دکھ نہ پہنچاؤں۔“

یعقوب نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور لیاہ اور راحل کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

لابن نے مزید کہا۔ ”اگر تو میرے گھر سے چلا آیا تو خیر کوئی بات نہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تو نے میرے بت کیوں چرائے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میرے چوری سے چلے آنے کا سبب یہ تھا کہ میں خوفزدہ تھا کہ کہیں آپ اپنی بیٹیوں کو مجھ سے چھین نہ لیں۔ رہا بتوں کے چرانے کا معاملہ، تو مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں۔ آپ تلاشی لے لیجیے، جس کے پاس سے آپ کے بت نکلیں گے اس کے لیے میری پیش گوئی یاد رکھیے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے۔“

لابن نے کہا۔ ”میں تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”شوق سے..... اور میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ میرے سامان میں سے جو چیز بھی آپ کی نکلے، آپ اسے اپنے قبضے میں کیجیے۔“

لابن دیر تک یعقوب کے سامان کی تلاشی لیتا رہا اور اس میں سے ایک بھی چیز ایسی نہ نکال سکا جسے وہ اپنی کہہ سکتا۔

یعقوب نے لابن کی خواہش کے مطابق قسم کھا کر عہد کیا۔
لابن نے مزید کہا۔ ”اور میں عہد کرتا ہوں کہ اس
ڈھیری کے دوسری طرف میں تجھے نقصان پہنچانے نہیں
آؤں گا۔“

یعقوب نے کہا۔ ”اور میں بھی آپ کو یہ یقین دلاتا
ہوں کہ اس حد کے اس پار بھی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں
آؤں گا۔“

اس عہد و پیمان کے بعد یعقوب نے سب کو کھانا
کھلایا۔ وہ رات ان سب نے پہاڑ پر ہی کاٹی۔ لابن
علی الصباح اٹھا اور اپنی بیٹیوں کو الوداعی بوسہ دیا اور دعائیں
دیتا ہوا ندان ارم واپس چلا گیا۔

☆☆☆

لابن کے چلے جانے کے بعد لیاہ اور راحیل بہت
اداس ہو گئیں۔ اس رات یعقوب نے ایک عجیب و غریب
خواب دیکھا۔ ایک نوری شعاع یعقوب کو مطلع کر رہی تھی۔
اس نے یعقوب سے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”یعقوب۔“
یعقوب کو مطلع کیا گیا۔ ”لیکن اب تو یعقوب نہیں
اب تو اسرائیل (خداوند ساتھ چلتا ہے یا خداوند قوت بخشتا
ہے) ہے۔ میں تجھے برومند کرتا ہوں، تجھ سے ایک قوم تو کیا
قوموں کے جتنے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تیرے صلب سے
ہوں گے۔“

جب یعقوب نے لیاہ اور راحیل کو اس بشارت سے
مطلع کیا تو لیاہ تو بہت خوش ہوئی لیکن راحیل اداس ہی رہی۔
یعقوب نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ”کیا
بات ہے راحیل! تو پریشان کیوں ہے اور تیرا منہ کیوں
بن رہا ہے؟“

راحیل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہتے ہوئے
پوچھا۔ ”دریائے فرات کتنی دور ہے؟ کیا یہ سراب جیسا منظر
دریائے فرات ہی کا ہے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ دریائے فرات
ہمارے سامنے ہی بہہ رہا ہے۔“

راحیل نے پوچھا۔ ”ہماری دایہ کدھر ہے؟ اسے بلاؤ۔“
یعقوب نے کہا۔ ”اب میں سمجھا۔“

اس کے بعد دایہ بلالی گئی۔ اس نے خوب اچھی طرح

دیکھ بھال کے بعد راحیل کو مطلع کیا۔ ”میری آقا زادی!
آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا آپ کو دوسرے پھل سے بھی
نوازا رہا ہے اور یہ پھل بھی لڑکا ہی ہے۔“

اس غریب الوطنی میں لیاہ اپنی بہن کو بہت چاہنے لگی
تھی، پوچھا۔ ”راحیل! اب تو کیسی ہے؟“

راحیل نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ جب میں
اس درد سے نجات پاؤں گی تو میں ہوش میں بھی ہوں گی یا
نہیں، اگر میں بے ہوش ہو جاؤں اور لڑکا پیدا ہو تو لیاہ! تم
اس کا نام بن دینی رکھنا۔“

لیاہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”بہت اچھا۔ ایسا
ہی ہوگا تو فکر نہ کر۔“

راحیل نے دھندلائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے
ہوئے پوچھا۔ ”میرا بیٹا یوسف کہاں ہے؟“

یعقوب نے یوسف کو راحیل کے رو برو کھڑا کر دیا۔
راحیل نے یوسف کو پے درپے کئی بوسے دیے، پھر پوچھا۔
”یہ کون سی جگہ ہے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اس جگہ سے قریب ہی
بیت لحم ہے، ویسے اس جگہ کا کوئی نام نہیں۔“

راحیل کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ دایہ نے بڑی
کوشش کی کہ راحیل اور اس کے نومولود کو بچالیا جائے
لیکن وہ راحیل کو بچانے میں ناکام اور نومولود کو بچانے
میں کامیاب ہو گئی۔

لیاہ نے اپنی بہن کا خوب خوب ماتم کیا۔ بلہاہ
زارو قطار روئی۔ یوسف کا دل پھٹنے لگا۔ یعقوب نے ماچشم غم
لوگوں کو صبر کی تلقین کی۔

یعقوب نے بیت لحم سے ذرا قاصطے پر راحیل کو زمین
کے حوالے کر کے، اس پر ایک ستون کھڑا کر دیا۔ دریائے
فرات ان کے سامنے بہہ رہا تھا اور انہیں یہیں سے کنعان کی
خوشبو محسوس ہو رہی تھی اور ان کے تصور کی آنکھیں ماضی کے
ماہ و سال کے ایک درختے سے کنوئیں پر عورتوں کے ہجوم میں
راحیل کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور کنعان کا غریب
الدیار روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑے بوسہ لے رہا تھا۔
وقت اور اتفاق کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ پہلی ملاقات پر
بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور دائمی رخصت نے بھی دونوں
آنکھوں کو تر کر دیا تھا۔

قرآن پاک۔ عہد نامہ قدیم و جدید۔ کتاب الہدیٰ، یعقوب حسن
النبیائے قرآن، محمد جمیل احمد۔ قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمن بیوہاردی۔

قیمت

کاشف زبیر

قدرت کا نظام ہے تو بڑا پیچیدہ مگر... منصفانہ اصولوں پر رائج ہے... کبھی ببول کے بیچ سے گلاب کا پودا نہیں پھوٹ سکتا۔ اپنی غرض میں اندھی ہو کر اس نے بھی جو کچھ حاصل کرنا چاہا اس کی وہی قیمت ادا کرنا تھی جس کا اس نے عہد کیا تھا... اب ادائیگی آسان ہو یا مشکل، کیے گئے عہد کا تو پاس بہر حال رکھنا تھا ورنہ اونچ نیچ کی صورت میں معافی کا کوئی امکان نہ تھا۔ منصفانہ اصول کے مطابق اس سے بھی وہی قیمت وصول کی گئی جس سے بچنے کی خاطر اس نے اپنی جان کی بھی پروا نہ کی مگر جان کی قیمت پھر بھی جان ہی رہی۔

سفاکانہ طرز عمل اختیار کرنے والی ایک خود غرض منصف نازک کا قصہ



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



عمیر دو مہینے بعد گھر آیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ عرصے بعد گھر آیا ہو۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی وہ ابھی چھ سال کا تھا۔ پہلی کلاس میں تھا اور نانی کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بڑے بہن بھائی دارالحکومت سے کچھ فاصلے پر واقع ہل اسٹیشن پر اپنے ہوٹل کے ساتھ بنے گھر میں رہتے تھے۔ عمیر کے نانا سول سرونٹ تھے اور صبا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ کیونکہ اس کا ایک بڑا بھائی عین نوجوانی میں بیس سال کی عمر میں اچانک ہی مر گیا تھا۔ صبا اس سے پانچ

سال چھوٹی اور اس وقت میٹرک میں تھی۔ اس نے گریجویشن کے بعد ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کیا اور اسی کورس کے دوران اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی۔ جلد یہ ملاقات پسند میں بدل گئی اور سمیر کے نانا، نانی نے اس رشتے کو پسند کر لیا کیونکہ سمیر اچھے خاندان کا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ وہ ایم بی اے کر چکا تھا اور اب ہوٹل لائن میں آنے کے لیے یہ کورس کر رہا تھا۔ شادی سے پہلے وہ جاب کرتا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اور صبا نے مل کر اپنا ہوٹل کھولنے کا ارادہ کیا۔ کچھ رقم ان کے پاس تھی۔ مل اسٹیشن پر ہوٹل قائم کیا۔ اس وقت صرف سمیر کا بڑا بھائی شامیر تھا۔

وہ شامیر کو نانا، نانی کے پاس چھوڑ گئے۔ شامیر کے دو سال بعد سونیا ہوئی۔ سمیر سونیا سے ڈھائی سال چھوٹا تھا۔ صبا کے تمام بچے بچپن میں نانا، نانی کے پاس ہی رہتے تھے۔ البتہ جب سمیر ان کے پاس آیا تو اس کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ ڈھائی سال کا تھا۔ ان کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بہت خوب صورت اور سجا ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف کیاریوں میں پھول دار پودے اور بیلین لگی ہوئی تھیں۔ مکان جس گلی میں تھا، اس کے ساتھ ہی جنگل شروع ہو جاتا تھا مگر یہ قدرتی جنگل نہیں تھا بلکہ دارالحکومت کے مختلف سیکٹرز کے ساتھ لگائے جانے والے جنگلوں میں سے ایک تھا۔ سمیر اکثر اپنے مکان کی چھت سے اس جنگل کو دیکھتا تھا مگر اسے کبھی جنگل میں جانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ نانی جنگل میں جانے کی سخت مخالف تھیں۔

اگرچہ نانی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اسے باہر بھی لے جاتیں۔ وہ نانی سے اس قدر قریب تھا جب والدین نے اسے لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا لہذا اسے یہیں ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اب صبا اور سمیر اسے اپنے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر وہ نانی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اس نے نانی سے کہا۔ ”میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں، مجھے یہیں اسکول میں پڑھنے دیں۔“

”نہیں میری جان۔“ نانی نے اسے پیار کیا۔ ”اب تمہیں جانا ہوگا۔“

”کیوں؟“ اس نے پاؤں پیچ کر پوچھا۔

”بس میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نانی فکر مند نظر آنے لگیں۔ انہوں نے جیسے خود سے کہا۔ ”ہاں، اب وقت قریب آ رہا ہے۔“

موسم سرما کا آغاز ہو گیا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے جھڑ رہے تھے۔ اچانک بادل گھر کر آئے اور تیز بارش شروع ہو

گئی۔ نانی شام سے بہت خوف زدہ اور پریشان تھیں۔ انہوں نے گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر لیے۔ سمیر ان سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ نانی کیا بات ہے مگر وہ جواب دینے کے بجائے اسے لے کر کمرے میں آ گئیں۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے کمرے میں کھایا۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش جاری تھی۔ کھانے کے بعد سمیر بستر پر لیٹ گیا۔ نانی اپنی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ رات کسی وقت سمیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نانی کرسی پر ساکت بیٹھی ہیں۔ وہ بستر سے اتر اور ان کے پاس آ کر انہیں ہلایا تو اچانک ہی ان کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور جسم یوں ہلنے لگا جیسے زلزلے کی زد میں آیا ہوا ہو۔ سمیر ڈر کر پیچھے ہٹا۔ اس نے کہا۔ ”نانو..... آپ کو کیا ہوا؟“

مگر جب نانی نے اس کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہو رہی تھیں۔ سمیر ڈر کر بھاگا اور لاؤنچ میں رکھا فون اٹھا کر صبا کو کال کی۔ اس کا نمبر اسپڈ ڈائل میں تھا اور اس نے خاص طور سے سمیر کو سکھایا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہ اسے کیسے کال کر سکتا ہے۔ صبا نے سوتے سے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ وہ فکر مند ہو گئی۔ ”کیا ہوا سمیر؟“

وہ روتے ہوئے اسے نانی کی طبیعت کی خرابی کا بتانے لگا۔ صبا نے اسی وقت اپنے کزن عبداللہ کو کال کی اور اسے گھر جانے کو کہا۔ عبداللہ، صبا کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ نزدیک ہی رہتا تھا اس لیے دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک سمیر ڈر کے مارے کمرے کی طرف نہیں گیا۔ کال بیل بجی تو اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ عبداللہ کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے اندر جا کر بے ہوش نانی کو چیک کیا اور انہیں اسپتال لے جانے کو کہا۔ صبح کے قریب جب اسپتال میں نانی کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے تو صبا اور سمیر بھی پہنچ گئے۔ نانی ہوش میں آ گئی تھیں مگر وہ یک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھیں۔ نہ تو کسی کی بات کا جواب دے رہی تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرا رد عمل ظاہر ہوتا تھا۔ وہ تین دن اسپتال میں رہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ کسی وجہ سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں اور ان کی کیفیت نوزائیدہ بچے جیسی تھی جس کی ساری دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ انہوں نے تجویز دی کہ انہیں کسی ایسے ادارے میں داخل کر دیا جائے جہاں ذہنی طور پر مفلوج افراد کی دیکھ بھال ہوتی ہو۔ صبا اور سمیر انہیں ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے اس لیے انہوں نے انہیں ایک

ادارے میں داخل کر دیا جو ایسے معمر افراد کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں تربیت یافتہ عملہ تھا جو ہر طرح سے دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ماحول اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ اس لیے صبا نے یہاں کی بھاری فیس بھی گوارا کر لی۔ ان دنوں وہ ہوٹل کے توسیعی منصوبے پر کام کر رہے تھے اور اس کی تکمیل تک سیزن میں صبا کا وہاں رہنا ضروری تھا۔ وہ بچت کر رہے تھے اور زیادہ ملازمتیں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد شامیر بھی بہت سے کاموں میں صبا کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

عمیر بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ صبا نے گھر بند کر دیا تھا۔ جب عمیر آخری بار سامان لینے آیا تو وہ رو رہا تھا۔ وہ بار بار ماں سے پوچھتا کہ نانو ٹھیک ہو جائیں گی۔ صبا سے تسلی دیتی کہ جلد نانو ٹھیک ہو جائیں گی اور وہ ان کے ساتھ رہ سکے گا مگر صبا حقیقت جانتی تھی کہ ایسا شاید بھی نہ ہو سکے کیونکہ ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت شاید ان کے مرتے دم تک جاری رہے۔ عمیر کا یہ سال ضائع جاتا مگر صبا نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے خود پڑھائے گی اور اگلے سال اسے دوسری جماعت میں جانے کے قابل کر دے گی۔ سرما میں جب شامیر اور سونیا کے اسکول تین مہینے کے لیے بند ہوتے اور ہوٹل کا بزنس بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتا تو صبا بچوں سمیت ماں کے پاس آ جاتی تھی۔ ان تین مہینوں میں گھر میں بہت رونق ہوتی تھی مگر اس بار جب وہ سردیوں میں گھر آئے تو سب کے ہوتے ہوئے بھی رونق نہیں تھی۔ صبا نے دو مہینے کے لیے ماں کو ادارے میں داخل کرایا تھا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ جب وہ اور بچے یہاں آئیں گے تو وہ ماں کو گھر لے آئے گی۔

ادارے کے عملے نے اسے تمام احتیاطی تدابیر اور دوائیں بتادی تھیں جو انہیں ہر روزانہ کی بنیاد پر یا دورہ پڑنے کی صورت میں دینا ہوتی تھیں صبا نے فرسٹ ایڈ کورس کیا ہوا تھا۔ نانی کو ہمپر باندھا جاتا تھا کیونکہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ یہ ظاہر ہوش میں ہونے کے باوجود وہ ساکت پڑی رہتی تھیں۔ صبا ایسبوسٹنس میں ماں کو گھر لے کر آئی۔ دو مہینے سے بند ہونے کی وجہ سے گھر گرد سے اٹا ہوا تھا۔ صبا، ماں پر بچوں کی ڈیوٹی لگا کر خود صفائی کرنے میں لگ گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کا کمر صاف کیا۔ انہیں ان کے صاف ستھرے بستر پر لٹا کر صبا گھر کے دوسرے حصوں کی صفائی میں لگ گئی۔ عمیر نانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ چہرہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا مگر اس

وقت وہ اسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ نانی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ عمیر نے نزدیک آ کر ان کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ اچانک نانی نے سر گھما کر اسے دیکھا اور پوچھیں۔

”عمیر تو یہاں کیوں آیا ہے، یہاں سے چلا جا..... وہ آنے والا ہے۔“

عمیر ایک لمحے کو ڈرا پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون نانو؟“

”عمیر۔“ باہر سے صبا کی آواز آئی تو نانی نے سر سیدھا کر لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے نہ تو اس کی طرف دیکھا ہو اور نہ ہی کوئی بات کی ہو۔ عمیر باہر آیا۔ وہ ماں کو بتانے کے لیے بے تاب تھا کہ نانی نے ابھی اس سے بات کی ہے مگر صبا مصروف تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم کھانا کھا لو، ابھی مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔“

”ماما نانو نے مجھ سے بات کی ہے۔“

شامیر ہنسا۔ ”تمہیں خواب آیا ہوگا۔“

”جاگتے میں۔“ سونیا نے بھائی کی تائید کی۔ وہ دونوں ساتھ رہتے تھے اس لیے ان میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور عمیر ان کے ساتھ اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ وہ اس سے الگ انداز میں پیش آتے تھے۔

”عمیر پلیز! کھانا کھا لو۔“ صبا نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے عمیر کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ عمیر نے دیکھا کہ ماں اس کی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہے تو وہ کھانے کی میز پر چلا آیا جہاں شامیر اور سونیا موجود تھے۔ صبا نے ان کے لیے سینڈوچز بنائے تھے۔ انہیں کھاتا چھوڑ کر صبا ماں کو کھانا کھلانے چلی گئی۔ عمیر نے بے دلی سے سینڈوچز کھائے اور پھر نانی کے کمرے میں آ گیا۔ صبا نے انہیں کھانا کھلا دیا تھا اور اب خود کھانے گئی تھی۔ عمیر کرسی گھسیٹ کر نانی کے پاس بیٹھ گیا۔ شامیر اور سونیا بھی وہیں تھے اور وہ برابر میں دراز پر رہی ان کی دوائیاں اٹھا کر چیک کر رہے تھے اور آپس میں مذاق کرنے کے انداز میں بات کر رہے تھے کیونکہ وہ عرصے سے نانی کے ساتھ نہیں رہے تھے اس لیے ان کے لیے وہ فکر اور محبت نہیں تھی جو عمیر میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ نانی سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تجسس تھا کہ نانی کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔ خدا خدا کر کے شامیر اور سونیا کمرے سے نکلے تو عمیر جلدی سے نانی کے پاس آیا۔

”نانو! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟“
مگر نانی ساکت رہیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر
مرکز تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں
دیا۔ عمیر نے پھر پوچھا اور اس بار بھی جواب نہیں ملا تو وہ
مابوس ہو کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد شامیر نے اندر
جھانکا۔ ”ہم باہر جا رہے ہیں، چلو گے؟“
عمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جا رہا، میں نانو
کے پاس ہوں۔“

”کیا فائدہ۔“ سونیا بھی آگئی۔ ”ان کو پتا تھوڑی ہے
کہ کوئی ان کے پاس ہے۔“

”ان کو پتا ہے۔“ عمیر نے یقین سے کہا۔ ”نانو نے
مجھ سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ہم یہاں کیوں
آئے ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے
والا ہے۔“

شامیر اندر آیا۔ ”تمہیں لگا ہوگا۔ نانو تو ہوش میں ہی
نہیں ہیں، وہ بات کیسے کر سکتی ہیں؟“
”یہ چھوڑ رہا ہے۔“ سونیا ہنسی۔
”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا نانو نے کہا تھا۔“ اسے غصہ

آ گیا۔

”اچھا، تم بیٹھو ہم جا رہے ہیں۔“
سونیا بولی۔ ”ہم جنگل میں بھی جائیں گے۔“
”نانو وہاں جانے سے منع کرتی ہیں۔“ عمیر نے
خبردار کیا۔ ”وہ کہتی ہیں، وہاں کوئی بری چیز ہے۔“
”تم کبھی گئے ہو؟“ سونیا نے پوچھا۔
”نہیں۔“

”تب تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“
”نانو نے کہا تھا..... اور نانو غلط نہیں کہتی ہیں۔“ عمیر
کی بات پر وہ دونوں ہنسے اور پھر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے
وہاں سے چلے گئے۔ عمیر نے پہلے سوچا کہ ماں سے کہے
لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ صبا مصروف تھی اور
ایسے میں اسے چھیڑا جاتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس لیے عمیر
مبرا کر رہ گیا۔

وہ بہت صبح سویرے ہل اسٹیشن سے روانہ ہوئے
تھے اور جلدی اٹھنے کی وجہ سے عمیر ٹھکن اور نیند محسوس کر رہا
تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ کچھ دیر بعد صبا کمرے
میں آئی تو اس نے عمیر کو سوتا پایا کر محبت سے اسے دیکھا۔ اس
نے جھک کر اسے چوما۔ ”نانو کا دیوانہ۔“

صبانے اسے گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے

آئی۔ یہ تین بیڈرومز کا گھر تھا۔ اس میں سے ایک مستقل صبا
کے لیے مخصوص تھا۔ وہ جب آتی تو یہیں رکتی تھی۔ تیسرا...
بیڈروم بچوں کے استعمال میں آتا تھا۔ تین بیڈرومز کے علاوہ
اس میں ایک بڑی سی نشست گاہ تھی اور لاؤنج بھی جس کے
ساتھ ہی کچن بھی تھا۔ شروع میں جب یہ گھر صبا کے والد کو
الاٹ ہوا تھا تو اس میں صرف تین کمرے تھے اور وہ بھی
پرانی طرز کے۔ پلاٹ سات مرلے کا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ
صحن پر مشتمل تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اسے بڑھاتے گئے اور امان
کی موت سے کچھ پہلے ہی یہ مکمل ہوا تھا۔ صبا اور اس سے
پہلے امان اسی گھر میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ صبا
کو امان کی موت کا دن یاد تھا جب ان کے گھر میں قیامت
برپا تھی۔ جوان اولاد کی موت ماں باپ کے لیے قیامت ہی
ہوتی ہے۔ صبا نے اس کے بعد اپنے باپ کو بہت ہی کم
مسکراتے دیکھا تھا اور ایک دن امان کے غم میں وہ گھلتے گھلتے
دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔

باپ کا خیال آیا تو صبا کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے
کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے شامیر اور سونیا
کا خیال آیا۔ وہ باہر گئے تھے اور سردی کے دن چھوٹے اور
جلد تار یک ہو جانے والے تھے۔ وہ گیٹ تک آئی اور باہر
جھانکا تو وہ اسے نظر نہیں آئے۔ وہ باہر جانے کا سوچ رہی تھی
کہ اندر سے آنکھیں ملتا ہوا عمیر آیا۔ صبا نے اس سے
پوچھا۔ ”شامیر اور سونیا کہاں گئے ہیں؟“
”ماما! وہ جنگل میں گئے ہیں۔“

صبا پریشان ہو گئی۔ اگرچہ یہ روایتی خطرناک جنگل
نہیں تھا مگر وہاں ویرانی تو تھی۔ عمیر کو گیٹ کے پاس رہنے کا
کہہ کر وہ باہر آئی اور جنگل کے کنارے سے ہی انہیں آواز
دی۔ ”شامیر..... سونیا! کہاں ہو تم؟“

دوسری بار آواز دینے پر وہ اندر سے برآمد ہوئے۔
دونوں بہت خوش اور شوخ ہو رہے تھے۔ صبا نے انہیں ڈانٹا
کہ وہ جنگل میں کیوں گئے تھے۔ وہ ماں کی ڈانٹ کو خاطر
میں لائے بغیر ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے اس کے ساتھ چلے
آئے۔ گھر آ کر صبا نے انہیں اور ڈانٹا تو عمیر نے کہا۔ ”ماما!
نانو جنگل میں جانے سے منع کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کبھی
جنگل میں جانے نہیں دیا۔“

”نانو کا چچہ۔“ سونیا نے آہستہ سے کہا مگر عمیر نے سن
لیا۔ اس نے ماں سے شکایت کی۔

”ماما! سونیا مجھے چچہ کہہ رہی ہے۔“
”سونیا! بری بات ہے۔ ایسا کسی کو نہیں کہتے اور یہ

ریفر۔ ٹمنٹ دستیاب ہوتی۔ توسیع کا کام اس سرمایہ مکمل ہو جاتا۔ اب ان کے پاس اتنی منجائش تھی کہ زیادہ اسٹاف رکھ سکتے تھے۔

اب تک صبا نے سمیر کا پورا ساتھ دیا تھا مگر بچے بڑے ہو رہے تھے اور ایل اسٹیشن کے آس پاس زیادہ اچھے اسکول نہیں تھے اس لیے اس نے سمیر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب دارالحکومت میں رہے گی اور بچوں کو یہیں اسکول میں داخل کرائے گی۔ ایل اسٹیشن ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اس لیے وہ ہر ہفتے ہی ایک دوسرے کے پاس آ جاسکتے تھے۔ وہ یہیں رہتی تو ماں کی دیکھ بھال بھی خود کر سکتی تھی۔ درحقیقت اس کی یہاں منتقلی کے فیصلے میں ماں کی بیماری کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر فی الحال انہوں نے بچوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اسے اس وقت تک کے لیے واپس جانا پڑتا جب تک بچوں کے پیپر نہیں ہو جاتے اور اس دوران میں وہ ماں کو دوبارہ دیکھ بھال کرنے والے ادارے میں چھوڑ کر جاتی۔ بچوں کے پیپر کے بعد وہ مستقل یہاں آ سکتی تھی۔

صبا اور کنگ دو مین تھی اور وہ سارے کام کر سکتی تھی۔ اس کے پاس چھوٹی کورے کار تھی اور وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ ہوٹل کے بہت سے کاموں کے ساتھ بچوں کو اسکول سے لانے لے جانے کا کام بھی وہی کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے رہ کر گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں پوری کرنا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے سمیر کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ سب کر لے گی اور وہ اپنی ساری توجہ ہوٹل پر لگائے۔ ڈنر تیار کر کے اس نے بچوں کو آواز دی تو وہ اوپر سے دوڑے آئے۔ سردی سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ شام ہوتے ہی درجہ حرارت بہت تیزی سے گرتا تھا۔ انہیں اندر لانے کے بعد صبا نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے تھے۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”تم اوپر گئے تھے اور وہ بھی اتنی سردی میں؟“

”ہاں ماما، شامیر ہمیں.....“ سونیا بتانے جا رہی تھی کہ شامیر نے اسے کپڑی ماری اور جلدی سے بولا۔

”ماما! میں انہیں انر پورٹ پر اترنے والے طیاروں کی روشنیاں دکھا رہا تھا۔“

”اب شام کے وقت باہر مت جانا۔ یہاں بھی بہت سردی ہوتی ہے۔“

”لیکن ماما وہاں جیسی تو نہیں ہوتی ہے اور اسنو بھی نہیں گرتی۔“ سونیا نے شکوہ کیا۔ شامیر نے اسے اصل بات

آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔“
”یہ میرا بھائی نہیں ہے۔“ سونیا نے چڑانے کے انداز میں کہا۔ ”میرا بھائی صرف شامیر بھائی ہے۔“
”سونیا.....“ صبا نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا تو سونیا جلدی سے کان پکڑ کر مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومانہ شرارت تھی کہ صبا بھی مسکرانے لگی۔ ”نالی گرل۔“
صبا نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ سمیر اپنے بہن بھائی سے دور ہے اور وہ بھی اسے زیادہ لفٹ نہیں کراتے ہیں۔ اس لیے اس نے سمیر سے کہا۔ ”اب آپ نانو کے پاس نہیں جائیں گے، سونیا اور شامیر کے ساتھ کھیلیں گے۔“
”ماما! اسے کھیلنا نہیں آتا ہے۔“

”مجھے لوڈو اور کیرم آتا ہے۔“ سمیر نے فخر سے کہا۔ ”میں نانو کے ساتھ کھیلتا تھا اور انہیں ہرا بھی دیتا تھا۔“
”وہ نانو ہیں۔“ شامیر نے اسے گھورا۔ ”مجھے ہرا کر دکھاؤ۔“
لاؤنج میں کیرم بورڈ موجود تھا۔ وہ بورڈ پر آگئے۔ شامیر بھی اچھا کھیلتا تھا مگر چھ سالہ سمیر زیادہ ماہر نکلا اور اس نے شامیر کو لگا تار دو گیم ہرا دیے۔ وہ حیران رہ گیا۔ شامیر جھنجھلا پاتا تھا مگر سونیا نے سمیر کی سائنڈ لی۔ ”یہ تم سے اچھا کھیلتا ہے اس لیے جیت گیا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“
”میں رو نہیں رہا ہوں۔“ شامیر غصے سے بولا۔

”تو اور کیسے روتے ہیں۔“ سونیا ہنسی اور پھر شامیر سے بچنے کے لیے ماں کے پاس بھاگی۔ شامیر اٹھا تھا مگر پھر بیٹھ گیا اور اس نے سمیر سے کہا۔
”تم کھیلنا جانتے ہو۔“

”میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔“ سمیر نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بتاؤ تم لوگوں نے جنگل میں کچھ دیکھا؟“
شامیر نے ماں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”بتاتا ہوں لیکن یہاں نہیں۔“

صبا کچن میں ڈنر تیار کر رہی تھی۔ وہ تھک گئی تھی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ اپنے بچوں کو دوسرے وقت بھی سینڈ وچز کھلائے۔ وہ افتخانی پلاؤ بنا رہی تھی۔ ہوٹل میں یہ ڈش اور چند اور ڈشیں وہ خود تیار کرتی تھی۔ اب تک بیشتر کام وہ اور سمیر کرتے رہے تھے۔ سیزن کے پیک دنوں میں صبا نے لائڈری تک کی ہوئی تھی۔ اس محنت اور بچت کا صلہ انہیں یہ ملتا کہ ان کا بارہ کمروں والا ہوٹل توسیع کے بعد بتیس کمروں کا ہو جاتا اور انہوں نے ڈائمنگ والا حصہ بھی بڑھا کر اسے باقاعدہ ریسٹوران کی صورت دے دی تھی۔ اب وہاں تینوں وقت کا کھانا اور صبح چھ سے رات بارہ بجے تک

بتانے سے روک دیا تھا۔ جب وہ جنگل میں گئے تھے تو وہاں انہوں نے ایک بہت پرانی اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی دیکھی تھی۔ اس میں بہت بوٹھی اور وہاں دیواروں پر عجیب عجیب سی چیزیں لگی ہوئی تھیں جیسے کپڑے کی بنی گڑیاں اور مٹی کے بنے ہوئے پتکے، ہڈیاں اور پرندوں کے پر۔ وہاں ایک ڈھانچا ہو جانے والا سانپ بھی تھا۔ شامیر نے عمیر کو سب بتایا وہ بھی تجسس تھا۔ شامیر نے اس سے اگلے دن وہاں چلنے کو کہا مگر عمیر راضی نہیں تھا۔ اسے اب بھی خیال تھا کہ تانی نے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔ سو نیا اور شامیر نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ ماما کو یہ بات نہیں بتانی ہے ورنہ ان کے باہر جانے پر بھی پابندی لگ سکتی تھی۔ عمیر نے ان سے کہا۔ ”نانو ٹھیک کہتی تھیں کہ جنگل میں کوئی بری چیز ہے۔“

”پاگل، وہ صرف ایک جھونپڑی ہے۔“ شامیر نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

”وہاں کوئی نہیں تھا نہ اچھی چیز اور نہ بری چیز۔“ سو نیا نے یقین سے کہا۔ ”مجھے بہت مزہ آیا، میں پھر جاؤں گی۔“

ڈنر کی میز پر وہ خاموش رہے۔ کھانے کے بعد صبا نے برتن سمیٹتے ہوئے ان سے کہا۔ ”آپ سونے کی تیاری کریں۔“

”ماما! ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔“ شامیر نے احتجاج کیا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمیں امان ماموں کی تصویریں دکھائیں گی۔“

”اوکے آپ سب چینیج کر کے برش کرو اور بستر پر لیٹو میں البم لے کر آتی ہوں۔“

وہ خوش ہو گئے اور کمرے کی طرف بھاگے۔ صبا نے ان کی الماری سیٹ کر دی تھی جس میں ان سب کے ٹائٹ سوٹ لٹکے ہوئے تھے، انہوں نے کپڑے نکالے اور باری باری ہاتھ روم جا کر تبدیل کیے۔ برش کیا اور پھر بستر پر لیٹ کر ماں کا انتظار کرنے لگے۔ شامیر اور سو نیا پر جوش ہو رہا تھا۔ البتہ عمیر سکون سے لیٹا ہوا تھا کیونکہ اس نے یہ البم بہت بار دیکھے ہوئے تھے۔ شامیر اور سو نیا چونکہ کم آتے تھے اور انہیں ایک دو بار ہی ان البمز کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اپنے لیے چائے کا گگ اور تین بڑے البمز لے کر آگیا اور وہ تینوں ماں کے گرد جمع ہو گئے۔ صبا نے خبردار کیا۔ ”سکون سے دیکھنا میری چائے نہ گر جائے۔“

صبا نے پہلے البم سے شروع کیا جب صرف امان تھا اور نانا تانی اس وقت جوان تھے۔ پہلے البم میں ان کی شادی

کی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں میں صرف وہی دونوں تھے۔ اچانک عمیر نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ماما! نانو اور نانا کے پیچھے یہ کیا ہے؟“

صبا تیزی میں صحنے پلٹ رہی تھی اور پھر اس نے یہ تصویریں نئی بار کی دیکھی ہوئی تھیں اس لیے اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے رک کر دیکھا، یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب امان پیدا ہونے والا تھا۔ تصویر میں تانی کے دائیں طرف ایک دھندلا سیاہی مائل ہیولا تھا اور یوں لگ رہا تھا کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہو۔ ظاہر ہے وہاں کوئی نہیں تھا اور یہ تصویر کی ڈیولپنگ میں آنے والی خرابی تھی یا شاید اتنے عرصے میں کاغذ خراب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی چالیس سال پرانی تصویر تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”کوئی نہیں کھڑا ہے بیٹا، تصویر میں دھبہ آ گیا ہے۔“

”ماما! یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“ عمیر نے یقین سے کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا۔ یہ ابھی آیا ہے۔“

صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو..... کون ابھی آیا ہے؟“

”یہ آدمی جو نانو کے پیچھے کھڑا ہے۔ یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“

شامیر اور سو نیا ہنسنے لگے۔ صبا نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ ہیولا سچ سچ انسانی لگ رہا ہے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ یقیناً تصویر کی خرابی تھی۔ اس نے نرمی سے عمیر کو سمجھایا۔ ”تصویر بہت پرانی ہے اور اس میں دھبہ آ گیا ہے اب یہ اتفاق سے آدمی جیسا لگ رہا ہے۔“

عمیر ماں کی بات سے متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے تصویریں دیکھنے لگا۔ پھر امان کی تصویریں شروع ہوئیں۔ کچھ تصویروں میں وہ بچہ تھا۔ جیسے جیسے البم آگے بڑھ رہا تھا، وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آخری تصویر اس کے انتقال سے دو دن پہلے کی تھی۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتا اور اس نے دو دن پہلے ہی ایک اسٹوڈیو میں خاص طور سے تیار ہو کر پاسپورٹ سائز تصویر بنوائی تھی۔ بعد میں ان لوگوں نے اس تصویر کو اٹلارج کرا کے اس البم میں شامل کر لیا تھا۔ جیسے ہی تصویر سامنے آئی تو اس بار صبا بھی چونک گئی۔ امان کے عقب میں بھی وہی ہیولا نما دھبہ تھا اور یہ بھی سیاہی مائل تھا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ ”ماما! دیکھیں ماموں کے پیچھے بھی وہی آدمی ہے۔“

”یہ آدمی نہیں ہے۔“ اس بار صبا کا لہجہ تیز تھا۔ ”تمہیں بتایا ہے کہ تصویر پر اس طرح کا اسپاٹ آ جاتا ہے۔“

”لیکن ماما! یہ بالکل ویسا ہی ہے۔“ عمیر نے اصرار کیا تو صبا نے البم بند کر دیا۔ وہ جھنجلا رہی تھی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شامیر اور سونیا نے عمیر کو تھکورا۔ سونیا بولی۔

”تم منہ بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے؟“

”اب کوئی نہیں بولے گا۔“ صبا نے دوبارہ البم کھولتے ہوئے کہا۔ وہ تصویریں دکھانے لگی اور اس بار سب خاموش تھے۔ صبا انہیں تصویریں دکھاتی رہی اور ان کے بارے میں بتاتی رہی۔ عمیر اب یور ہو رہا تھا، وہ ذرا سرک کر لیٹا اور کسی وقت سو گیا۔ جب صبا نے آخری البم بند کیا تو وہ گہری نیند میں تھا۔ سونیا کو اپنے بستر پر بھیج کر صبا نے عمیر کو سیدھا کیا اور پھر اسے پیار کیا۔ اسے غدا مت ہو رہی تھی کہ اس نے عمیر پر غصہ کیا۔ شامیر شرارت سے بولا۔

”کیا بات ہے ماما، آپ کو اس پر زیادہ ہی پیار آرہا ہے۔“

”کیونکہ یہ میرا بیٹا ہے اور مجھ سے اتنے عرصے دور رہا ہے۔“ صبا نے عمیر کو دوبارہ چوما۔ ”اب میں اسے خود سے دور نہیں کروں گی۔“

صبا باہر آئی اور اس نے ماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ خاصی دیر سے ایک کروٹ پر تھیں، اس نے انہیں دوسری کروٹ پر کیا۔ موسم سرد تھا اور امکان نہیں تھا کہ انہیں پسینا آئے گا، اس کے باوجود انہیں ہر چند گھنٹے بعد کروٹ دلائی جاتی تھی۔ صبح عمیر کی آنکھ کھلی تو سب سو رہے تھے۔ وہ جلد اٹھ جانے کا عادی تھا اور سات بجے تک بستر سے نکل آتا تھا۔ اس نے ماں کے کمرے میں دیکھا صبا سو رہی تھی۔ پھر وہ نانی کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگ گئی تھیں اور چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ عمیر بستر پر چڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور انہیں کل کی روداد سناتے لگا۔ اس نے شامیر اور سونیا کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ جنگل میں گئے تھے۔ حالانکہ اس نے انہیں منع کیا تھا۔ پھر اس نے تصویروں کے بارے میں بتایا اور جب اس نے تصویروں میں نظر آنے والے ہیولوں کا ذکر کیا تو اچانک نانی نے سرگھما کر اس کی طرف دیکھا اور سرگوشی نما لہجے میں بولیں۔

”وہ آگیا ہے، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے رکیں اور پھر کھر کھرائی آواز میں کہا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔“

”نانو! آپ بول رہی ہیں۔“ عمیر خوش ہو گیا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ نانی نے کیا کہا ہے اور اس کا کیا

مطلب ہے۔ ”آپ نے کل بھی مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ماما کو بتایا مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ نانو! آپ کیوں بات نہیں کرتیں؟“

”میں بات نہیں کر سکتی۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔ ”میری زبان بند کر دی گئی ہے۔ عمیر میرے بچے، یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کیوں نانو؟“

”وہ پھر آرہا ہے جان لینے کو۔“ نانی کو کہتے ہوئے جھٹکا لگا اور وہ سراو پر کر کے چھت کو گھورنے لگیں۔ عمیر انہیں ہلانے لگا۔

”نانو! مجھ سے بات کریں۔ مجھے بتائیں کون آرہا ہے؟“

اسی لمحے صبا نے کمرے میں جھانکا اور تیزی سے اندر آئی اس نے عمیر کو روکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”ماما! نانو بات کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کوئی آرہا ہے اور ہم یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔“

صبا نے ماں کو دیکھا مگر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”بیٹا نانو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ ابھی بات نہیں کر سکتیں۔“

”مجھ سے بات کی ہے اور نانو ہمیں جانے کو کہہ رہی تھیں۔“ عمیر نے یقین دلانے کی کوشش کی مگر صبا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ واش روم میں لے آئی۔ اپنے سامنے۔۔۔ منہ ہاتھ دھلویا اور برش کر کے باہر جانے کو کہا مگر نانی کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر میں گھس گیا۔ وہ کڑھ رہا تھا کہ ماما اس کی بات کیوں نہیں مان رہی ہیں۔ دو بار نانو نے اس سے بات کی اور دونوں بار ماما نے اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ نانو نے دونوں بار انہیں یہاں سے جانے کو کیوں کہا؟ کیا انہیں ان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ عمیر کا ننھا سا ذہن اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ کچھ انوکھی بات ہے جو صرف نانو جانتی ہیں اور دوسرا کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔ وہ اس وقت تک لیٹا ہوا سوچتا رہا جب تک صبا نے کمرے میں جھانک کر سب سے اٹھنے اور ناشتے کے لیے تیار ہونے کو نہیں کہا۔ وہ اس دوران میں ماں کو صاف کر کے اور ان کو ناشتا کرا کے آچکی تھی۔

سونیا اور شامیر بھی اٹھ گئے اور کچھ دیر بعد سب

ناشتے کی میز پر تھے۔ صبا نے ان کے سامنے ابلے ہوئے انڈے، جام اور جیلی لگے تو اس اور دودھ کے گلاس رکھے تھے۔ آج اسے سامان بھی لانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی کر رہی تھی۔ اس نے خود برائے نام ناشتا کیا۔ جیسے ہی بچے ناشتے سے فارغ ہوئے، صبا نے اپنی چادر اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس نے جانے سے پہلے ان تینوں سے کہا کہ وہ نہ باہر جائیں گے اور نہ ہی چھت پر جائیں گے اور نانی کا خیال رکھیں گے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوری اس کے موبائل پر کال کریں گے۔ جیسے ہی صبا کی گاڑی باہر نکلی۔۔۔ شامیر نے گیٹ بند کیا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”جنگل چلو گے؟“

عمیر نے انکار کیا۔ ”نہیں، گھر میں نانو کے پاس کوئی نہیں ہوگا۔“

بستر کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔

”نانو! گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ماما شاپنگ پر گئی ہیں شامیر اور سونیا جنگل میں گئے ہیں۔ وہاں بری چیز ہے نا؟“

نانو پلیز مجھ سے بات کریں۔“

نانی ساکت رہیں۔ عمیر نے دوبارہ کہا اور جواب نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر باہر جانے لگا۔ اچانک عقب سے ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو نانی بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کا چہرہ عمیر کی طرف تھا۔ ان کی آنکھیں بالکل اسی طرح سیاہ ہو رہی تھیں جیسے دورہ پڑنے والی رات ہو گئی تھیں۔ وہ بولیں تو ان کی آواز پھٹی ہوئی اور کرخت تھی۔ ”میں آ گیا ہوں۔“

”یہ ڈرپوک ہے۔“ سونیا نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ ”نانو نے اسے ڈرایا ہے کہ وہاں بری چیز ہے اس لیے یہ ڈر کر نہیں جا رہا۔“

”میں ڈرتا نہیں ہوں۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”مجھے نانو کا خیال ہے۔“

”ہم جا رہے ہیں۔“ شامیر نے کہا۔ ”لیکن تم مانا کو کچھ۔۔۔ نہیں بتاؤ گے۔“

عمیر جانتا تھا کہ جھوٹ بولنا اتنی ہی بری بات ہے جتنی کہ ماں باپ کا حکم نہ ماننا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”اگر مانا نے پوچھ لیا تو؟“

”تب بھی تم نہیں کہو گے ورنہ ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے۔“ شامیر نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ وہ اور سونیا گیٹ کے چھوٹے دروازے سے باہر نکل گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ماں سودا لینے گئی ہے اور اسے آنے میں دیر لگے گی۔ عمیر دروازہ بند کر کے اندر آیا اور نانی کے کمرے میں جھانکا تو وہ ساکت لیٹی تھیں۔ عمیر صبا کے کمرے میں آیا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی چٹنی دراز کھول کر اس میں رکھے البم باہر نکالے اور وہ البم کھولا جس میں بیوے والی تصویریں تھیں۔ البم بھاری تھا اور اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا اس لیے اس نے نیچے قالین پر رکھ کر اسے کھولا اور صفحے پلٹتا ہوا نانی اور نانا کی اس تصویر تک آیا۔ تصویر والا صفحہ کھول کر وہ چند لمحے کے لیے اسے گھورتا رہ گیا۔ تصویر میں نظر آنے والا بیولا اب غائب تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے امان ماموں کی تصویر نکالی مگر اس میں بھی بیولا نہیں تھا۔ کاغذ بالکل صاف اور پہلے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے البم واپس دراز میں رکھے اور دروازہ بند کر کے نانی کے کمرے میں آیا۔ اس نے

عمیر بے ساختہ باہر کی طرف بھاگا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور دل بہت رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ نانو بستر سے اٹھ کر اس کے پیچھے نہ آجائیں۔ اسی لیے وہ بہت تیزی سے بھاگا۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر وہ خوفزدہ نظروں سے مکان کے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی طرف تھی اس لیے وہ شامیر اور سونیا کو آتے نہیں دیکھ سکا۔ شامیر دبے قدموں اس کے پاس آیا اور عمیر کے کان میں زور سے بولا۔ ”ہاؤ۔“

عمیر کی چیخ نکل گئی۔ اس موسم میں بھی اسے پسینا آیا ہوا تھا اور رنگت سفید ہو رہی تھی۔ اس کی صورت اور حالت دیکھ کر شامیر اور سونیا کو احساس ہوا کہ انہوں نے اسے زیادہ ہی ڈرا دیا ہے اور اس ڈر سے وہ اس سے سوری کرنے لگے کہ کہیں وہ مانا کو ان کے جنگل میں جانے کا نہ بتا دے۔ عمیر ان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اندر آئے اور لاؤنج میں چلے گئے مگر عمیر صحن میں ہی رہا۔ اسے اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ نانو کی آواز کیسے بدل گئی۔ وہ نانو نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ ان سے محبت کرتا تھا اور اسے کبھی ان سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا مگر آج وہ ایسا ڈرا تھا کہ اب تک خود پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ شامیر اور سونیا کے ہوتے ہوئے بھی اسے اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شامیر اندر سے فٹ بال لے آیا اور اسے بھی دعوت دی مگر عمیر کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”تم اسی جگہ گئے تھے؟“

”ہاں، آج ہم وہاں سے ایک چیز بھی لائے ہیں۔“ شامیر نے کہا اور نزدیک آتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی اور عمیر کے سامنے کی۔

اس کی ہنسی پر ایک چھوٹا سا پتلا رکھا ہوا تھا اور اس پتلے کے پیٹ میں ایک چھوٹی سی سوئی بیوست تھی۔ پتلا شاید آنے سے بنا تھا اور بہت پرانا تھا کیونکہ سوئی بری طرح زنگ آلود ہو رہی تھی اور اس کا پچھلا حصہ ٹوٹ بھی گیا اب معمولی سا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ پتلا بہت گندا ہو رہا تھا اور شامیر اسے کوشش کے باوجود صاف نہیں کر سکا۔ عمیر کو نہ جانے کیوں اس سے خوف محسوس ہوا۔ شامیر نے اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ شامیر نے ہاتھ واپس کر لیا۔ ”کیا ہے؟ میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔“

”گندہ ہے اسے پھینک دو۔“

”پاگل، یہ ایک یونیک چیز ہے۔ میں واپس جا کر اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا۔“

شامیر نے پتلا واپس جیب میں رکھ لیا اور اکیلے ہی فٹ بال کھیلنے لگا۔ عمیر کو پیاس لگ رہی تھی اور پانی اندر کچن میں تھا۔ وہ ہمت کر کے اندر آیا۔ سونیا فی وی آن کر کے کارٹون نیٹ ورک دیکھ رہی تھی۔ عمیر نے کولر سے پانی پیا اور اس کے پاس آیا۔ اس نے سونیا سے پوچھا۔ ”تم بھی کچھ لائی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہاں سب گندا تھا۔ میں نے شامیر بھائی کو منع کیا تھا مگر انہوں نے اٹھا لیا۔“

”میں نے ان سے کہا وہ پھینک دیں مگر وہ نہیں مان رہے۔“

”وہ مجھے ملا تھا۔“ سونیا نے انکشاف کیا۔ ”میں نے اس کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کی تو وہ ٹوٹ گئی۔ مجھے چبھی تھی، تھوڑا سا خون بھی نکلا تھا۔“ سونیا نے اپنی انگلی آگے کی جس پر ہلکا سا سرخ نشان تھا۔ ”پھر شامیر بھائی نے مجھ سے لے لیا۔“

عمیر کو کارٹون اچھے لگتے تھے۔ وہ سونیا کے ساتھ کارٹون دیکھنے میں لگ گیا۔ اچانک سونیا صوفے سے اچھلی اور اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ عمیر نے اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”میرے..... پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولی۔

”تمہارا پیٹ خراب ہے۔“

”میرا پیٹ ٹھیک ہے۔ عجیب سا درد ہے۔“ سونیا نے کہا اور جا کر پانی پیا تو اسے سکون آیا۔ وہ پھر سے کارٹون دیکھنے میں لگن ہوئی اور کچھ دیر میں بھول گئی کہ اس کے پیٹ میں تکلیف ہوئی تھی۔ صبا دوپہر تک واپس آئی۔ بارن کی

آواز سن کر وہ دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ شامیر نے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر آ کر کی تو وہ تینوں ماں کے ساتھ ٹل کر سامان اٹھانے لگے۔ صبا جھکی ہوئی مگر خوش تھی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی شاپنگ کرنا اچھا لگتا تھا اور خاص طور پر اپنے گھر اور بچوں کے لیے۔ وہ بھی سامان اندر لا رہی تھی اور ساتھ ہی ان سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کیا کرتے رہے؟ شامیر اور سونیا نے ماں سے کہا کہ وہ گھر میں رہے اور کھلتے رہے۔ جب صبا نے عمیر سے پوچھا تو ان دونوں نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھا جیسے خبردار کر رہے ہوں کہ ماں سے مت کہنا۔ سونیا ایک شاپر لے کر اندر جا رہی تھی اور شامیر تھک کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اچانک سونیا نے چیخ ماری اور اس کے ہاتھ سے شاپر چھوٹ گیا۔ ساری چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔ صبا اس کی طرف لپکی۔

”کیا ہوا میری جان؟“

”ماما! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

”کیسا درد اور کہاں ہو رہا ہے؟“

”یہاں۔“ سونیا نے ناف کی جگہ ہاتھ رکھا۔ شامیر اور عمیر بھی اس کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے عمیر نے ماں کو بتایا۔

”اسے کارٹون دیکھتے ہوئے بھی درد ہوا تھا۔“

”لگتا ہے تم نے کچھ الٹا سیدھا کھایا ہے۔ آؤ میں تمہیں دوا دوں۔“ صبا اسے اندر لے گئی اور ان سے سامان کچن میں رکھنے کو کہا۔ شامیر فکر مند تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔

”اب یہ ماما کو سب بتا دے گی۔“

”ماما سے چھپانا اچھی بات نہیں ہے۔“ عمیر نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے نانی کو کس حال میں دیکھا تھا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ماما کو بتائے یا نہیں۔ اس نے نانی کے حوالے سے انہیں پہلے بھی جو بتایا تھا، انہوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ شامیر سامان کچن میں ترتیب سے رکھ رہا تھا تو عمیر نانی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔ نانی حسب معمول بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں لیکن اب آنکھیں نارمل تھیں۔ عمیر بستر کے پاس آیا اور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جھک کر نانی سے کہا۔ ”پلیز مجھ سے بات کریں، مجھے بہت ڈر لگا تھا۔ آپ کی آنکھیں کالی ہو گئی تھیں۔ نانو! آپ کی آواز بھی بدل گئی تھی۔“

نانی کے سپاٹ چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار

”پتا نہیں، نانوں نے مجھ سے بات کی تھی۔“

”احق، وہ ہوش میں نہیں ہیں۔“

”وہ ہوش میں ہیں۔“ عمیر نے دھیمی آواز میں کہا

پھر اس نے شامیر کو بتایا کہ نانوں نے بہت کوشش کے بعد اسے کیا کہا تھا۔

”سرخ سوٹ کیس۔“ شامیر نے پُرخیال انداز میں

کہا۔ وہ جس اسکول میں پڑھتا تھا، وہاں معیارِ تعلیم زیادہ اچھا نہیں تھا مگر شامیر ماں باپ کے ساتھ ہوٹل میں ہوتا تھا اور کم عمری میں اس نے بھانت بھانت کے لوگ اور ان کے رویے دیکھ لیے تھے اس لیے ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے زیادہ عقل مند ہو گیا تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”اگر یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس ہوا تو تمہاری بات سچ ہوگی ورنہ تم لمبی لمبی چھوڑ رہے ہو۔“

نیچے کا پورا پورشن عمیر کا دیکھا بھالا تھا اور اسے ایک ایک چیز کا علم تھا۔ اس نے بھی یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ادپری منزل پر ایک کمرہ تھا اور اس کے دروازے پر ہمیشہ تالا لگا رہتا تھا۔ عمیر بھی اس کمرے میں نہیں گیا تھا۔ نانی نے ہمیشہ اسے یہی بتایا کہ اس کمرے میں کاٹھ کباڑ ڈالا جاتا ہے مگر عمیر نے بھی اس میں کاٹھ کباڑ ڈالتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شامیر کو اس کمرے کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ ”اگر سوٹ کیس ہے تو وہیں ہوگا۔“

”مگر اس پر تالا لگا ہوا ہے۔“

”احق، گھر کی چابیوں میں اس کی جابی بھی ہوگی۔“ شامیر نے کہا۔ ”جب ماما لٹچ کے بعد ہمیں کمروں میں بھیج دیں گی، تب ہم چپکے سے اوپر جائیں گے۔“

عمیر ڈر گیا۔ ”اگر ماما کو پتا چل گیا تو؟“

”تو کچھ نہیں۔“ شامیر کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ ”ماما بس ڈانٹتی ہیں، مارتی نہیں ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ عمیر نے کہا۔ ”پر ڈانٹ سنا بھی تو اچھا نہیں ہے۔“

”ماما کو پتا نہیں چلے گا۔“ شامیر نے یقین سے کہا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے لٹچ کیا اور صبا نے انہیں اپنے کمرے میں جانے کو کہا۔ سونیا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ نانی کو دن میں دو بار کھانا دیا جاتا تھا کیونکہ وہ بستر پر لیٹی رہتی تھیں اور ان کا نظام ہضم زیادہ خوراک برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے ڈاکٹرز نے ان کی خوراک دن میں دو بار کر دی تھی۔ انہیں ایک انجکشن صبح شام دیا جاتا تھا اور دورہ پڑنے کی صورت میں انہیں ایک اور دوا کا انجکشن دیا جاتا تھا۔

ہوئے جیسے وہ بولنا چاہ رہی ہوں مگر بول نہیں پا رہی تھیں۔ کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد وہ تھک گئیں اور تیز تیز سانس لینے لگیں۔ اس دوران میں عمیر مسلسل انہیں بولنے پر اکسارہا تھا۔ انہوں نے کسی قدر سرگھما کر عمیر کی طرف دیکھا اور زیر لب کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگیں۔ عمیر نے کان قریب لے جا کر سننے کی کوشش کی۔ ان کی آواز بہت مدھم مدھم تھی۔ وہ بہ مشکل اتنا سن سکا۔ ”سرخ سوٹ کیس۔“

”سرخ سوٹ کیس؟“ اس نے تصدیق کے لیے پوچھا مگر اس دوران میں نانی کا سر دوبارہ اوپر کی طرف ہو گیا تھا اور چہرہ سپاٹ ہو چکا تھا۔ عمیر نے انہیں ہلایا۔ کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ عمیر نے مایوسی سے انہیں دیکھا۔ ”نانو! آپ کو کیا ہوا ہے، پلیز جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور میرے ساتھ رہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز نانو پلیز۔“ عمیر رونے لگا۔ اسی وقت صبا ماں کے کمرے کی طرف آرہی تھی اور کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے عمیر کو اس طرح روتے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا اس نے عمیر کو بازوؤں میں لے لیا۔

”میری جان! نانو ٹھیک ہو جائیں گی۔ اب ہم یہاں آگئے ہیں۔ ہم سب مل کر ان کی دیکھ بھال کریں گے تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”ماما! نانو ٹھیک ہیں، ان کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔“ عمیر نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”نانو نے ابھی مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔“

صبا نے اسے پیچھے کیا اور غور سے اسے دیکھا۔ ”عمیر کیا کہہ رہے ہو؟ نانو ہوش میں نہیں ہیں۔“

”ماما! وہ میری بات سنتی ہیں اور کبھی کبھی جواب بھی دیتی ہیں۔“ عمیر نے زور دے کر کہا۔ ”ابھی انہوں نے مجھے سرخ سوٹ کیس کہا ہے۔“

صبا چونکی۔ ”سرخ سوٹ کیس؟“

”ہاں ماما! نانو نے بہت کوشش کے بعد بتایا ہے۔“

صبا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے عمیر کو گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر لے آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ سونیا اب ٹھیک تھی اور لاونچ میں اپنی گڑیوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ صبا نے عمیر کو بھی صوفے پر بٹھا دیا۔

”اب تم سب یہیں رہو گے جب تک میں لٹچ نہیں بنا لیتی۔ کوئی باہر یا چھت پر نہیں جائے گا۔“

شامیر نے آہستہ سے عمیر سے پوچھا۔ ”ماما نے نانو کے کمرے کا دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

ادارے والوں کا کہنا تھا کہ انہیں ہفتے میں ایک بار دورہ پڑتا تھا۔ صبا نے دونوں دوائیں کمرے میں رکھی تھیں تاکہ دورہ پڑنے کی صورت میں فوری دی جاسکیں۔ جب صبا سونیا کو لے کر اپنے کمرے میں گئی تو شامیر اور عمیر دبے قدموں کمرے سے باہر آئے۔ انہوں نے لاؤنج میں لٹکے کی ہولڈر سے چابیوں کا گچھا اتارا اور اسی طرح دبے قدموں سیزھیوں سے اوپر آئے۔ شامیر نے عمیر سے کہا۔

”چھت پر زور سے مت چلنا، ماما کو پتا چل جائے گا۔“ شامیر کی ہدایت کے مطابق وہ دبے قدموں سیزھیوں سے مخالف آخری حصے میں واقع کمرے تک آئے۔ یہ خاصا پرانا سا کمرہ تھا اور کیونکہ اسے اسٹور کے طور پر بنایا گیا تھا اس لیے اس کا دروازہ لوہے کا تھا۔ اس پر ایک پرانا زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ شامیر چابیوں میں سے اس کی چابی تلاش کرنے لگا اور پھر اس نے ایک چابی لگائی۔ یہ واحد چابی تھی جو تالے میں فٹ آئی مگر تالانہ جانے کب سے بند تھا۔ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ شامیر نے عمیر کو گچھا دیا۔ ”تم رکو، میں نیچے سے آئل لاتا ہوں۔ اس میں آئل ڈالیں گے تو یہ کھل جائے گا۔“

شامیر نیچے سے جا کر مشین آئل کی کچی لے آیا اور اس نے چند قطرے تالے کے سوراخ میں ڈالے پھر چابی لگا کر اسے بار بار گھمانے لگا۔ اس کی ترکیب نے کام کیا اور تالا کھل گیا۔ وہ دونوں خوش ہو گئے لیکن جب زنگ آلود دروازہ کھلا اور اندر تاریکی نظر آئی تو عمیر سہم گیا۔ اسے لگا کہ اندر تاریکی میں کوئی ہے مگر شامیر نے بے فکری سے پورا دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ باہر تیز دھوپ سے اندر سائے میں آئے تو چند لمحے کے لیے انہیں کچھ نظر نہیں آیا اور پھر عمیر کی نظر ایک کونے میں کھڑے آدمی پر گئی تو اس نے چیخ مار کر شامیر کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ آدمی.....“ عمیر نے اشارہ کیا۔ شامیر نے دیکھا مگر ڈرا نہیں۔ وہ آگے بڑھا اور ہنس کر بولا۔ ”احتمالاً نانا جان کا اوور کوٹ ہے۔“ اب عمیر کو بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”ہاں یہ تو نانا ابو کا اوور کوٹ ہے۔“

شامیر اب وہاں دوسرا سامان دیکھ رہا تھا اور چیزیں ادھر ادھر کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سرخ سوٹ کیس کے بجائے دوسری چیزوں پر زیادہ تھی۔ سرخ سوٹ کیس وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت کم روشنی اندر آرہی تھی۔ عمیر سوٹ کیس

دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف چند پرانے سوٹ کیس رکھے تھے مگر ان میں کوئی سرخ رنگ کا نہیں تھا اور دوسرے یہ سب کھلے ہوئے اور خالی تھے۔ شامیر نے کہا۔ ”دیکھ لو یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں ہے۔“

”نانو نے کہا تھا..... پھر پتا نہیں وہ کہاں ہو گا؟“ عمیر نے مایوسی سے کہا..... مگر وہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک طرف کچھ پرانے قالین تھے اور ان پر مٹی سی جم گئی تھی مگر قالین اس طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے نیچے کچھ ہو۔ عمیر نے انہیں ہٹانا چاہا مگر یہ خاصے وزنی تھے اور چھ سالہ بچے کے بس کا روگ نہیں تھے۔ اس نے شامیر سے کہا۔ ”میرے ساتھ انہیں اٹھاؤ۔“

شامیر آگے آیا اور اس نے عمیر کے ساتھ مل کر قالین اوپر کیے۔ عمیر نے نیچے جھانکا تو اسے ایک چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا۔ اس نے شامیر سے قالین پکڑے رہنے کو کہا اور خود سوٹ کیس باہر کھینچنے لگا۔ نیم تاریکی میں اس کا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے ٹیالا سا سوٹ کیس باہر کھینچ لیا اور شامیر نے قالین چھوڑا تو وہاں گرد و غبار کا ایک بادل سا اٹھا جو سانس کے راستے ان کے حلق میں گیا اور وہ کھانسنے لگے۔ عمیر نے سوٹ کیس اٹھایا۔ یہ وزنی نہیں تھا مگر اس میں کچھ تھا۔ شامیر نے سوٹ کیس عمیر سے لے لیا۔ اس نے سوٹ کیس کو جھٹکا تو اس پر موجود گرد ہٹ گئی اور نیچے سے اس کا سرخ رنگ جھلکنے لگا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ ”وہی ہے۔“

شامیر اور عمیر سوٹ کیس باہر لائے۔ یہ کھٹکے سے بند ہونے والا سوٹ کیس تھا مگر لاک نہیں تھا۔ شامیر نے کھٹکا ہٹا کر اسے کھولا اور دونوں نے بیک وقت اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں ایک گڑیا اور اس کے نیچے کسی ہنگی کی بہت پرانی فرائڈ تھی۔ گڑیا بھی پرانے انداز کی اور کپڑے سے بنی ہوئی تھی۔ گڑیا اور فرائڈ دونوں کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ عمیر نے گڑیا اٹھائی اور شامیر نے فرائڈ تو ان کے نیچے سے سیاہ جلد والی ایک چھوٹی سی ڈائری نکل آئی۔ اچانک نیچے سے صبا کی آواز آئی۔ ”شامیر اور عمیر..... تم لوگ کہاں ہو؟“

انہوں نے جلدی سے دونوں چیزیں واپس سوٹ کیس میں ڈالیں اور شامیر نے اسے بند کر کے جلدی سے کمرے میں رکھ دیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اس میں تالا لگایا۔ عجلت میں اس نے تیل والی کچی بھی اندر کمرے میں چھوڑ دی تھی۔ ادھر وہ تالا لگا کر وسط میں کھڑے عمیر کے پاس آیا اور ادھر نیچے سیزھیوں سے صبا نمودار ہوئی۔ اس

نے آتے ہی انہیں غور سے دیکھا اور بولی۔ ”تم دونوں یہاں ہو، میں نے آواز دی تو جواب کیوں نہیں دیا تھا؟“

شامیر نے چابی پتلون کی بیسب میں ڈال لی تھی۔ ”سوری ماما! ہمیں سنائی نہیں دیا۔“

صبا نے چھت کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”نیچے چلو۔“

وہ نیچے آئے تو صبا کے کمرے سے سونیا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر گئی اور اس کے جاتے ہی شامیر نے چابی نکال کر واپس کی ہولڈر پر ٹانگ دی۔ عمیر نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا نا..... نا تو مجھ سے بات کرتی ہیں۔“

”ہاں لیکن وہ ہم سے کیوں نہیں کرتیں؟“

اپنی بات تسلیم کیے جانے پر عمیر اتنا خوش ہوا کہ اس نے صبح والا واقعہ بھی شامیر کے گوش گزار دیا جب نانی نے اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ بستر سے اٹھ کر کہا تھا کہ وہ آگیا ہے۔ شامیر حیران ہوا۔ ”نانو نے یہ کہا؟“

”ہاں اور ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہو رہی تھیں جیسے کچے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگا اسی لیے تو میں گیٹ سے باہر آگیا تھا۔“

”تم نے ماما سے کہا؟“

”نہیں، ماما کو دوبار بتایا تو انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔“

سونیا کے چلانے کی آواز رک گئی تھی۔ عمیر سوچ رہا تھا کہ نانو نے جنگل میں جانے سے منع کیا تھا۔ شامیر اور سونیا کو وہاں ایک جھونپڑی ملی تھی اور انہوں نے اسے سرخ سوٹ کیس کا بتایا جو اوپر کمرے میں نہ جانے کب سے رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اندر سے آئی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پتا نہیں سونیا کو کیوں رہ رہ کر پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے۔“

”ماما! اس نے زیادہ کھالیا ہوگا۔“ شامیر نے کہا۔

”نہیں، اسے دوپہر سے درد ہو رہا ہے، جب اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور ہم کارٹون دیکھ رہے تھے۔“ عمیر نے بتایا۔

”شاید اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔“ صبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیر ابھی تو وہ ٹھیک ہے۔“

صبا پھر اندر چلی گئی۔ شامیر صوفے پر بیٹھا ہوا ٹانگیں ہلاتا تھا۔ اس نے جیب سے آئے کا پتلا نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پتلے کے پیٹ میں لگی سوئی نکالنے کی کوشش کی اور جیسے ہی اس نے سوئی ہلائی، اندر سے پھر سونیا کے

چلانے کی آواز آئی۔ صبا اس سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پیٹ میں پھر تکلیف ہو رہی ہے۔ صبا پریشان ہو کر باہر آئی تو شامیر نے جلدی سے پتلا دو صوفوں کے درمیان خلا میں ڈال دیا کہ ماں اس کے ہاتھ میں نہ دیکھے۔ اگر صبا دیکھ لیتی تو وہ لازمی اس سے سوالات کرتی اور پھر وہ اس سے اصل بات اگلا کر ہی رہتی۔ وہ فریج سے دوا کی شیشی لینے آئی تھی۔ سونیا اب خاموش تھی اور جب صبا دوا لے کر گئی تو اس نے کہا کہ اس کی تکلیف اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود صبا نے اسے پیٹ درد کا سیرپ پلا دیا۔ عمیر یہ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد شامیر نے صوفوں کے درمیان سے پتلا نکالنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کر دیا اور صحن کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے سنسنی خیز لہجے میں اطلاع دی۔

”بادل آرہے ہیں، بارش ہوگی۔“

شامیر کو بارش پسند تھی اور وہ نہانا پسند کرتا تھا مگر یہ سرما کی بارش تھی۔ اسے نہانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ موسم تاریک ہوا تو صبا باہر آئی۔ اس نے باہر جھانکا اور کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی۔ شامیر نے التجا کی۔ ”ماما! کیا میں برآمدے میں جاسکتا ہوں؟“

”نہیں، آج سردی بہت ہے اور بارش کے بعد مزید ٹھنڈ ہو جائے گی۔ تم باہر رہے تو بیمار پڑ سکتے ہو۔ میں پہلے ہی سونیا کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

شامیر کا منہ لٹک گیا۔ عمیر نے اسے تسلی دی۔ ”تم کھڑکی سے دیکھ سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن میں اسے محسوس تو نہیں کر سکتا۔“ وہ جھنجھلایا۔

عمیر صبح سے ایک دو بار ہی نانی کے کمرے میں گیا تھا اسے ڈر لگ رہا تھا۔ صبا نے اسے آواز دی اور اس سے کہا کہ وہ نانی کے پاس رہے تو عمیر نانی کے کمرے میں آگیا۔ اس نے بستر سے ذرا دور اپنی کرسی رکھی اور دروازہ کھلا رکھا تھا۔ نانی ساکت لیٹی تھیں۔ اچانک باہر سے بادل گرے تو عمیر ڈر گیا۔ لائٹ ایک لمحے گومم ہوئی اور پھر ٹھیک ہو گئی۔ عمیر کی توجہ نانی کے ہاتھ پر گئی، ان کی انگلیاں مل رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور غور سے انگلیاں دیکھنے لگا۔ انگلیاں یوں بار بار کھل اور مڑ رہی تھیں جیسے کسی چیز کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہوں۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے انگلیوں کو چھوا تھا کہ نانی کا ہاتھ مڑا اور انہوں نے عمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر نانی کی گرفت بہت سخت تھی اور اچانک ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے سرگھبرا کر عمیر کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں ویسی ہی سیاہ ہو رہی تھیں۔

عمیر نے چیخ ماری مگر وہ بادل کی گرج میں دب گئی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو نانی نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر عمیر کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے چلانے کی کوشش کی مگر گرفت اتنی سخت تھی کہ عمیر کی آواز ہی نہیں نکلی اور اب بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ عمیر کی سانس رکنے لگی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے پھل رہا تھا مگر چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ نانی کی گرفت بہت سخت تھی۔ خود کو چھڑانے کی کوشش میں وہ نیچے بیٹھا تو نانی کا بستر پر توازن خراب ہوا اور وہ نیچے لڑھک گئیں۔ عمیر کی گردن اور ہاتھ دونوں ان کی گرفت سے نکل گئے۔ اس کی گردن آزاد ہوئی تو اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور وہ فرش سے اٹھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کی چیخیں اتنی بلند ضرور تھیں کہ صبا کے کانوں تک پہنچ گئیں اور وہ پریشان ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ ”عمیر! کیا ہوا؟“

مگر وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس نے ہاتھ سے نانی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو صبا اس طرف لپکی۔ ماں کو فرش پر گرے اور لرزاتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کے پاس پہنچی اور انہیں فرش سے اٹھانے کی کوشش کی مگر ان کا وزن خاصا تھا۔ اس نے چلا کر شامیر کو آواز دی۔ شور سن کر وہ پہلے ہی آگیا تھا۔ اس نے صبا کی مدد کی اور انہوں نے نانی کو اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھیں صبا کو لگا کہ اگر اس نے انہیں چھوڑا تو وہ پھر نیچے نہ گر جائیں اس نے شامیر سے کہا۔ ”اوپر چڑھ کر انہیں قابو کرو۔ عمیر! تم بھی آؤ۔“

”میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے انکار کیا وہ دروازے پر کھڑا تھا۔

”پلیز بیٹا، مجھے انجکشن بنانا ہے۔ تم بھائی کے ساتھ مل کر نانو کو پکڑے رکھو۔“ صبا نے التجائی تو وہ بادل نا خواستہ۔۔۔ آگے آیا اور اس نے شامیر کے ساتھ مل کر نانی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ اب بستر پر سردائیں بائیں مار رہی تھیں۔ صبا نے جلدی سے دراز سے سرخ نکالی اور اس کا رپہ کھول کر دوا کی شیشی اٹھائی۔ صبا نے شیشی رکھ کر سرخ سے ہوا خارج کی۔ اس دوران میں شامیر اور عمیر نانی کا جسم دبائے ہوئے تھے۔ صبا نے ان کا ایک بازو کس کر پکڑا اور جیسے ہی انس ابھری اس نے سوئی داخل کر کے پسٹن دبا

دیا۔ چند لمحے بعد نانی ڈھیلی پڑنے لگیں اور ان کا لرزہ کم ہو گیا۔ ایک منٹ بعد وہ ساکت ہو گئیں اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ شامیر اور عمیر نے انہیں چھوڑ دیا اور بستر سے نیچے اتر آئے۔ صبا نے ماں کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور سر کے نیچے نگیہ درست کیا۔

باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اندر بھی اتنی سردی ہو گئی تھی کہ صبا نے ہیٹر آن کر دیے۔ اس نے تمام بچوں کو اپنے کمرے میں جمع کر لیا کیونکہ وہ گیس ہیٹر صرف اپنی نگرانی میں چلاتی تھی۔ نانی کے کمرے میں اس نے الیکٹرک فین ہیٹر آن کر دیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور ابھی اسے رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔ وہ بچوں کو کمرے میں رہنے کا کہہ کر باہر آئی۔ شامیر اور عمیر آپس میں بات کر رہے تھے اور سونیا سن رہی تھی۔ جب انہوں نے اوپر والے کمرے میں موجود سرخ سوٹ کیس کی بات کی تو وہ چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم دونوں اوپر گئے تھے؟“

”وہاں ایک سوٹ کیس میں ایک گڑیا اور ایک فراک ہے۔“ عمیر نے انکشاف کیا۔

”ماما کی ہوگی۔“ سونیا نے یقین سے کہا۔ ”جب وہ چھوٹی ہوں گی تو گڑیا سے کھیلتی ہوں گی۔ میں ماما سے کہوں گی کہ وہ گڑیا مجھے دے دیں۔“

”تم ماما کو نہیں بتاؤ گی کیونکہ ہم نے انہیں نہیں بتایا ہے۔“ شامیر نے کہا۔ ”اگر تم نے بتایا تو ماما کو پتا چل جائے گا۔“

”اچھا میں نہیں کہوں گی لیکن تم مجھے گڑیا دکھانا۔“

”وہ خراب اور بیکار ہے۔“ شامیر نے اسے ٹالنا چاہا مگر جب وہ سھر رہی تو مجبوراً شامیر مان گیا کہ وہ اسے اگلے دن گڑیا دکھائے گا۔ سردی زیادہ ہو رہی تھی اس لیے صبا نے ڈنر سات بجے ہی تیار کر لیا۔ ڈنر ڈائننگ ٹیبل پر کیا جاتا اور یہاں سردی زیادہ تھی۔ اس نے بچوں کے گرم کپڑے نکال لیے تھے۔

کھانے کے بعد صبا نے بچوں کو کمرے میں بھیج دیا اور ماں کے کمرے میں آئی۔ انجکشن نکلنے کے سات اٹھ گھنٹے تک وہ بے ہوشی کی نیند سوتی۔ اس کے بعد انہیں ہوش آیا تو وہ انہیں کھانا کھلا سکتی تھی۔ انہیں شام پانچ بجے وارد پڑا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ بارہ یا ایک بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتی تھیں۔ پہلے صبا نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کر لے مگر وہ یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر اس کی آنکھ لگ گئی تو وہ سوتی رہ جائے گی۔ وہ جا کر اپنے کمرے سے ایک

کتاب لے آئی اور بستر کے برابر میں کرسی رکھ کر پڑھنے لگی۔ نو بجے وہ جا کر اپنے لیے چائے بنالائی۔ اس وقت بارش رک گئی تھی مگر موسم بدستور بارش والا ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور دور پہاڑوں کی طرف بجلی چمک رہی تھی۔ صبا نے جان بوجھ کر چائے اسٹرائنگ بنائی تاکہ اس کی نیند بھاگ جائے کیونکہ وہ سارا دن مصروف رہتی تھی اس لیے اسے جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت تھی۔

چائے بھی اس کی نیند بھگانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے تک وہ باقاعدہ اوجھنے لگی۔ کسی وقت اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور پھر اسے لگا جیسے کوئی اس کے آس پاس سرگوشی کر رہا ہے۔ ”میں آگیا ہوں..... میں آگیا ہوں۔“ وہ چونک کر بیدار ہوئی تو وہاں کوئی نہیں تھا اور ماں بدستور بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک بچوں کے کمرے سے صبا کو چیخ سنائی دی۔ صبا بے اختیار اٹھ کر بھاگی اس نے بچوں کے کمرے کا دروازہ کھولا تو سونیا اپنے بستر پر گھڑی سی بنی پڑی تھی اور اونچی آواز میں چلا رہی تھی۔ صبا اس کی طرف لپکی۔ ”کیا ہوا سونیا؟ کیا ہوا میری جان؟“

”ماما! میرا پیٹ.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”بہت درد ہو رہا ہے۔“

صبا اس کا پیٹ ٹٹولنے لگی۔ پیٹ نرم تھا اور بہ ظاہر کوئی اور علامت بھی نہیں تھی مگر سونیا بہت تکلیف میں تھی۔ صبا نے پوچھا۔ ”کیسا لگ رہا ہے؟“

”ماما! ایسا لگ رہا جیسے کوئی ٹیکسی چیز چھو رہا ہے۔“

شامیر اور عمیر بھی بستر پر اٹھ بیٹھے تھے۔ عمیر سونیا کی بات پر چونکا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ صبا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔“

عمیر سہم گیا۔ ”ماما! ہم اکیلے رہیں گے؟“

”ہم نہیں، آپ یہاں رہیں گے۔“ صبا نے سونیا کو گرم کپڑے پہناتے ہوئے کہا۔ ”شامیر! آپ تیار ہو آپ میرے ساتھ جاؤ گے۔ راستے میں آپ سونیا کو دیکھو گے۔“

عمیر اکیلا رہنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر وہ ماں کی پریشانی کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ شامیر تیار ہونے لگا۔ سونیا کو تیار کر کے صبا نے اپنا گرم کوٹ پہنا اور پرس و چابیاں لے کر سونیا کو گود میں اٹھالیا۔ عمیر شامیر کے ساتھ لگا ہوا دروازے تک ساتھ آیا مگر صبا نے اسے باہر آنے سے روک دیا۔ ”آپ یہیں سے دروازہ بند کر لیں اور جب تک میری آواز نہ سنیں دروازہ مت کھولے گا۔“

”یس ماما۔“ عمیر نے کہا۔

”آپ نانو کا خیال رکھنا اور کوئی بات ہو تو مجھے فون کرنا۔“ صبا نے کہا اور باہر نکل گئی۔ عمیر نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ صبا گھر کی چابیاں لے گئی تھی۔ اس نے شامیر کو گیٹ کھولنے کو کہا اور خود سونیا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ جب تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور گاڑی اسٹارٹ کی شامیر نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی باہر نکلنے کے بعد اس نے باہر تالا لگایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آگیا۔ سونیا بدستور رو رہی تھی اور تکلیف کی شکایت کر رہی تھی۔ صبا نے اسے تسلی دی۔ ”بس میری جان، ابھی ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

گاڑی گیٹ سے آگے نکلی تو عمیر نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور لاؤنج کے صوفے پر آگیا۔ اس کی خوفزدہ نظریں نانی کے کمرے پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ صبا نے انہیں بتایا تھا کہ نانی اب بارہ بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی، اس کے باوجود عمیر ڈر رہا تھا کہ کہیں نانی جاگ نہ جائیں اور ان کی آنکھیں سیاہ نہ ہوں۔ اس لیے وہ ماں کی ہدایت کے باوجود ان کے کمرے میں نہیں گیا اور لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک بادل زور سے گرے اور بجلی کی چمک ایسی تیز تھی کہ پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا۔ انرجی سیورز کی روشنی اس کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔

پھر جیسے ہی چمک ختم ہوئی، اچانک ہی تاریکی چھا گئی۔ عمیر خوف سے چلا اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لائٹ چلی گئی تھی اور اب اندر گہپ اندھیرا تھا۔ باہر سے تیز بارش کی آواز آئی، اس کی شدت پہلے سے زیادہ تھی۔ عمیر کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور کچن کی طرف بڑھا۔ اس کی ایک دراز میں ٹارچ رکھی تھی۔ وہ ٹارچ کی مدد سے ایمر جنسی لائٹس تلاش کر سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا کچن کی دراز تک پہنچا اور اسے کھول کر اندر سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس کی روشنی سے عمیر کو حوصلہ ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ایمر جنسی لائٹس صبا کے بیڈ روم کے ساتھ ایک ریک پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ ریک تک آیا اور ایک بڑی ایمر جنسی لائٹ اٹھا کر آن کی اور اسے لا کر لاؤنج میں رکھ دیا۔ اس کی روشنی ہر طرف جاری تھی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی لیکن اسے اپنے پاس ہی رکھا۔

وہ سونیا کی تکلیف کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اچانک اسے اس پتے کا خیال آیا جو شامیر لایا تھا اور جس

انکار ہی سمجھوں

ایک میراثی کے لڑکے کو ایک زمیندار کی لڑکی سے محبت ہو گئی، تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ چودھری صاحب سے میرے لیے رشتہ مانگ آئے۔ آخر کار باپ تھا، بیٹے کی خاطر رشتہ مانگنے چلا گیا۔ چودھری صاحب مہمانوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ میراثی نے آداب سے سلام کیا۔ بلند آواز میں کہا۔

”چودھری صاحب! میں اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگنے آیا ہوں۔“ چودھری صاحب یہ بات سن کر جلال میں آگئے۔ کہاں میراثی اور کہاں میں علاقے کا زمیندار۔ چودھری صاحب نے اپنے حواریوں کو اشارہ کیا۔ حواریوں نے میراثی کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کہا۔

”چودھری اسی ہوں انکار سمجھیے۔“

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

کہہ رہے ہو؟

”ماما! نانو کی آنکھیں بلیک ہو جاتی ہیں اور انہوں نے عمیر کا گلا بھی دبایا تھا۔ تبھی وہ بستر سے نیچے گری تھیں۔ عمیر نے مجھے سب بتایا ہے۔ ابھی جب ہم آرہے تھے، تب بھی وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔“

صابا نے اور باتوں پر تو توجہ نہیں دی تھی مگر یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی کہ اس کی ماں نے عمیر کا گلا دبایا تھا اور اس وقت عمیر ان کے ساتھ گھر میں اکیلا تھا مگر اس نے خود کو تسلی دی کہ ماں انجکشن کے زیر اثر ہیں اور انہیں رات بارہ بجے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ وقت پر اسے گھڑی کا خیال آیا اور اس نے ڈیش بورڈ میں لگی گھڑی دیکھی تو اس میں پونے بارہ ہو رہے تھے۔ اس کا اطمینان ہوا ہو گیا۔ بارہ تو بجتے والے تھے اور انہیں کسی وقت بھی ہوش آسکتا تھا۔ صابا نے اپنا موبائل نکالا اور گھر کے فون پر کال کرنے لگی۔ تیل جا رہی تھی مگر دوسری طرف سے کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے تاب ہونے لگی کہ عمیر کال کیوں نہیں ریسپونڈ کر رہا تھا۔ پھر کسی نے کال ریسپونڈ کی۔

☆☆☆

کے پیٹ میں سوئی چبھی ہوئی تھی۔ وہ لاؤنج میں دو چھوٹے صوفوں کے درمیان گر گیا تھا۔ عمیر نے جھک کر دونوں صوفوں کے درمیان خلا میں دیکھا اور پھر ٹارچ روشن کر کے اس میں جھانک رہا تھا کہ اچانک ہی نانو کے کمرے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی شیشہ فرش پر گرا ہوا اور ٹوٹ گیا ہو۔ چھٹا کے نے عمیر کو سہا دیا۔ پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور ٹارچ آن کر کے نانو کے کمرے تک آیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ٹارچ سے روشنی اندر ڈالی تو نانو کا بیڈ خالی تھا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ نانو کہاں تھیں؟ اس نے جلدی سے پورے کمرے میں ٹارچ گھمائی مگر نانو وہاں کہیں نہیں تھیں۔ عمیر نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نانو! آپ کہاں ہیں؟“

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر آیا تو اچانک کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ وہ بستر کے قریب جا گرا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو نانو دروازے کے پیچھے کھڑی تھیں اور وہیں سے انہوں نے اسے دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور گر کر بند ہو گئی مگر باہر سے آتی ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں نانو کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چتر لہجے تک ساکت کھڑی رہیں اور پھر پلٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عمیر فرش سے اٹھا اور اس نے ٹارچ اٹھائی پھر باہر آیا۔ نانو چکن کی طرف جا رہی تھیں۔ عمیر جھکا ہوا لاؤنج میں آیا اور عقب سے چھوٹے صوفوں کے پیچھے آگیا۔

☆☆☆

صابا فکر مند تھی کیونکہ سونیا مسلسل رو رہی تھی اور وہ پچھلی نشست پر گول مول سی ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ ان کے روانہ ہونے کے چند منٹ بعد ہی بہت تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس نے دائر چلا دیے تھے اور ہیڈ لائٹس فل کر دی تھیں۔ اس کے باوجود اسے گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چلائی پڑ رہی تھی کیونکہ اوپر سے جیسے پانی کی چادر گر رہی تھی۔ شامیر جو سونیا کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے عمیر کی فکر ہو رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ماما! عمیر نانو کے بارے میں ٹھیک کہتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتی ہیں۔“

سونیا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”ماما! نانو نے اسے سرخ سوٹ کیس کا بتایا اور وہ ہمیں اوپر اسٹور والے کمرے میں ملا۔ اس میں ایک پرانی گڑیا، ایک فراک اور ایک بلیک ڈائری تھی۔“

صابا سامنے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”شامیر اتم کیا

عمیر صوفوں کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ نانو کچن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں اور پھر وہ پلٹیں تو ان کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ چھری سے زیادہ خوفناک ان کے چہرے کے تاثرات تھے۔ ان کی آنکھیں پوری سیاہ اور چہرہ جیسے پتھر کا ہو رہا تھا۔ عمیر کو لگا وہ اس کی نانو تھیں کوئی اور ہیں۔ وہ چھری لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں گئیں، عمیر صوفوں کے درمیانی خلا میں ہاتھ ڈال کر پتلا نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ سے تارچ چھوٹ کر نیچے گری اور خاصی آواز ہوئی۔۔۔ فوراً ہی دروازے پر نانو نمودار ہوئیں۔ وہ لاؤنچ کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے تعین کر رہی ہوں کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ عمیر نے تارچ پکڑ لی اور پھر خلا میں ٹٹولنے لگا۔ صوفے کے نیچے سے وہ دیکھ رہا تھا کہ نانو اسی طرف آرہی تھیں اور جیسے ہی وہ صوفوں کے پچھلے حصے میں نمودار ہوئیں، عمیر کا ہاتھ پتلے سے ٹکرایا۔

عمیر اسے پکڑتے ہوئے سیدھا ہوا اور اٹھ کر تیزی سے دوڑ لگائی۔ وہ کچن کے پاس سے ہوتا ہوا نشست گاہ میں آیا اور اس کے بڑے صوفے کے پیچھے دبک گیا۔ خوف سے اس کا سانس تیز ہو رہا تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ اس نے ٹٹول کر پتلے کے پیٹ میں پیوست سوئی تلاش کی اور اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر سوئی کا بہت کم حصہ اب باہر تھا جو اس کی انگلیوں کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ نشست گاہ کی کھلی آرج پر نانو کا ہیولا نمودار ہوا اور وہ کھڑے ہو کر نشست گاہ میں دیکھنے لگیں۔ یہاں سے ایک دروازہ پیچھے راہداری میں کھلتا تھا جس میں بیڈ رومز تھے۔ نانو نے عجیب کھرکراتی سی آواز میں کہا۔ ”عمیر! تم کہاں ہو، سامنے آؤ میرے پیچھے۔“

عمیر نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی آواز نہ نکل جائے اور نانو کو پتا چل جائے کہ وہ صوفے کی سائڈ میں موجود ہے۔ نانو آگے آئیں اور انہوں نے پہلے چھوٹے صوفوں کے پیچھے جھانکا جب وہاں عمیر نظر نہیں آیا تو وہ بڑے صوفے کی طرف بڑھیں اور جب اس کے بالکل نزدیک آگئیں تو عمیر نے پکڑے جانے کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک ہی فون کی بیل بجی اور نانو رک گئیں۔ فون لاؤنچ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ پلٹیں اور لاؤنچ کی طرف جانے لگیں۔ ان کے جانے کے بعد عمیر نے نہ جانے کب سے رکھا ہوا سانس لیا اور دوبارہ پتلے سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طرح نہیں نکلے گی۔ اسے کچن میں اوزاروں والی دراز کا خیال

آیا جس میں پلاس تھا اور وہ اس کی مدد سے سوئی نکال سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سونیا کی تکلیف اور نانو کی اس کیفیت کی وجہ یہی پتلا اور اس کے پیٹ میں پیوست سوئی تھی۔ اس لیے وہ اسے نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔

وہ اٹھ کر دبے قدموں آرج والے دروازے تک آیا اور لاؤنچ میں جھانک کر دیکھا تو نانو فون کے پاس کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے ریسور اٹھایا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ان کی پشت عمیر کی طرف تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور فریج کی سائڈ میں چلا گیا۔ وہ فریج سے بالکل لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نانو اس کے سامنے سے گزر کر نشست گاہ کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ فریج کی سائڈ سے نکلا اور جھک کر کچن کی اس دراز تک آیا جس میں اوزار رکھے ہوتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دراز کھولی اور اس میں پلاس ٹٹولنے لگا۔ اوپر دوسرے اوزار تھے اور اسے پلاس نہیں مل رہا تھا۔ وہ زیادہ ہاتھ مارتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں آواز نہ پیدا ہو۔ بالآخر اسے پلاس مل گیا۔ اس نے ذرا عجلت سے کام لیا اور اسے کھینچ کر نکالنے لگا تھا کہ چند اوزار آپس میں ٹکرائے اور آواز پیدا ہوئی۔

عمیر کا سانس ایک لمحے کورک گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا مگر نانو نشست گاہ میں ہی تھیں۔ اس نے جلدی سے پلاس پکڑا اور پتلے کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے لگا کہ اس کے عقب میں کوئی ہے اور وہ بے ساختہ آگے ہوا۔ اسی لمحے چھری آکر کیبنٹ سے لگی۔ نانو کب وہاں آئیں اسے پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں اتنے پاس دیکھ کر عمیر گھبرا کر پیچھے ہوا تو اس کے ہاتھ سے پلاس چھوٹ گیا۔ اس نے پلاس اٹھانا چاہا مگر نانو نے پاؤں کی ٹھکڑی سے اسے دور پھینک دیا۔ عمیر چلا یا۔

”نانو! یہ کیا کر رہی ہیں؟“
”میں آگیا ہوں۔“ نانو نے کھرکراتی آواز میں کہا۔ ”مجھے قیمت چاہیے۔“
نانو کہتے ہوئے آگے آنے لگیں۔ عمیر پیچھے سرکا۔ ”کون ہو تم؟“
”میں وہی ہوں جس سے معاہدہ کیا تھا۔ میں اس کی قیمت لینے آیا ہوں۔“
”میں آپ کا عمیر ہوں۔“ وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں پتلا موجود تھا۔ اب پلاس نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے سوئی نکالے۔ اچانک اسے خیال آیا اور وہ پتلا منہ تک لایا۔ نانو اس کی طرف جھپٹیں مگر وہ جھکائی دے کر بچا اور تیزی سے

لاؤنج کی طرف بھاگا۔ نانو اس کے پیچھے تھیں مگر ان کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ان کی پہنچ سے دور جاتے ہی عمیر نے دانتوں سے سوئی پکڑ کر پوری قوت سے کھینچی اور وہ پتلے سے نکل گئی۔ نانو چھری سمیت اس پر جھپٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

”ہیلو..... ہیلو۔“ صبا بول رہی تھی۔ ”کون ہے.....“ فون کس نے ریسیو کیا ہے؟ عمیر! یہ تم ہو بیٹا..... بولتے کیوں نہیں ہو؟“

مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ صبا نے کار سائڈ پر روک دی اور کال کاٹ کر دوبارہ ملائی مگر اس بار انجین ٹون آرہی تھی۔ سونیا کی حالت بدستور خراب تھی مگر اب صبا کو زیادہ بڑے مسئلے کا سامنا تھا۔ اس نے سوچا اور کار واپس سوڑ لی۔ شامیر نے اس سے پوچھا۔ ”ماما! کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟“

”ہاں کسی نے گھر میں کال ریسیو کر کے ریسیور فون سے الگ رکھ دیا ہے۔ وہاں گڑ بڑ ہے۔ سونیا! تم کیسی ہو؟“

”ماما تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ”بس بیٹا، میں جلد تمہیں اسپتال لے جاؤں گی۔“ صبا نے اسے تسلی دی۔ ”تمہوڑا صبر کر لو۔“ اس بار صبا بارش کی پروا کیے بغیر کسی قدر تیز ڈرائیو کر رہی تھی اور اسے رہ رہ کر عمیر کا خیال آرہا تھا۔ اچانک سونیا چلائی۔ ”ماما.....“

”کیا ہوا میری جان؟“

”میری تکلیف ٹھیک ہو گئی ہے۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”ماما! بالکل بھی درد نہیں ہے اور نہ ہی چھین ہے۔“

صبا نے سکون کا سانس لیا اور پوری توجہ سے ڈرائیو کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ سب خیریت سے ہونے کی دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

عمیر نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چھری اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بس ایک لمحہ لگتا اور وہ اس کے ننھے جسم میں اتر جاتی مگر جب کچھ نہیں ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ نانو سامنے ہی ساکت کھڑی تھیں اور ان کا چھری والا ہاتھ بھی ساکت تھا۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا تو ان کی آنکھیں اب نارمل تھیں اور چہرہ بھی ٹھیک لگ رہا تھا۔ پھر بھی عمیر ڈر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”نانو! اب آپ ٹھیک ہیں؟“

نانو نے سر ہلایا پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود

چھری دیکھی اور خود سے سوال کیا۔ ”یہ میں کیا کرنے والی تھی؟ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والی تھی۔“

”نانو! آپ کو کیا ہوا تھا؟“ عمیر کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔

”مجھ پر شیطان حاوی آ گیا تھا۔ جیسے بہت سال پہلے آیا تھا۔“ انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسی لمحے باہر سے کار کے ہارن کی آواز آئی تو عمیر اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”ماما آگئیں۔“

عمیر باہر کی طرف بھاگا۔ نانی اسے جاتا دیکھ رہی تھیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ میرے کسی اور بچے کو میرے گناہ کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہیے۔“

نانی پلٹیں اور صبا کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

☆☆☆

صبا کے ہاتھ میں سیاہ ڈائری تھی۔ اس نے ڈائری کھولی۔ اس کے شروع کے صفحات خالی تھے مگر ایک صفحے پر کچھ لکھا ہوا تھا اس کے بعد اسی طرح سے وقفے وقفے سے آج سے بیس سال پہلے تک کی تاریخوں میں ایک روداد لکھی تھی جو حیران کن بھی تھی اور عبرتناک بھی۔ صفیہ اور احمد اللہ کی شادی آج سے پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت صفیہ پندرہ سال کی اور احمد اللہ انیس سال کا تھا۔ وہ کچھ مہینے پہلے ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہوا تھا۔ شادی کے بعد وہ اور صفیہ دارالحکومت میں آکر رہنے لگے۔ وقت گزرتا گیا اور اولاد کی شدید چاہ کے باوجود ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ پانچ سال گزر گئے تب احمد اللہ کو یہ گھر ملا تھا۔ اس وقت یہاں بہت کم لوگ تھے اور نزدیک ہی جنگل تھا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے بعد وہ پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ گئی۔ احمد اللہ اسے منع کرتا تھا اور کہتا کہ جب نصیب میں ہوگی تو اولاد ملے گی، وہ کیوں غیر اللہ سے مانگتی ہے مگر اپنی چاہ کے آگے صفیہ کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک دن وہ دروازے پر ریڑھی والے سے سبزی لے رہی تھی کہ ایک عجیب سے حلیے کا آدمی وہاں سے گزرنے لگا اور صفیہ کو دیکھ کر رک گیا۔ جب سبزی والا آگے بڑھ گیا تو اس آدمی نے اچانک کہا۔ ”اولاد چاہتی ہے؟“

یہ صفیہ کی دکھتی رگ تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”ہاں بابا۔“

”تب ادھر جنگل میں آ جانا۔“ آدمی نے پیچھے جنگل

کی طرف اشارہ کیا۔ ”جوگی کا ٹھکانا ادھر ہے..... اور ہاں ڈراما، بے فکر ہو کر آنا۔“

جوگی کہہ کر چلا گیا۔ اگر معاملہ اولاد کا نہ ہوتا تو صفیہ ساری دنیا کے خزانوں کے بدلے بھی چند سو قدم دور جوگی کی جھونپڑی تک نہ جاتی مگر اولاد کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اگلے ہی دن احمد اللہ کے دفتر جاتے ہی وہاں پہنچ گئی۔ جوگی کی جھونپڑی میں وہی سب کچھ تھا جو شامیر اور سونیا نے دیکھا تھا مگر اس وقت یہ سب تازہ تھا۔ جوگی جوان آدمی تھا۔ اس نے صفیہ کو دیکھ کر کہا۔ ”اچھا ہوا تو آگئی ورنہ میں یہاں سے جانے والا تھا۔“

”جوگی بابا مجھے بچے کی خواہش ہے۔“
”ہر خواہش کی ایک قیمت ہوتی ہے وہ دے گی؟“
”کیسی قیمت بابا؟“ صفیہ نے فکر مند ہو کر پوچھا اور جب جوگی نے اسے قیمت بتائی تو وہ مرجھا گئی تھی۔
”میں ایسا نہیں کر سکتی بابا، کسی کی گود کا پھول کیسے لا دوں۔“

”اگر اپنی گود بھرنا چاہتی ہے تو ایسا کر لے..... تیرے پاس بس دو دن ہیں۔“
صفیہ مایوس سی گھر واپس آگئی اگر جوگی اس سے پیسا مانگا تو وہ اپنے پاس موجود ہر چیز اسے دے دیتی مگر اس نے تو بچہ مانگا تھا وہ کہاں سے لاتی۔ اگلے دن دوپہر میں وہ صحن کی صفائی کر رہی تھی کہ باہر سے کسی بچی کی آواز آئی۔ وہ اپنی گڑیا سے باتیں کر رہی تھی۔ صفیہ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ایک چار پانچ سال کی پیاری سی بچی کپڑے کی گڑیا لیے کیاری کے کنارے بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بچی نے خوب صورت فراک پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر صفیہ کے دل میں خیال آیا اور اس نے بچی کو اندر بلا لیا۔ وہ مصحوبیت میں اندر آگئی۔ اس وقت صفیہ پر شیطان پوری طرح حاوی آگیا تھا۔ اس نے اچانک بچی کا منہ دبا دیا اور اس وقت تک دبائے رکھا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہو گئی۔ پھر اس نے اسے اپنی چادر تلے لیا اور جوگی کی جھونپڑی تک لے آئی۔ وہ باہر ہی موجود تھا۔ ایسا لگا جیسے اسے صفیہ کی آمد کا علم تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور صفیہ نے بچی اس کے حوالے کر دی۔ وہ بچی کو لے کر جھونپڑے میں گیا اور کچھ دیر بعد آکر اس نے بچی کی فراک اس کے حوالے کی۔ ”یہ لے اور یہاں سے جا..... ایک گھنٹے بعد آنا، تیرا کام ہو جائے گا۔“

صفیہ دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آئی۔ اس وقت تک محلے میں شور نہیں اٹھا تھا۔ شاید بچی کسی اور کی تھی اور

کھیتے ہوئے یہاں تک آگئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد صفیہ پھر جوگی کی جھونپڑی تک آئی۔ جوگی باہر ایک بڑا سا جھولا لیے کھڑا تھا۔ اس میں نہ جانے بچی کبھی یا کبھی اور تھا۔ جوگی نے ایک پڑیا اس کے حوالے کی۔ ”اسے پھانک لینا..... اور ہاں اگر تجھے کچھ نظر آئے تو اس سے اولاد کا کہنا۔ پھر وہ تجھے اپنی قیمت بتائے گا۔“

صفیہ نے جوگی سے پوچھنا چاہا کہ اسے کیا نظر آئے گا مگر وہ اس کی بات سننے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ صفیہ گھر آئی اور اس نے بچی کی فراک اور گڑیا ایک ایسی جگہ چھپا دیں جہاں احمد اللہ کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔ رات سونے سے پہلے اس نے پڑیا کھائی اور رات جب وہ باتھ روم جانے کے لیے کمرے سے نکلی تو اسے صحن میں ایک سیاہ بیولا نظر آیا۔ صفیہ کو جوگی کی بات یاد تھی اس لیے وہ ڈری نہیں۔ بیولے نے اس سے پوچھا۔

”کیا چاہتی ہے مجھ سے؟“
”مجھے بچے کی خواہش ہے۔“
”اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“
”مجھے منظور ہے۔“ صفیہ نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”جتنی اولاد اتنی قیمت..... ہر اکیس سال بعد..... یاد رکھنا۔“ بیولے نے کہا اور اچانک غائب ہو گیا۔ اس واقعے کے ایک سال کے اندر صفیہ کے ہاں پہلی اولاد بیٹے کی صورت میں ہوئی۔ وہ اتنی خوش اور مگن ہوئی کہ سب بھول گئی۔ پانچ سال بعد بیٹی ہوئی تو اسے لگا کہ اس کا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ جب بیٹا بیس سال کا ہونے والا تھا تو صفیہ نے خواب میں اسی بیولے کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ قیمت لینے آرہا ہے اور قیمت ایک انسانی جان تھی۔ صفیہ ڈری مگر اس نے اسے خواب قرار دیا۔ البتہ جب وہی بیولا اسے رات کی تاریکی میں سچ فح نظر آیا تب وہ جان گئی کہ یہ حقیقت ہے مگر وہ اسے کہاں سے انسانی جان کی قربانی دیتی۔ اس کے لیے تو اس گھر کی ہر جان قیمتی تھی۔ وہ کیسے کسی کی قربانی دیتی۔ ان دنوں اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور اسے رہ رہ کر وہ بیولا نظر آتا۔ آخری بار جب وہ نظر آیا تو اس نے کہا۔

”تم نے جان نہیں دی لیکن میں نے چن لی ہے۔“
اس سے اگلے دن ہی اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہوئی اور اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ صفیہ پاگل ہو گئی۔ جب وہ اولاد کی چاہ میں پاگل ہو رہی تھی اور اس نے قیمت دینے کی ہامی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا قَانٍ ۝



جو پیدا ہوا ہے، اسے لوٹ کر اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے۔ آج کوئی اور، توکل ہماری باری ہے۔ ادارے سے اپنا قلمی کیریئر شروع کرنے اور مسلسل وابستہ رہنے والے ہونہار، نوجوان، باشرع، پیروں سے معذور مگر عزم و حوصلے کے پیکر اور صاحب طرز کہانی نگار، کاشف زبیر کئی ہفتوں تک علالت سے نبرد آزما رہنے کے بعد 22 فروری کی سہ پہر خالق حقیقی سے جا ملے۔

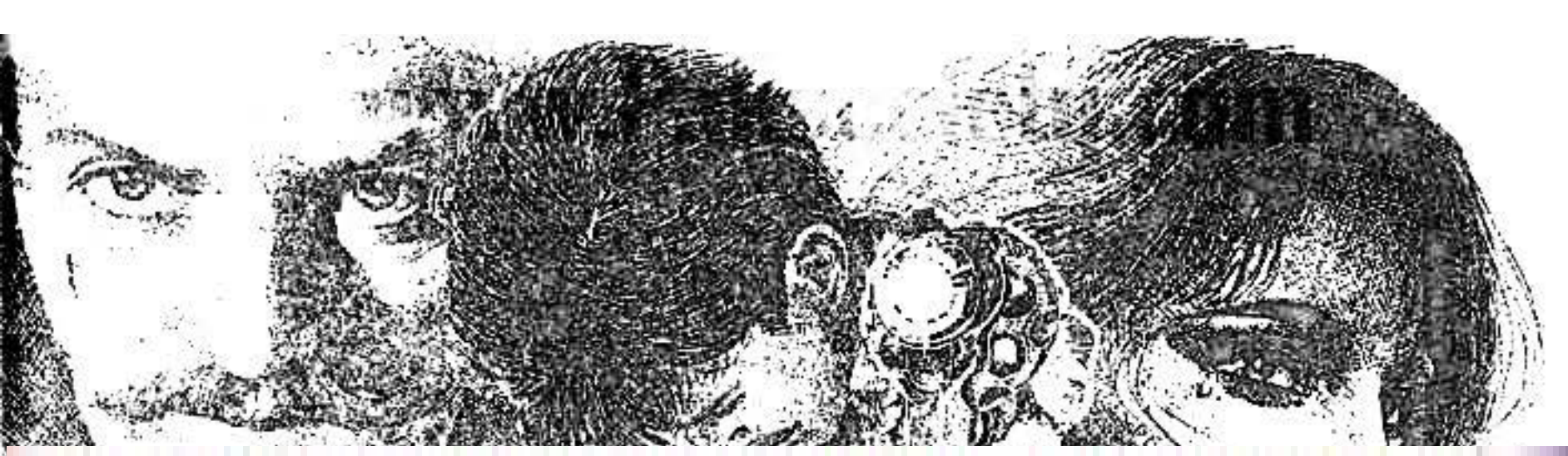
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ ۝

ادارہ اور اس کے جملہ اراکین مرحوم کے پسماندگان کے اس صدمے اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں کہ رب العزت انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

بھری تھی مگر جب قیمت دینا پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کیا سودا کیا تھا۔ کتنے دن صفیہ سنبھل نہیں سکی اور وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ پھر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس نے یہ ڈائری لکھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا۔ اس نے کسی کی گودا جاڑی تھی اور نتیجے میں اس کی گودا جڑ گئی۔ اس نے ڈائری، نجی کی فراک اور کپڑے کی گڑیا ایک چھوٹے سرخ سوٹ کیس میں رکھ کر اسے اوپر کباڑ والے کمرے میں ڈال دیا تھا کبھی کبھی وہ وہاں جا کر ڈائری نکالتی اور اس میں اپنے احساسات تحریر کرتی۔ جب بیٹے کی موت کو اکیس سال ہونے کو آئے تو اس خوف سے اس کی حالت خراب ہونے لگی کہ پھر اس کی واحد رہ جانے والی اولاد کی شامت آئے گی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایسا ہونے سے پہلے مر جائے مگر موت بھی اپنی مرضی سے کہاں آتی ہے۔

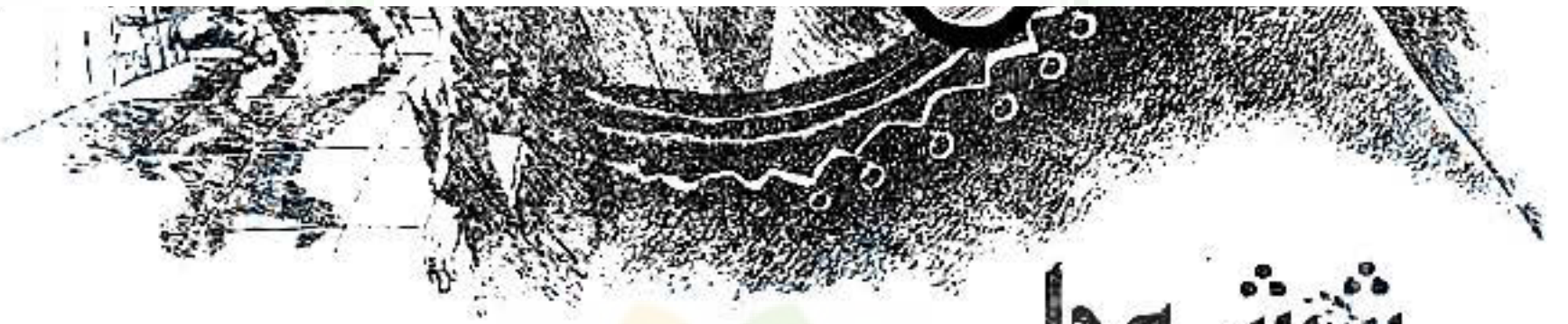
صبا نے گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی۔ اس کی ماں یعنی صفیہ کو بالآخر اس کی مرضی کی موت آگئی اور اس نے اپنی جان دے دی۔ اس نے کمرے میں جا کر گیس ہیٹر کھول دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ جب تک صبا کو احساس ہوتا اور وہ دروازہ تڑوا کر اندر داخل ہوتی، گیس نے صفیہ کی جان لے لی تھی۔ شامیر نے اسے پتلے کے بارے میں بتایا اور عمیر نے جب اس کی سوئی نکالی تو نہ صرف صفیہ ٹھیک ہو گئی تھی بلکہ سونیا کے پیٹ کی تکلیف بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ صبا نہیں جان سکی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اپنی ماں کا تو اس معاملے سے تعلق سمجھ آ گیا تھا مگر سونیا کا اس سے کیا تعلق تھا جو اس کے پیٹ میں درد ہوا؟ پھر عمیر نے پتلے سے سوئی نکال دی تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ صبا ان چیزوں کی قائل نہیں تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کو نہ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ۔ اس نے بچوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ صفیہ کی موت اس کی نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر حادثاتی قرار پائی۔ ماں نے جو کیا وہ غلط تھا اور شاید اسی کی سزا بھی بھگتی لیکن صبا اور اس کی اولاد بے گناہ تھی۔ اس لیے اوپر والے نے ان کی حفاظت کی۔ صبا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی اور سرخ سوٹ کیس میں موجود چیزیں ضائع کر دے گی۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔ صفیہ کے بعد مکان اس کی ملکیت تھا اور اس نے اسے فروخت کرنے کا سوچ لیا تھا۔





PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



شیش محل

اسماء تادری

قسط: 8

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رپ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سببی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے پر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحریک کے پردوں میں ملوث سطر سطر رنگ بدلتی دار و ادات قلبی کی عکاسی دلچسپ داستان

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کوئی ایک ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شاہجی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے مکمل کراٹھا نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کا تگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شاہجی کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کر دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت خرید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوق کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کیا کہ ہملا کا جو لہجہ اسے ناگوار گزر رہا تھا، وہ ایک طرح سے اس کا حق تھا۔ وہ بھابیہ کی بیٹی تھی اور ظاہر ہے اپنے باپ کے بچکلے کے باہر کسی اور کو راستے میں ڈٹا سوال جواب کرنا دیکھ کر خود اس نے ناگواری محسوس کی ہوگی۔

”اب آپ مجھے اندر جانے کا راستہ دیں گے یا نہیں؟“ اس نے فاروق کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر ایک طرف ہو گیا۔ ہملا خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر کر اندر داخل ہو گئی۔ ولایتی لباس کے ساتھ ہی اس نے کسی ولایتی خوشبو کا بھی استعمال کر رکھا تھا۔ اس کے نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد فاروق نے بے ساختہ ہی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ پہلی نظر میں ہملا اسے بہت کم عمر لگی تھی اس لیے اسے سامنے پا کر اسے ذرا بھی یہ گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ بھابیہ سیٹھ کی بیٹی ہوگی کیونکہ ہملا کے متعلق جو معلومات اسے حاصل تھیں، ان کے مطابق وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کا شوہر مرچکا تھا اور وہ

”آپ نے جواب نہیں دیا۔ کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ فاروق ابھی حیران ہی کھڑا تھا کہ اس نے حیر لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

”خاکسار کو فاروق کہتے ہیں۔ اس بچکلے کے مالک مسٹر بھابیہ کا مہمان ہوں اور ظاہر ہے ان ہی کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔“ فاروق کی حیرت پر وہ ناگواری غالب آگئی جو اس نے لڑکی کے تھکمانہ لہجے پر اپنے دل میں محسوس کی تھی۔

”اوہ، آئی سی۔“ جواب میں اس نے ایک ادا سے ہونٹ سکوڑے اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کروانے لگی۔

”میں ہملا بھابیہ ہوں۔ مسٹر بھابیہ کی اکلوتی بیٹی اور اس بچکلے کی مالک۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ تعارف سن کر فاروق کو یہ روایتی جملہ ادا کرنا پڑا اور دل ہی دل میں تسلیم

ایک کالج میں لیکچرار تھی۔ پہلی نظر میں بہت کم عمر نظر آنے والی بھلا اس کے ذہن میں بسی ایک پختہ عمر عورت کے خیال پر پوری نہیں اتری تھی اس لیے وہ خطا کھا گیا تھا۔ اپنی اس غلط فہمی پر کچھ کچھ جھینپا ہوا وہ ملازم کو گاڑی کی ڈکی سے بھلا کا سامان اتارتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ملازم بھلا کے اندر جانے کے فوراً بعد ہی باہر آیا تھا اور اب ڈکی سے اس کا بھاری بھر کم سوٹ کیس نکال رہا تھا۔

”آپ کی چائے ریڈی ہے سر۔ آپ کدھر پینا پسند کریں گے؟“ سوٹ کیس میں پیسے لگے ہوئے تھے لیکن ملازم نے اسے پیوں پر چلا کر لانے کے بجائے اپنے کامدھے پر اٹھا رکھا تھا اور فاروق کے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”اندر ڈائننگ ٹیبل پر ہی لے آؤ۔“ فاروق نے اسے جواب دیا اور اس کے پیچھے ہی خود بھی اندر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ ڈرائیور کے علاوہ اس جھنگلے میں یہی ایک مستقل ملازم تھا جو باورچی خانہ بھی سنبھالتا تھا۔ البتہ صفائی اور برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے مقامی آبادی سے صبح دشام ایک عورت وہاں آتی تھی۔ ملازم ہی سے اسے علم ہوا تھا کہ کسی خاص موقع پر جب مہمانوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ عورت اس کے کہنے پر اس کی مدد کے لیے بھی رک جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ خاص موقع بھامیہ سیٹھ کے یہاں قیام کے دنوں میں ہی آتا ہوگا اور سیٹھ شاید سال میں ایک آدھ بار ہی یہاں آ پاتا تھا۔

بھلا کا سوٹ کیس اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد ملازم نے فاروق کو چائے پیش کی۔ وہ چائے اچھی بناتا تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں ہی ڈالنے تھا کیونکہ اس نے اب تک جو کچھ بھی پکا کر کھلایا تھا ان لوگوں کو پسند آیا تھا۔ وہ فاروق کو چائے پیش کر کے پلٹا ہی تھا کہ اوپری منزل سے بھلا نے اسے پکارا۔ وہ فوراً سیڑھیوں کی طرف دوڑ گیا۔ یہاں رہتے ہوئے یہ بات پہلے ہی فاروق کے علم میں آ چکی تھی کہ جھنگلے کی اوپری منزل پر مالکوں کے کمرے ہیں۔ مالکان سے مراد بھلا، منوہر اور بھامیہ سیٹھ خود تھا۔ مہمانوں کو عام طور پر چلی منزل کے کمروں میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ چائے پینے کے دوران فاروق بھلا کی یہاں آمد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بھامیہ کی زبانی جو حالات اس کے علم میں آئے تھے، ان کے مطابق بھلا اچھی خاصی باغی لڑکی تھی جس نے پہلے باپ کی مرضی کے خلاف اپنی پسند سے اپنے سے کم مالی حیثیت رکھنے والے لڑکے سے شادی

کی اور اس لڑکے کی خاطر باپ کی اتنی بڑی جائیداد کو ٹھوکر مار کر چلی گئی۔ بد قسمتی سے اس کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو گیا اور بیوہ ہونے کے بعد سیٹھ نے کوشش کی کہ وہ اس کے بچے منوہر سے شادی کر لے لیکن اس بار بھی بھلا نے باپ کی خواہش سے انحراف کیا اور دوسرے شہر جا کر کالج میں ملازمت کرنے لگی۔ اب جبکہ منوہر مر چکا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ باپ بیٹی کے بیچ کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے جب ہی بھلا یہاں نظر آ رہی تھی۔ ان ہی سوچوں کے درمیان اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ کیتھرائن اور گولو بھی وہاں چلے آئے۔ صبح کے سلام کے بعد ان دونوں نے بھی ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیاں سنبھال لیں۔

”مس صاحبہ کہتی ہیں وہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتا کریں گی۔ کیا آپ ان کے آنے تک انتظار کرنا پسند کریں گے؟“ ملازم نے نہایت مؤدب لہجے میں فاروق سے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں۔ انہیں آنے دو۔ ہمیں ناشتے کی ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا تو ملازم واپس پلٹ گیا جبکہ اس کے ساتھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ یہ صبح صبح کن مس صاحبہ کا تذکرہ ہے۔

”مسٹر بھامیہ کی بیٹی مس بھلا بھامیہ کی سواری سویرے سویرے ہی تشریف لائی ہے اور اب غالباً وہ ہمیں اپنی میزبانی سے نوازنے کے موڈ میں ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ان کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر گولو اور کیتھرائن نے اس سے بھلا کے سلسلے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ اپنی معلومات کی حد تک ان کے سوالوں کے جوابات دیتا رہا۔ تھوڑی دیر میں بھلا سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی دکھائی دی۔ اس وقت اس نے سفید رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کی سرو قامت اور گندی رنگت پر چرچ رہی تھی۔ ساڑی کے ساتھ ہی اس نے سرمئی رنگ کی ایک ہلکی سی شال بھی اپنے شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ یہ سردی کا موسم نہیں تھا لیکن بہر حال شملہ کی صبح بھی اور صبح صبح غسل کرنے والا ہلکی سی خنکی محسوس کرتا تھا۔ بھلا نے بھی سفر کی گرد اتارنے کے لیے غسل کیا تھا۔ اس کے سیاہ بال پشت پر کھلے ہوئے تھے اور ان میں اچھی خاصی نمی تھی۔ فاروق کو وہ اس بھلا سے خاصی مختلف نظر آئی جس سے آتے کے ساتھ ہی اس کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ بھلا ماڈرن اور کم عمر نظر آتی تھی جبکہ اس وقت جو بھلا اس کے سامنے تھی، وہ خاصی گریس فل اور میچور خاتون محسوس ہو

کپ لیوں سے لگایا۔ اس کا ناشا بھی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

خوب صورت پھول دار لانگ اسکرٹ میں ملبوس جوزفین کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ تھے۔ بڑی مدت بعد ملنے والا یہ نیا جوڑا پہن کر وہ کافی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ بچپن کا دور بس ختم ہوا ہی جاتا تھا اور نوجوانی کی آمد آمد تھی اور اسی حساب سے اس کے چہرے پر وہ روپ نظر آنے لگا تھا جو کسی منہ بند لونی کی کا خاصہ ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج اسے خود بھی اپنا آپ اچھا لگا تھا اور وہ اپنے اندر کسی تبدیلی کی آہٹیں سن رہی تھی۔ یہ آہٹیں آتی جوانی کی آمد کا اعلان تھیں لیکن عموماً بدرنگ و بوسیدہ لباس سے تن ڈھانپنے والی جوزفین کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ خوب صورت ہے اور ہرگز رتا دن اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ اپنے آپ سے بے نیاز دن بھر وہ باتو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی یا اپنے اور جوزف کے گھر کے کام نمٹاتی رہتی۔ اسے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ ہمیشہ ہی سے اس کی محبت کا دم بھرنے والے جوزف کی محبت کے رنگ بدلنے لگے تھے اور وہ کچھ خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لیے تو اب بھی جوزف ایک ایسا دوست تھا جس سے وہ خود بھی بے حد محبت کرتی تھی لیکن جوزف کی طرح ابھی اس کے دل نے اس محبت کو کوئی عنوان نہیں دیا تھا۔ وہ اس سے بڑی بے ریا محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ جوزف بھی اسے بے تحاشا چاہتا ہے اور جوزف کی محبت سے تو سب ہی واقف تھے اسی لیے تو کسی نے جوزف کے اس کے لیے کرمس کا خصوصی تحفہ لانے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا، نہ ہی اس بات میں کوئی معنی خیزی محسوس کی تھی۔

”یو آر لٹل سو پریٹی۔“ تو لیا فیکٹری میں دن بھر مشقت کرنے والی اس کی ماں کو بھی آج بہت عرصے بعد فرصت ملی تھی کہ اس کی طرف غور سے دیکھ سکے اور دیکھا تھا تو بے ساختہ ہی تعریف بھی کر ڈالی تھی۔

”تھینک یو سو مچ مام۔ جوزف کی چوائس اچھی ہے۔ وہ میرے لیے اتنا بیوٹی فل ڈریس لایا ہے کہ اسے پہن کر مجھے اچھا لگتا ہی تھا۔“ اس نے ماں کی بات کا جواب دیا اور پیروں میں جوتے پہننے لگی۔ یہ جوتے پچھلے کرمس پر اسے دلائے گئے تھے لیکن بے حد احتیاط سے پہننے کے بعد اب بھی اچھی حالت میں تھے۔ جوتے پہن کر

رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔ آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں، میں ناشتے سے پہلے فریش ہونا چاہتی تھی۔ آئی ہوپ کہ آپ لوگوں نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔“ ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے یہ چند جملے ادا کیے۔ اس کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور دلکش تھا۔ یقیناً جب وہ کلاس میں لیکچر دیتی ہوگی تو طلباء بہت دھیان سے اس کی بات سنتے ہوں گے۔

”انس اوکے۔ ہم میں سے کسی کو بھی آپ کا انتظار گراں نہیں گزرا۔“ فاروق نے اسے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کروانے لگا اس دوران میں ملازم نے میز پر ناشا لگانا شروع کر دیا تھا۔

”ہوں..... کرشن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کچھ بیمار ہیں اور ڈاکٹر کے دیے گئے تھدیلی آپ وہاں کے مشورے پر یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ تعارف سننے کے بعد اس نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے وہ مالکن تھی اس لیے ملازم نے اس کے پوچھے بنا بھی پچھلے میں موجود ان اجنبی افراد کے بارے میں اسے معلومات فراہم کر دی ہوں گی۔ ناشتے کے دوران ہی اس نے فاروق کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں سوال و جواب کیے اور پھر اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے حد مختصر ناشا کیا تھا۔ مکھن لگا ایک سلائس اور جوس کا گلاس بس یہ اس کا ناشا تھا۔

”معاف کیجیے گا۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں اس لیے آپ لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔“ وہ ان سے معذرت کرتی ہوئی ڈائننگ روم سے رخصت بھی ہو گئی۔

”کچھ بھی نہیں کھایا۔“ گولو نے ڈائننگ ٹیبل پر موجود ڈیسروں دیسی و بدیسی ناشتے کے لوازم پر ایک نظر ڈال کر گویا بھلا کی ناقدری پر افسوس کا اظہار کیا۔

”وہ کہہ تو گئی ہیں کہ تھکی ہوئی ہیں اور تھکن میں انسان سے زیادہ کھایا بچا کب جاتا ہے۔ تم جو ہوان چیزوں سے انصاف کرنے کے لیے۔ تم مزے کرو۔“ فاروق نے اسے جواب دیا۔

”ایں تو کھائے گا ہی۔ مالک نے کھانے کے لیے ہی یہ ساری نعمتیں اوپر سے اتاری ہیں۔“ گولو نے نہایت عزائم سے جواب دیا اور ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فاروق اس کا جواب سن کر مسکرایا اور چائے کا

جہاں سانا کلاز بھی مشکل ہی سے اپنی شکل دکھاتا تھا۔ مشنری سے وابستہ افراد کو اس محلے کا خیال آ جاتا تھا اور وہ چندے کی رقم سے تحائف سے لدے پھندے سانا کلاز کو اس طرف روانہ بھی کر دیتے تھے تو سانا کے پاس موجود تحفے اس محلے میں بے سہارا پھرتے تنگ دھڑنگ بچوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں کم پڑ جاتے تھے اور یہ تحفے کوئی ایسے قیمتی بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ سستے چاکلیوں کا پیکٹ، کریم لگے بسکٹ، رنگ برنگی گولیاں، مکی پلسلیں، لکھنے کی تختیاں، پلاسٹک کے ہار بندے بس یہی کچھ ہوتا تھا سانا کے پاس ان کے لیے۔ بچے ان تحفوں پر بھی ٹوٹ پڑتے تھے کیونکہ انہیں کوئی تحفہ دینے والا تھا ہی نہیں۔ زندگی کے پیسے کو کسی نہ کسی طرح متحرک رکھنے کی مشقت میں جتنا ان کے والدین کی اتنی استطاعت ہی نہیں تھی کہ کرسی منا سکیں۔ وہ کرسی کی صبح جاگنے پر اپنے بچوں کو ان کی کوئی من پسند شے یہ کہہ کر تحفہ نہیں دے سکتے تھے کہ رات سانا ان کے لیے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ باپ کی زندگی میں جوزفین کے لیے پھر بھی چھوٹے موٹے تحفے آ جاتے تھے لیکن اس کے بعد اب کہیں جا کر اسے کسی نے کچھ دیا تھا اور اسے یہ تحفہ بہت پسند آیا تھا۔ اس کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ سردی کا موسم ہونے کے باوجود اس نے اپنے لباس پر کوئی گرم سویٹر یا شال نہیں لی تھی۔ اصل میں وہ اس بوسیدہ لباس پر اپنا گھسا ہوا، رنگ اڑا سویٹر پہن کر اس کی شان نہیں گھٹانا چاہتی تھی اس لیے سردی برداشت کرنا قبول کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے جوزف نے البتہ گرم کپڑے پہن رکھے تھے یہ اور بات کہ کپڑے اپنی بدرنگی اور خراب فنگ کے باعث خود یہ گواہی دے رہے تھے کہ انہیں لنڈا بازار سے خریدا گیا ہے۔ لنڈا بازار سے اس گھسے ہوئے سوٹ کی خریداری اس لیے ممکن ہو سکی تھی کہ ماں کا بخار غیر متوقع طور پر جلد اتر گیا تھا اور وہ دوا کے خرچے سے بچ جانے والے روپوں سے اپنے لیے یہ لباس خریدا لایا تھا۔ باقی کے چند روپے اس نے اس سرکس میلے میں جانے کے لیے بچا لیے تھے جو خصوصاً کرسی کی وجہ سے لگا تھا اور وہ جوزفین کو اس میں گھمانا چاہتا تھا۔

”تم نے کبھی سرکس دیکھا ہے جوزف؟“ اس کے ساتھ ساتھ چلتی جوزفین نے اس سے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں دیکھا ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور دیوار میں نصب گول دھندلے سے آئینے میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینہ لمبائی کے رخ چٹھا ہوا تھا چنانچہ جب وہ اس میں اپنا عکس دیکھتی تھی تو وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود سچائی اپنی جگہ قائم تھی اور آئینہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اسے آواز دیتا ہوا جوزف گھر کے اندر آیا تو اس کی آنکھوں نے بھی یہی سچ کہا جسے اپنی دھن میں مگن جوزفین سن نہیں سکی۔

”تم ریڈی ہے جوزفین تو اب چلنے کا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو پورا انجوائے نہیں کر سکے گا۔“ جوزف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”یہ تو کب سے ریڈی ہے۔ بس مرر میں خود کو دیکھنے میں بڑی ہے۔ کہتی ہے می جوزف نے اتنا بیوٹی فل ڈریس گفٹ کیا ہے کہ اس کو پہن کر میں بھی بیوٹی فل لگنے لگی ہوں۔“ جوزفین کی ماں نے ہنس کر جوزف کو بتایا۔ جوزف اس بات کو سن کر محض ہنس پڑا اور اسے یہ کہنے کی جرات نہیں ہوئی کہ خریدتے وقت اسے یہ ڈریس جتنا اچھا لگا تھا جوزفین کے تن پر سجنے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ اسے جوزفین کی سوچ اور طبیعت کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر اپنے حالات بہتر بنانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس کے لیے اس طرح کے براہ راست اظہار بہت قبل از وقت بات ہو جاتی اور ممکن تھا کہ وہ ڈسٹرب ہو جاتی اس لیے جوزف کچھ کہنے میں احتیاط ہی کرتا تھا۔ پھر وہ خود بھی تو ابھی ایک نو عمر سا لڑکا ہی تھا جس کی اپنی بھی ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنے ہم عمر لڑکوں کو گلی کے کٹڑ، دکانوں کے تھڑوں اور اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر لڑکیوں سے متعلق بہت کھلی گفتگو کرتے سنا تھا لیکن وہ خود جوزفین کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت خاص اور مقدس تھی۔

”اب چلو بھی۔ کیا یہیں کھڑے بیٹے رہو گے؟“ جوزفین کو می کے تبصرے اور جوزف کی ہنسی نے جھینپ میں جکلا کر دیا تھا اور اسی جھینپ کو مٹانے کے لیے وہ جوزف سے تیز لہجے میں بولی تھی۔

”ہاں چلو، چلتے ہیں۔“ جوزف اس کے لہجے پر بوکھلاتا ہوا فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جوزفین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ دونوں اپنے کرسی کو انجوائے کرنے جا رہے تھے۔ وہ ایسی غریب بستی کے باشندے تھے

”وہاں بہت مزہ آتا ہے کیا؟“ جوزفین نے دریافت کیا۔

”ہاں، بہت مزہ آتا ہے۔“ اس کے معصوم اشتیاق کا جواب دیتے ہوئے وہ کبھی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سرکس مزہ کرنے نہیں، جزوقتی کام کرنے جاتا تھا جس سے اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کر سکے۔ ان کاموں میں سب سے اہم کام صفائی کا ہوتا تھا اور یہ صفائی کوئی معمولی نہیں ہوتی تھی۔ اسے انسانوں کے پھیلائے گند سے لے کر سرکس کے جانوروں کی غلاظت تک سب کچھ صاف کرنا پڑتا تھا۔

”تم کو بوائے ہونے کا بہت بینیفٹ ملتا ہے جوزف۔ تمہارا جودل چاہتا ہے کرتے ہو اور جہاں دل چاہتا ہے چلے جاتے ہو۔“ جوزفین نے اس پر رشک کیا۔ اس بار بھی جوزف بس مدبرانہ انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ راستے بھر جوزفین اس سے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی اور پھر جب وہ سرکس والے میدان میں داخل ہوئے تو جوزفین گویا جہان حیرت میں داخل ہو گئی۔ مختلف کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال، آرائش و زیبائش کی سستی اشیاء کی دکائیں اور مختلف تماشوں کے لیے اعلان کرتے سرکس کے منتظمین و مداریوں کے علاوہ جھولوں والے۔ ڈولی والے جھولے کے قریب پہنچ کر تو جوزفین کا دل مچل مچل گیا۔ لکڑی کی ڈولیاں جن میں چھوٹی بڑی عمروں کے بچے بیٹھے ہوئے تھے، جھولے والے کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ یہ ڈولیاں اوپر نیچے حرکت کرتی تھیں اور لمحوں میں اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر پہنچ جاتے تھے۔ حرکت کرتی ڈولیوں میں بیٹھے بچے پُرسرت چہنیں مار کر اور بھی جوزفین کے دل کو لبھاتے تھے لیکن وہ اس جھولے پر بیٹھنے کی اپنی خواہش کو اس لیے پورا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی مٹھی میں گنتی کے چند ہی سکے دبے تھے جو اس کی ماں نے اسے اس میلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے عنایت کیے تھے لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ان سکوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے چنانچہ اپنی خواہش کو دل میں ہی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر جوزف نے اس کی خواہش کو اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا چنانچہ اصرار کر کے اسے جھولے میں بٹھایا اور پیسے اپنے پلے سے دیے۔ خود وہ یہ کہہ کر ساتھ نہیں بیٹھا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور ایسے بچوں والے شوق نہیں رکھتا۔ جھولا جھلانے کے بعد وہ

اسے اسٹالز کے درمیان لیے گھومتا رہا تھا۔ خریداری تو دونوں ہی کو نہیں کرنی تھی کہ جیب اجازت نہیں دیتی تھی لیکن وہاں موجود ہر شے کو انہوں نے بہت شوق سے دیکھا اور ان کی گیتیں بھی معلوم کیں۔

”تو ادھر بیٹھ جوزفین۔ اپن حیرے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہے۔“ جب وہ اسٹالز کے درمیان بہت دیر تک گھوم چکے تو جوزف نے اس سے کہا۔ وہ اس چھولداری کے قریب بیٹھ گئی جس میں سنا تھا کہ جل پری یعنی مچھلی کے دھڑ والی عورت رکھی گئی تھی۔ اس عورت کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے شوق میں کئی من چلے اس چھولداری کا رخ کر رہے تھے۔ یہاں ترپالوں کی مدد سے کئی ایسے پارٹیشن بنائے گئے تھے جن کے باہر بڑے بڑے باتصویر بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک بند، بھونپور اعلان بھی کرتا جاتا تھا کہ ترپال کے اس پار آنے والوں کے لیے کیسی حیرت و مسرت سے بھرپور لمحے منتظر ہیں۔ کہیں موت کا کنواں تھا تو کہیں رسی پر چلتے بازی گر..... کہیں بات بات پر مجمعے کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والے جو کر کا تذکرہ تھا تو کہیں آگ کے دائروں سے گزر جانے والے ماہر انسان و حیوان کے قصے۔ اس نے اور جوزف نے سرکس کے اس میدان میں گھومتے ہوئے ہر طرح کا اعلان سنا تھا۔ ان کے دل اندر ہی اندر للچائے بھی تھے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں سے ایسے عجوبوں کو دیکھیں لیکن ایسے ہر تماشے کو دیکھنے کے لیے الگ سے ٹکٹ لینا پڑتا اور ٹکٹ کے لیے رقم ان کی جیبوں میں نہیں تھی۔ خالی جیبیں رکھنے والوں کے رانا تمام خواہشات سے بھرے انہیں دبائے رکھنے میں ماہر ہوتے ہیں سو ان دونوں نے بھی اپنی خواہش کو دل میں دبایا تھا۔

جل پری والی چھولداری کے قریب بیٹھی جوزفین نے جوزف کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس اسٹال پر پہنچ گئی۔ جہاں اس نے مختلف رنگوں کے ٹکوں والی انگوٹھیاں دیکھی تھیں۔ پلاسٹک کے نگینوں والی ان انگوٹھیوں کے نرخ ایسے تھے کہ وہ ان میں سے ایک عدد انگوٹھی خرید سکتی تھی۔ انگوٹھی اس نے پہلے ہی پسند کر لی تھی لیکن جوزف کی موجودگی میں خریدنے سے گریز کیا تھا۔ اب جو موقع ملا تو جھٹ پٹ جا کر خرید ڈالی۔ سلور کے ہلکے سے دھاتی رنگ میں جزا کی جیسے رنگ کا بیضوی نگینہ دیکھنے میں آنکھوں کو بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ انگوٹھی خرید کر واپس آئی تو جوزف ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹالز پر بہت زیادہ رش ہے، اس رش میں کچھ خرید کر لانے میں وقت تو لگتا ہی تھا چنانچہ وہ اطمینان سے بیٹھی جل پری سے متعلق بھونپو پر کیے جانے والے انکشافات سنتی رہی۔ بھونپو میں بولنے والے کا زور بیاں ایسا تھا اور اس نے جل پری کی اتنی خصوصیات گنوا ڈالی تھیں کہ لوگ اس طرف کھینچے چلے آ رہے تھے۔ جوزفین نے جتنے پیسوں سے انگوٹھی خریدی تھی اتنے میں جل پری کو بھی دیکھ سکتی تھی لیکن اسے اپنی خریداری پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ یہ انگوٹھی اس نے جوزف کے لیے لی تھی اور جوزف کے لیے اتنی سی قربانی دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

”لے پکڑ، اسپیشل چنا چاٹ کی پلیٹ بنوا کر لایا ہوں تیرے لیے۔ ساتھ یہ ٹھنڈی سوڈے کی بوتل بھی ہے۔“ وہ ارد گرد پھیلی رونق دیکھنے میں مگن تھی کہ اپنے قریب سے جوزف کی آواز سن کر چونکی۔ وہ چینی کی سفید پلیٹ اور سوڈے کی ہری بوتل ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔ جوزفین نے چینی کی پلیٹ کو تھام لیا۔ اس میں چنا چاٹ موجود تھی۔ پلیٹ میں رکھے سلور چمچے سے اس نے چاٹ کا مسالا ملا یا اور پہلا چمچہ منہ میں ڈالا۔ پتلی دال، موسم کی سب سے سستی سبزی، موٹے چاول اور بے چھنے آٹے کی روٹی کھانے کی عادی جوزفین کی زبان کو اس تیسرے درجے کی چنا چاٹ کا ذائقہ بھی بہت عمدہ معلوم ہوا۔

”بہت ٹیسی ہے۔ تم بھی کھاؤ۔“ بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے اس نے پلیٹ جوزف کی طرف بڑھائی جو سوڈے کی بوتل ہاتھ میں پکڑے اب اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا۔

”تو کھا۔ اپن کا پیٹ ذرا گڑبڑ ہے تو اپن یہ نہیں کھا سکتا۔“ جوزف نے انکار کیا۔

”یہ تو بڑا برا ہوا۔“ جوزفین کو افسوس ہوا کہ جوزف کو اتنے مزے کی چیز سے محروم رہنا پڑے گا خود اسے چاٹ اتنی پسند آئی تھی کہ یکے بعد دیگرے تین چار چمچے منہ میں ڈالتی ہی چلی گئی۔ مرچیں ذرا زیادہ تیز تھیں، اس کی زبان جلنے لگی۔ جوزف نے فوراً اس کی طرف سوڈے کی بوتل بڑھائی۔ اس نے جلدی سے ایک بڑا سا گھونٹ لیا پھر خیال آنے پر بولی۔

”تم سوڈا تو پی سکتے ہو جوزف۔ سوڈے سے تو سنا ہے کہ پیٹ کی خرابی ٹھیک ہو جاتی ہے۔“

”نہ بھی نہ۔ اپن نہیں پیتا سوڈا اوڈا۔ پی کر گلا خراب

ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“ اس نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

”اور جو میرا گلا خراب ہو گیا؟“ چنا چاٹ اور سوڈے کی بوتل کے خوشگوار تجربے سے لطف اندوز ہوتی اس بار وہ ذرا سی ٹھنکی اور جوزف کو غور سے دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ تو آرام سے پی۔“ جوزف نے اسے تسلی دی۔

”نہیں۔ اگر تم نہیں کھاؤ پیو گے تو میں بھی کچھ حلق سے نیچے نہیں اتاروں گی۔“ وہ مضبوطی سے منہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

”مجھے بولا ہے نا کہ اپن کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔“ جوزف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ سب میں نہیں جانتی۔ بس تمہیں بھی میرے ساتھ کھانا پینا ہوگا۔“ اس نے ضد کی کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمیشہ اس کی خاطر قربانی دینے والا جوزف اس وقت بھی قربانی دے رہا ہے۔ یقینی طور پر اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ دونوں کے لیے الگ الگ چیزیں خرید سکتا اس لیے صرف جوزفین کے لیے لے آیا تھا اور خود اس لیے حصے دار نہیں بن رہا تھا کہ وہ دل بھر کر کھاپی لے۔

”بھئی بھئی تو بہت تنگ کرتی ہے۔ لا کھلا اور اگر میرے پیٹ کا درد بڑھانا تو تم ذمے دار ہوگی۔“ جوزف کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ان دونوں نے مل کر چنا چاٹ کی پلیٹ اور سوڈے کی بوتل ختم کی۔ جوزفین کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ گھر چلنے کو کہے گا لیکن اس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ اسے ایکروٹ (بازی گر) کے کرتب دکھانے لے جا رہا ہے۔

”تمہارے پاس اس کے لیے پیسے ہیں؟“ جوزفین نے اس کا پروگرام سن کر خشک سے پوچھا۔

”نہیں پر اپن کی ٹکٹ دیکھ کر پبلک کو اندر چھوڑنے والے لڑکے سے فرینڈ شپ ہے۔ اس نے اپن کو بولا تھا کہ آ جانا۔ موقع لگا کر وہ اپنے کو ایسے ہی اندر بھیج دے گا۔“ جوزف نے اسے بتایا۔ بغیر ٹکٹ کے تماشا دیکھنے جانے کا تجربہ جوزفین کے لیے انوکھا تھا۔ اسے آخری لمحے تک یہ ڈر رہا تھا کہ کوئی انہیں اندر جانے سے روک لے گا۔ وہ ذرا سیدھے سیدھے راستے پر چلنے والی کچھ کچھ ڈرپوک لڑکی تھی۔ اگر اسے کرتب دیکھنے کی اتنی شدید خواہش نہ ہوتی تو شاید کبھی اتنا خطرہ نہ مول لیتی۔ اندر جاتے ہوئے اس کے دل میں یہ خواہش بھی جاگی تھی کہ کاش جل پری کے ٹکٹ چیکر

شیش محل

خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”فاروق بھائی کی طبیعت کیسی تھی؟ وہ ٹھیک تو تھے نا؟“ ربن کو شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے سجو نے اس سے دریافت کیا۔ ربن کو بمبئی پہنچے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر اڈے پر موجود افراد کھل اٹھے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ خوب بھینچ بھینچ کر اس سے گلے ملیں لیکن اول تو ربن کا احترام اور دوسرے رامو کی سختی نے انہیں اپنے جذبات پر بند باندھنے پر مجبور کر دیا۔ رامو نے ان سب کو ربن کے گرد جمع ہوتے دیکھ کر ڈپٹ دیا تھا کہ دادا ابھی سفر سے تھکا مانداداپس آیا ہے اس لیے اسے نہادھو کر سفر کی دھول اور گرد اتارنے اور آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ربن بھی شاید ابھی میل ملاقات کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس نے رامو کو انہیں ڈپٹنے پر نہیں ٹوکا۔ وہ سارے خاموشی سے منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد ربن سچ سچ غسل کر کے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد اس نے رامو کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ رامو اس کے کمرے میں آنے سے قبل سجو کو ہدایت دے کر آیا تھا اس لیے وہ ٹرے میں شربت کے گلاس اور کھانے کے دو تین ہلکے پھلکے آئٹم رکھ کر لے آیا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اور رامو کا خیال تھا کہ راستے میں کھانا کھا لینے کا بتا کر آنے کے بعد کچھ کھائے پیے بغیر سو جائے والے ربن کو بھوک محسوس ہو رہی ہوگی۔ سجو نے نہایت پھرتی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور اب شربت کا گلاس ربن کو پیش کرتے ہوئے اس سے اپنے دل کی بات پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہی ہے رے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جائے گا تو لوٹ کر ادھر ہی آئے گا۔ کاہے کو اتنا پریشان ہوتا ہے۔“ ربن نے اسے تسلی دی۔

”اور گولو..... وہ کیسا ہے؟“

”مزے میں ہے سالہ۔ پر تم لوگوں کو یاد بھی کرتا ہے۔“ ربن نے ہنس کر بتایا۔

”یہ اپنا سجو بے چارہ اداس ہو گیا ہے۔ اس کے فاروق بھائی اور گولو یہاں نہیں ہیں تو اس کا من ہی نہیں لگتا ہے۔ سچ بولوں استاد تو جب سے تم لوگ گئے ہو، اس کے بعد

سے جوزف کی دوستی ہوتی تو وہ کہانیوں میں سنی جل پری کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتی لیکن وہ ٹکٹ چیکر تو کوئی بڈھا پھولس تھا۔ اس سے بھلا جوزف کی کیسے دوستی ہو سکتی تھی۔ یہاں تو اس نے تقریباً اپنے ہی ہم عمر ٹکٹ چیکر سے یارانہ گھاٹ کر مطلب پورا کر لیا تھا۔ بازی گروں والے حصے میں آکر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بازی گرنے ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ اسے کئی بار اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بغیر کسی سہارے کے تنہی ہوئی رسی پر چلنا اور مختلف کرتب دکھانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ بازی گرنے اس کا دل موہ لیا اور جب وہ وہاں سے باہر نکل رہی تھی تو اس کے دل سے جل پری کو نہ دیکھ پانے کا غم نکل چکا تھا۔ واپسی کے راستے میں وہ جوزف سے بازی گرنے کے ایک ایک کرتب کو ڈسکس کرتی رہی اور وہ مدبرانہ انداز میں مسکراتا رہا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اسے جوزف کے لیے خریدی گئی انگوشی یاد آئی۔

”پہلی کرسمس جوزف۔“ اس نے انگوشی اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ کیا؟“ جوزف انگوشی کو دیکھ کر بیک وقت حیران اور خوش ہوا۔

”میں نے تمہارے لیے کرسمس کا گفٹ لیا ہے۔ میرے پاس پیسے کم تھے نا تو بس یہی لے سکی۔“ اس نے کچھ جھینپے ہوئے شرمندہ سے انداز میں بتایا۔

”اپن کے لیے تو یہ بھی بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ تو نے اپن کے لیے لی ہے۔“ جوزف کی آنکھیں جھلسلا سی گئیں اور اس نے انگوشی اپنی انگلی میں پھن لی۔

”بہت بیوٹی فل ہے۔“ ساتھ ہی اس نے تعریف بھی کی۔

”سچ۔“ جوزفین اس کی تعریف پر کھل اٹھی۔

”بالکل سچ۔ اپن اسے ہمیشہ سنبھال کر رکھے گا۔“

جوزف نے اسے یقین دلایا۔ وہ اپنے قول میں کتنا سچا تھا، اس کی گواہ ڈائری پڑھتی جولیٹ خود تھی۔ لڑکپن کے دور میں جوزفین کی طرف سے تحفہ ملی وہ انگوشی جس کا سلور رنگ کالا پڑ چکا تھا، ہمیشہ جوزف کے پاس رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دور میں جو انگوشی اس کی درمیانی انگلی میں آتی تھی، وہ تنگ ہو جانے کے باعث بعد میں اپنی چھوٹی انگلی میں پھننے لگا تھا۔ مرتے وقت بھی وہ انگوشی اس کی انگلی میں موجود تھی اور باوجود کوشش کے اتاری نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اس انگلی میں بھی وہ بے حد تنگ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دعوے میں اتنا سچا اور پکا نکلا تھا کہ جوزفین کی دی ہوئی اس انگوشی کو مر کر بھی

آج رسوئی سے خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔ ورنہ تو اپن لوگوں کو تو یہ کچا پکا جلا بھنا پتا نہیں کیسا کیسا پکا کر کھلا رہا تھا۔“ رامو کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ سجو نے اس پر خفا سی نظر ڈالی اور احتجاج کے انداز میں بولا۔

”جیا ذتی تو نہیں کرو استاد۔ اپن روز تم سے پوچھ کر تمہاری مرضی کا کھانا ہی پکا رہے تھے۔ ابھی کل ہی بکرے کا بھنا گوشت نہیں پکا کر کھلایا تھا کیا؟“

”سالے وہ خالی بھنا گوشت کہاں تھا۔ وہ تو جلا بھنا گوشت تھا۔“ رامو کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ اس بار سجو کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھرے اور وہ آہستہ سے بولا۔

”وہ تو اپن ذرا فاروق بھائی کی طبیعت کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا تو دھیان ہٹا دیا پر سے تھوڑی دیر کو ہٹ گیا اور ذرا سی لگ گئی۔“

”دیکھا دادا! یہاں سب کیسے دیوانے ہیں اس راجے مہاراجے کے۔ پکانے والے سے ڈھنگ سے پکایا نہیں جاتا اور کھانے والوں کے حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دادا اور فاروق بھائی کے بغیر کھانے میں سواد نہیں آ رہا۔“ رامو نے جتے ہوئے رین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

”اپنا ہیرو ہے ہی ایسا۔ اللہ نے کسی خاص مٹی سے اسے بنایا ہے کہ جو دیکھے اور ملے اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔“ رین کا لہجہ بھی فاروق کی محبت سے چھوڑ تھا۔

”بھگوان اسے جلدی اچھا کر دے تاکہ اپنے اڈے کی رونق لوٹ آئے۔“ رامو نے خلوص دل سے دعا کی جس پر سجو اور رین دونوں ہی کے دل آئین پکاراٹھے۔ دعا مانگنے والا کس کو پکار رہا تھا انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کیونکہ ان کے لیے اصل اہمیت اس خلوص اور محبت کی تھی جو وہ فاروق کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا۔

”جولی کا کیا حال ہے۔ باپ کے مرنے کا تو بہت اثر لیا ہوگا اس نے؟“ سجو کمرے سے چلا گیا تو رین نے رامو سے دریافت کیا۔

”وہ تو لیتا ہی تھا۔ جانی بتا رہا تھا کہ بالکل مسم ہو گئی تھی۔ اپن کا تو اس سے ملنا ہوا ہی نہیں، بس کر یا کرم میں باہر کے باہر ہی گیا تھا۔ جانی ہی ادھر کی ساری دیکھ رکھ کر تا رہا۔ اپن کا تو ایک پیر ادھر تھا تو دو جا ادھر مجھ والے اڈے پر بلکہ ادھر تو ذرا کم ہی رہا، زیادہ ادھر ہی نیم گزارا۔ مجھ جنے کیسے چوکی پر بیٹھ گیا تھا، پر اڈا چلانے کا ڈھنگ اسے نہیں آتا تھا۔ بہت کم ڈھنگ کے بندے ہیں اس کے اڈے پر،

سارے حرام خوردوں کو جمع کر رکھا ہے۔ ایسے بے تحشے بیلوں کو ٹکیل ڈال کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ سالے بار بار رسی تڑاتے ہیں۔ سویرے جلدی اٹھنا، ورزش کرنا، چاقو اور خنجر زنی کی پریکٹس کرنا سب انہیں کھلتا ہے۔ علاقے میں بھی بڑی دھاندلی مچا رکھی تھی انہوں نے۔ جس کا جیسے من کرے اپنی چلا رہا تھا۔ پھل، سبزی اور گوشت والے سے لے کر ٹائی اور لوہا تک سب کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اپنا راج جان کر جدھر من بولے منہ مارتے پھر رہے تھے۔ مجھ نے کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ اسے اس کا حصہ پورا لا کر دے دیں پھر جو چاہے موج مستی کریں۔ ایسے بے لگاموں کو اب حساب کتاب دینا پڑ رہا ہے اور اصول قاعدے سے چلنا پڑ رہا ہے تو بوکھلائے ہوئے ہیں۔ تمہارے نام کا ڈنڈا سر پر نہیں ہوتا تو رسی تڑوا کر بھاگتے۔ ابھی سمجھو سالے مجبوری میں دبے ہوئے ہیں پر کتنوں کے من میں کا لک ہے کہنا مشکل ہے۔ ایک ایک پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔“ رامو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

”اپنے کو بھی یہ سب پتا ہے پر اپنے کو بھی چاہک تھا م کر سرکش گھوڑوں کو قابو کرنا آتا ہے۔“ رین نے اسے جواب دیا اور حقے کی منہ سے لگا کر ایک ساتھ دو تین کش لیے۔ یہ حقہ سجو ہی کمرے میں رکھ کر گیا تھا۔ رین کو اس کے استعمال پر بھی اور دوسرے معاملات کی طرح زبردست قابو حاصل تھا۔ پیتا تو یوں کہ بڑے بڑے عادی حقے بازوں کو مات دے دیتا لیکن پینے کے مواقع میسر نہ آتے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا اور نہ ہی وہ عادی افراد کی طرح طلب کے ہاتھوں ستایا ہوا نظر آتا۔

”جوزف کا افسوس کرنے اپن جولی کے پاس جائے گا۔ محلے داری میں بھی اپن کو اس کا خیال رکھنا ہی تھا، پر اپنے شہزادے کے دل کی رانی ہے تو اس کا حق اور بھی زیادہ بنتا ہے۔ یاد رکھنا رامو..... اپن بھی آگے پیچھے ہو بھی جائے تو جولی کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کل کو شہزادہ شکایت نہ کرے کہ کوئی کمی رہ گئی۔“

”ٹھیک ہے دادا۔“ رامو نے اس کی ہدایت سن کر فرمانبرداری سے کہا۔

”اور یہ اپنی ثریا بانو کا کیا حال ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں اسے؟“ جولی کے بعد اسے ایک اور اہم معاملہ یاد آیا۔

”ٹھیک ہے وہ بھی۔ اپن نے اس کی طرف راشن دے کر بندہ بھیجا تھا پر اس نے شکر یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا۔ بولتی تھی سلانی کڑھائی کا کام کر کے اپنی روزی کما رہی ہے

اس لیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رامو نے اسے رپورٹ دی۔

”اچھی بات ہے۔ بندہ کسی کا دیا لے کر کھانے کے بجائے اپنے ہاتھ کی تھوڑی بھی کھائے تو زیادہ خوش رہتا ہے۔“ ربن کوثر یا بانو کا راشن لوٹا دینا برا نہیں لگا۔

”ہاں دادا یاد آیا۔ وہ غلامو آیا تھا۔ بولتا تھا کلکتے میں اس کے دور کے رشتے داروں میں ایک لڑکا ہے۔ اس کی بیوی بچی کو جنتے ہوئے مر گئی تھی۔ چھوٹی بچی کو ماں کے بنا پالنے میں اسے سخت مشکل ہو رہی ہے اس لیے چاہتا ہے کہ دوسری شادی کر لے۔ شادی کے لیے اس کی بس اتنی شرط ہے کہ عورت سمجھ دار اور ہمدرد ہو۔ بچی کی اچھی تربیت بھی کرے اور اس سے محبت سے بھی پیش آئے۔ غلامو بولتا تھا ثریا بانو کے لیے یہ رشتہ اچھا رہے گا۔ اپن بولا دادا آجائے تو اس کے کانوں میں بات ڈالتے ہیں۔ پھر جو دادا کی مرضی۔“

”اپنی کیا مرضی۔ اصل ہاں نہ تو ثریا بانو خود یا اس کے ماما می کر سکتے ہیں پر تو غلامو سے کہنا کہ اپن سے آکر مل لے۔ اپن پہلے لڑکے کے بارے میں ساری جانکاری کر لے پھر بات آگے بڑھائیں گے۔“ ربن نے اسے جواب دیا پھر دوسرے موضوع پر آگیا۔

”بھائیہ سیٹھ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے اسے؟“

”ارے نہیں دادا۔ سیٹھ تو بڑا خوش ہے۔ بولتا تھا تم لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ ایسے ایسے لوگوں سے بھاڑا نکلتا لیا جنہوں نے سال سوا سال سے ایک پائی بھی نہیں دی تھی اور جگہ خالی بھی نہیں کرتے تھے۔ اپن بولا سیٹھ چتا نہ کرو۔ تم نے یہ ذمے داری ربن دادا کے اڈے کو دے دی ہے تو اب کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ دم بھی مار سکے۔ ہر مہینے پابندی سے کرایہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔“ رامو نے رپورٹ دی۔ بھائیہ سیٹھ نے اپنے اس قسم کے سارے کام ربن کے حوالے کر دیے تھے۔ وہ اچھے خاصے کاروبار سے حاصل ہونے والے ٹکڑے منافع کو عمارتیں اور دکانیں خرید کر مزید منافع کما رہا تھا لیکن بعض کرائے دار کرایہ دینے کے معاملے میں بڑی آنا کانی کرتے تھے۔ سیٹھ کو شک تھا کہ کرائے داروں کی ہٹ دھرمی سے زیادہ یہ اس کے منشی کی نااہلی تھی جو ان لوگوں سے کرایہ وصول کرنے میں ناکام رہتا تھا چنانچہ اس نے منشی سے چارج لے کر یہ کام ربن کے حوالے کر دیا تھا۔

گولڈن نمبر

سردار گھر میں داخل ہوا۔

بیوی۔ ”یہ آپ کے چہرے پہ کیا ہوا ہے؟“
سردار۔ ”کجنت نادرہ والوں نے مارا ہے۔“

بیوی۔ ”کیوں؟“

سردار۔ ”ارے پتا نہیں، لگتا ہے پاگل ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ شاختی کارڈ کے گولڈن نمبر دکھاؤ تو پٹائی شروع کر دی..... ہائے بہت درد ہو رہا ہے۔“

★...★★...★

وہم

ٹیچر۔ ”بچو! نفل ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی مثال دو۔ جیسے میں خوب صورت تھی۔ میں خوب صورت ہوں۔ میں خوب صورت رہوں گی۔“
بچہ۔ ”مس! آپ کو وہم تھا، آپ کو وہم ہے، آپ کو وہم رہے گا۔“

★...★★...★

ایک سردار کو نیند نہیں آرہی تھی، سوچا سگریٹ پی لے۔ ماچس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا۔ بالآخر ماچس ہو کر موم بتی بجھا کر سو گیا۔
مرسلہ۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور، ہزارہ

تنبیہ

اسکول کے کوریڈور میں اکثر بچے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے ڈانٹتے ہوئے تنبیہ کی۔ ”اگر اب کوئی بچہ مجھے بھاگتا ہوا نظر آتا تو میں نے پکڑ لینا ہے اور دو لگانے ہیں۔“
تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا بچہ اکیلا بھاگتا ہوا آ رہا تھا کہ میں نے پکڑ لیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بچے نے مصومیت سے کہا۔ ”دو لگالیں میم جی..... دو لگالیں پھر مجھے جانے دیں، مجھے جلدی ہے۔“

مرسلہ۔ عذرا ہاشمی، الائیڈ اسکول گڑھ موڑ

بھائیہ کا شمار ان دولت مندوں میں ہوتا تھا جو باقاعدہ کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے ذرائع آمدنی ایسے ہوتے ہیں جن پر قانون گرفت کر سکے لیکن وہ پیسے پر جان بھی دیتے ہیں اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ آتا ہوا پیسا کسی صورت رکھنے نہ پائے۔ اب چاہے اس پیسے کے حصول کے لیے انہیں کسی غی گردن پر پیر ہی کیوں نہ رکھنا پڑے، اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ بے شمار ذرائع سے پیسا کمانے والے اس سا ہوکار کو اس بات سے بھی تکلیف ہوتی تھی کہ دو کمروں کے فلیٹ میں رہنے والا خاندان جس کا سربراہ بیمار یا بے روزگار ہے، چند سو کی رقم ادا کرنے سے رہ جائے۔ وہ انسانی ہمدردی یا فلاحی کاموں میں پیسا خرچ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ ہاں ذاتی آرام اور عیاشی کے لیے بے دریغ دولت لٹا سکتا تھا جب ہی تو بمبئی کی فلم نگری میں بھی اپنا پیسا لگا رکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسرز اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے کہ وہ ان کی فلم پر پیسا لگائے کیونکہ وہ بہت دل کھول کر پیسا لگاتا تھا، یہ اور بات کہ اس کے لگائے گئے پیسے کا تاوان فلم کی ہیروئن یا کسی دوسری خوش شکل اداکارہ کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ معذور ہونے سے قبل تو وہ بہت ہی عیاش تھا البتہ اب معذوری اور آئے دن کی بیماری نے اسے لگام ڈال دی تھی۔

”سیٹھ خوش ہے تو یہ اپن کے لیے اچھا ہے۔ وہ بگڑی پارٹی ہے، اس سے بنا کر رکھنے میں اپنا فائدہ ہے۔ اب دیکھ کہ اسی کی وجہ سے فاروق شملہ میں کتنے مزے سے رہ رہا ہے۔ ان سیٹھ لوگوں کے بہت اد پر تک تعلقات ہوتے ہیں۔ اپنے کو کوئی مشکل ہوئی تو سیٹھ اپنا ساتھ دے گا۔ فاروق کی گرفتاری کا ٹیم یاد ہے نا تجھے۔ کیسے رات بھر خوار ہوئے تھے تب جا کر اس کا پتا چلا تھا۔ ویری ہو جانے کی وجہ سے اس کا اتنا نقصان بھی ہوا۔ سر کی چوٹ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اپن کا سینہ چلنے لگتا ہے اس وقت کو سوچ کر۔ اپنے پر ایسی نہیں گزرتی تو بھی سیٹھ کی آفر کو نہیں ماننے والے تھے۔ اپنے جیسے آزاد طبیعت کے بندے کے لیے یہ ڈیوٹی بڑی بھاری ہے پر اپن فاروق کے لیے اور تم سب کے لیے راضی ہو گیا۔ حالات ویسے بھی بہت خراب ہیں۔ ایسے میں اپن بھی ذرا احتیاط سے چلے تو اچھا ہے۔“ ربن کچھ ادا اس تھا۔

”اپن سب سمجھتا ہے دادا۔ اپن نے اتنا ٹیم تمہارے ساتھ گزارا ہے۔ اپن کیسے نہیں سمجھے گا کہ تم نے کوئی کام

کیوں کیا ہے۔“ رامو نے جیسے اس کی دل جوئی کی۔

”ادھر گورے کی بھی کوئی خبر ہے کہ نہیں۔ حرام کا جٹ انگلستان سے واپس لوٹا کہ نہیں؟“ اس نے انگریز افسر ولیم کے بارے میں دریافت کیا۔ ولیم وہ شخص تھا جو مجو دادا کے ساتھ چاند بانو کے کوٹھے پر اس وقت پہنچا تھا جب فاروق چاند بانو کی پُر زور دعوت پر وہاں اس سے ملنے گیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہونے والی چاند بانو نے فاروق کی موجودگی میں کسی سے بھی ملاقات سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجو اور ولیم نے اس انکار کو اپنی بے عزتی جانا اور مرنے مارنے پر آگئے۔ فاروق نے اکیلے ہونے کے باوجود بہت بہادری اور ذہانت سے ان لوگوں پر قابو پایا اور انگریز افسر ولیم کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکل گیا لیکن بعد میں ولیم نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے فاروق کو گرفتار کر دیا۔ تھانے میں فاروق کو بے حد تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کی ایک نشانی اس کے سر کی چوٹ بھی تھی۔ فاروق کے ساتھ اس سلوک کا بدلہ لینے کا ربن نے عہد کر رکھا تھا۔ مجو دادا کو اس کے اڈے پر اس کے لوگوں کے سامنے خاک چٹا کر اڈے کی گدی سے بے دخل کرنے کے علاوہ ساری عمر کے لیے چاقو پکڑنے سے محروم کر دینے کی سزا دی جا چکی تھی جبکہ ولیم اپنے انجام سے اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ فاروق والے واقعے کے فوراً بعد اپنے خاندان کو ہندوستان سے نکل کرنے کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کے باعث اپنے خاندان کو انگلستان واپس منتقل کر دینے والا ولیم خود واپس ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتا تھا اور ربن اس کی واپسی کا خطر تھا۔

”ابھی کدھر سے لوٹے گا دادا۔۔۔ انگلستان کوئی قریب رکھا ہے کیا۔ سنا ہے ساتھ میں بہت سامان تھا اس واسطے پانی کے جہاز سے گیا ہے۔ واپس پھر کر آنے میں اسے ٹیم تو لگتا ہے نا۔“ رامو نے اسے جواب دیا تو وہ ذرا جھینپ گیا اور بولا۔

”یہ جو سینے میں آگ لگی ہے نا رامو، اس نے ساری عقل ماردی ہے۔ سامنے کی بات بھی نظر نہیں آتی۔“

”چٹا نہیں کرو دادا۔۔۔ بدلہ تو اپنے کو لینا ہی ہے۔ وہ گورا افسر ہے تو اپن اسے اپنے شہزادے کی چوٹ، شام

تھوڑی کر دے گا۔ پورا حساب دینا ہوگا اسے۔“ رامو نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد بھی وہ دونوں مختلف امور پر ایک

گیا تھا، اس پر کہاں اس حسن کا جادو چلتا تھا۔ اس نے اگر اس پر بھی ستائی نظر ڈالی بھی تو وہ نظر ایسی ہی تھی جیسی کسی خوب صورت منظر، تصویر، زیور، کپڑے یا برتن پر پڑنے والی نظر ہوتی ہے۔ جذبات سے خالی صرف اور صرف ستائش سے پر نظر..... اور اس نظر کی بے اعتنائی نے اس کے لیے اس کا حسن بے معنی کر دیا تھا۔

”میں قربان جاؤں۔ یہ میری چاند بانو ہے۔ اللہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کتنی حسین لگ رہی ہے۔ جاؤ میاں جا کر پروڈیوسر صاحب سے بولو کہ کوئی بکرا وغیرہ منگوائیں بے بی کا صدقہ دینے کے لیے۔“ زمرہ بائی جو کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے میک اپ روم سے باہر گئی تھی، اسی وقت واپس آئی اور چاند بانو کو دیکھ کر صدقہ واری جانے لگی۔ حقیقت تھی بھی یہی کہ چاند بانو معمول سے کئی گنا بڑھ کر خوب صورت لگ رہی تھی حالانکہ آج وہ کوئی پہلی بار نہیں بنی سنوری تھی۔ ان کے پیٹے میں تو کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ہی میدان مارنے کو اتر جاتا ہے لیکن اس تیاری اور اس تیاری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آج اس کا حسن فلم نگری کے معروف مشاق آرٹسٹ کے ہاتھوں سنور کر ایسی اچھوتی چھب دکھا رہا تھا کہ زمرہ بائی بھی دنگ رہ گئی تھی۔

”مانتی ہیں نا بائی جی ہمارے فن کو۔“ میک اپ آرٹسٹ اس کے بے ساختہ تبصرے کو سن کر فخر سے بولا۔

”کمال تو ہمارا ہے جو ہم نے ایسا نایاب ہیرا آپ کے حوالے کیا۔“ زمرہ بائی نے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ہیرا جتنا نایاب ہو، اس کو تراشنے والے ہاتھوں کو اتنا ہی ماہر ہونا چاہیے بائی جی۔ نایاب ہیرا اگر کسی اناڑی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی قدر و قیمت بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتی ہے۔ ایسے نایاب ہیروں کو تراشنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔“ اپنے فن پر نازاں اس نے اپنے حق میں دلیل دی۔

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ زمرہ بائی نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”شارٹ شروع ہونے ہی والا ہوگا۔ تم تو ریڈی ہونا بے بی؟“ اس بار اس کی مخاطب چاند بانو تھی۔ چاند بانو نے فقط اثبات میں سر کو جنبش دے کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے فلم نگری میں قدم رکھنے پر زمرہ بائی کتنی محوش ہے۔ اس کا تو جیسے یہ برسوں پرانا کوئی خواب تھا

دوسرے سے گفتگو کرتے رہے۔ سب نے کھانا کتنے کی اطلاع دی تو وہ اٹھ کر سب کے درمیان آئے۔ دسترخوان پر سچ سج بڑی رونق تھی اور سارے کمرے میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکرار ہی تھیں۔ ربن کو اپنے درمیان پا کر کمرے میں موجود تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے۔ کھانے کے دوران ربن سب کا حال احوال پوچھتا رہا اور انہیں فاروق کی طبیعت کے بارے میں سلی دی۔ اس کی طرف سے بولنے کی اجازت پا کر سب ہی اپنی اپنی کتھا سنانے لگے۔ باتوں باتوں میں کھانا کیسے ختم ہوا پتا ہی نہیں چلا۔ خالی ڈونگے اور ڈشیں دیکھ دیکھ کر سب کا خون بڑھتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ آج بہت دنوں بعد اڈے پر رہنے والوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

☆☆☆

چاند بانو نے سرخ بناری چوڑی دار پاجامے پر خوب گھیردار سفید فرائ پہنی ہوئی تھی۔ فرائ کے دامن، آستینوں اور گلے پر سرخ موتیوں اور سنہری کلا بتو کا کام بنا ہوا تھا۔ میک اپ آرٹسٹ نے لباس کے رنگ کے حساب سے اس کا شوخ میک اپ کیا تھا اور شوخ چمکتی سرخ لپ اسٹک میں اس کے بھرے بھرے ہونٹ نمایاں ہو رہے تھے۔ لباس ہی کی مناسبت سے اسے زیور بھی پہنایا گیا تھا۔ دودھیا کلائیوں میں بھر کر پہنی گئیں سرخ اور سنہری چوڑیاں، کانوں میں موجود سرخ گلیٹوں والے بڑے بڑے جھمکے، صراحی دار گردن میں موجود سنہری گلو بند اور ماتھے پر پورے چاند جیسا ٹیکا جس کے درمیان میں ایک بڑا سا ٹنگ لگا تھا اور نیچے کے حصے میں چھوٹے چھوٹے سرخ موتی لٹک رہے تھے۔ میک اپ آرٹسٹ نے اسے بہت دل لگا کر تیار کیا تھا کہ ایسی پیاری شکل اور کھل حسن فلم نگری سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی اسے کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہر ہر زاویے سے اس کی تیاری کو جانچنے کے بعد سب سے آخر میں اس نے چاند بانو کے سر پر سرخ رنگ کا سنہری کام سے جھلملاتا دوپٹا لٹکایا۔ دوپٹا اس انداز سے اوڑھایا گیا تھا کہ صرف سر پر لٹکا ہوا تھا اور دونوں پلو پیچھے کی طرف گر رہے تھے۔

”اب کھڑی ہو کر خود کو آئینے میں دیکھو۔“ ادھیڑ عمر میک اپ آرٹسٹ نے اسے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے کہنے پر چاند بانو نے ذرا کی ذرا آئینے کی طرف دیکھا اور نظریں واپس پھیر لیں۔ اسے اپنے حسن سے آگاہی تھی لیکن اس کے لیے یہ بے تحاشا حسن اس لیے اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے من کی مراد پانے کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ جو پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں کھب

جس کی تعبیر ہاتھ میں آنے پر وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ انہیں قلم اسٹوڈیو لانے کے لیے انیل کمار روزانہ گاڑی بھجواتا تھا۔ وہ گاڑی آنے سے بہت پہلے خود بھی جاگ جاتی تھی اور چاند بانو کو بھی جگا دیتی تھی کہ مہارادیر ہو جائے اور انیل کمار کو شکایت ہو۔ خود وہ اس کی حفاظت کے لیے ساتھ ہی آتی تھی۔ انیل کمار نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے دھندے کا نقصان نہ کرے اور کوٹھے پر بیٹھ کر اپنا کاروبار چلاتی رہے۔ چاند بانو کا خیال وہ اپنی ذمہ داری پر رکھے گا لیکن اسے یہ بات منظور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے درنا یا ب کو بغیر چوکیداری کے ہرگز بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی کہ اسے غلم تھا ہر طرف چور اور لیرے گھوم رہے ہیں۔ کسی بھی وقت کوئی ہاتھ دکھا سکتا ہے۔ اس کے نہ ماننے پر انیل کمار نے زیادہ زور بھی نہیں دیا تھا کہ یہ تو قلمی دنیا کی ریت تھی کہ یہاں آنے والی لڑکیوں کے سر پرست ان پر کڑی نگرانی رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ان کی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو اڑانہ لے جائے۔

”مس چاندنی! آپ کا شارٹ ہے۔“ اسپاٹ بوائے نے ڈریسنگ روم میں جھانک کر چاند بانو کو اطلاع دی۔ انیل کمار کے مطابق چاند بانو ذرا غیر قلمی سا نام تھا اس لیے اس نے اس کے نام کو ذرا تبدیل کر دیا تھا۔ اس سے قبل چاند بانو کے لیے کوئی اور نام بھی تجویز کیا گیا تھا لیکن پھر چاندنی پر دونوں طرف کے لوگوں کا اتفاق ہو گیا اور اب وہاں سب اسے چاندنی ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

”تم چلو ہم آتے ہیں۔“ اسپاٹ بوائے کے لائے پیغام کا جواب زمر دہائی نے دیا اور پھر چاند بانو کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنے تیار ہونے کا اشارہ دیا اور پھر سچ سچ قدم اٹھاتی زمر دہائی کے پیچھے چل پڑی۔ چلنے سے اس کے پیروں میں پڑی سنہری پازیب کے ٹھنڈے دھبے لگے تھے۔ زمر دہائی کے پیچھے چلتی وہ سیٹ پر پہنچی تو عملے کو ہدایات دیتا انیل کمار اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اتنے مکمل حسن نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں انیل جی۔ اپنی چاندنی بے بی ہے یہ۔“ زمر دہائی کو اس کی حالت نے محظوظ کیا اور وہ ذرا تفاخر سے بولی۔

”یہ تو سچ مچ کی چاندنی ہے بائی جی۔ اس کی چکا چوند کے آگے تو سیٹ پر لگی لائٹیں پھیل چکی ہیں۔“ انیل کمار اسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا تو زمر دہائی کھلکھلا کر ہنس دی البتہ چاند بانو نے کسی ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ

اسی طرح نظریں جھکائے کم صم سی کھڑی رہی۔

”ارے یہ اپنی چاندنی اتنی اداس کیوں ہے؟“ انیل کمار نے فوراً اس کی عدم دلچسپی کو محسوس کیا۔

”یہ تو ہے ہی خاموش طبیعت۔ کھل کر بہت کم ہنستی ہے۔“ زمر دہائی نے فوراً وضاحت کی۔

”اچھا ہی کرتی ہے۔ جس کی اداسی ایسی من میں کھب جانے والی ہے، وہ کھلکھلا کر ہنسنے کی تو دیوانوں کا توکل عام ہو جائے گا۔“ انیل کمار ذرا عاشقانہ موڈ میں تھے۔

”شارٹ ریڈی ہے سر۔“ اس کے اسسٹنٹ نے اطلاع دی تو وہ سنجیدہ ہوا اور چاند بانو کو سین کے متعلق مختصر برسٹنگ دینے لگا۔ اسکرپٹ وغیرہ تو پہلے ہی اسے دے کر ریہرسل کروائی جا چکی تھی۔ چاند بانو کی صورت میں اپنی اس تازہ دریافت پر وہ بہت خوش تھا۔ کوٹھوں سے اٹھ کر لڑکیوں کا قلمی لائن میں آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن چاند بانو جیسا تراشا ہوا ہیرا ملنا خوش قسمتی تھی۔ اس کا لب و لہجہ دل نشین تھا اور وہ بمبئی کی عام طوائفوں کی طرح کھڑی بولی نہیں بولتی تھی بلکہ وہ تو اتنی باتھذیب تھی کہ اس پر لکھنؤ کی نواب زادی کا گماں ہوتا تھا۔ رقص اور موسیقی پر عبور تو چلو بہت سی طوائفوں کو ہوتا ہے لیکن وہ حرف آشنا بھی تھی۔ اپنے لیے لکھے گئے مکالمے نہ صرف بالکل صحیح تلفظ سے ادا کرنا جانتی تھی بلکہ ان کے مفہوم کو بھی روح کے ساتھ سمجھتی تھی، اس لیے اس کی ادائیگی بہترین تھی۔ انیل کمار نے ابھی تک اس کے ایک دو مناظر ہی فلمائے تھے لیکن اس کی صلاحیتوں کو ابھی طرح بھانپ گیا تھا۔ اس نے اپنی قلم کے لیے جو کہانی منتخب کی تھی وہ بڑی اچھوتی سی تھی۔ چاند بانو کو جدید دور کی ایک ایسی لڑکی دکھایا گیا تھا جو پچھلے کسی جنم میں مغل شہزادی رہی تھی اور اپنے موجودہ جنم میں وہ بار بار ایسے خواب دیکھتی تھی جس میں اس کے پچھلے جنم کی باتیں سامنے آتی تھیں۔ انیل کمار نے اس کے پہلے جو دو مناظر فلمائے تھے، ان میں اس نے موجودہ جنم کی کالج گرل کا کردار ادا کیا تھا جبکہ آج اسے پچھلے جنم والی شہزادی کا منظر شوٹ کروانا تھا۔ اسی لیے تیاری بہت خاص تھی۔ منظر کی عکس بندی شروع ہوئی تو مغل شہزادی کے عالی شان کمرے کے سیٹ میں وہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھ گئی۔ ایک ایسی شہزادی جس کا شوہر شادی کی پہلی رات ہی ہنگامی وجوہات کی بنا پر اسے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان کے وقار کی خاطر شہزادی نے اس صورت حال پر لب سی لیے تھے لیکن اپنے محبوب سے عین ملن کی گھڑی میں جدائی پر وہ جس آرزو کی اور کرب کا

شکار تھی، اس کا ہر تاثر اس کی آنکھوں میں تحریر تھا۔ کمرے کے در پیچے میں کھڑی شہزادی رخصت ہوتے ہوئے محبوب کو افسردہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں افسردگی اور غم کے یہ تاثرات سجانے کے لیے چاند بانو کو اداکاری نہیں کرنا پڑی تھی۔ یہ سب تو یوں ہی اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ نارسائی، جدائی، محرومی ایسی ہر شے سے وہ عمر کے اسی حصے میں واقف ہو گئی تھی۔

”شاندار۔“ سین شوٹ ہو گیا تو انیل کمار نے اسے داد دی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا سین بھی اسی سیٹ اور اسی لباس میں تھا۔ یہ سین شہزادے کی ماں کے ساتھ تھا۔ اس کی عکس بندی بھی کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔ اس سین کے بعد انیل کمار نے زمر دہائی اور چاند بانو کو اپنے ساتھ اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔

”ہم پہلے لباس وغیرہ تبدیل کر لیتے ہیں۔“ چاند بانو اپنی جج دجج سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس کا دل اب صرف اپنے محبوب نظر کے سامنے ہی سج سنور کر آنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن ستم یہ تھا کہ ایک وہی نہیں تھا اور دسیوں لوگ اس کے حسن کی تابناکیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ فلم بن کر ریلیز ہو جاتی تو دیوانوں کی تعداد بے شمار ہو جاتی۔

”ابھی رہنے دو۔ مجھے کہیں باہر جانا ہے اس لیے تمہارے چہنچ کرنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ انیل کمار نے بہانہ بتایا۔ وہ چاند بانو کو اسی روپ میں اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا اس لیے اسے چہنچ نہیں کرنے دے رہا تھا۔ چاند بانو نے بے بسی سے زمر دہائی کی طرف دیکھا اور اس کے اشارے پر انیل کمار کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

”ٹھنڈی بوتلیں لے کر آؤ چھوٹے۔“ انیل کمار نے آواز لگا کر اسپاٹ بوائے سے کہا پھر انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف چلا۔ اپنی مخصوص کرسی سنبھال کر ان دونوں کو اپنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باری باری ان دونوں کے چہرے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں چاند بانو کو ابھمن میں جٹلا کر رہی تھیں چنانچہ اس کی جانب دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے جائزے کے بعد انیل کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور زمر دہائی کی طرف متوجہ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

”میں نے آپ کو ایک آفر کی تھی بائی جی..... اس کا کیا ہوا؟ آپ نے اس پر غور کیا؟“

”کیسی آفر؟“ زمر دہائی نے تجاہل برتا۔
”وہی ہیروئن کی ماں کے رول کی آفر۔ سچ کہتا ہوں

بائی جی آپ اس رول کے لیے بالکل پرفیکٹ ہیں۔“ وہ جانتا تھا کہ زمر دہائی جان بوجھ کر تجاہل برت رہی ہے پھر بھی بڑے سکون سے اسے یاد دہانی کروائی۔

”اس کا تو ہم نے آپ کو جواب دے دیا تھا انیل جی۔ ہمیں فلموں میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بس آپ ہماری چاند بانو کو بڑی ہیروئن بنادیں۔“ زمر دہائی نے بھی بے حد اخلاق سے اسے جواب دیا۔

”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ چاند بانو کو ہندوستان کی سب سے بڑی ہیروئن نہ بنایا تو میرا نام بدل دیجیے گا لیکن آپ خود تو کام کرنے کی ہامی بھریں۔“ انیل کمار اپنے مطالبے پر ڈٹا ہوا تھا۔

”اس بات کو جانے دیجیے انیل جی۔ ہم ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ اب کوئی کام کرنے کا دل نہیں چاہتا بس ان بچیوں کی سرپرستی کر لیتے ہیں وہی بہت ہے۔“ زمر دہائی اپنے انکار پر قائم رہی۔

”سرپرستی نہیں چوکیداری کرتی ہو تم چالاک عورت۔“ انیل کمار نے دل میں تپ کر سوچا لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی سجائے رکھی اور خوشامدی لہجے میں بولا۔

”آپ نے بڑی جلدی کی بائی جی ریٹائرمنٹ لینے میں۔ ابھی کہاں آپ کا شباب ڈھلا ہے۔“

”یہ تو آپ کی نظر کا کمال ہے ورنہ اب وہ پہلی سی بات کہاں۔“ زمر دہائی نے بھی مسکرا کر اسے جواب دیا۔ البتہ چاند بانو کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اس گفتگو کے دوران سخت بیزار ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ زمر دہائی نے اس کی بیزار کو بھانپ لیا اور اسپاٹ بوائے کی لائی ہوئی ٹھنڈی بوتل کا ایک ٹھونٹ بھرتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔

”آپ نے بتایا نہیں انیل جی کہ کس مقصد کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے..... باتوں باتوں میں آپ کا خاصا وقت ضائع ہو گیا۔ آپ کو تو کہیں جانے کی جلدی تھی نا۔“

”اوہاں۔“ انیل کمار جس کی نظریں چاند بانو پر جمی تھیں ذرا سا چونکا اور پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ لوگوں کو یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ فلم کے کچھ مناظر اور گانے کسی خوب صورت مل اسٹیشن پر فلمانے کا پروگرام ہے اور ظاہر ہے چاندنی کو فلم یونٹ کے ساتھ جانا ہوگا تو یہ تیار رہے۔“

”اچھی بات ہے، ہم تیاری کر لیں گے۔ آپ بس یہ بتادیں کہ کتنے دن بعد جانے کا پروگرام ہے اور کتنا عرصہ وہاں قیام رہے گا؟“

”پندرہ دن بعد نکلتا ہے اور تقریباً پندرہ سے بیس دن

محکمے موتی

☆ جس نے رب کے آگے جھکنا سیکھ لیا وہی علم والا ہے کیونکہ علم والے کی پہچان عاجزی ہے اور جاہل کی پہچان تکبر۔

☆ زندگی جینے کے دو راستے۔ بھول جاؤ ان کو جن کو معاف نہیں کر سکتے اور معاف کر دو ان کو جن کو بھول نہیں سکتے۔

☆ مصیبت کا مقابلہ صبر سے کرو اور نعمت کی حفاظت شکر سے۔

☆ جس طرح بیمار ہونے کی صورت میں کھانے کی لذت محسوس نہیں ہوتی، اسی طرح گناہوں کی موجودگی میں عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی۔

☆ جو لوگ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو شامل رکھتے ہیں خوشیاں سب سے پہلے ان کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، الفریڈ گارڈن، پاکپتن شریف

پر چونک گئی تھی۔

”تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“ اس کی دلچسپی کو محسوس کر کے انیل کمار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”شملہ۔“ اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ مل اسٹیشن کا ذکر سنتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ فاروق شملہ گیا ہوا ہے اور کیا ہی اچھا ہو کہ فلم یونٹ بھی شملہ پہنچ جائے تو ملاقات کی کوئی سبیل کھل آئے گی۔

”خوش ہو جاؤ۔ ہم شملہ ہی جا رہے ہیں۔“ انیل کمار نے ہنس کر اسے بتایا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس میں آنے والی اس تبدیلی کو انیل کمار نے بہت اچھی طرح محسوس کیا۔

”لگتا ہے کہ شملہ میں کچھ خاص ہے جو ہماری اداس ہیروئن کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی ہے۔“

”نن..... نہیں۔ وہ بس ہم نے شملہ کی خوبصورتی کے بارے میں بہت سن رکھا ہے تو اس لیے وہاں جانے کا سن کر خوش ہوئی۔“ اس نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

”چلو۔ جیسے ہی سہی تم خوش تو ہو گئیں۔“ انیل کمار نے اسے قہار ہونے والی نظروں سے دیکھا۔

”اچھا انیل جی۔ اب ہم کو اجازت دیجیے۔ کام کی

کا اسٹے رہے گا۔ شیڈول تو ہم نے پندرہ دن ہی کا بنایا ہے لیکن مختلف مسائل کی وجہ سے اکثر آؤٹ ڈور شوٹنگ میں طے شدہ شیڈول سے ہٹ کر بھی وقت لگ جاتا ہے۔“ انیل کمار نے بتایا۔

”بس تو پھر جس دن آپ کا ڈرائیور فارغ ہو، ہمیں اطلاع کر دیجیے گا۔ وہ ہمیں ضرورت کے مطابق خریداری کروالائے گا۔ ظاہر ہے پہاڑوں پر یہاں بمبئی میں پہنچنے جانے والے کپڑے اور جوتے تو مناسب نہیں رہیں گے تا اس لیے نیا سامان لینا پڑے گا۔“ زمر دباکی نے فوراً ہی مطالبہ کر ڈالا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ انیل کمار نے جواب تو اثبات میں دیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے اس نے کوئی کڑوی گولی چبالی ہو۔ زمر دباکی اس کے تاثرات کو نظر انداز کر گئی اور مؤدبانہ لہجے میں بولی۔

”ماشاء اللہ دل کے بڑے کھلے ہیں آپ۔ چاند بانو کی قسمت اچھی ہے کہ پہلی ہی فلم آپ جیسے دل والے شخص کے ساتھ مل گئی ہے لیکن آپ بھی کم خوش قسمت نہیں..... دیکھیے گا جب ہماری چاند بانو فلمی پردے پر جلوہ گر ہوگی تو

آپ کی تجوریاں بھر جائیں گی۔“ انیل کمار کے ہامی بھر لینے پر زمر دباکی نے اس کی تعریف کی لیکن ساتھ میں خود کو بھی نہیں گرنے دیا اور انیل کمار کو جتا دیا کہ تمہارے ہاتھ

جو ہر نایاب آگیا ہے اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنا ہی پڑے گی چنانچہ اگر وہ شائنگ کروائے گا تو ان پر کوئی احسان نہیں کرے گا۔ بظاہر مسکرا کر سب سنا انیل کمار اپنے

دل میں سوچ رہا تھا۔

”تجوریاں میری نہیں بھائیہ سیٹھ کی بھریں گی کیونکہ ویسا تو سارا اسی نے لگایا ہے۔ میرے حصے میں تو بس چند فیصد کا منافع ہی آئے گا۔ رہی دل کے بڑے ہونے کی

بات تو تمہاری خریداری کا بل کونسا میری جیب سے جائے گا۔ وہ بھی سیٹھ ہی بھرے گا۔ آخر اس نے کہا تھا نا کہ تمہارا بہت خیال رکھا جائے تو اس خیال داری کا بل تو اسے ہی ادا

کرنا ہوگا۔“

”ہم شوٹنگ کے لیے کون سے مل اسٹیشن جائیں گے انیل جی؟“ اب تک خاموش سامع کا کردار ادا کرنے والی چاند بانو نے اچانک ہی سوال کیا۔ اس نے اپنے سامنے

رکھی ٹھنڈی بوتل کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور اسے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ آپس میں گفتگو کرنے والے ان دو افراد کے دلوں میں کیا ہے۔ وہ تو بس مل اسٹیشن کے لفظ

☆☆☆

”ہیلو۔“ براؤن پینٹ کے ساتھ چیک دار بش شرٹ زیب تن کیے فاروق ملازم کرشن سے بات کر رہا تھا کہ سیرھیاں اترتی بھلانے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”صبح بخیر۔“ فاروق نے اس کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج ناشتے کی میز پر بھلا ان کے ساتھ نہیں تھی بلکہ اس نے کل دوپہر اور رات میں بھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا اور ملازم نے اس کے بارے میں صرف اتنی خبر دی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ دونوں ٹائم ملازم کو کھانے کی ٹرے لے کر اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے البتہ سب ہی نے دیکھا تھا اور آج بھی جب وہ ناشتے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئی تھی تو یہی سوچا تھا کہ وہ ناشتا اپنے کمرے میں ہی کرے گی۔ وہ یہاں ان کے لیے نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ اس کے مہمان تھے۔ اس لیے اس کے ایسے کسی رویے پر شکوہ و شکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ اس نے فاروق کے پیروں میں گھریلو استعمال کے سپررز کے بجائے براؤن جوتے دیکھ کر سوال کیا۔

”بس ذرا پوسٹ آفس تک جانا ہے۔ کرشن سے اسی کا پتا سمجھ رہا تھا۔“ اس نے بھلا کے سوال کا جواب دیا۔

”کچھ پوسٹ کروانا تھا تو کرشن کو دے دیتے، یہ جا کر پوسٹ کروادے گا۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”نہیں۔ میں خود پوسٹ آفس جانا چاہ رہا تھا۔ اس یہاں تو تھوڑا سا شملہ بھی دیکھ لوں گا۔“

”اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چلیے گا۔ میں بھی باہر گھومنے ہی جا رہی تھی۔ میں آپ کو تھوڑا نہیں بہت سارا شملہ دکھا دوں گی۔ بس آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بریک فاسٹ لے لوں پھر نکلتے ہیں۔ آپ کو جلدی تو نہیں ہے نا؟“ بھلا کی پیش کش اچھی تھی اس لیے اس نے انکار نہیں کیا اور بولا۔

”آپ آرام سے ناشتا کریں۔ مجھ جیسے بے کار آدمی کو بھلا کیا جلدی ہوگی۔ دن رات آرام کرنے کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔“

”بہت بیزار لگ رہے ہیں۔“ بھلا بے ڈانٹنگ چیز سنبھال لی اور اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ اس وقت وہ بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ سیاہ پتلون پر پہنی سرخ جرسی اس کی گندی رنگت پر فوج رہی تھی۔

بات تو ہو گئی، اب بے بی ذرا آرام کر لے۔ دیکھ رہے ہیں ناکتنی ابھی ہوئی بیٹھی ہے۔“ زمر دباکی فوراً چوکنی ہوئی اور لبوں پر بظاہر مسکراہٹ سجا کر انیل کمار سے اجازت چاہی۔

”ہاں ہاں بالکل۔ آپ لوگ جائیں۔ میں بھی اپنے کام سے نکلتا ہوں۔“ اندر ہی اندر دانت کچکچاتے انیل کمار نے بھی اخلاق سے جواب دیا۔ فلمی ہیروئن بننے کے لیے آنے والی لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے اور اپنے دام میں پھنسانے کا ہنر وہ خوب جانتا تھا۔ اوپر دالے نے شخصیت ہی اچھی دی تھی اور اسے ٹپ ٹاپ سے رہنا بھی آتا تھا اس لیے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اس کی شخصیت اور چکنی چڑی باتوں کے جال میں نہیں پھنستی تھی تو دھونس اور دھمکی سے بھی کام چل جاتا تھا کیونکہ وہ ایک کامیاب فلم میکر تھا اور فلمی دنیا میں راج کرنے کی خواہش مند کوئی لڑکی اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں گنونا چاہتی تھی۔ چاند بانو کے سلسلے میں اسے فقط اس لیے احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کہ بھامیہ سیٹھ کی طرف سے اس کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت دی گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھامیہ سے بگڑے چنانچہ رال نکٹنے کے باوجود خود کو باندھ کر رکھنے پر مجبور تھا۔

”بہت بد معاش آدمی ہے یہ انیل کمار۔ اس سے بہت بچ کر رہنا ہوگا تمہیں۔“ وہ دونوں ڈریسنگ روم میں واپس آئیں تو وہاں کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر زمر دباکی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چاند بانو جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے اپنے زیورات اتارنے لگی۔

”چالاک آدمی ہمیں فلم میں کردار کی پیشکش کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ آدمی کی آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر تک کا حال جان لیتے ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنانے چلا تھا جیسے ہم تو اس کی چال بازی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہم کام کرنے کی ہامی بھر لیتے تو یہ ہمیں یہاں کام میں الجھاتا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر شملہ چل پڑتا لیکن ہم نے بھی کوئی چکی گولیاں نہیں کھیل رکھیں جو ایسے جھکنڈوں سے زیر ہو جائیں۔“ زمر دباکی بولتی جا رہی تھی اور وہ جیسے سروں میں گنگناتے ہوئے مغل شہزادی کے گیٹ اپ سے نجات حاصل کر رہی تھی۔ اسے شہزادی بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو اپنے من مندر میں بے دھوتا کی داسی بن کر رہنے میں بھی خوش تھی اور اس داسی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان فضاؤں میں پہنچ جائے جہاں اس کے دل کا شہزادہ موجود ہے۔

شیش محل

اس سے دریافت کیا۔ جس واقعی تازہ اور فرحت بخش تھا۔
 ”اگر اس بات کا ڈر ہوتا تو میں آپ کو آفر ہی نہیں کرتی۔“ اس نے نظر اٹھا کر پل بھر کے لیے فاروق کی طرف دیکھا اور جواب دے کر اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب وہ خود بھی پھلوں کا رس پی رہی تھی۔ آج بھی اس نے بہت مختصر ناشتا کیا تھا۔ شاید وہ کبھی ہی کم خوراک اسی لیے دہلی سکی اور نازک سی تھی اور ذرا سی خود پر توجہ دے کر اصل عمر سے کہیں کم نظر آنے لگتی تھی۔
 ”تو پھر چلیں۔“ چند منٹوں میں ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے فاروق سے پوچھا۔

”بالکل۔“ وہ جو پہلے ہی اپنا جوس کا گلاس خالی کر چکا تھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے تو کرشن گاڑی میں بڑا سا ہاٹ پاٹ اور پانی کا کولر رکھتا ہوا نظر آیا۔ بنگلے پر ڈرائیور سمیت گاڑی موجود تھی لیکن بھلا نے اپنی ہی گاڑی کا انتخاب کیا تھا۔ ڈرائیورنگ سیٹ سنبھال کر اس نے فاروق کے لیے اپنے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی آگے بڑھائی۔ پہلے وہ پوسٹ آفس پہنچے۔

”آپ اپنا لیٹر پوسٹ کر آئیں۔ میں یہیں آپ کا ویٹ کرتی ہوں۔“ پوسٹ آفس کی پرانی سی عمارت کے سامنے گاڑی روک کر بھلا نے اس سے کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں موجود چمڑے کا چھوٹا سا بیگ لیے گاڑی سے اتر گیا۔ پوسٹ آفس کی سیڑھیاں چڑھ کر بیگ میں موجود دو لفافوں کو پوسٹ کر دینے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ اس نے اڈے کے سب ساتھیوں کے لیے ایک مشترکہ خط لکھا تھا۔ جس میں اپنا تفصیلی احوال درج کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی گئی تھی۔ شملہ سے واپسی کے بعد رہن حسب وعدہ اس سے فون پر رابطے میں تھا لیکن دو تین منٹ کی اس کال سے اس کے ساتھیوں کی وہ تسکین نہیں ہو سکتی تھی جو اس کے ہاتھ سے لکھے اس تفصیلی خط سے ہوتی اس لیے اس نے خط کا تردد کیا تھا۔ دوسرا خط چاند بانو کے نام تھا۔ وہ یہاں آتے ہوئے اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ خط کے ذریعے اپنے احوال سے آگاہ رکھے گا چنانچہ اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے اس خط کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ اس سے زیادہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس سے ذہن پر زور پڑنے کا احتمال تھا اس لیے اس نے وقفے وقفے سے یہ دونوں خطوط مکمل کیے تھے۔ خطوط پوسٹ کرنے کے بعد وہ باہر آیا۔ بھلا اس کی

ہونٹوں پر سرخ ہی رنگ کی لب اسٹک تھی اور سیاہ بالوں کو پیچھے کی طرف سمیٹ کر ان کی پونی ٹیل بنائی گئی تھی۔ اس صبح میں آج پھر وہ کوئی کالج گرل محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی سبج دھج سے بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیوہ ہے۔ ہندو خاندانوں سے تعلق رکھنے والی بیوہ عورتوں کے بارے میں فاروق کا تجربہ تھا کہ وہ سفید لباس میں نہایت سادگی سے رہتی ہیں اور اپنی مرضی یا معاشرتی دباؤ کے باعث زندگی کی ساری خوشیوں کو خود پر حرام کر لیتی ہیں لیکن بھلا کو دیکھ کر ذرا بھی یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بیوہ ہے اور عین جوانی میں اپنے محبوب شوہر کو کھونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے اس نے اپنے باپ، گھر بار اور دولت و جائیداد سب کو ٹھکرا دیا تھا، اس سے چھن گیا تھا لیکن وہ ممکن نظر آتا تو دور کی بات بہت مطمئن اور تروتازہ نظر آتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس نے اس سبج دھج کے پیچھے اپنا غم چھپا لیا تھا یا وہ ترکہ رسوم کی قائل تھی اس لیے ہندومت کی روایات کے مطابق بیوہ عورت کا چولا پہننا منظور نہیں کیا تھا۔
 ”آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟“ کانٹے کی مدد سے ٹوسٹ اور آلیٹ کے ٹکڑے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بھلا نے اس سے دریافت کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ بھلا کے ناشتے کے علاوہ ملازم اس کے اپنے سامنے پھلوں کے تازہ رس کا گلاس رکھ گیا تھا۔ یہ ملازم کو کیتھرائن کی ہدایت تھی کہ فاروق کو زیادہ چائے کافی نہ دی جائے اور خاطر کرنا مقصود ہو تو جوس پیش کیا جائے چنانچہ اس وقت اس کے آگے جوس کا گلاس رکھا تھا۔

”وہ دونوں ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور شاید اسی کے انتظام میں مصروف ہیں۔“ اس نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے انہیں ان کے پروگرام کے مطابق فلم دیکھنے دیں اور آپ میرے ساتھ میرے پروگرام میں شامل ہو جائیں۔“ وہ بہت نفاست کے ساتھ کانٹے اور چھری کی مدد سے ٹوسٹ اور آلیٹ کھا رہی تھی۔ اس کی ایک ایک جنبش سے ظاہر تھا کہ اس کی پرورش مخصوص ماحول میں ہوئی ہے۔ وہی مخصوص ماحول جو بہت زیادہ پیسے والے لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے اور بچوں کو ان کی ماؤں سے زیادہ تربیت یافتہ و تجربہ کار گورنس اور ٹرینرز زندگی گزارنے کے ادب و آداب سکھاتی ہیں۔

”میرے شامل ہونے سے آپ کا اپنا پروگرام تو ڈسرب نہیں ہوگا؟“ فاروق نے جوس کا ایک گھونٹ بھرا اور

ختر تھی۔ اس کے بیٹھے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی پھر پوچھنے لگی۔

”کہاں چلنا پسند کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے شملہ میں کوئی جگہ پہلے دیکھنا چاہیں گے؟“

”جہاں آپ مناسب سمجھیں۔ میں پہلی بار شملہ آیا ہوں اور یہاں کے قابل دید مقامات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا لیکن آپ تو یقیناً شملہ کو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔“

”کیوں نہیں۔ شملہ پورے ہندوستان میں میری سب سے پسندیدہ جگہ ہے۔ جب بھی موقع ملے، میں یہاں ضرور آتی ہوں۔ یہ میری ممی کی جنم بھومی بھی ہے۔ جس بچکے میں ہم رہ رہے ہیں وہ میرے نانا نے ممی کو جہیز میں دیا تھا اور ممی نے میرے پیدا ہوتے ہی میرے نام کر دیا تھا۔ یہاں آکر مجھے اس لیے بھی بہت اچھا لگتا ہے کہ شملہ کی خوب صورتی دیکھنے کے ساتھ ساتھ میں ممی کو بھی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں گھومتے پھرتے ہوئے ممی بھی میرے ساتھ ساتھ ہر جگہ موجود ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔ فاروق کو اس کی بات سن کر سمجھ آیا کہ اول ملاقات میں جو اس نے خود کو بچکے کی مالکن قرار دیا تھا تو وہ دعویٰ ملکیت محض بھائیہ کی بیٹی ہونے کے زعم میں نہیں تھا وہ حقیقتاً اس بچکے کی مالکن تھی۔ ”یہ کرسٹ چرچ ہے۔“ ایک قدیم عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے فاروق کو بتایا۔ عمارت خاصی پرانی لگتی تھی لیکن یہ پرانا پین بس طرز تعمیر کی حد تک ہی تھا ورنہ عمارت کی حالت بہت عمدہ تھی۔

”یہ چرچ 1850ء میں بنایا گیا تھا۔ شملہ میں دیکھنے کے لائق جگہوں میں سے ایک ہے لیکن میں ابھی آپ کو یہ نہیں دکھا رہی۔ ابھی ہم جاکھو مندر (Jakhu) جاکیں گے۔ جاکھو شملہ میں سب سے بلند مقام ہے اور ہم وہیں سے شملہ دیکھنے کی شروعات کریں گے۔“ اس نے فاروق کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”جیسا آپ پسند کریں۔ میں تو بس آپ کے ساتھ چل پڑا ہوں۔“ فاروق نے اسے جواب دیا۔

”بڑے او بیڈینٹ ہیں۔“ بھلا اس کے جواب پر ہنس کر بولی۔

”اتنا زیادہ ہوں تو نہیں لیکن کبھی کبھی فرمانبرداری اور تابعداری میں حرج بھی نہیں ہوتا۔“ فاروق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ بھلا کی بھی زیادہ توجہ ذرا نیونگ کی طرف بھی پھر

اس نے ایک مقام پر گاڑی روک لی اور اسے اطلاع دی۔ ”یہاں سے ہم پیدل اوپر جائیں گے۔“ اطلاع دینے کے بعد وہ گاڑی سے سامان نکالنے لگی۔ ہاٹ پاٹ اور کولر کے علاوہ اس نے دو چھڑیاں بھی نکالی تھیں۔ فاروق جو اس کی پیروی کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا تھا، کولر اور ہاٹ پاٹ اٹھانے لگا۔

”نو.....نو۔ آپ صرف کولر اٹھالیں۔ ہاٹ پاٹ میں خود اٹھاؤں گی۔“ بھلا نے اسے ٹوکا۔

”میری موجودگی میں ایک خاتون سامان اٹھا کر چلیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے مشرقی روایت نبھانی چاہی۔

”یہاں ایسے تکلفات کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہاتھ میں اسٹک بھی پکڑنی ہوگی اس لیے ایک فرد کے لیے ایک بوجھ مناسب ہے۔“ بھلا نے اس سے کہا اور ایک چھڑی اس کی طرف بڑھادی۔ فاروق نے اس کی بڑھائی ہوئی چھڑی تھام لی۔

”ناؤ لیش گو۔“ اپنی چھڑی اور ہاٹ پاٹ کو تھامنے کے بعد بھلا نے اس سے کہا۔

”یہ چھڑی کیوں ساتھ لی ہے؟“ فاروق نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ اسٹک جاکھول پر جانے والوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جاکھو آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ ہم جو راستہ پیدل طے کریں گے اس پر چڑھتے ہوئے اگر کہیں مشکل پیش آئی تو اسٹکس سے سپورٹ مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی اسٹک بڑی امپورٹنٹ ہے۔“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے بھلا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب؟“ فاروق چونکا۔

”ہمیں جاکھو پر موجودا چکوں سے نمٹنے کے لیے ان اسٹکس کا استعمال کرنا پڑے گا ورنہ ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔“ وہ بڑے محظوظ سے انداز میں اسے بتا رہی تھی اور فاروق حیران تھا کہ وہ اچکوں کا ذکر بڑے اطمینان سے کر رہی ہے ورنہ خواتین تو ایسی کسی بھی چیز سے بہت گھبراتی ہیں۔

”واقعی وہاں اچکے ہوتے ہیں؟“ اس نے مشکوک سے لہجے میں دریافت کیا۔

”کاؤنٹ لیس۔ آپ خود دیکھ لیجیے گا۔“ وہ جیسے فاروق کی حیرانی پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”تو کیا یہاں کی انتظامیہ انہیں کچھ نہیں کہتی؟ میرا

مطلب ہے یہ تو ایک سیاحتی مقام ہے اور یہاں ایسی صورت حال کا ہونا خود حکومت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اچکوں کے ڈر سے سیاح یہاں آنا چھوڑ بھی سکتے ہیں۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ سیاحوں کو خود بھی وہ اچکے اچھے لگتے ہیں۔“ بھلا نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو رہا۔ اصل صورت حال سمجھ میں نہ آنے کے باوجود وہ اتنا تو سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بات میں کوئی راز ہے اور حقیقت خود کھل کر سامنے آ جائے گی۔ اب وہ اس مسئلے پر سوچنے کے بجائے راستے پر توجہ دے رہا تھا۔ دیودار اور چیز کے درختوں کے درمیان سے گزرتا یہ راستہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اصل میں تو شملہ میں جس طرف بھی نکل جاؤ خوب صورتی ہی خوب صورتی تھی، یہ اور بات کہ وہ یہاں آمد کے بعد آج پہلی بار ہی باہر نکلا تھا۔ انہیں کیونکہ چڑھائی چڑھنی پڑ رہی تھی اس لیے تھوڑی دیر میں ہی ہلکا ہلکا پسینا آنے لگا تھا۔ فاروق اچھے اسٹیمنا کا مالک تھا لیکن بیماری نے اسے متاثر کیا تھا۔ بہر حال صورت حال اتنی خراب بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے اس راستے پر چلنا ناممکن ہوتا۔ وہ بھلا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

”ذرا رک کر پانی پی لیتے ہیں۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔“ ایک جگہ بھلا نے اس سے کہا تو اس نے اپنے قدم روک لیے۔ وہ دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ آ بیٹھے۔ بیٹھنے کے بعد دونوں نے اپنا اپنا رد مال نکال کر پسینا خشک کیا پھر بھلا نے اپنے بڑے سے پرس سے ایک گلاس نکالا۔ پلاسٹک کا بنایا گلاس شوخ سرخ رنگ کا تھا۔

”آپ کو پانی دوں؟“ کولر سے گلاس بھرتے ہوئے اس نے فاروق سے پوچھا۔

”پہلے آپ پی لیجیے۔ آپ کو پیاس لگی تھی۔“ فاروق نے مسکرا کر جواب دیا تو بھلا نے مزید تکلف میں پڑے بغیر گلاس لبوں سے لگا لیا۔ خود پانی پینے کے بعد اس نے فاروق کی طرف بڑھا دیا۔ فاروق گلاس منہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ بھلا نے قریب رکھی چھڑی پھرتی سے اٹھا کر ہوا میں چلائی۔ فاروق نے اپنی پشت پر قیس قیس کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک بندر تھا جو چھڑی کی ضرب کھا کر ان سے دور جا رہا تھا۔

”اگر میں ہوشیار نہیں ہوتی تو یہ آپ کے ہاتھ سے گلاس اچک کر لے جاتا۔“ بھلا نے شوخی سے کہا تو فاروق چونکا۔ یعنی بھلا اب تک اسے جن اچکوں سے ڈرانے کی کوشش کرتی رہی تھی، وہ یہ بندر تھے۔

”تو یہ ہیں آپ کے سوکا لڈاچکے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔ ”جی ہاں اور انہیں معمولی مت سمجھیے گا۔ یہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ ہل میں انسان کے ہاتھ کی چیز اچک کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بس چیز انہیں پسند آنے کی بات ہوتی ہے۔ بٹوا، چشمہ، ٹوپی کچھ بھی اچانک آپ کے قبضے سے نکل سکتا ہے اگر آپ ہوشیار نہ ہوں تو۔“

”بڑے تیز ہیں یہ بندر۔“ فاروق نے مسکرا کر کہتے ہوئے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گلاس چھیننے میں ناکام ہو کر جانے والا بندر کچھ آگے جانے کے بعد رک گیا تھا اور ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ ہنومان جی کی فورس ہیں۔ انہیں ہلکا لیجیے گا بھی نہیں۔“ بھلا نے اسے اطلاع دی تو وہ ہنس دیا۔ ہندو مذہب میں ہنومان اور ان بندروں کا کتنا گہرا تعلق تھا، اس بات کا تو اسے بھی علم تھا۔

”چلو تمہاری کچھ خاطر کرتے ہیں۔“ اب بھلا بندر سے مخاطب تھی۔ ہاٹ پاٹ کھول کر اس نے اس میں سے ایک کچوری نکالی اور بندر کی طرف اچھال دی۔ وہ فوراً اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ اچانک ہی دو تین بندر مزید وہاں آ گئے۔ بھلا نے ان کی طرف بھی کھانے کی اشیاء اچھالیں پھر اس سے بولی۔

”چلیں اب چل پڑیں ورنہ راستے میں ہی گھر جا بیٹھیں گے۔“ فاروق نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ راستے میں انہوں نے کئی بندروں کو دیکھا لیکن وہ دور دور ہی رہے اور ان کے نزدیک نہیں آئے۔ راستے میں بھلا اسے پہاڑی اور مندر کے بارے میں معلومات فراہم کرتی رہی۔

”کہتے ہیں جب ہنومان جی راون سے لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے تو انہوں نے جاکھول پر ہی بسیرا کیا تھا اور یہیں وہ حیرت انگیز بوٹی سنجیوئی۔۔۔۔۔۔ بھی پائی جاتی ہے جو ہر طرح کے زخم کے علاج کے لیے کارآمد ہے۔ ہنومان نے اسی بوٹی سے اپنے زخموں کا علاج کیا تھا اور راون سے اگلے ٹکراؤ تک یہیں پڑاؤ کیے رہے تھے۔“ بھلا اسے جو کچھ بتا رہی تھی وہ بغیر تبصرے کے سن رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے ان ہندو دیومالائی داستانوں پر یقین نہیں تھا لیکن بھلا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر کے وہ اس کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ماڈرن عورت ہونے کے باوجود اگر ان داستانوں پر یقین رکھتی تھی تو ایسا صرف عقیدے کی وجہ سے تھا اور وہ کسی کے عقیدے کو

خواتین چھڑنے کا قائل نہیں تھا سو چپ چاپ چلتا رہا۔ چلتے چلتے اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور نہ ہی چہرے سے تکلیف کا اظہار ہونے دیا۔ بالآخر وہ جاکھو مندر تک پہنچ ہی گئے۔ بلندی پر بنے اس مندر کے پس منظر میں دیودار اور چتر کے درختوں کی موجودگی نے منظر کو مزید خوب صورت بنا دیا تھا۔ مندر کے اطراف میں ہنومان کے عقیدت مندوں کے علاوہ چند انگریز جوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے جو یقیناً صرف تفریح کے خیال سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ویسے اس نے سن رکھا تھا کہ انگریزوں کو تاریخی عمارتیں اور نوادرات وغیرہ دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ بھلا انگریزوں کے لباس میں بھی لیکن وہ ان کی طرح یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں آئی تھی۔ اسے ہنومان جی کی پوجا بھی کرنی تھی چنانچہ وہ مندر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فاروق اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا اور احاطے میں ہی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سر کی تکلیف میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھتا تو سکون محسوس ہو سکتا تھا لیکن سارا سامان اس کی تحویل میں تھا اور ہنومان جی کے بندروں کی فورس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کب کیا اچک کر لے جائیں اس لیے وہ چوکنا بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔

مندر کی عمارت خوب صورت تھی اور اس پر لگے رنگین جھنڈے دور ہی سے اسے نمایاں کر رہے تھے۔ دیواروں پر مختلف نقش و نگار موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نقش ہنومان اور رام جی کے تھے۔ بھلانے اسے راستے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق یہاں ماربل کی ایک سِل پر ہنومان جی کا قدموں کا نشان بھی موجود تھا۔ اسے ہنومان کے قدموں کا نشان دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اپنی جگہ بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں موجود افراد میں چند ایسے جوان جوڑے بھی شامل تھے جنہیں دیکھتے ہی احساس ہو جاتا تھا کہ وہ نوبیا ہتا ہیں اور شملہ ہنی مون منانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی جدا تھی۔ من پسند سا بھی کے مل جانے کی خوشی چہروں سے چھلکی پڑتی تھی۔ ایسے منظر کو دیکھ کر اسے جولیٹ کا خیال نہ آتا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر ہی خود کو اور اسے ان جوڑوں کے درمیان انہی کی طرح گھومتا پھرتا محسوس کرنے لگا۔ جاگتی آنکھوں کا یہ خواب کتنی دیر جاری رہا اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بھلا کے

پکارنے پر ہڑبڑا کے چونکا تو اس خواب کا اختتام ہوا۔ ”کیا آنکھیں کھول کر سو رہے تھے؟“ بھلانے ہنس کر پوچھا لیکن اس کی ہنسی میں کچھ پھیکا پن تھا جسے فاروق نے فوراً محسوس کر لیا اور فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”کیا بات ہے آپ کچھ ادا اس لگ رہی ہیں۔“

”نہیں بس ایسے ہی!“ اس نے فاروق سے نظریں چرائیں۔

”کچھ تو ہے اگر مناسب سمجھیں تو بتادیں۔“ اس نے ہلکا سا اصرار کیا۔

”کچھ خاص نہیں۔ اندر مندر میں مہی کی ایک پرانی جاننے والی مسز شیکھر مل گئی تھیں۔ انہیں کسی سے میرے ہنر بینڈ کی ڈھکچہ کا پتا لگ گیا تھا۔ اب ملیں تو مجھ سے افسوس کرنے لگیں لیکن افسوس کم کیا اور تنقید زیادہ کہ میں ایک ودھوا کے بجائے شوخ اور ماڈرن لڑکی کے روپ میں کیوں نظر آ رہی ہوں۔ پتا نہیں لوگ دوسروں کو جینے کیوں نہیں دیتے خاص طور پر عورت کو۔ اگر میرا پتی مر گیا ہے تو اب مجھے بھی جیتے جی مرجانا چاہیے اور جیون کی ہر خوشی سے منہ پھیر لینا چاہیے۔ یہ کہاں کا اصول ہے۔“ وہ غم و غصے کا شکار تھی۔

”جانے دیجیے۔ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ آپ کے ہاں ذرا زیادہ اور ہمارے ہاں ذرا کم بیوہ عورت کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے لیکن آپ تو ایک پڑھی لکھی اور بہادر خاتون ہیں۔ آپ کو لوگوں کی ایسی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے۔“ فاروق نے مختصر الفاظ میں اس کی دلجوئی کی۔

اس کے لیے اتنی ہی بات کافی ہوئی اور سر جھٹک کر بولی۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چلیں آئیں میں آپ کو یہاں کچھ اور خاص چیزیں دکھاتی ہوں پھر ہم کوچ کریں گے۔“

اپنی خراب ہوتی طبیعت کے باوجود فاروق اس کی دلجوئی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ویسے بھی یہاں تک آنے کے بعد اس جگہ کو اچھی طرح نہ دیکھنا بے وقوفی ہوتی۔ بھلا اس کے آگے آگے تھل رہی تھی ایک اونچے چبوترے پر بنے ہنومان جی کے مجسمے کو دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم دی اور آگے بڑھ گئی۔ لمبی دم دانے لے ہنومان جی اپنی سینا کے اچھلتے کودتے شریز سپاہیوں میں گھرے ساکت کھڑے رہے۔ بھلا اسے اپنے ساتھ مندر سے کافی آگے لے آئی۔ اس جگہ پر درخت اتنے زیادہ نہیں تھے اور بلندی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

”یہ ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائیں اور پتہ کی طرف دیکھیں۔“ ایک مقام پر رک کر بھلانے اپنے ذہنیل

جیسے پرس سے دور بین برآمد کی اور اس سے کہا۔ اس کے حکم کے مطابق اس نے دور بین آنکھوں سے لگا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ منظر سمٹ کر اس کی آنکھوں کے قریب چلا آیا تھا اور وہ دور تک پھیلے منظر کو خوشگوار احساسات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ سبزہ اور اس سبزے کے درمیان فاصلے فاصلے سے موجود رنگین چھتوں والے گھر آنکھوں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ سبزے کے بیچ مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوں۔ وہ دور بین کو مختلف زاویوں پر گھما کر نیچے قصبے کے مناظر دیکھتا رہا۔

”آپ تو ایک ہی منظر کے ہو گئے اصل منظر تو ادھر ہے۔“ بملا نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”کہاں؟“ اس نے ذرا جھینپتے ہوئے آنکھوں پر سے دور بین ہٹائی۔

”اس طرف۔“ بملا نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے اس کی بتائی ہوئی سمت رخ کر کے دور بین آنکھوں سے لگالی۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ خوب صورت منظر اتر آیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کسی سحر زدہ آدمی کی طرح پوچھا۔ ”یہ ہمالے ہے۔“ بملا نے اتنے فخر سے بتایا جیسے اسی نے ہمالیہ کو دریافت کیا ہو۔ فاروق زبان سے مزید کچھ کہے بغیر برف پوش ہمالیہ کی چوٹی کا نظارہ کرتا رہا۔ سفید برف پر گویا سورج کی کرلوں کا رقص ہو رہا تھا۔ ہمالیہ کی سفید برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے والی سورج کی کرنیں ارد گرد رنگ سے بکھیر رہی تھیں۔

”میں جب بھی یہاں آؤں ہمالے کو دیکھے بغیر واپس نہیں لوٹتی۔“ اس کی کیفیت کو محسوس کرتی بملا نے اسے بتایا تو وہ ذرا سا چونکا اور دور بین اس کی طرف بڑھادی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود دور بین پر قبضہ کیے کھڑا ہے اور بے چاری بملا کو کچھ دیکھنے کا موقع نہیں مل رہا۔

”یہاں آنے کے بعد اتنا خوب صورت منظر نظر انداز کر جانے والا کوئی بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔“ اس کا یہ تبصرہ حقیقت پر مبنی تھا۔ جاکھول پر کھڑے ہو کر برف پوش ہمالیہ کو دیکھنے کا تجربہ واقعی بہت خوش کن تھا۔ جب بملا بھی اپنے شوق کی تکمیل کر چکی تو انہوں نے مندر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ مندر کے احاطے میں ایک جگہ جن کر بملا نے بیچ کا فیصلہ کیا۔

”یہ کھا کر دیکھیے۔ شملہ مریچ اور پنیر سے بنائی ہوئی یہ شملہ کی ایک روایتی ڈش ہے۔“ اب وہ ایک گھڑ اور ڈے

دار میزبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ فاروق نے اس کی پیشکش پر ایک نوالہ منہ میں رکھا۔ ڈش یقیناً اچھی رہی ہوگی لیکن وہ اس کا ذائقہ محسوس کرنے سے زیادہ اس کو شش میں مبتلا تھا کہ منہ میں رکھے نوالے کو حلق سے نیچے اتار سکے۔ ہلکی ہلکی ٹیسوں سے شروع ہونے والا سر درد یکدم ہی بہت زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔

”بیچ کے بعد ہم جنگل میں چلیں گے۔ وہاں جا کر بہت اچھا لگتا ہے لیکن میں اکیلی ہوں تو اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتی اور کوشش کرتی ہوں کہ یہاں سے ہی کسی فیملی کو دوست بنا کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لوں۔ پہلے می اور میں جنگل میں ضرور جاتے تھے۔ ان کے بعد میں اکیلی شملہ آتی ہوں تو ہوائی چانس ہی جنگل کی طرف جاپاتی ہوں۔“ رغبت سے بیچ کرتے ہوئے بملا اسے بتا رہی تھی۔ خوب چلنے کی وجہ سے اس کی بھوک چمک اٹھی تھی اور اس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ فاروق کچھ ست پڑ رہا ہے۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے فاروق نے بھی اپنی طبیعت کا ذکر نہیں کیا اور یونہی دکھاوے کے لیے وقفے وقفے سے چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈالتا رہا۔

”لگتا ہے آپ کو کھانا پسند نہیں آیا۔“ بملا نے اس کی کھانے میں سست روی کو محسوس کر کے تبصرہ کیا۔

”ایسی بات نہیں۔ میں نے ناشتا خاصا بھاری کیا تھا اس لیے اس وقت زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔“ فاروق نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”اتنا چلنے کے بعد تو پتھر بھی ہضم ہو جاتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”دیکھیں، میں کیسے ندیدوں کی طرح کھا رہی ہوں۔“ ”آپ نے جو چڑیاؤ جیسا ناشتا کیا تھا اس کے بعد بھوک تو لگتی ہی تھی۔“ فاروق نے مسکراتے ہوئے اس کی کوشش کی لیکن درد کی ایک تیز لہر نے اس کی مسکراہٹ کو جھٹ لیا۔ اس پل بملا کی توجہ اس کی طرف ہی گئی، وہ چونک گئی۔

”کیا بات ہے مسٹر فاروق آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ”جی بس ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے آہستہ سے بتایا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں، آپ جنگل میں گھوم لیں تو پھر ہم واپس چلیں گے۔ میں واپس جا کر دوا لے لوں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

اسے جو مان اور عزت دی تھی، اس کے بعد اسے ایسا ہی محسوس کرنا چاہیے تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ایسا ہی ہوا ہوگا۔ وہ تو میں نے خود فیل کر لیا کہ ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے لیکن کوشش کے باوجود واپس آنے میں ٹائم لگ گیا۔“ بھلا کو افسوس تھا کہ اس کی تفریح خراب نہ کرنے کے چکر میں فاروق نے اپنی تکلیف بڑھائی۔

”آپ لوگ کہاں گئے تھے؟“ کیتھرائن نے چونک کر پوچھا۔

”جا کھوٹل، شملہ میں سب سے بلند جگہ ہے۔ پیدل اوپر جانے اور آنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ آئی سی۔ تب ہی تو مسٹر فاروق کی طبیعت بگڑی۔ یوں تو وہ فزیکلی بالکل ٹھیک ہیں لیکن سرکی چوٹ کی نوعیت ایسی ہے کہ ڈاکٹر نے زیادہ جسمانی مشقت سے بھی منع کر رکھا ہے۔ اصل میں انسان کا دماغ ہی تو ہے جو پورے جسم کا کنٹرول سنبھالے ہوتا ہے۔ بلندی پر چڑھنے سے زیادہ انرجی خرچ ہوتی ہے اور آکسیجن کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن بلندی پر جاتے ہوئے فضا میں آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے۔ مسٹر فاروق کو آکسیجن کی کمی نے متاثر کیا ہے۔“ کیتھرائن جیسے سارا معاملہ سمجھ گئی۔

”اگر تم فیل کرو کہ کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتانا۔ ہم کسی اچھے ڈاکٹر سے رائے لے لیں گے۔ یہاں میری پہچان کے ایک دو اچھے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔“ بھلا بنا غلطی کے ہی خود کو قصور وار سمجھ رہی تھی اس لیے فکر مند تھی۔

”ڈونٹ وری میڈم۔ مسٹر فاروق بہت اسٹرونک وول پاور رکھنے والے آدمی ہیں۔ وہ جلدی کور کر لیں گے۔“ کیتھرائن نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

چاند بانو نے پتا نہیں کوئی بار سادہ سے صفحے پر تحریر وہ چند سطری خطوط پڑھا جو آج ہی اسے ملا تھا اور جس میں فاروق نے اپنی خیریت اور شملہ کی خوب صورتی کے مختصر سے تبصرے کے علاوہ اس سے اس کا احوال دریافت کرنے کے سوا کچھ نہیں لکھا تھا لیکن وہ یوں شاداں و فرحاں تھی جیسے کوئی محبت نامہ پڑھ رہی ہو۔ اس کے لیے اتنا خیال ہی بہت تھا کہ فاروق دور جا کر بھی اسے نہیں بھولا اور اس نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے اس کے نام علیحدہ سے خط لکھ کر بھیجا ہے۔ اس ایک خیال سے وہ اتنی خوش تھی کہ کبھی خط کی تحریر

”بالکل بھی نہیں، ہم ابھی ابھی واپس چل رہے ہیں۔ مجھے آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔“ بھلا نے فوراً اپنا فیصلہ سنایا۔

”لیکن آپ کا جنگل میں گھومنا تو رہ جائے گا۔“ فاروق اب بھی متذبذب تھا۔

”جنگل میں گھومنے کے لیے دوبارہ بھی آیا جاسکتا ہے۔“ وہ بہت پھرتی سے سب کچھ سمیٹ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس بار فاروق نے بھی اصرار نہیں کیا۔ اسے واقعی اچھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی واپسی کا سفر انہوں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا۔ درمیان میں رکے بھی نہیں۔

”کب سے ہو رہا ہے آپ کے سر میں درد؟ آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔“ وہ دونوں جب گاڑی میں سوار ہوئے تو بھلا نے انکیشن میں چابی گھماتے ہوئے خفگی سے کہا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ پچھلے تک کا سفر بہت تیزی سے طے ہو گیا۔ یہاں کیتھرائن اور گولو منتظر تھے۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“ آپ نے تو صرف پوسٹ آفس تک جانے کا بتایا تھا مجھے۔“ اس کی شکل دیکھتے ہی کیتھرائن نے شکوہ کیا۔

”انہیں میڈیسن دوسٹر۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مزید سوال جواب کا موقع دینے کے بجائے بھلا نے تیز لہجے میں اطلاع دی تو کیتھرائن چونکی ہو گئی اور فوراً ہی پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فاروق کو دیکھنے لگی۔ معائنہ کرنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ صرف گولی اثر نہیں کرے گی بلکہ انکیشن بھی دینا پڑے گا۔ تمام ضروری دواؤں کا ذخیرہ وہ لوگ ساتھ لائے تھے پھر کیتھرائن نے ڈاکٹر سے خصوصی بریفنگ بھی لی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ کس صورت میں کیا کرنا ہے۔ اس کی کوششوں کے اثر سے فاروق آدھے گھنٹے بعد اپنے کمرے میں پرسکون نیند سو رہا تھا۔

”صبح میرے ساتھ نکلے تو اچھے بھلے تھے۔ پھر اچانک ہی پتا نہیں کیسے طبیعت خراب ہو گئی۔“ کیتھرائن لیونگ روم میں واپس آ کر بیٹھی تو بھلا نے ہاتھ ملتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

”اچانک طبیعت خراب نہیں ہوئی ہوگی۔ مسٹر فاروق کو عادت ہے کہ کم تکلیف ہو تو اسے برداشت کرتے رہتے ہیں، اسی چکر میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔“ کیتھرائن نے اس سے لہجے میں بتایا۔ فاروق کی تکلیف کو وہ بالکل ایسے ہی محسوس کر رہی تھی جیسے وہ اس کا سگابھائی ہو۔ فاروق نے

بڑھتی، کبھی اسے آنکھوں سے لگاتی، کبھی لبوں سے چومتی اور کبھی سینے سے لگالیتی۔ یہ خط محض ایک کاغذ کا ٹکڑا تھوڑی تھا جس پر نیلی روشنائی سے چند سطریں درج تھیں۔ یہ تو پیا سے کے لیے صحرا میں پانی کی بوندوں کی طرح تھا۔ وہ اس کاغذ سے لپٹی فاروق کی خوشبو کو سونگھ سکتی تھی۔ اسے کاغذ پر موجود فاروق کی انگلیوں کا نادیدہ لمس بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں وہ خوشی سے سرشار نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

”کیا بات ہے بنو! آج کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ کہیں ابھی سے بڑی ہیروئنوں کے خمرے تو نہیں آگئے مزاج میں کہ اپنے ساتھ دالیوں سے ملنا ہی گوارا نہیں۔“ وہ اپنی خوشی میں مست بستر پر نیم دراز تھی اور خط کے کاغذ کو اپنے دائیں رخسار سے لگا رکھا تھا کہ کاجل دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے شکوہ کیا۔

”اللہ نہ کرے جو ہم میں ایسے خمرے آئیں۔ ویسے بھی کونسا ہم اپنی خوشی سے فلمی ہیروئن بننے پر راضی ہوئے ہیں جو اس بات پر غرور کریں گے۔ ہمارے لیے تو بس یہ سب ایک آزمائش ہی ہے۔ اگر آپ سب لوگوں کا اتنا اصرار نہ ہوتا تو ہم کبھی اس کام کی ہامی نہ بھرتے۔“ کاجل کی آواز سن کر وہ بستر پر اٹھ بیٹھی اور پوری سچائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ہم کیا اور ہمارا اصرار کیا۔ یوں کہونا کہ ”ان“ کے کہنے پر راضی ہوئی تھیں۔“ کاجل نے اسے چھیڑا۔

”ان کا کہنا ہم ٹال بھی کیسے سکتے تھے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں مسکرائی اور اپنی نرم و نازک انگلیوں کو سطروں پر پھیرنے لگی۔

”لگتا ہے انہوں نے محبت نامہ بھیجا ہے۔“ کاجل نے فوراً ہی اس کے ہاتھ میں موجود خط کا نوٹس لیا پھر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ کے دیکھ لو۔“ چاند بانو نے خط اس کی طرف بڑھا دیا جسے کاجل نے فوراً تمام لیا اور جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔ زمر دبائی کے کوشٹے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور شعراء کا کلام خاص طور پر پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا کیونکہ زمر دبائی کا کہنا تھا کہ جو شعر کو پڑھنا اور سمجھنا نہیں جانتا، وہ اسے روح کی پوری گہرائی سے گا بھی نہیں سکتا۔ سو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام تھا اور انہیں اساتذہ کا کلام پڑھایا جاتا تھا۔

”میری طبیعت اچھی ہے۔ شملہ کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ یہ بھلا کیسا محبت نامہ ہے۔“ ایک نظر میں پورا خط پڑھ لینے والی کاجل نے خط اسے واپس کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”محبت نامہ تو اسے تم نے قرار دیا تھا ورنہ یہ تو ایک سادہ سا خط ہے۔“ چاند بانو اس کے تبصرے پر مسکرا کر بولی۔

”وہ تو ہمیں تمہارے چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے چہرے کو دیکھ کر گمان ہوا تھا۔“ کاجل نے منہ بنایا۔ وہ چاند بانو کے بستر پر اس کے عین مقابل بیٹھی اس سے مکالمہ کر رہی تھی۔

”ہمیں تو وہ ہوا بھی پیاری ہے جو ان کو چھو کر آجائے، یہ تو پھر ان کے ہاتھ سے لکھا خط ہے۔“ چاند بانو نے عالم جذب میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں خط کو سینے سے لگایا۔

”اللہ اللہ..... ایسا عشق۔ عشق کے سمندر میں اتنی گہرائی تک مت اترو چاند بانو..... یہ سمندر تمہیں ڈبو دے گا۔“ اس بار کاجل ذرا گہرا گئی تھی۔

”واللہ۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔“ چاند بانو نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

”تمہاری باتوں سے مجھے تو خوف آرہا ہے۔“

”تو چھوڑنا جانے دو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ ہمارے سفر کی تیاری کہاں تک پہنچیں پتہ لگئی تھیں نا خریداری کے لیے ساتھ میں۔“ اس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔

انیل کمار نے حسب فرمائش زمر دبائی اور اس کے لیے گاڑی بھجوا دی تھی کہ وہ جا کر اپنی مرضی کی خریداری کر آئیں۔ آج چاند بانو کا کوئی سین شوٹ نہیں ہونا تھا اس لیے اس کی چھٹی تھی اور اسی لیے انیل کمار نے بھی آج گاڑی بھجوائی تھی لیکن زمر دبائی نے اسے خریداری کے لیے اپنے ساتھ بازار لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ برقعوں میں خود کو چھپا کر بازار جایا کرتی تھیں لیکن زمر دبائی کے خیال کے مطابق مستقبل کی ٹاپ ہیروئن کا بازاروں میں پھرنا اس کی شان کے خلاف تھا چنانچہ وہ کاجل کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کاجل کو اس کی پسندنا پسند کا اچھی طرح علم تھا اس لیے اسے کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔

”بڑی جلدی خیال آگیا آپ کو خریداری کے بارے میں پوچھنے کا؟ کتنی دیر ہوئی بنے میاں سے پیغام بھجوایا تھا کہ ہال میں آجاؤ۔ سب وہیں جمع تھے اور تمہارے ساتھ مل کر سارا سامان دیکھنا چاہتے تھے۔“

کا جل نے خفا سے لہجہ میں اسے یاد دلایا۔

”ہاں بس ہم ذرا مصروف تھے۔“ اس نے عطف کو انگلیوں سے سہلایا۔

”چھٹی کے دن مصروف رہنے کا عذر..... اس کا مطلب سمجھتی ہو چاند بانو.....؟ تمہارے ساتھ والیوں کو یہ گمان گزرے گا کہ تم مغرور ہو گئی ہو اور ہیروئن بننے کے بعد ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔“ کا جل کا لہجہ ٹھیکھا ہو گیا۔

”لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ شپٹائی۔

”یہ صرف میں سمجھتی ہوں۔ باقی سب کو تمہارے دل کی خبر نہیں ہے اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ محبت ایک ایسا مقدس راز ہے جو دل میں ہی دفن رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ لوگوں کی زبان پر آنے کے بعد یہ جذبہ تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔“ کا جل نے اسے نصیحت کی۔

”آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔“ اس نے فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کر لی اور خط کا کاغذ تہ کر کے لفافے میں رکھنے لگی۔

”فاروق صاحب کو اس خط کا جواب دو گی تو اس میں اپنے شملہ پہنچنے کی خبر دو گی کیا؟“ کا جل نے اس سے پوچھا۔ اس بار اس کا لہجہ پہلے ہی کی طرح نرم تھا۔ وہ چاند بانو سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی سچی خیر خواہ تھی۔

”ارادہ تو نہیں ہے۔ کیا خیال ہے انہیں اطلاع دینی چاہیے کیا؟“ اس نے کا جل سے رائے مانگی۔

”مت دو اطلاع۔ اچانک پہنچ کر ان کے تاثرات دیکھنا۔“ کا جل نے اسے مشورہ دیا۔

”ہم بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہے ہیں۔“ اس کے پنکھڑی کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ چٹختی۔ وہ جیسے تصور کی آنکھ سے فاروق کا حیران چہرہ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس بل اس کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ کا جل نے نظر لگ جانے کے ڈر سے اپنی نظریں اس پر سے ہٹالیں اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”آؤ چلو۔ چل کر سب کے درمیان بیٹھتے ہیں۔“ چاند بانو نے خط اپنے ٹپکے کے نیچے احتیاط سے رکھا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی چال کے متوالے پن میں آج ہونے والی آدمی ملاقات کی سرشاری بھی شامل تھی۔

☆☆☆

ربن کی قہر بار نظریں اپنے سامنے کھڑے شخص پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت مجود دادا لے اڈے پر تھا۔ اس کے داگیں ہاتھ پر رامو بیٹھا ہوا تھا اور سامنے اڈے کے باقی

افراد موجود تھے۔ اچھے خاصے افراد کی موجودگی کے باوجود وہاں ایسی خاموشی تھی کہ پن بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اس خاموشی میں صرف ربن کی آنکھیں بول رہی تھیں اور یہ آنکھیں قہر کی جو زبان بول رہی تھیں اس کو سمجھنے والوں کے دل اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب انہوں نے یہیں اسی مقام پر ربن کے ہاتھوں مجود دادا کا انجام دیکھا تھا۔ ایک عرصے اڈے پر حکمرانی کرنے والے مجود دادا کو اس نے منٹوں میں چت کر دیا تھا اور بڑے بڑے دعوے کرنے والا مجود دادا اس لائق بھی نہیں رہا تھا کہ زندگی میں کبھی چاقو تھام سکے۔

”تیرے کو اڈے کے اصولوں کا پتا نہیں لگا تھا کیا؟“ سامنے کھڑے شخص کو کچھ دیر گھورتے رہنے کے بعد اس نے بھاری آواز میں اس سے استفسار کیا۔

”اپن نے کوئی نیا کام نہیں کیا ہے۔ اپن نے وہی کیا ہے جو اتنے سالوں سے کرتا آرہا ہے۔“ اس شخص نے شانے جھٹکتے ہوئے ذرا خراب مزاج کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ قد کاٹھ اچھا تھا اور ہاتھ پیروں کا بھی مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کا نام رفیق عرف فیرکا تھا اور وہ مجود دادا کے منہ چڑھے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

”اب وہ تیری ماں کا یا اس اڈے کی گدی پر نہیں بیٹھا ہے جس کے ہوتے تو اپنی من مانی کرتا تھا۔ اب یہ مجوکا نہیں، ربن دادا کا اڈا ہے اور یہاں صرف ربن دادا کا اصول چلنے کا ہے۔ تم ساروں کو پہلے دن ہی بولا تھا کہ جس کو ادھری رہنا ہے اپنے اصولوں کے حساب سے رہنا ہوگا ورنہ ادھر سے چلتے بنو۔ ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ کدھر نہ کدھر تم کو جگہ مل ہی جائے گی پر تو سمجھ رہا تھا کہ ربن دادا کی ناک کے نیچے رہ کر اپنی من مانی کرتا رہے گا اور کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ پر یہ تیری بھول تھی۔ یہ جو تیرے کو اپنے تھو بڑے پر دو آنکھیں اور دو کان دکھتے ہیں، یہ دیکھنے کو صرف دو دو ہیں ورنہ اپن کی سیکڑوں آنکھیں اور سیکڑوں کان ہیں اور تیرے جیسے..... اپنے سے چھپ نہیں سکتے۔“ اس نے منہ بھر کے فیکے کو ایک بڑی سی گالی سے نوازا۔

”گالیاں مت دو دادا۔“ گالی سن کر فیکے کا منہ سرخ ہو گیا اور اس نے احتجاج کیا۔

”گالی نہ دوں تو تیرے جیسے..... کو پھولوں کا ہار پہناؤں۔“ ربن نے اسے ایک اور زوردار گالی دی۔ گالی سن کر فیکے کی آنکھوں میں طیش کی لہر دوڑ گئی اور اس نے لبوں کو یوں کھولا کہ جیسے جواب میں خود بھی کوئی سخت لفظ کہنا چاہتا

شیش محل

اس کا کچا چٹھا کھولا تو وہ بس سر جھٹک کر رہ گیا، منہ سے کچھ بولا نہیں۔

”اسے باندھ کر چوک پر ڈال دو اور گن کر سب کے سامنے پورے سو جوتے لگاؤ تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ ربن دادا کے اڈے پر کوئی اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔“ ربن نے اس کا باغیانہ انداز دیکھا اور جھٹ سزا تجویز کر دی۔ اس سزا کو سن کر فیکے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے سر عام جوتے لگائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ پھر اس علاقے میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا۔

”تم لوگوں نے سنا نہیں کہ اپن نے کیا کہا ہے۔“ فیکے کو سنائی جانے والی سزا پر دم بخود رہ جانے والوں کو اس نے قہر بار لہجے میں پکارا تو اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے لوگوں کے جسموں میں جنبش پیدا ہوئی۔ پہلے پیش قدمی کرنے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے دل سے ربن کی اڈے پر حکمرانی کو تسلیم کر لیا تھا۔

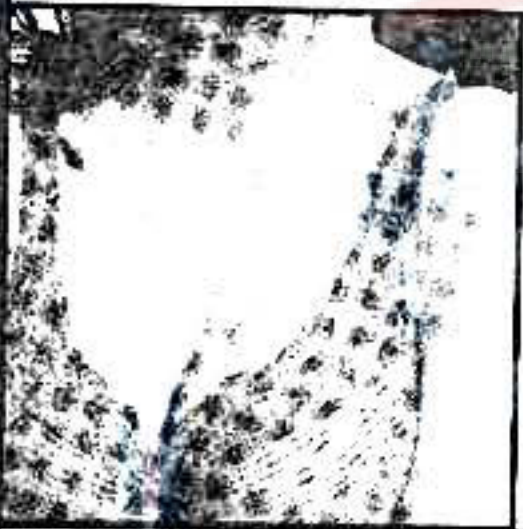
”ہاتھ نہیں لگانا اپنے کو۔“ فیکے نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو بھڑک اٹھا اور چاقو نکال لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں چاقو ہی چاقو نکل آئے۔ اتنے چاقوؤں کی

ہولیکن پھر عین وقت پر ہونٹوں کو بھیج لیا۔
”اپن نے بولا تھا کہ ادھر اپنی مرضی نہیں چلے گی اور کوئی ماں کا جنا اپنی مرضی سے کہیں سے ایک دھیلا نہیں لے گا۔ اپنے پاس سارا کام حساب کتاب سے ہوتا ہے اور حساب کتاب سے سب کو حصہ ملتا ہے پر تو نے اپنی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑادی اور حاجی سرمد کی دکان سے ایک دو نہیں پورے درجن بھر جوڑے کٹوا ڈالے۔ تیرے کو ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی تھی؟“ ربن اس پر بری طرح بگڑ رہا تھا۔

”اپنے کو ضرورت تھی اس لیے اپن نے ایسا کیا۔“ فیکے نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک واضح بغاوت تھی اور لگتا تھا وہ ربن کے رعب میں آنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

”کیوں تیرے کو بہن بیٹی کا دھج بنانے کا تھا جو ضرورت تھی؟ ہوتی تو اپن خود سارا انتظام کرتا پر تو حرام کا جنا تو اس رن..... کے نازا اٹھانے کو مال سمیٹ کر لے گیا تھا نا جس کے کوٹھے پر دن رات پڑا رہتا ہے اور جس کی ہوس کا پیٹ کسی طرح بھرنا ہی نہیں۔“ ربن نے کاٹ دار لہجے میں

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جازب نظر آئیں



بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹاسٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
گزشتہ 30 سال سے آزمودہ

چہرے کے فاضل
بالوں کو ہمیشہ کیلئے
ختم کرتی ہے۔

یونانی کریم
کلیسی

اپنی PIC روانہ کریں

WhatsApp: 0311-5800057

Email: bdhdeva@yahoo.com

skype: devapak

0322-2916250

0300-2500026

کراچی ہیم ڈیویری

چٹائی ڈیویری

- ☐ مسئلہ دو خانہ مالہ و عید آباد
- ☐ باجانب ہوید مشورہ جنت بازار لعل آباد
- ☐ عوامی دو خانہ من بازار مظفر آباد
- ☐ شہزادہ خانہ شاہ بازار بہاول پور
- ☐ انتظامیہ ملک بازار ملک آباد چتر
- ☐ ملت دو خانہ گھنٹہ گھر پٹنہ
- ☐ غنی ہوید مشورہ بکری روڈ متن

- ☐ خالدہ خانہ صرافہ بازار امروٹ آباد
- ☐ قدیمی چھوٹی دو خانہ بکری بازار سرحد
- ☐ سلیم ہزاری کوٹہ و خانہ آباد
- ☐ غنی انتظامیہ جلال مشورہ بہاول
- ☐ یونی چنسا مشورہ جری کشمیری روڈ کوٹہ
- ☐ ناصر دو خانہ 20 سدرہ کن پٹنہ صدر
- ☐ کلاںک اویس پٹنہ کوٹہ

- ☐ خوبیا مشورہ بکری مارکیت صدر کراچی
- ☐ صدر میٹلک مشورہ بکری مارکیت صدر کراچی
- ☐ مسلم جنرل مشورہ بکری مارکیت پٹنہ کراچی
- ☐ ابراہیم من لیاقت مارکیت پٹنہ کراچی
- ☐ آداس میٹلک مشورہ بکری مارکیت 22 کراچی
- ☐ قمری مشورہ بکری مارکیت 22 کراچی
- ☐ غنی مشورہ بکری مارکیت 22 کراچی

051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹرچر مفت منگوائیں

انجیب پانی مشورہ بکری مارکیت پٹنہ کراچی، 021-32720328 ریاض محمد 69 نمبر عالمگیر مارکیت شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264
پورے پاکستان میں گھرے منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ
فہمیر آل کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Website: www.devaherbal.com, Cell: 0333-5203553

موجودگی میں اکیلا فیکا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اتھار ڈالنے ہی پڑے۔ ذرا دیر میں وہ رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ پانچ چھ بندوں نے مل کر اسے اٹھایا اور ربن کے حکم کی تعمیل کے لیے چل پڑے۔ اس سارے ہنگامے کے بعد ربن زیادہ دیر سب کے درمیان نہیں ٹھہرا اور رامو کے ساتھ اٹھ کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔

”اپنے کو لگتا ہے یہ بات ادھر ہی ختم نہیں ہوگی۔ فیکا پھر دوبارہ کمیٹہ پن کرے گا۔ سالے کی آنکھوں پر سو رکی چربی چڑھی صاف نظر آرہی تھی۔“ تنہائی ملتے ہی رامو نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”اپنی جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔ اپن نے بھی سب دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ حرام کا جناب ادھر نکلنے والا نہیں ہے۔ تو دیکھ لینا وہ دوبارہ ادھر شکل نہیں دکھائے گا اور یہ بہت اچھا ہوگا۔ اپن کو اس کے تیور نظر آرہے تھے۔ باقیوں کو سبق سکھانے کے واسطے اس کا یہ انجام ضروری تھا۔“ ربن نے اسے جواب دیا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”اپن اب ادھر سے چلے گا۔ ادھر بھی دیکھنا ہے۔ تو ادھر ہی رک اور آنکھیں اور کان کھلی رکھ۔“ رامو کو نصیحت کر کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اس کا رخ اپنے پرانے اڈے کی طرف تھا۔ شملہ سے واپسی کے بعد اس نے دونوں اڈوں میں کئی انتظامی تبدیلیاں کی تھیں جن میں سب سے بڑی تبدیلی افراد کا تبادلہ تھا۔ مجود ادا والے اڈے سے کچھ لوگ اپنے اڈے پر منتقل کیے گئے تھے اور کچھ افراد کو پرانے اڈے سے مجود ادا والے اڈے پر لایا گیا تھا۔ اس طرح نئے شامل ہونے والوں کی تربیت اور نگرانی دونوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ ان چکروں میں الجھا وہ جولی سے ملاقات کا وقت بھی نہیں نکال سکا تھا۔ ایک تو وہ خود بھی ملازمت کرتی تھی اس لیے ایسا بھی ہوا کہ اس کے پاس ملاقات کی فرصت ہوتی تو وہ گھر پر موجود نہ ہوتی لیکن آج اسے امید تھی کہ ملاقات ہو جائے گی کیونکہ شام ہو چکی تھی اور شام تک جولی واپس گھر آ جاتی تھی۔ اسے ثریا بانو کے رشتے کے سلسلے میں غلام محمد سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ اپنے علاقے میں پہنچ کر اس نے کمو کو اڈے پر جانے کا حکم دیا اور خود جانی کے ساتھ غلامو کے گھر کی طرف بڑھا۔ کمو اور جانی کو وہ مجود ادا والے اڈے سے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔

”ارے بھائی آپ آئیے اندر تشریف لائیے۔“ غلام محمد کا دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ خود باہر نکلا اور ربن کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر گرم جوشی سے دعوت دی۔

”نہیں بھائی۔ اپن کو دوسرے کام سے جانا ہے۔ آپ کے پاس بس اس لیے ٹھہرے تھے کہ پتا کر لیں کہ آپ نے لڑکے والوں کو بمبئی آنے کا پیغام بھیج دیا یا نہیں۔ اپن چاہتا ہے کہ وہ لوگ آئیں تو اپن ان سے ملنے کو موجود ہو۔“ ربن نے اندر جانے سے انکار کرتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”پیغام بھیج دیا ہے اور وہاں سے جواب بھی آ گیا ہے۔ آنے والے سوموار کو وہ لوگ بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ میں خود یہ اطلاع دینے آپ کے پاس آنے ہی والا تھا۔“ غلام محمد نے اسے بتایا۔

”تم آؤ کہ اپن آئے ایک ہی بات ہے۔ کام کی بات ہوگئی، یہ کافی ہے۔ یاد رکھنا کہ وہ لوگ اپنے مہمان ہوں گے اور ان کی ساری خاطر مدارت اپنے ذمے ہوگی۔“ ”جیسی آپ کی مرضی۔“ غلام محمد نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

”چلو تو پھر ابھی اپن چلتے ہیں۔“ ربن وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ اندر نگلی میں جولیٹ کے گھر کی طرف تھا۔ دروازے پر تالا موجود نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ جولیٹ گھر میں ہی ہے۔ اس کے اشارے پر جانی نے دروازے پر زور سے دستک دی اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب ربن اکیلا دروازے کے مقابل کھڑا تھا۔ دستک کا فوری رد عمل ظاہر ہوا اور اندر سے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور جولیٹ کا چہرہ نظر آیا لیکن ربن کی نظروں نے جس پہلی چیز کو فوکس کیا، وہ جولیٹ کا چہرہ نہیں کچھ اور تھا۔ جولیٹ نے بھی اس کی نظر کے زاویے کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور تیزی سے شانوں پر پڑے اس کا رخ کو سمجھ کر آگے پھیلایا۔ اس کے اس عمل سے قبل ہی ربن اپنی نظروں کا رخ بدل چکا تھا لیکن دونوں فریقین جانتے تھے کہ مل بھر میں کیا ہو گیا ہے۔ ربن نے تو پھر تیزی سے اپنی نیت پر قابو پا لیا لیکن جولیٹ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ”چہ جب وہ بولی تو بھی اس کی آواز کانپ رہی تھی۔“

”جی فرمائیے۔“ یہ دو لفظ ادا کرنے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید

Downloaded From
Paksociety.com

سینس ڈائجسٹ

شناخت

تئویر ریاض

کبھی کبھی اندھا اعتماد گہری نظر رکھنے والوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ذرا سی غلطی کر بیٹھی تھی مگر جب اعتماد اور یقین کی دیوار گری تو وہ خود بھی جانے کتنی پستی میں جا دی۔ اور بس اس ایک پل میں اس نے یقین اور گمان کے درمیان بہت لمبا سفر طے کیا اور بالآخر صحیح مقام پر جا پہنچی لیکن... اس ایک پل کی شناخت اس کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گئی۔

بھولے بسرے چہروں میں رشتوں کی تلاش کا کٹھن مرحلہ



Downloaded from
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



کہ میں کچھ نہ سن سکی اور نہ ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ میرے سر کا دایاں حصہ لکڑی کے فرش سے ٹکرایا اور میں وہیں ڈھیر ہو گئی۔ کافی دیر تک حرکت کرنے کے قابل نہ رہی اور فرش پر لیٹے ہوئے یوں لگا جیسے گولی مجھے لگی ہے اور شاید میں

”کیا تم ترتیب سے واقعات کی تفصیل بتا سکتی ہو؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا لیکن میں کوئی معقول جواب نہ دے سکی کیونکہ مجھے تفصیل یاد نہیں تھی۔ پستول کا قاتر میرے قریب سے ہوا تھا اور دھماکے کی آواز اتنی زیادہ تھی

مرچکی ہوں کیونکہ میں کچھ محسوس کر رہی تھی اور نہ ہی سن پارہی تھی۔

کافی دیر تک میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید مرچکی تھی یا زندہ تھی۔ جب تک حرکت کرنے کی کوشش نہ کرتی یہ کیسے معلوم ہوتا کہ میں زندہ ہوں یا مرچکی ہوں لیکن وہ اس وقت تک زندہ تھا جب میں اس سے چلے جانے کی التجا کر رہی تھی پھر ایک فائر ہوا اور گولی اس کے سینے میں جا گئی۔ اس وقت تک ٹریوس زندہ تھا لیکن وہ میری بات نہیں سن رہا تھا اور مجھ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور الفاظ میرے دماغ میں جم کر رہ گئے۔ ”چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔“ میں اس کی خوشامد کر رہی تھی۔

لیکن اس پر میری التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل قہقہے لگا رہا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند لمحوں بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔ کوئی بھی جاندار اپنی موت کے بارے میں نہیں جانتا۔ ٹریوس اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں خیال آیا کہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ میں اسے شناخت کر چکی ہوں۔ اس لیے میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن اپنے کزن ٹریوس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گن تھی۔

وہ منظر کبھی کبھی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح مجھے ستاتا ہے۔ میں بے سدھ فرش پر لیٹی ہوئی ہوں۔ میرے بازو اور ٹانگیں سن یا مفلوج ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بچوں میں سے کوئی ایک میرا کندھا ہلا کر جگا دیتا ہے۔

”مٹی، اٹھ جاؤ۔“ میری بیٹی اس حالت میں لیٹا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور خوفزدہ ہو کر رونے لگتی ہے، تب میں ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں اور بچوں کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتی ہوں تاکہ انہیں یقین آجائے کہ ان کی ماں خیریت سے ہے۔

”کیا تمہیں وہ گن یاد ہے؟“ مجھ سے پوچھا گیا۔ میرا جواب نفی میں تھا۔ گن نہیں البتہ فائر کی آواز یاد ہے۔ میں صاف طور پر گن نہیں دیکھ سکی کیونکہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اسپارٹا جرنل میں اس گن کی ساخت ایشاریہ چین آٹھ کولٹ ریوالور کے طور پر ہوئی تھی اور یہ چھپالیس ڈرویلین ایونیو میں رہنے والے گورڈن

میکڈ انلڈ کی ملکیت تھا جسے 1958ء میں اس کا ہوم اوئر پر مٹ جاری ہوا تھا۔ اس کے تحت مالک پر لازم ہے کہ وہ ہتھیار کو گھر میں رکھے اور اسے جیب یا کار میں رکھ کر گھر سے باہر لے جانا ممنوع ہے۔ مسٹر میکڈ انلڈ کے پاس دو شکاری بندوقیں بھی تھیں جو اس کے گھریلو دفتر کی الماری میں مقفل تھیں جسے میرا کزن اور اس کا دوست نہیں کھول سکے۔

جب ریوالور سے فائر ہوا تو میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ گولی لگی یا کزن نے مجھے فرش پر گرا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی اور کو گولی لگی۔ وہ جان بوجھ کر چلائی گئی یا کوئی حادثہ تھا۔ اس واقعے کو چھبیس سال گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا لیکن سچ یہ ہے کہ اب بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ میکڈ انلڈ ہاؤس آج بھی چھپالیس ڈرویلین ایونیو پر موجود ہے جیسے یہ کوئی عام مکان تھا جس میں کسی کا قتل نہ ہوا ہو۔ یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے اور ہر بار جب بھی میں اسپارٹا آتی تو یہ مجھے پوری طرح اپنے بچوں میں جکڑ لیتی ہے۔

اگر میں کار میں اپنے بچوں یا کسی اور کے ساتھ وہاں سے گزروں تو کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرتی اور عموماً اس مکان پر دوسری نظر ڈالے بغیر وہاں سے گزر جاتی ہوں۔ میری چودہ سالہ بیٹی پوچھتی ہے کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

”اس مکان میں میری ایک پرانی ٹیچر رہا کرتی تھی۔“ میں خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوں جیسے برابر میں بیٹھی ہوئی بیٹی اور پچھلی نشست پر براجمان بیٹے کو ستانے کے بجائے خود سے مخاطب ہوں۔

میری بیٹی ایلن پوچھتی ہے کہ مسز میکڈ انلڈ کیسی ٹیچر تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسز میکڈ انلڈ بہت عرصہ پہلے اسپارٹا سے جا چکی تھی لیکن یہ نہیں جانتی کہ وہ دونوں میاں بیوی اب بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ شاید وہ حیات ہوں کیونکہ 1961ء میں وہ درمیانی عمر کے تھے۔

”وہ بہت اچھی ٹیچر تھیں۔“ میں سوچ کر جواب دیتی ہوں۔ ”ہم سب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔“

”وہ کیا پڑھاتی تھیں مام؟“

”وہ ہمیں سوشل اسٹڈیز پڑھاتی تھیں اور نویں جماعت میں وہ میری کلاس ٹیچر بھی تھیں۔“

”میری زندگی میں ان کی خاص اہمیت تھی۔“ میں

نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر مضبوطی سے جھاتے ہوئے کہا۔ میری نظریں پرانے مکانات کی قطار پر جمی ہوئی تھیں۔ سرخ اینٹوں اور سبز دروازوں والے مکان آج بھی اسی حالت میں تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ میں جب بھی اسپارٹا آتی اور اس مکان کے پاس سے گزرتی تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگتی اور دماغ کی اسکرین پر برسوں پرانی فلم چلنے لگتی۔

☆☆☆

”صرف تم اور کوئی نہیں ماریا۔ میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ کسی اور کو اس مکان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

میرے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اپنی ٹیچر کی مدد کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈانلڈ کو بغرض علاج سیراکوس کے اسپتال میں داخل ہونا تھا اور مسٹر میکڈانلڈ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں مکان کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ میری ذمہ داریوں میں روزانہ اسکول سے واپس آنے کے بعد میکڈانلڈ ہاؤس جانا، اخبار اور ڈاک اٹھانا، مسٹر میکڈانلڈ کی بلی کے لیے خوراک کا انتظام کرنا اور پودوں کو پانی دینا تھا۔ مسٹر میکڈانلڈ کا کہنا تھا کہ وہ مجھے ان خدمات کا معاوضہ ادا کریں گی۔ معاوضے کی رقم سن کر میں حیران رہ گئی۔ یہ بے بی سنگ کے معاوضے سے دو گنا تھی۔ تاہم یہ ایک ہنگامی صورت حال تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ مسٹر میکڈانلڈ کو اچانک ہی آپریشن کی ضرورت پیش آجائے گی اور انہیں اپنے شہر سے پچاس میل دور سیراکوس کے ایک ہوٹل میں قیام کرنا پڑے گا جو اسپتال سے نزدیک ہی تھا۔ اس دوران کوئی متبادل ٹیچران کی جگہ کلاس لیتی جبکہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے وہ مجھ سے مدد کی توقع کر رہی تھیں۔

وہ اپریل 1961ء کا مہینا تھا۔ اس وقت میں چودہ سال کی اور نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ مسٹر میکڈانلڈ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ چالیس کی ہونے کے باوجود وہ بہت پُرکشش تھیں۔ ان کے ملبوسات، بالوں کا انداز، ذہانت اور شاندار شخصیت انہیں دوسری ٹیچرز سے ممتاز کرتی تھی۔ ان کا جسم بے حد متناسب تھا۔ اس وجہ سے ہر لباس ان پر چلتا تھا اور انہیں دیکھ کر ہالی ووڈ ایکٹریس جین کریبن کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسپارٹا کے سب سے بہترین علاقے میں واقع ایک بڑے اور پُرکشش مکان میں رہتی

تھیں۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈانلڈ ریٹائرڈ فوجی افسر تھے جنہوں نے جنگ عظیم دوم میں خدمات انجام دی تھیں۔ مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جب مسٹر میکڈانلڈ نے کلاس روم سے نکلتے ہوئے میرا بازو پکڑ کر کہا تھا۔ ”ماریا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ اگلے روز ان کے شوہر کا آپریشن ہے۔

”یہ کوئی بڑا آپریشن نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”گورڈن بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل ہم لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ کل صبح سات بجے اس کا آپریشن ہے۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟“

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ میرے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی کہ انہوں نے اس اہم ذمہ داری کے لیے میرا انتخاب کیا۔

جانتی تھی کہ میری ماں اس کی مخالفت نہیں کرے گی کہ میں اس ہنگامی صورت حال میں اپنی ٹیچر کی مدد کروں۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسکول کی کوئی ٹیچر میری ذات میں دلچسپی لے اور میں دوسری لڑکیوں سے آگے نکل جاؤں۔ دراصل اس طرح وہ اپنی محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دیہی علاقے میں پیدا ہوئی اور حالات کے سبب اسے نویں جماعت میں اسکول چھوڑنا پڑ گیا۔

مسٹر میکڈانلڈ ہمارے مکان سے چند بلاک کے فاصلے پر رہتی تھیں۔ اس دن اسکول ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ اس علاقے میں سبھی مشہور لوگ رہا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اپنے والدین یا کسی قریبی رشتے دار کے بجائے ایک غیر عورت کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ وہ کافی پریشان لگ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے شوہر کو ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے سیراکوس کے اسپتال بھیج دیا گیا ہے جبکہ وہ اگلے روز صبح روانہ ہوں گی اور توقع ہے کہ آپریشن شروع ہونے سے پہلے اسپتال پہنچ جائیں گی۔ آپریشن معمولی نوعیت کا ہے۔ اس لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بار بار ایک ہی بات کہی۔ ”ماریا! یہ بہت اہم ہے کہ کسی اور کو مکان میں داخل نہ ہونے دو۔ سوائے تمہاری ماں کے، اگر وہ ساتھ آنا چاہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ وعدہ کرو کہ کسی اور کو اندر نہیں آنے دو گی۔“

میں نے وعدہ کر لیا۔ ویسے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بلاتی۔ صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد سزمیکڈ انلڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ ”اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی مقفل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے، وہ تم کھانے کی میز پر رکھ دینا۔“

وہ مجھے لے کر پختی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔ میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی ملی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ سیڑھیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

”تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہوگا تاکہ ساشا کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کر سکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم..... کوئی اور نہیں۔“

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھما رہی تھیں اور بھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیشے کی کھڑکیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ سزمیکڈ انلڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی لہذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔

اس دوران میں ایک خوب صورت سیامی ملی کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیکی اور کان عام بلیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے کبھی

قریب سے اتنا دلکش جانور نہیں دیکھا تھا۔ سزمیکڈ انلڈ نے کہا۔ ”امید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنا لو گی۔“ لیکن یہ ظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ سزمیکڈ انلڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ملی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز ملی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے پیالہ دھو کر اسے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔ اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔

”خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔“ سزمیکڈ انلڈ نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔“

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ سزمیکڈ انلڈ نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ”ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کل صبح اسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابل اعتماد شاگرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔“

گھر سے باہر نکلتے وقت انہوں نے مجھے چابی سے دروازہ کھولنے کی مشق کروائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی بیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

وہ بالکل ساٹھ ڈالر زتھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گوکہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اسرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیصلہ کر لیں، تبدیل نہیں ہوسکتا تھا۔

”اندھیرا پھیل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔“

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لوگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمے

داریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور مہر جوش نظر آرہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکر مند بھی کہ اگر مسز میکڈانلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آگیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

مسز میکڈانلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے پیسے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں پہلی بار میکڈانلڈ باؤس گئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موہوم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈائننگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے کچن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ سنک میں ناشتے کے برتن بغیر دھلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت جلد میں روانہ ہوئی ہو۔ کچن کا ڈنر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے مقفل نہیں تھے جیسا کہ مسز میکڈانلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر مسز میکڈانلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط مسز میکڈانلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بچا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالا سے صاف کیا اور اس کے لیے مچھلی کا نیا ڈبہ کھولا اور ساتھ ہی خشک میوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں

آ رہی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر سنک میں رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کر کے کینٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ مسز میکڈانلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے ٹیلی ویژن کو آن کیا جو ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہو گئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

ٹی وی روم کے برابر میں مسز میکڈانلڈ کا ہوم آفس تھا جسے میری ٹیچر نے مقفل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے مسز میکڈانلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیڑھیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار پکارا۔ ”ہیلو، ہیلو“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کُل کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے مگر مجھے آئے ہوئے یہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو مسز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھلانا تھا لیکن وہ آواز سن کر میں اتنی گھبرا گئی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکنا محال ہو گیا۔ میں نے جلدی سے لائنس آف کیس اور گھر کی طرف چل دی مگر کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ مام نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ مسز میکڈانلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

میں نے وعدہ کر لیا۔ ویسے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بلاتی۔ صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد مسز میکڈانلڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ ”اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی منتقل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے، وہ تم کھانے کی میز پر رکھ دینا۔“

وہ مجھے لے کر نئی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔ میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی بلی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ سیڑھیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

”تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہوگا تاکہ ساشا کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کر سکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم..... کوئی اور نہیں۔“

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھما رہی تھیں اور بھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیٹے کی کھڑکیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ مسٹر میکڈانلڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی لہذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔

اس دوران میں ایک خوب صورت سیامی بلی کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیکی اور کان عام بلیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے بھی

قریب سے اتنا دلکش جانور نہیں دیکھا تھا۔ مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ ”امید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنا لو گی۔“ لیکن یہ ظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز بلی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے پیالہ دھو کر اسے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔ اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔

”خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔“ مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔“

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز میکڈانلڈ نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ”ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کل صبح اسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابل اعتماد شاگرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔“

گھر سے باہر نکلتے وقت انہوں نے مجھے چابی سے دروازہ کھولنے کی مشق کروائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی بیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

وہ کل ساٹھ ڈالر تھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گوکہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیصلہ کر لیں، تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔

”اندھیرا پھیل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔“

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لوگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمہ

داریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور مریجوش نظر آرہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکر مند بھی کہ اگر مسز میکڈانلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آگیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

مسز میکڈانلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے پیسے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں پہلی بار میکڈانلڈ باؤس گئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موہوم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈائننگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے کچن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ سنک میں ناشتے کے برتن بغیر دھلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت عجلت میں روانہ ہوئی ہو۔ کچن کا وٹنر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے مقفل نہیں تھے جیسا کہ مسز میکڈانلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر مسز میکڈانلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط مسز میکڈانلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بچا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالا سے صاف کیا اور اس کے لیے مچھلی کا نیا ڈبا کھولا اور ساتھ ہی خشک میوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں

آ رہی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر سنک میں رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کر کے کینٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ مسز میکڈانلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے نیلی ویرٹن کو آن کیا جو ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہو گئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

ٹی وی روم کے برابر میں مسٹر میکڈانلڈ کا ہوم آفس تھا جسے میری ٹیچر نے مقفل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے مسز میکڈانلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیرھیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار یکارا۔ ”ہیلو، ہیلو۔“ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کُل کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے گوکہ مجھے آئے ہوئے بہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو مسز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھانا تھا لیکن وہ آواز سن کر میں اتنی گھبرائی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکنا محال ہو گیا۔ میں نے جلدی سے لائنس آف کہیں اور گھر کی طرف چل دی گوکہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ مام نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ مسز میکڈانلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

یہ عجیب و غریب سوال سن کر میں حیران رہ گئی۔ ”ہاں سب ٹھیک ہے، گھر کو کیا ہوتا تھا؟“

”اس نے آج مجھے سیرا کوس سے فون کیا تھا۔“

”تمہیں فون کیا تھا..... کیوں؟ وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

”وہ تمہارے اور اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہی تھی لیکن اس نے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ ذاتی باتیں کسی سے نہیں کرنا چاہتی۔“

دوسرے روز ماں نے رضا کارانہ طور پر میرے ساتھ چنے کی پیشکش کی لیکن میں نے فوراً ہی منع کر دیا کیونکہ مسز میکڈانلڈ نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں کسی کو اپنے ساتھ لے کر نہ آؤں البتہ ماں کے لیے منع نہیں کیا تھا لیکن میں احتیاط سے کام لے رہی تھی۔

”میں نہیں سمجھتی کہ مسز میکڈانلڈ کو اس پر کوئی اعتراض ہوگا۔“ ماں نے کہا۔

”لیکن میں وعدہ کر چکی ہوں اور اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی۔“

اس روز میں نے وہ سارے کام نمٹا دیے جو مسز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ مجھے اپنی نیچر کی ہدایت کے مطابق ایک گھنٹا وہاں رہنا تھا۔ میں نے وقت تزاری کے لیے ساشا کو اپنے پاس بلانا چاہا لیکن وہ مجھ سے دور رہی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تمام کمروں کی لائٹس آن کر دیں۔ اس کے بعد اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھ گئی لیکن مجھے بے آرا می محسوس ہو رہی تھی۔ سو اسات ہو چکے تھے اور میں واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ریسپور اٹھایا۔ دوسری جانب سے مسز میکڈانلڈ بول رہی تھیں۔

”بیلو، ماریا! کیسی ہو..... گھر کا کیا حال ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے وہ سارے کام کر دیے جو تم نے مجھے بتائے تھے۔“

”اور ساشا کیسی ہے؟“

”کھانا کھا رہی ہے لیکن مجھ سے اب بھی تھوڑی سی خوفزدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی ہماری دوستی ہو جائے گی۔“

انہوں نے مجھ سے ایک بار پھر مکان کے بارے میں پوچھا۔ وہ اپنی ڈاک کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھیں اور ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی فون تو نہیں آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم سب انہیں بہت یاد کر رہے ہیں اور سب لوگ پوچھتے

رہتے ہیں کہ تم واپس کب آؤ گی؟

”بہت جلد۔ اگلے ہفتے تک واپس آ جاؤں گی۔“

میں نے ان سے مسز میکڈانلڈ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ میں نے گھر کی بتیاں بجھائیں اور اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

تیسرے روز میں نے چھتج کر بیس منٹ پر اپنا کام ختم کر لیا۔ بلی کے برتن دھوئے اور اس میں تازہ کھانا رکھ رہی تھی کہ میں نے ساشا کو بچن کے دروازے پر دیکھا۔ وہ اضطراب کی طور پر اپنی دم فرش پر گر گئی تھی۔ عین اسی وقت دروازے کی کھنٹی بجی جس کی آواز اس خاموش مکان میں ایک چھٹا کے کے ساتھ گونجی۔ کیا کوئی دروازے پر تھا؟ میں سوچنے لگی کہ میرے والدین کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ میں اس وقت یہاں ہوتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میکڈانلڈ کا کوئی جاننے والا ہو۔ کوئی سامان لانے والا شخص تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ نوگ عموماً صبح کے وقت آتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ یہ سوچ کر واپس چلا جائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ میں نے مسز میکڈانلڈ کی ہدایت کے مطابق تمام کمروں کی بتیاں روشن کر رکھی تھیں جس سے کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ گھر خالی نہیں ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ لیونگ روم کی جو کھڑکیاں سڑک کی جانب کھلتی تھیں، وہاں پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کسی کے لیے باہر سے جھانکنا ممکن نہ تھا۔

دروازے کی کھنٹی دوبارہ بجی اور بار بار بجتی رہی جو کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ یقیناً یہ کوئی میکڈانلڈ کا دوست نہیں ہو سکتا پھر میرے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ”ماریا!“ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ وہ میرا کزن ٹریوس ریڈل تھا لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟ یہ بات تو صرف میرے والدین ہی جانتے تھے۔ ضرور میری ماں نے اپنے کسی رشتے دار کے سامنے شیخی بگھاری ہوگی کہ میں اپنی نیچر کی غیر موجودگی میں اس کے مکان کی دیکھ بھال کر رہی ہوں اور اس نے میری سوتیلی خالہ لوئیس ریڈل کو بتا دیا ہوگا جو اسپارٹا سے نو میل کے فاصلے پر پنجم کاؤنٹی میں رہتی تھی لیکن دونوں بہنوں کے درمیان ملنا جلنا نہیں تھا اور وہ میرے کزن ٹریوس کی ماں تھی۔

یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ میں نے ٹریوس کو

گزشتہ ایک سال سے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ ایک ایسی جگہ کیوں آگیا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟ وہ مسلسل کھنٹی بجا رہا تھا اور بار بار کھنٹی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تم اندر ہو۔ دروازہ کھول دو لڑکی۔ باہر بہت سردی ہے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ”دروازہ کھولو ماریا، ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔“

میں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ دونوں دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لیے ہڈ پھین رکھے تھے۔ وہ میرا آوارہ گرد کزن تھا گوکہ میں نے یہ بات کبھی اس کے منہ پر نہیں کہی ورنہ وہ ناراض ہو جاتا۔ یہ ان کے خاندان کی خاصیت تھی۔ اگر انہیں شک ہو جائے کہ کوئی ان پر تنقید کر رہا ہے تو وہ جارحیت پر اتر آتے تھے۔

ٹریوس اب سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس میں ایک آرٹسٹ یا کارٹونسٹ جیسی خصوصیات تھیں۔ وہ اپنی کامک بک کی نقالی کرتے ہوئے ادھوری، دلچسپ اور رنگین تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ باب ڈیلن کی طرح نامور موسیقار بننا چاہ رہا تھا۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں ایک پرانا گٹار بھی خرید لیا تھا اور اسے بجا کر وہ اپنے آپ کو موسیقار سمجھنے لگا تھا۔ بد قسمتی سے وہ گٹار ٹوٹ گیا یا چوری ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریوس بھی مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اسے اپنی سے بڑی عمر کے ساتھی ویلز کے ساتھ لوٹ مار، نقب زنی اور چوری کے الزامات میں گرفتار کیا گیا تاہم انہیں نابالغ ہونے کی بنا پر اچھے چال چلن کی ضمانت پر رہائی مل گئی گوکہ میری ماں کے خیال میں وہ سخت سزا کے مستحق تھے۔

میری آنٹی لوئیس کی دو تین مرتبہ شادی اور طلاق ہو چکی تھی۔ ان کے پانچ بچے تھے جنہوں نے ان کی زندگی برباد کر رکھی تھی۔ ٹریوس ان میں سب سے چھوٹا اور ہونہار تھا۔ جی ہاں وہ میرا خاص کزن تھا۔ جانتی تھی کہ وہ میرے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے جس طرح میں اس کے لیے سوچتی ہوں۔

”ماریا، اچھی لڑکی۔ ہمیں اندر آنے دو۔“ وہ کسی لوہے کی سلاخ سے دروازے پر ضرب لگا رہا تھا اور مسلسل دروازہ کھولنے کی التجا کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ

نشے کی حالت میں ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازے پر آ کر اس سے جانے کے لیے کہوں۔ اس طرح وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر خاموش رہوں گی تو وہ یہی سمجھے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے اور اگر میں نے انہیں اشتعال نہ دایا تو وہ چند منٹوں میں چلے جائیں گے۔

ایسا ہی ہوا۔ پانچ یا چھ منٹ بعد دروازے پر ضربیں پڑنا بند ہو گئیں۔ اب وہ دروازے کی کھنٹی بھی نہیں بجا رہے تھے۔ میرے کزن کی التجائیں اور چیخا چلاتا بھی بند ہو گیا تھا۔ غالباً انہوں نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے بیرونی دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ ظاہر وہاں سیڑھیوں پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لیونگ روم کی کھنٹی سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے سامنے والے لان میں بھی کوئی نظر نہ آیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا سوچا ہی نہ تھا کہ وہ مجھے ہراساں یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور نہ ہی وہ یہاں سے کچھ چرانا چاہتا ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے پکڑے جانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور کبھی نہیں چاہے گا کہ میں کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤں جب تک کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں اب بھی اپنے کزن ٹریوس سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے چاہ رہی تھی کہ کم از کم آج کی رات وہ میکڈائلڈ ہاؤس میں نہ آنے۔

یہ جانتے کے بعد کہ ٹریوس اور اس کا ساتھی جا چکے ہیں، میں بھی گھر جانے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ اب مجھے بتیاں بچھانا تھیں۔ میں نے جلدی جلدی پودوں کو پانی دیا۔ اس کے بعد کچن میں واپس آئی۔ میں گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کچن کے دروازے پر آوازیں اور دبے دبے قہقہے سنائی دیے۔

”ماریا! ہم نے تمہیں دیکھ لیا۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے کی تاب گھمائی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اسی دوران ٹریوس کا چہرہ کھنٹی میں نمودار ہوا۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اندر آنے دو۔“ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان سے مغلطات کا طوفان ابل پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی، اس نے کھنٹی کے شیشے پر زوردار گھونسا مارا جس سے شیشے کے ٹکڑے کچن کے فرش پر بکھر گئے۔ اب اس نے اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی تاب گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کوشش میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا کیونکہ خون کے دھبے دروازے اور فرش پر نظر آ رہے تھے لیکن اس نے اس پر

کوئی توجہ نہیں دی۔

ٹریوس کا دوست اس کے پیچھے کچن میں نہیں آیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ٹریوس اتنی بڑا احتیاطی کا مظاہرہ کرے گا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ باہر کھڑا اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ غالباً ویلز تھا۔ اس کا جسم مضبوط، چوڑے جڑے اور عمر بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ اور سر ہڈ میں چھپا رکھا تھا اور وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے پھر وہ وہاں سے جانے لگا۔ ٹریوس نے غصے سے کہا۔ ”جہنم میں جاؤ۔“

جب وہ دونوں کچن کے دروازے کے باہر بحث مباحثہ کر رہے تھے تو مجھے چاہیے تھا کہ سامنے کے دروازے سے باہر نکل کر کسی کو مدد کے لیے پکارتی۔ راہ چلتی کسی گاڑی کو روکتی یا کسی پڑوسی کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بے حس و حرکت کھڑی اپنی پلکیں جھپکاتی رہی جیسے میری ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ایک شرارت سے زیادہ نہ ہو اور میرے کزن کا ارادہ حقیقت میں نقب زنی کرنے کا نہ ہو۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو میرے لیے برائی کا سبب بنے۔ وہ میرا دوست جو تھا۔

ٹریوس دروازے سے اندر آیا اور مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ہمیں اندر کیوں نہیں آنے دیا؟ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔“

میں نے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن میرے بازو پر اس کی گرفت بڑی مضبوط اور تکلیف دہ تھی۔ وہ اتنا قریب تھا کہ میں اس کی سانسوں کی ناگوار بو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے کبھی اسے اتنے پُر جوش انداز میں نہیں دیکھا تھا اور مجھے اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ میرا کزن مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔

میں نے اس سے چلے جانے کی التجا کی اور سمجھانا چاہا کہ میری کلاس ٹیچر اس مکان میں رہتی ہے اور میں اس کی غیر موجودگی میں یہاں کی دیکھ بھال کر رہی ہوں کیونکہ اس کا شوہرا ہسپتال میں ہے۔

”پریشان مت ہو ماریا۔ کوئی بھی اس مکان کو یا تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا تاوقتیکہ تم پولیس کو بلانے یا اس مقصد کے لیے باہر جانے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی صورت میں تمہیں پھنسا پڑے گا۔“

کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟ بچپن میں کھیل کے دوران وہ

کبھی کبھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جن میں دھمکی کی جھلک ہوتی تھی اگر میں فوراً ہی اس کی بات مان جاتی تو وہ نہ مجھے دھکا دیتا اور نہ ہی مارتا اور اگر میں روئے لگتی تو فوراً ہی نرم پڑ جاتا اور کہتا کہ وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن اب گوکہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ میں خوفزدہ و پریشان ہوں لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ ناراض ہونے کے باوجود قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کا دوست اسے یوں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ شاید وہ اسے دیکھ کر کہہ سکے۔ ”بے وقوف بزدل۔“

جب میں نے اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ یہاں سے چلا جائے تو اس نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تنگ مت کرو ماریا۔ میں اپنا کام ختم کر کے ہی جاؤں گا۔“

”ممکن ہے کہ پڑوسیوں نے تمہیں نقب زنی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس کو فون کر سکتا ہے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔ یہ مکان کافی فاصلے پر ہے ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی نے کچھ نہیں سنا ہوگا اور نہ ہی کوئی اس پر توجہ دے گا۔“

ٹریوس کچن کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ شاید ہی اس سے پہلے اس نے اتنا بڑا کچن دیکھا ہو۔ اس نے الماریوں کے دروازے اور کینٹ کی درازیں کھولیں اور ایک ایک کر کے چیزیں نکال کر دیکھنے لگا۔ اس نے مستی میں آکر اپنی جیکٹ اتار کر فرش پر پھینک دی۔ اس کے نیچے اس نے ایک سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال جو کبھی بہت خوب صورت ہوا کرتے تھے، اب گرد اور مٹی کی وجہ سے سخت اور بے رونق ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح شاداب نہیں رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ منشیات کا عادی ہو چکا تھا۔

”دوبارہ اکٹھے ہونے کی خوشی میں ایک ایک ڈرنک ہو جائے۔“ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے یاد نہیں کر رہی تھیں؟ کیا میں تمہارا پسندیدہ کزن نہیں ہوں؟“

میں نے مشروب لینے سے انکار کیا تو اس نے زبردستی میرے منہ سے گلاس لگایا۔ میں نے دانت بھینچ لیے تو اس نے میرے جڑے کھول کر تھوڑا سا مشروب میرے منہ میں ڈال دیا۔ میرے حلق میں جلن ہونے لگی اور میں نے زور زور سے کھانسا شروع کر دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگا پھر کھینچتا ہوا ہال میں لے گیا جہاں سے گزر کر وہ ٹی وی روم میں داخل

ہو گیا۔ وہاں رکھے ہوئے ٹی وی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے خواب میں بھی اتنا بڑا اور قیمتی ٹی وی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے ٹی وی آن کیا اور۔۔۔۔۔ بے ہودہ طریقے سے چینل بدلنے لگا۔

ٹریوس کی فطرت میں بے چینی تھی۔ وہ چند سیکنڈ سے زیادہ ایک چینل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ البتہ اس نے ٹیلی ویژن کی آواز اونچی کر رکھی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید پڑوسی یہ آواز سن کر پوچھ گچھ کرنے آجائیں لیکن یہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹریوس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ اسے یہ ٹی وی لے جانے کے لیے دوبارہ آنا پڑے گا کیونکہ اس کے لیے اسے ایک ٹرک کی ضرورت ہوگی۔ اس نے ٹی وی سے ابھرنے والی موسیقی کی دھنوں پر تھرکنا شروع کر دیا اور مجھے بھی پکڑ کر رقص کے انداز میں حرکت کرنے لگا۔ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ تم میرے لیے بالکل مناسب ہو۔“

اس نے کلائی کے پاس سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا بازو میری گردن کے گرد ڈالا اور گلاس پھر میرے منہ سے لگایا۔ میں نے مزاحمت کی لیکن وہ میرے مقابلے میں بہت طاقتور تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر مزاحمت ترک کر دی کہ شاید وہ رک جائے۔ شاید وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ وہ مجھے تنگ کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اس نے مجھے جس طرح پکڑ رکھا تھا، وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے شاید ہی مجھے غور سے دیکھا ہو لیکن اس وقت وہ میرے بہت قریب تھا۔ میں اس کی ناگوار سانسوں اور جسم سے پھوٹنے والی بو کو محسوس کر سکتی تھی۔

”تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ لگتا ہے جیسے تم مجھے نہیں جانتیں؟“

میں نے قہقہہ لگا کر اپنے آپ کو پُر سکون کرنے کی کوشش کی اور اس کی گرفت سے بھی اپنے آپ کو نکال لیا لیکن اس سے دور جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جانتی تھی کہ اسے وہ اپنی بے عزتی محسوس کرے گا۔ اس لمحے مجھے اچانک ہی ٹریوس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کاش وہ کہیں دور چلا جائے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح جس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور ویت نام کی جنگ میں چلا گیا تھا۔

گوکہ میں اب بھی اس سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی لیکن وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ڈانٹنگ روم میں لے گیا۔ وہاں

اس نے گملوں میں لگے ہوئے پودوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ مسز میکڈانلڈ نے یہ پودے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ انہیں نقصان نہ پہنچائے چنانچہ میں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔ ”ٹریوس! پلیز رک جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کہاں چلا جاؤں۔۔۔۔۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی جگہ ہے؟“

مجھے اب چکر آرہے تھے۔ گوکہ میں نے ایک دوہی گھونٹ لیے تھے۔ پھر مجھے زور کی قے آئی۔ ٹریوس میری حالت دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ میں کلی کرنے کے لیے کچن یا باتھ روم جانا چاہ رہی تھی لیکن ٹریوس نے مجھے روک دیا۔ اسے مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے ایک کیمینٹ سے چاندی کے برتن نکالے اور بولا۔ ”کچھ لوگوں کے پاس بہت مال ہے اور کچھ بالکل قلاش ہیں۔“

ان میں سے کچھ برتن اس کی بے پردائی کی وجہ سے فرش پر گر پڑے تو اس نے انہیں ٹھوکر ماری۔ مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا اور میں نے اس سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز! گھر چلے جاؤ۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”واقعی تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی سوئٹ ہارٹ اور اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا چہرہ بد صورت ہو جائے گا۔ بالکل اس پیدائشی نشان کی طرح سرخ اور بد نما۔“

اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل پر لگے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ میرے بارے میں ایسی بات بھی کہہ سکتا ہے جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس پیدائشی نشان کے بارے میں کیسا محسوس کرتی ہوں۔ میں نے ہٹکلاتے ہوئے کہا کہ جب مسز میکڈانلڈ واپس آئیں گی اور انہیں پتا چلے گا کہ ان کی کچھ چیزیں غائب ہیں تو بتا دوں گی کہ کون لے گیا ہے۔ اس پر ٹریوس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ تم ایسا کر سکو گی اور اگر تم نے انہیں کچھ بتایا تو بہت پچھتا نا پڑے گا۔“

میں نے دوسرے آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بھی ٹریوس کی طرح ہوڈی پہن رکھی تھی لیکن اپنا ہڈ نیچے نہیں کیا تھا البتہ یہ بتا سکتی تھی کہ وہ ٹریوس سے عمر میں بڑا تھا۔ میں اسے نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس کی آواز پہچان سکی۔ اتنا وقت ہی نہیں ملا جب وہ کچن کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

میں اپنے کزن کی منتیں کرتی رہی کہ وہ مسز میکڈانلڈ کے گھر سے چلا جائے لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اس۔۔۔۔۔ کمرے کے دروازے تک لے گیا جسے مسز میکڈانلڈ اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ مقفل نہیں تھا۔

کرتوت

دلہا۔ ”جانتی ہو ہمارے ستارے مل گئے۔
ورنہ میرے تو شادی سے پہلے بیس لڑکیوں سے چکر
تھے۔“

مواہن شرما تے ہوئے۔ ”جی..... ہمارے
ستارے ہی نہیں کرتوت بھی ملتے ہیں۔“

☆☆☆

Active, passive

وائف۔ ”سونے کی چین کب دو گے؟“

شوہر۔ ”چین سے سونے کب دو گی؟“

☆☆☆

”چلو۔ ایک کوشش اور کرتے ہیں۔“ اس نے نال کا

رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ پلیز نہیں۔“ میں گڑگڑانے لگی لیکن اس پر

کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پستول کی نال میرے چہرے سے

رگڑنے لگا۔ پھر اس نے میرا منہ کھول کر نال اس میں گھسیڑ

دی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ وہ مجھے قتل نہیں کرے گا

کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر اس نے ایک ایسی

حرکت کی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے

گرمیان میں ہاتھ ڈال کر میرا سوٹر پھاڑ دیا اور پستول

میرے سینے سے لگا دی۔ میں بری طرح کانپ رہی تھی پھر

میں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا لیکن اس کا گن والا ہاتھ

مسلح حرکت کرتا رہا۔ اس نے پستول کی نال کو اور نیچے کیا

پھر پیٹ سے ہوتا ہوا ٹانگوں تک آگیا۔ ڈر کے مارے میرا

پیشاب خطا ہو گیا اور پستول کی نال بھیگ گئی۔ ٹریوس کا چہرہ

غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور کن

کرسی پر پھینک دی جیسے وہ گندی ہو گئی ہو۔

”رونا بند کرو۔ ابھی تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

اپنے گھٹنوں پر چل کر دیکھو۔ اس طرح تم اپنے آپ کو بچا

سکتی ہو۔“

میں نے چلنا شروع کیا اور کرسی کے قریب پہنچ گئی۔

پھر میں نے بے اختیار وہ گن اٹھالی۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا

کہ وہ گن میرے ہاتھوں میں آگئی۔ وہ میری توقع سے

زیادہ بھاری تھی۔ ٹریوس نے میرے ہاتھ میں گن دیکھی تو

مسز میکڈائلڈ شاید جلدی میں اسے لاک کرنا بھول گئی تھیں۔
ٹریوس بے دھڑک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کتابوں
سے بھرے شلف دیکھ کر کہا۔ ”اوہ میرے خدا! اتنی ساری
کتابیں، کیا کوئی شخص انہیں پڑھ سکتا ہے۔“ پھر اس نے میز
کی درازیں دیکھنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلی دراز میں
سے اسے ایک گن ملی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور
پر جوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس کی ضرورت تھی۔“

میں بہت خوفزدہ ہو گئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس
گھر میں کوئی گن بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مسز
میکڈائلڈ اس کمرے کا دروازہ مقفل کرنا کیوں بھول گئیں۔
میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی تاکہ سڑک پر پہنچ کر کسی کو
مدد کے لیے پکاروں لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو ٹریوس مجھے
بہت سخت سزا دے گا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ پر گولی چلا دے۔
شاید وہ مجھے جان سے نہ مارے لیکن میری ٹانگ کا نشانہ
لے کر زمین پر ضرور گرا سکتا ہے اور پھر فاسٹانہ انداز میں
قہقہے لگاتے ہوئے کہے گا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا تھا لیکن تم
نے حکم عدولی کی۔“

ٹریوس نے گن کا چیمبر کھول کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کے
چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے میری طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے اجتماعی خودکشی کے بارے میں سنا
ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محبت کا امتحان ہوگا۔“
میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ کسی فلمی اداکار کی طرح
آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے
پستول کی نال اپنے سر سے لگالی پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس
نے ریوالور نیچے کیا اور احتیاط سے گولیاں نکال کر اپنی جیب
میں رکھنے کے بعد بولا۔ ”اب یہ پوری طرح بھری ہوئی
نہیں ہے۔ اس لیے تمہارے بچنے کا چانس ہے۔“
”نہیں۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز اسے
دور رکھو۔“

”اس میں صرف ایک گولی ہے۔“ اس نے دوبارہ آئینے
میں دیکھتے ہوئے کہا اور پستول کی نال دوبارہ اپنے ماتھے سے
لگالی۔ لگتا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے والا ہے پھر وہ ڈرامائی انداز میں
گھوما اور گھٹنوں کے بل جھک کر نال کا رخ میری طرف کر کے
ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکی سی کلک ہوئی۔ میں نے آنکھیں
بند کر لیں، موت میرے قریب سے آکر گزر گئی تھی۔

میں بہت خوفزدہ تھی۔ سردی کے باوجود پورا جسم سینے
سے شراپور ہو گیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا
لیکن ٹریوس کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ وہ بدستور قہقہے لگا رہا تھا۔

پولیس والوں نے مجھ سے بڑے ہمدردانہ لہجے میں

کئی مرتبہ پولیس بائیس سالہ ویلز کو پوچھ بچھ کے لیے ہیڈ کوارٹر لے کر آئی۔ انہیں یقین تھا کہ ویلز ہی وہ شخص ہے جس نے حادثاتی طور پر اپنے دوست ٹریوس ریڈلی کو ڈکیتی کے دوران گولی ماری تھی لیکن اسے گرفتار کرنے کے لیے ان کے پاس ناکافی ثبوت تھے لہذا ہر مرتبہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اگر ویلز۔۔ میرے کزن کا ساتھی ہوتا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ اس نے ٹریوس کو گولی نہیں ماری اور ممکنہ طور پر اسے معلوم تھا کہ ٹریوس کو ہلاک کرنے والا کون تھا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ اس نے اپنے دوست کو گولی نہیں ماری کیونکہ اس طرح وہ یہ تسلیم کر لیتا کہ وہ بھی ٹریوس کے ساتھ اس ڈاکاڑی میں شریک تھا لیکن وقوعہ سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے بجائے اس نے موقف اختیار کیا کہ وہ ڈروملین پر ہونے والی ڈکیتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے یہ

دماغ ٹھکانے پر ہوتا تو وہ کبھی ماریا کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچتا۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات سمجھتی ہو اور ماریا بھی شاید یہ جانتی ہو۔“

☆☆☆

میرے بچے ٹریوس ریڈل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں تو اپنی ماں کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ان چھبیس سالوں میں میں جب بھی اسپارٹا آئی تو اسٹیو ویلز سے چند مرتبہ ہی میرا سامنا ہوا بلکہ میں اس کی جھلک ہی دیکھ پائی۔ ایک دفعہ شاپنگ مال اور دوسری مرتبہ سیون ایون اسٹور میں۔ ہم جوانی میں بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میرا نام بھی معلوم نہیں تھا گو کہ اس واقعے کے بعد وہ اس بارے میں جان گیا ہوگا۔ جب بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ پر رک گیا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ مجھے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس بار جب میں اسپارٹا آئی تو حادثاتی طور پر اسٹیو ویلز سے میرا آسنا سامنا ہو گیا۔ میں اپنی بیٹی کے ہمراہ بینک کے عقب میں واقع پارکنگ لاٹ سے گزر رہی تھی کہ میں نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے گندی سی جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے بڑی بے دردی سے کسی دائرہ برش سے صاف کیا گیا ہو۔ اب وہ ایک بھاری چسامت، ہلکے بالوں، کرخت چہرے اور اس آنکھوں والا شخص بن چکا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی عمارت میں داخل ہوتے وقت راستہ نہیں دیتے اور نہ ہی آپ کو اپنے سے پہلے قطار میں کھڑا ہونے دیتے ہیں۔

اس نے مجھے دیکھا اور ایک اچنتی ہوئی نظر میری بیٹی پر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنے والا ہے لیکن جھجک رہا ہے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بد صورت شخص مجھے پہچانے۔ میں اس شہر سے اپنا تعلق ختم کر چکی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ مجھے کن لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے یا کون میرے لیے اجنبی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس سے گزرنے ہی والی تھی جب اس نے میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”ہیلو ماریا! میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی نہیں۔“

یہ سننے کے بعد میرا بدن بڑی طرح لرزنے لگا اور ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ میں نے اپنی بیٹی کا سہارا لیا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بھی نہیں معلوم کہ اس شام ٹریوس ریڈل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ اس واقعے سے ایک روز پہلے اس کی اپنے دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس زمانے میں چھوٹے شہروں کے پولیس سراغ رساں جائے وقوعہ سے ملنے والے شواہد کو احتیاط سے محفوظ کرنا نہیں جانتے تھے۔ جس پستول سے ٹریوس کو قتل کیا گیا، اس پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس دھندلے ہو گئے تھے اور کسی نے میرے فنگر پرنٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں سرے سے مشکوک افراد کی فہرست میں نہیں تھی۔ پستول مسٹر گورڈن میکڈائلڈ کو واپس کر دیا گیا کیونکہ وہ ان کی قانونی ملکیت تھا۔

اگلے ہفتے مسٹر میکڈائلڈ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آ گئے لیکن وہ زیادہ عرصے اس گھر میں نہیں رہے۔ اس واقعے کے بعد مکان کی شہرت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے مارکیٹ پرائس سے بہت کم قیمت پر اسے فروخت کرنا پڑا۔ اسے ایک ایسے جوڑے نے خرید لیا جو اسپارٹا میں قیام کا خواہش مند تھا اور اسے اس حادثے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ مکان فروخت ہونے کے بعد میکڈائلڈ فیملی اسپارٹا سے چلی گئی اور پولیس کی ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد کسی نے بھی مجھ سے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ اس شام میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ یہ افواہ ضرور پھیل گئی کہ ماریا کو اس کے اپنے کزن نے ایذا پہنچائی اور جس معنی خیز انداز میں یہ بات لگی جاتی تھی، اس سے لوگ اپنی مرضی کے معنی نکال لیتے حالانکہ یہ صرف میں ہی جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

مسٹر میکڈائلڈ نے مجھے کسی بات کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے اپنے کزن ٹریوس کو گھر میں نہیں بلایا تھا اور یہ کہ میں نے اس سے چلے جانے کی درخواست کی تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا۔ ”بے چاری ماریا..... یہ میری فطرت تھی کہ اتنی چھوٹی لڑکی کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔“

لیکن ماں نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ماریا تو بہت خوش تھی۔ یہ محض ایک حادثہ تھا۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آنٹی لوئیس نے بھی میری ماں کے سامنے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ٹریوس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر وہ خود کو مجرم محسوس کرتی ہیں اور شرمندہ ہیں۔

”یہ حقیقت ہے کہ وہ ماریا کو بہت چاہتا تھا اگر اس کا

راز ماضی

ملک صفدر حیات

اپنی مرضی سے شریک زندگی کا انتخاب کرنے کا اختیار اللہ نے تو انسان کو دے دیا ہے مگر انسان... جو اللہ کو تو مانتا ہے لیکن... اللہ کی نہیں مانتا کہ زمرے میں بعض معاملات میں اپنی ہی چلاتا ہے اور ناقابل تلافی نقصان اٹھاتا ہے... یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا، قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے بالآخر اپنے جگر گوشے کو ہی نظروں سے دور کر ڈالا... وہ جب ماضی کا ایک ایسا ہی راز بن کر سامنے آیا تو بہت سے پہلوئوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک نئی داستان رقم کر گیا۔ خطا کسی کی اور سزا کسی کو... غلط فیصلوں کے نتائج ایسے ہی نکلتے ہیں اور ایسی غلطیوں کو درست کرنے کے لیے ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر درست حقائق سامنے آتے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

بہتی تھی۔ کوٹ فرمان، فرید آباد کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
”کیا کچھ پتا چلا کہ وہ کس کی لاش ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”نہیں ملک صاحب!“ اے ایس آئی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ بندہ پورے گاؤں والوں کے لیے اجنبی ہے۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس بندے کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پڑی ملی ہے اور اللہ رکھا اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔“
”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں دو تین افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اے ایس آئی نے پوچھا۔

”اگر آپ کہیں تو میں اللہ رکھا کو اندر بھیجتا ہوں۔“
”ہاں، ہاں..... ضرور.....“ میں نے جلدی سے کہا۔

اجنبی نوجوان کی لاش نے موضع ”کوٹ فرمان“ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ وہ ماہ فروری کے ابتدائی ایام تھے تاہم موسم سرما کسی بھی طور رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک قصبے فرید آباد میں تھی۔

ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ٹھنڈے ٹھار موسم میں ایک گرم خبر میری منتظر تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اے ایس آئی گل شیر میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”ملک صاحب! ادھر ایک بندے کی لاش ملی ہے جناب۔“

میں نے اے ایس آئی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ادھر کدھر گل شیر؟“

”وہ جی کوٹ فرمان میں۔“ گل شیر نے جواب دیا۔
موضع کوٹ فرمان اور قصبہ فرید آباد کے بیچ ایک نہر



تھوڑی ہی دیر کے بعد اللہ رکھا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ رکھا کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے عام دیہاتی لباس پہن رکھا تھا اور سر پر سادہ سی پگڑی جسے عام طور پر ”صافہ“ کہا جاتا ہے۔ شکل صورت اور وضع قطع سے وہ مزدور پیشہ نظر آتا تھا۔ اے ایس آئی نے اس کے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی روک لیا تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ دیگر دونوں افراد اس کے پڑوسی تھے۔ اللہ رکھا خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اللہ رکھا! یہ لاش کا کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”صبح سو کر اٹھا ہوں تو دروازے کے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔“

”ہوں.....“ میں نے اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پرسوج انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”صبح کتنے بجے..... تم نے اپنے دروازے کے سامنے کتنے بجے اس لاش کو پڑے دیکھا تھا؟“

”جی ابھی سورج نہیں اگا تھا مگر ہلکا ہلکا اجالا ہو رہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ دروازے کے سامنے کسی کو سوتا ہوا دیکھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ اتنی سردی میں میرے دروازے کے سامنے کون سو رہا ہے لیکن جب میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا.....“

”کیسا جھٹکا اللہ رکھا؟“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”بندہ مرا پڑا تھا جناب۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

”جسمیں کیسے پتا چلا کہ وہ مر چکا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے ہلا جلا کر دیکھا تھا؟“

”نہیں تھا نے دار صاحب!“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو اس بندے کی لاش کو ہاتھ تک نہیں لگایا جی۔ جب میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے اس کے چہرے اور سر پر خون نظر آیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون لگا ہوا تھا اور وہ بالکل ساکت پڑا تھا..... سانس بھی نہیں لے رہا تھا جی.....“ اس نے وحشت زدہ انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور لمحاتی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”بس جی، مجھے تو یہی لگا کہ وہ بد نصیب دوسرے جہان پہنچ چکا ہے۔ بعد میں دوسرے دیکھنے والوں نے بھی میری بات کی تصدیق کر دی۔“

اللہ رکھا جو کچھ بتا رہا تھا، اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ شخص واقعی زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور اس کے لباس اور چہرے پر نظر آنے والا خون اس امر کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اللہ رکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جب تمہیں یقین ہو گیا کہ وہ بندہ مر چکا ہے تو پھر تم نے کیا کیا؟“

”کرنا کیا تھا جی.....“ وہ ایک ٹھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے شور مچا کر لوگوں کو وہاں جمع کر لیا۔ آج مجھے مسجد کی طرف جانے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ اس وقت تک لوگ مسجد سے واپس آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے ہمسایوں کے علاوہ بھی وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ سب کی ایک ہی رائے تھی جناب کہ وہ بندہ مر چکا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”وہ بد قسمت آخر ہے کون..... مجھے بتایا گیا ہے کہ اسے کوئی بھی نہیں جانتا؟“

”جی ہاں، آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس بندے کا تعلق ہمارے گاؤں سے نہیں تھا نے دار صاحب۔ وہ ہمارے لیے اجنبی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے اور..... قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ اس بندے کی لاش کو میرے دروازے کے سامنے کیوں پھینک گیا ہے.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے اپنی پھولی ہوئی اور گھبرائی ہوئی آواز کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ہم نے اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع سب سے پہلے چودھری صاحب کی حویلی میں پہنچائی تھی۔ وہاں سے ہمیں حکم دیا گیا کہ تھانے جا کر رپورٹ درج کرائیں۔ میں نے اپنے پڑوسیوں فقیر حسین اور یعقوب علی کو ساتھ لیا اور آپ کے پاس آ گیا ہوں.....“

کوٹ فرمان پر چودھری فیضان علی کی حکمرانی تھی۔ چودھری فیضان سے میری دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ عام روایتی چودھریوں سے خاصا مختلف شخص تھا۔ اس کے اندر غرور اور تکبر نام کی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی

کیا تھا۔ وہ ایک چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ اللہ رکھانے بتایا کہ تھانے کی طرف جاتے ہوئے اس نے مردہ شخص کے اوپر یہ چادر ڈال دی تھی۔ میں نے وہاں جمع لوگوں کو ایک طرف ہٹایا اور اللہ رکھا سے کہا۔

”چاچا! یہ چادر تو ہٹاؤ.....!“

اللہ رکھا نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں اکڑوں بیٹھ کر اس لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شخص اس دار فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ مقتول کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ اس نے مناسب سائز کی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے گرم شلوار قمیض زیب تن کر رکھا تھا جس کے اوپر گرم اونی سویٹر بھی نظر آ رہا تھا۔ پاؤں میں موزوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے تھے۔ اس جائزے کے دوران میں اس شخص کے سر اور چہرے نے میری توجہ خصوصی طور پر اپنی جانب مبذول کر لی تھی کیونکہ وہاں مجھے تشدد کے خویش آثار دکھائی دیے تھے۔ میں بغور اس کے سر کا جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا سر بری طرح زخمی تھا۔ کئی جگہ سے کھوپڑی چٹنی ہوئی تھی جہاں سے خارج ہونے والے خون نے اس کے چہرے کو بھی بھگو ڈالا تھا اور لباس کے سامنے والے حصے پر بھی جا بجا خون کے دھبے نظر آرہے تھے تاہم یہ تمام تر خون جم چکا تھا۔ سر کے زخموں اور خون کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس شخص کو زندگی کی بازی ہارے ہوئے آٹھ سے دس گھنٹے گزر چکے تھے یعنی اسے گزشتہ شب، رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

یہ سو فیصد قتل کی ایک ہولناک واردات تھی۔ کسی نے بڑی بے دردی سے اس اجنبی جوان کی کھوپڑی کو شدید زخمی کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا مگر کیوں.....؟

یہ ایک خطرناک سوال تھا جس کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک سوالات ابھی تک تشنہ جواب تھے مثلاً یہ کہ وہ شخص تھا کون؟ کہاں سے آیا تھا؟ اسے کس نے اور کیوں قتل کر ڈالا اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے ہی کیوں پھینک دیا؟

میں نے زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے مقتول کے لباس کی تلاشی بھی لے ڈالی۔ اس جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس بدنصیب شخص کی جیبوں سے چند ایسی اشیاء برآمد ہوئیں

سوج متوازن اور مزاج میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ یہ گاؤں اس کے دادا فرمان علی کے نام پر تھا۔

میں نے اللہ رکھا سے پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے، چودھری فیضان کو اس نامعلوم بندے کی لاش کے بارے میں بتا دیا گیا ہے؟“

”چودھری صاحب خود تو حویلی میں موجود نہیں ہیں جناب۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بہر حال، ہم نے حویلی میں یہ خبر پہنچا دی ہے۔“

میں نے اللہ رکھا سے مزید دو چار سوال کر کے اسے فارغ کر دیا اور اس کے ساتھ آنے والے افراد کو اندر بلا لیا۔ میں نے فقیر حسین اور یعقوب علی سے بھی دس منٹ تک پوچھ چمچ کی مگر کوئی نئی بات سامنے نہیں آ سکی۔ وہ بھی اس اجنبی شخص کی لاش کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا ان سے پہلے اللہ رکھا مجھے بتا چکا تھا۔ میں نے انہیں باہر برآمدے میں انتظار کرنے کو کہا۔

”آپ تھوڑی دیر باہر بیٹھو۔ میں ابھی آپ لوگوں کے ساتھ کوٹ فرمان چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں، اس اجنبی بندے کی لاش کا کیا معما ہے.....“

وہ تینوں میرے کمرے سے نکل گئے۔ میں نے اے ایس آئی گل شیر کو اپنے پاس بلا کر تھانے کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں پھر کانسٹیبل سلیم کو ساتھ لے کر کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہو گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، قصہ فرید آباد اور موضع کوٹ فرمان کے بیچ ایک نہر رواں دواں بھی اور اریب قریب اس نہر پر کوئی پل وغیرہ نہیں تھا لہذا فرید آباد سے کوٹ فرمان جانے کے لیے نہر کو یا تو تیر کر یا پھر چھوٹی کشتی کے ذریعے پار کیا جاسکتا تھا۔ مذکورہ نہر اچھی خاصی چوڑی تھی جو کسی دریا سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم نے کشتی کے ذریعے نہر کو پار کیا اور کوٹ فرمان پہنچ گئے۔ جب ہم نے کوٹ فرمان میں قدم رکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔

☆☆☆

اللہ رکھا کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ نہر کے کنارے سے گاؤں تک لگ بھگ آدھے میل کا فاصلہ تھا جو ظاہر ہے، ہم نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ موسم خاصا خنک بلکہ خوشگوار ہو رہا تھا۔ فضا میں ٹھنڈک رہتی تھی تاہم یہ سردی قابل برداشت تھی۔ آدھے میل کا یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

اللہ رکھا نے تھانے میں جس اجنبی شخص کی لاش کا ذکر

جنہوں نے مجھے متذکرہ بالا سوالات میں سے چند ایک کے جواب دے دیے۔

مقتول کی قمیص کے سامنے والی جیب میں سے ایک سو چالیس روپے نقدی کے علاوہ دو ٹکٹ برآمد ہوئے۔ ان ٹکٹ میں سے ایک ”راجا ٹریولز“ کی بس کا تھا جو لاہور سے لائل پور تک کے سفر کے لیے جاری کیا گیا تھا جبکہ دوسرا ٹکٹ ایک وین کا تھا جو ”ملک ٹرانسپورٹ“ سروس کے زیر اہتمام چلتی تھی۔ میں اس ٹرانسپورٹ ملک خدا بخش کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس بندے کی وین سروس لائل پور کے لاری اڈے سے مختلف دیہاتوں اور قصبہ جات کی طرف جاری تھی۔ یہ وینیں صرف ان قصبہ جات اور دیہاتوں تک جاتی تھیں جو کسی نہ کسی گچی یا پکی سڑک کے کنارے پر واقع تھے۔ دونوں ٹکٹس پر آٹھ فروری کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔

آج نو فروری تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گزشتہ روز وہ نامعلوم شخص لاہور سے ”راجا ٹریولز“ کی بس میں بیٹھ کر لائل پور پہنچا تھا اور پھر لائل پور کے لاری اڈے سے اس نے ملک ٹرانسپورٹ سروس کی وین پکڑ کر فرید آباد تک سفر کیا تھا اور ظاہر ہے، فرید آباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کے لیے اس نے کشتی کے ذریعے بڑی نہر عبور کی تھی اور پھر وہ ایک عبرت ناک موت سے دو چار ہو کر عدم آباد دردانہ ہو گیا تھا۔

دونوں ٹکٹ کی روشنی میں وہ نامعلوم شخص آٹھ فروری کو لاہور سے چل کر لائل پور اور فرید آباد سے ہوتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا تھا مگر کیوں.....؟ جب کوٹ فرمان کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی تھا تو پھر وہ کس مقصد سے یہاں آیا تھا؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے مجھے سوچ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانا پڑا۔ میں نے مقتول کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان کا جائزہ لیا۔ اس سامان میں ایک روپال، ایک چابیوں والا کچھا اور ایک المونیم (ایلو مینیم) کی کنگھی تھی۔ اس زمانے میں پلاسٹک کی مصنوعات کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسی چیزیں تیار کرنے کی فیکٹریاں وجود میں آئی تھیں۔ کنگھی عموماً یا تو لکڑی کی ہوتی تھی اور یا پھر ایلو مینیم کی چابیوں کے سچے میں تین چابیاں پروئی ہوتی تھیں۔

مقتول کی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان سے مجھے کسی قسم کی تحقیقی مدد نہیں مل سکی تاہم ان تمام چیزوں کو میں نے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرا روئے سخن اللہ رکھا کی جانب تھا۔

”اللہ رکھا! اچھی طرح ذہن پر زور دے کر بتاؤ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا واقعی تم اس بندے کو نہیں جانتے؟“

”سرکار! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”میں کیا، پنڈ کا کوئی ایک بندہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے.....“

”یہ کہاں سے آیا تھا، اس بات کا تو میں پتا چلا چکا ہوں اللہ رکھا۔“ میں نے مجبیر انداز میں کہا۔ ”اب یہ جانتا باقی ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے اور قتل کرنے کے بعد قاتل نے لاش تمہارے دروازے کے سامنے کیوں پھینکی ہے؟“

”جی.....“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟“ میں نے ابھی تک بس اور وین کے ٹکٹ کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ میں نے اس تفصیل سے اللہ رکھا کو آگاہ کر دیا اور کہا۔ ”اگر کوٹ فرمان میں رہنے والے لوگوں میں سے کوئی مقتول کو نہیں جانتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول لاہور سے یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟“

”جناب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ اللہ رکھا بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ ہی اس بھارت (پہیلی) کو حل کریں جی۔“

جس مقام پر اس اجنبی شخص کی لاش پڑی تھی وہاں پر مجھے ایسے کوئی آثار دیکھائی نہیں دیے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے اسی جگہ پر قتل کیا گیا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ قاتل نے کسی اور مقام پر اس کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا اور بعد ازاں کسی وقت اس کی لاش کو لا کر وہاں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں موقع کی کارروائی مکمل کی اور پھر نامعلوم مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کانسٹیبل سلیم کے ”ہاتھ“ سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ میں نے جائے وقوعہ پر موجود کم و بیش دو درجن افراد سے پوچھ گچھ کر کے اس امر کی تسلی کر لی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس اجنبی مقتول شخص کو نہیں جانتا تھا البتہ نور حسین نامی ایک بندے نے ایک ایسی بات کی کہ مجھے چونکنا پڑا۔

”جناب! اس بندے کی لاش کو دیکھ کر پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ موٹی ہے.....!“

میں نور حسین کو ایک طرف لے گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”کون موٹی؟“

میرے اس کڑے سوال سے وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی۔ مجھے

یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود کو کسی مصیبت میں مبتلا سمجھ رہا ہو۔
اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے جلدی سے کہا۔
”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں نور حسین۔ تم موسیٰ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، سچ سچ مجھے بتا دو۔ یہ باتیں ہم دونوں کے سچ رہیں گی۔ میں اسی لیے تمہیں ایک طرف لے آیا ہوں۔“

”جی..... مجھے مغالطہ ہوا تھا.....“ اس نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔

”مغالطہ..... کیسا مغالطہ نور حسین؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”وہ جی..... جب میں نے اس بندے کی لاش کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یہی لگا تھا کہ وہ موسیٰ ہے۔“ نور حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ موسیٰ نہیں جناب۔ اس میں تھوڑی بہت موسیٰ کی شہادت ضرور ہے۔“

”مگر یہ موسیٰ کون ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

”موسیٰ..... اللہ رکھا کا بیٹا تھا جی۔“

”بیٹا تھا..... کیا مطلب؟“

”موسیٰ کوئی چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا، تھانے دار صاحب۔“ نور حسین نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”پھر آج تک اس کی کوئی خبر نہیں ہے جناب۔ موسیٰ اللہ رکھا کی اکلوتی اولاد تھا۔ دونوں بڑا بڑا بڑا کٹائی دنوں تک بیٹے کی جدائی میں آنسو بہاتے رہے پھر رفتہ رفتہ انہیں قرار آ گیا۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ جس شخص کی لاش ابھی میں نے اسپتال بھجوائی ہے، وہ موسیٰ نہیں تھا؟“

”لو ہے کی طرح پکا یقین جناب.....“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اس بندے میں بس موسیٰ کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی مجھے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ موسیٰ ہرگز نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں نا جناب.....“ لچائی توقف کر کے اس نے اپنی سانس ہموار کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگر یہ بندہ موسیٰ ہی ہوتا تو بھلا اللہ رکھا اسے پہچاننے میں غلطی کیسے کر سکتا تھا۔ اللہ رکھا کی گھروالی کرم بی بی نے بھی اس اجنبی شخص کی لاش دیکھی ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے کو پہچاننے میں تو کوئی کوتاہی نہیں کر سکتی نا.....!“

نور حسین کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اگر ایسی

کوئی بات ہوتی تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی کرم بی بی ضرور اس اجنبی مقتول کو اپنے بیٹے موسیٰ کی حیثیت سے پہچان لیتے۔ میں نے ایک دو سوالات کے بعد نور حسین کو فارغ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نور حسین! تم کرتے کیا ہو؟“

”ذات کا کھار ہوں جی۔“ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ”مٹی کے برتن بناتا ہوں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ میری روزی روٹی کا بندوبست کر دیتا ہے۔“

”اگر تم کھار ہو تو برتنوں کی تیاری کے لیے تمہیں مٹی کی ضرورت پیش آتی ہوگی۔“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”یہ مٹی تم کہاں سے حاصل کرتے ہو؟“

”نہر سے جناب..... اور کہاں سے حاصل کروں گا۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میں روزانہ صبح اپنے گدھے کے ساتھ نہر کی طرف ایک چکر لگاتا ہوں۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے، نہر سے اتنی مٹی نکال لاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

”اللہ رکھا سے دو گلی پیچھے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم ابھی تو اپنے گھر جاؤ اور تسلی سے اپنا کام کرو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر تمہارے پاس آتا ہوں پھر اس واقعے کے حوالے سے کچھ باتیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جی، جو آپ کا حکم۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نور حسین کو چھوڑ کر اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس وقت تک جائے وقوعہ سے لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ گلی میں بس اللہ رکھا اور اس کے دو تین پڑوسی موجود تھے۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا۔

”تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی..... بسم اللہ۔“ اللہ رکھا جلدی سے بولا۔ ”میں آپ کے لیے بیٹھک کھلواتا ہوں جناب۔“

چند منٹ کے بعد میں اللہ رکھا کی بیٹھک میں ان

دونوں میاں بیوی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کرم بی بی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی شکل صورت کی مالک ایک گھریلو عورت تھی۔ اللہ رکھا ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زرعی اراضی تھی جس کی کھیتی باڑی سے اس کا رزق روزگار چلتا تھا۔ میں نے ان بڑا بڑا گدھے کی ذہنی پریشانی کو

دیکھتے ہوئے چند تسلی اور تسکینی کی باتیں کیں پھر اصل موضوع کی طرف آیا۔

”اللہ رکھا! آپ لوگوں کے بچے وغیرہ کہاں ہیں؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”گھر کے اندر کوئی رونق اور چہل پہل نظر نہیں آرہی.....؟“

”وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ.....“ اللہ رکھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہمارا صرف ایک ہی بیٹا تھا..... موسیٰ..... پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے۔“

”کہاں چلا گیا ہے..... کیا مطلب؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

نور حسین کی زبانی مجھے موسیٰ کی گمشدگی کی خبر تو مل چکی تھی تاہم میں یہ حقیقت اللہ رکھا اور اس کی بیوی کی زبان سے سنتا چاہتا تھا۔ کرم بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”حقیقت تو سو ہوتا رب ہی جانتا ہے جی۔“ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”کوئی چار سال پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک ڈھونڈ سکتے تھے، ہم نے اسے تلاش کیا لیکن وہ ہمیں ملا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر۔ تھک ہار کر ہم پیٹھ گئے لیکن..... اس کی واپسی کی اب بھی آس لگی ہوئی ہے۔“ اتنا بتا کر کرم بی بی خاموش ہو گئی۔

”تھانے دار جی! یوں محسوس ہوتا ہے.....“ اللہ رکھا اپنی بیوی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یوں لگتا ہے کہ موسیٰ کسی وقت اچانک ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا اور ہمیں حیران کر دے گا۔“

”ایسی ہی حیرت آج صبح اس اجنبی شخص کی لاش کو بھی دیکھ کر ہوئی تھی یا نہیں؟“ میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں جناب.....!“

”اللہ رکھا!“ میں نے غصے سے لہجے میں کہا۔ ”میں نے ابھی جو گھنٹا، آدھا گھنٹا گفتگو کی ہے اس سے مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا گمشدہ بیٹا شکل میں اس اجنبی مقتول سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے.....؟“

”شکل میں ملتا جلتا تو نہیں کہہ سکتے جناب۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔ ”البتہ اس کی جسامت موسیٰ جیسی ہی ہے۔“ ”میں نے بھی اس بندے کو دیکھا ہے جی۔“ کرم بی بی نے کہا۔ ”اللہ رکھا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے موسیٰ کی اور اس بندے کی شکل ایک جیسی نہیں۔ بس جی، نین نقش کچھ

ملنے جلتے ہیں ہاں..... اس کا قد کاٹھ اور بدن وغیرہ موسیٰ ہی کا لگتا ہے جی۔“

الفاظ اور بیان کا ہیر پھیر تھا لیکن کرم بی بی اور اللہ رکھا کا بیان نور حسین کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”یعنی تم لوگ یہ کہہ رہے ہو کہ اگر یہ اجنبی بندہ دور سے آ رہا ہو یا یہ کہیں جا رہا ہو تو پیچھے سے دیکھ کر ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ..... یہ موسیٰ ہے؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ کرم بی بی نے کہا۔ ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

اجنبی مقتول اور گمشدہ موسیٰ کے حوالے سے ان دونوں میاں بیوی کے تصدیقی کلمات نے میرے ذہن میں چند خدشات کو جنم دیا۔ میں نے پوچھا۔

”چار سال پہلے، جب آپ لوگوں کا بیٹا اچانک گم ہو گیا تھا تو کیا آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ وغیرہ درج کرائی تھی؟“

”رپورٹ.....؟“ اللہ رکھا نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”ہاں ہاں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے تھانے میں کوئی اطلاع دی تھی؟“

”نہیں جی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے اپنے طور پر ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ آلے دوالے کے گاؤں دیہات میں جدھر جدھر بھی ہمارے رشتے دار بستے ہیں، ہم نے ہر ایک کے گھر جا کر موسیٰ کو تلاش کیا تھا۔ رشتے داروں نے بھی اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کی تھی مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا.....“

”تھانے دار جی! وہی بات کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔“ کرم بی بی دکھی لہجے میں بولی۔ ”موسیٰ کو نہیں ملتا تھا، وہ نہیں ملا.....“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”میں تو ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ جہاں بھی ہو بس زندہ سلامت ہو۔ انسان زندہ ہو تو کبھی نہ کبھی زندگی میں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔“

ایک گمشدہ نوجوان بیٹے کی ماں کے دکھ کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا لیکن ان لمحات میں میرے ذہن میں جن خدشات نے جنم لیا تھا، ان کی تحقیق اور تصدیق بہت ضروری تھی۔ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ لوگوں کے درد کا پوری طرح احساس ہے۔ چار سال پہلے جب آپ کا بیٹا موسیٰ گم ہوا، میں اس

تھانے کا انچارج نہیں تھا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ موسیٰ کو تلاش کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کروں گا مگر فی الحال ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے۔“

”دوسرا معاملہ۔“ کرم بی بی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”کون سا معاملہ جی.....؟“

”اس اجنبی بندے کا معاملہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو کل لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور پھر شقی القلب قاتل نے پچھلی رات اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاش آپ کے دروازے پر پھینک کر کہیں گم ہو گیا ہے۔“

”لہلہ..... لیکن.....“ اللہ رکھا لگنت زدہ انداز میں بولا۔ ”موسیٰ کا اس بندے سے کیا تعلق؟“

”یہ ظاہر تو کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو بہت گہرا تعلق نکالا جاسکتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے جی آپ کا؟“ کرم بی بی کی گھبرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں، اس گاؤں میں سو کے قریب گھر آباد ہیں لیکن اجنبی شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا۔ میرے خیال میں اپنی اس حرکت سے قاتل آپ لوگوں کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔“

ان دونوں کی آنکھوں میں خوف اٹھ آیا۔ اللہ رکھانے پوچھا۔ ”کیسا پیغام تھا نے دار صاحب۔ میں تو آپ کی بات کو بالکل نہیں سمجھ سکا؟“

میں نے ان کی الجھن دور کرنے کی غرض سے واضح الفاظ میں کہا۔ ”دیکھیں، میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ میرے سوچنے کا انداز عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں گفتیش کے دوران میں ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہیں کروں تو پھر مجرموں تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہ میرے پیشے کا تقاضا اور فرض کا حصہ ہے۔ میں اس اجنبی شخص کے قتل کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو آپ دونوں مانتے ہیں تاکہ یہ اجنبی شخص قتل کا ٹھکانہ اور نقش و نگار میں کافی حد تک آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ سے ملتا جلتا ہے.....؟“

میں نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بہ یک زبان ہو کر بولے۔

”جی..... جی ہاں۔“

”اور آپ لوگ اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکیں گے کہ کوئی کسی کو خواہ مخواہ قتل نہیں کر دیتا۔“ میں نے یہ دستور سوالیہ نظر سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لہذا اس اجنبی شخص کو جس کسی نے بھی قتل کیا ہے وہ یقیناً اس کا دشمن ہوگا۔ اس کے دل میں اس اجنبی شخص کے لیے شدید ترین نفرت پل رہی ہوگی اسی لیے اس نے موقع ملتے ہی اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”جی تھانے دار صاحب۔“ اللہ رکھا سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے تھانے دار صاحب۔“ کرم بی بی شکایتی لہجے میں بولی۔ ”ان دونوں کی جو بھی آپس میں دشمنی تھی وہ ایک دوسرے سے لکالتے رہتے۔ اس بندے کی لاش کو ہمارے دروازے کے سامنے پھینکنے کی کیا تک جنتی ہے؟“

”تک جنتی ہے کرم بی بی!“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بد بخت اجنبی شخص کو آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ کے مقابلے میں کسی نے قتل کیا ہے جسے اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے.....“

”اوہ.....“ اللہ رکھانے ایک پرتشویش سانس خارج کی اور فکر مند لہجے میں بولا۔ ”لیکن موسیٰ کا ایسا دشمن کون ہو سکتا ہے جو اپنے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت رکھتا ہو کہ بے دردی سے اسے قتل کر ڈالے.....“

”یہ تو آپ لوگ مجھے بتاؤ گے نا؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”موسیٰ کرتا کیا تھا؟ میرا مطلب ہے، اس کی دن بھر کی کیا مصروفیات ہوا کرتی تھیں؟“

”دیکھیں جی.....“ اللہ رکھا گہری سنجیدگی سے بولا۔

”موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ہم جہاں جہاں اسے تلاش کر سکتے تھے، ڈھونڈ کر دیکھ لیا مگر وہ ہمیں کہیں بھی نہیں ملا۔ وہ اس وقت کہاں ہے اور کیا کرتا ہوگا، اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں جناب۔ ہاں.....“ تھوڑا توقف کر کے اس نے اپنی سانس درست کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب تک وہ یہاں ہمارے پاس تھا تو میرے ساتھ ہی کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ اللہ

نہ ہوسکا۔ اس صورت حال سے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

موضع ”کوٹ فرمان“ بڑی نہر کے کنارے سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ آدھا میل لہلہاتے، سرسبز و شاداب کھیتوں پر مشتمل تھا۔ نہر سے گاؤں کے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک کچا راستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ میں اسی راستے پر سبک خرازی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔

”تھانے دار صاحب!.....!“

میں نے یکا یک پلٹ کر دیکھا تو نور حسین کہہ رہی صورت دکھائی دی۔ میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب آگیا۔

”ہاں بھی نور حسین!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”خیریت تو ہے نا۔ یہ تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے.....؟“

”وہ جی..... آپ نے کہا تھا نا کہ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد آپ میرے پاس آئیں گے۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”لیکن آپ تو واپس جا رہے ہیں۔“

نور حسین کہہ رہے تھے جو قوعہ پر میری مختصر سی بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اجنبی شخص کی لاش کو دیکھ کر اس کے ذہن میں پہلا خیال موسیٰ کا آیا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی کیونکہ وہ موسیٰ نہیں تھا۔ اس وقت میں نے نور حسین سے کہا تھا کہ اللہ رکھا کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا اور تفصیلی بات چیت کروں گا۔ نور حسین بھی میری اسی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

”ہاں نور حسین!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے گھر نہیں آیا تو کیا ہوا۔ آؤ، ہم چلتے پھرتے بات کر لیتے ہیں۔“

وہ فرماں برداری سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ ”نور حسین! یہ بات تو طے ہوگئی کہ وہ اجنبی مقتول اللہ رکھا کا بیٹا موسیٰ نہیں ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ آخر ہے کون..... میرا مطلب ہے، وہ تھا کون؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جناب۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”اس بد نصیب کی شکل کافی حد تک موسیٰ سے ملتی جلتی ہے اسی لیے مجھے دھوکا ہوا تھا۔“

کے کرم سے اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ جب موسیٰ کام میں میرا ہاتھ بٹاتا تھا تو مجھے بڑی سہولت تھی مگر اب اکیلا ہی کام میں جتا رہتا ہوں۔ بوڑھی ہڈیاں جانے کب جواب دے جائیں.....“

”جب موسیٰ ادھر کوٹ فرمان میں ہی تھا تو ظاہر ہے، لوگوں سے اس کا میل جول بھی ہوتا ہوگا۔“ اللہ رکھا کے خاموش ہونے پر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”ایسا تو ممکن نہیں کہ انسان کے جہاں دس دوست ہوں وہاں اس کا کوئی ایک آدمہ دشمن نہ ہو لیکن تم بتا رہے ہو کہ..... اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی؟“

”تھانے دار صاحب! اللہ رکھا نے آپ کو بالکل سچ بتایا ہے۔“ کرم بی بی دیکھی لہجے میں بولی۔ ”موسیٰ اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا جی۔ لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے، اس کی تو کبھی کسی سے تو تو، میں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔“ ہر ماں کا عموماً اپنی اولاد کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے مہذب اور سلیکھی ہوئی شائستہ اولاد ہے۔ میں نے اس بڑھی بڑھے کو ایک اور زاویے سے کریدنے کی کوشش کی۔

”کیا آپ لوگوں نے موسیٰ کی شادی بھی کر دی تھی؟“

”جی نہیں۔“ اللہ رکھا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ”کوئی منگنی وغیرہ.....؟“

”نہ شادی اور نہ منگنی جی۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر ان سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن ایسی کوئی بھی مفید بات سامنے نہ آسکی جس سے اس اجنبی کے حوالے سے کوئی پیش رفت ہو سکتی جسے بڑی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اگرچہ موسیٰ کے والدین کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے کسی دشمن کا وجود نہیں تھا لیکن میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں ان کے گھر سے اٹھ آیا۔

”ٹھیک ہے اللہ رکھا! میں اس بد قسمت شخص کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس دوران میں اگر آپ لوگوں کو کوئی خاص بات پتا چلے تو فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔“

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں گھر سے باہر نکل آیا۔ واپسی کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اللہ رکھا کے پڑوسیوں فقیر حسین اور یعقوب علی سے فرداً فرداً دوبارہ پوچھ گچھ کی مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ نامعلوم اجنبی مقتول تک رسائی کا کوئی راستہ واضح

”اس اجنبی کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“ میں نے بہ دستور اس کی جانب دیکھے بغیر گنگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو اس اجنبی سے شدید نوعیت کی نفرت تھی اور اس کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ رکھا کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ دراصل موسیٰ کا دشمن ہے اور موسیٰ کے مخالفے ہی میں اس نے اس بندے کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

”جی.....“ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”آپ تو بڑی گہری بات کر رہے ہیں۔“

”بات کی گہرائی کو بعد میں بھی ٹاپا جاسکتا ہے۔“ میں نے نور حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟“

”آپ کی بات میں بہت وزن ہے تمہانے دار صاحب۔“ وہ پرسوج نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ موسیٰ جو پچھلے چار سال سے قایم ہے، اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا اور اس کا ایسا کون سا دشمن ہے جو بے دردی سے اسے قتل کر سکتا ہے۔“

”موسیٰ کہیں سے نمودار نہیں ہوا نور حسین!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا۔ جان کی بازی ہارنے والا موسیٰ نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی شکل کا کوئی بندہ ہے اور اسے موسیٰ کے شبہ میں قتل کیا گیا ہے۔“

نور حسین نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد بڑی عقل مندی کی بات کی۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا جناب کہ قاتل کو کہیں سے یہ اطلاع ملی ہوگی کہ پچھلی رات موسیٰ اپنے ماں باپ سے ملنے کوٹ فرمان آرہا ہے لیکن کسی بھی وجہ سے موسیٰ نہیں آیا اور یہ بد بخت قاتل کے ہتھے چڑھ گیا اور اس نے موسیٰ کے مخالفے میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔“

”میں تم سے سوئی صدا اتفاق کرتا ہوں نور حسین کیونکہ میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے نہر کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلی رات اگر موسیٰ کو کوٹ فرمان آنا تھا تو وہ کیوں نہیں آیا اور اس کی جگہ اس سے ملتی جلتی شکل کا یہ اجنبی کیوں اور کہاں سے فک پڑا.....؟“

”جی ہاں، یہ سوالات تو ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ بھی کہ موسیٰ کا ایسا خطرناک اور

جانی دشمن کون ہو سکتا ہے.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر جذبہ انداز میں بولا۔

”جہاں تک میں موسیٰ کو جانتا ہوں، وہ تو بہت امن پسند اور صلح صفائی سے رہنے والا انسان تھا۔ اس کا کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا ہوں تمہانے دار صاحب اور موسیٰ میری آنکھوں کے سامنے ہل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ میں نے بھی اسے کسی کے ساتھ الجھتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”موسیٰ کے ماں باپ کا بھی یہی دعویٰ ہے نور حسین۔“ میں نے گہمیر انداز میں کہا۔ ”لیکن میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں یہ راز جان کر رہوں گا کہ موسیٰ کے خون کا پیاسا کون ہو سکتا ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”جی..... آپ حکم کریں۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”میں کیا تعاون کر سکتا ہوں؟“

”یہ تو تم بتا چکے ہو کہ موسیٰ سے کسی کی یا کسی سے موسیٰ کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔“ میں نے پوچھ گچھ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ چار سال پہلے جب موسیٰ اچانک غائب ہوا تھا تو اس وقت ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جسے اس کی گمشدگی کے ساتھ جوڑا جاسکے.....؟“

”کوئی نہیں.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ بس، وہ ایک دن اچانک غائب ہو گیا تھا..... چپ چاپ..... پھر اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ چار سال کے بعد آج پہلی مرتبہ اتنے زور شور سے اس کا ذکر ہو رہا ہے۔“

موسیٰ کے کسی دشمن کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں، میں نے نور حسین سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

”کیا آج صبح تم مٹی نکالنے نہر کی طرف گئے تھے؟“

”جی..... گیا تھا۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”میرے اندازے کے مطابق قاتل نے اس اجنبی بندے کی لاش کو رات کے آخر پہر یا پھر علی الصبح لا کر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکا ہوگا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا تم نے کسی شخص کو ادھر آتے ہوئے یا جاتے ہوئے دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے، جب آج صبح تم نہر سے مٹی نکالنے گئے تھے تو تم نے گاؤں کے اندر یا گاؤں سے باہر کی فضا میں کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی؟“

وہ میرے سوال کے مقصد تک پہنچ گیا اور ٹھہرے

”سرکار! اگر آپ کا حکم ہو تو میں کشتی چلاؤں؟“ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔
میں نے مختصر جواب دیا۔ ”نہی اور پوچھ پوچھا۔“
اس نے کشتی کو رواں کر دیا اور بولا۔ ”اگر آپ کو برا نہ لگے تو کچھ پوچھوں جناب.....؟“
میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ”ہاں ہاں..... پوچھو خادم حسین۔“

اس نے پوچھا۔ ”سرکار! صبح آپ چند لوگوں کے ساتھ ادھر کوٹ فرمان گئے تھے اور ابھی آپ اکیلے ہیں۔“
”ہاں۔ وہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔“
میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”دو گھنٹے پہلے آپ کے ٹکے کا ایک سنتری کسی اجنبی کی لاش لے کر فرید آباد کی طرف گیا ہے۔“ وہ کریدنے والے انداز میں بولا۔ ”کیا کوٹ فرمان میں قتل کی کوئی واردات ہوگئی ہے.....؟“

میں نے چونک کر خادم حسین کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مجھے دنیا جہاں کے تجربے کے ساتھ ہی بہت گہرائی بھی نظر آئی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ خادم حسین اس واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے تاہم انجان بن کر مجھ سے استفسار کر رہا ہے۔ میں نے الٹا اسی کو گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے خادم حسین۔“ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کوٹ فرمان میں پچھلی رات ایک اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میرے عملے کا آدمی اسی بد نصیب بندے کی لاش کو لے کر فرید آباد کی طرف گیا ہے.....“ لچاتی توقف کر کے میں نے اسے ٹٹوتی ہوئی نظر سے دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

”ادھر گاؤں میں چند لوگوں کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اجنبی شخص کل شام میں، تمہاری کشتی پر سوار ہو کر کوٹ فرمان پہنچا تھا؟“

میرا یہ سوال ”اندھیرے میں چلایا ہوا تیر“ ہرگز نہیں تھا۔ فرید آباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ خادم حسین کی کشتی ہی تھی۔ کل شام میں، سہ پہر میں یا دن میں کسی وقت وہ نامعلوم شخص اسی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان پہنچا ہوگا۔

”آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تمہانے دار

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جناب! میں جب اپنے گدھے کے ساتھ مٹی نکالنے بڑی نہر کی طرف جاتا ہوں تو اس وقت ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا ہوتا ہے۔ آج صبح نہر کی جانب جاتے ہوئے یا واپسی میں مجھے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا جسے غیر معمولی کہا جاسکے۔ میں نے نہر سے مٹی نکال کر اپنے گدھے پر لا دی اور واپس گھر آ گیا۔“

نور حسین کی وضاحت سے یہ لگتا تھا کہ اس اجنبی نامعلوم شخص کی لاش کو رات کے اندھیرے میں کسی وقت لا کر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا تھا اور شواہد سے میں یہ اندازہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ قتل کی یہ واردات کسی اور مقام پر ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب اس بد قسمت کی لاش ٹھنڈی ہوگئی اور بدن سے خارج ہونے والا لہو جم چکا تو اسے اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا..... مگر کیوں؟ اللہ رکھا کا دروازہ ہی کیوں؟

اس ”کیوں“ کا کوئی واضح جواب ابھی تک سامنے نہیں آسکا تھا۔ اگر میں اصل جائے وقوعہ تک یعنی جہاں اس اجنبی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے مجھے کشتی کے ذریعے نہر عبور کرنا تھی۔ کشتی اس وقت نہر کے دوسرے کنارے سے اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے نور حسین سے کہا۔

”اب تم اپنے گھر جاؤ اور میں تمہانے جا رہا ہوں۔ میں کل پھر ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا..... میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”جی ہاں..... بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“

میں نے نور حسین کو واپس بھیج دیا اور نہر کے کنارے کھڑے ہو کر کشتی کا انتظار کرنے لگا۔ مذکورہ نہر کا پاٹ خاصا چوڑا تھا اسی لیے اسے بڑی نہر کہا جاتا تھا۔ جو نہیں جانتے تھے وہ اسے دریا ہی سمجھتے تھے۔

کشتی والے خادم حسین نے دو افراد کو نہر کے کنارے اتارا تو میں کشتی پر سوار ہو گیا۔ خادم حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور میانہ قد شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے جفاکشی جھلکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی ساری زندگی محنت کرتے گزری ہو۔

صاحب! وہ افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن دو بندوں کو میں آخری
پھیرے میں کوٹ فرمانا پہنچا رہا ہوں، آج ان میں سے
ایک کی لاش واپس جائے گی.....“
”دو بندوں کو.....؟“ مجھے کرنٹ سا لگا۔

”جی ہاں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”یہ جو آپ کا سٹری جس بندے کی لاش لے کر فرید
آباد گیا ہے نا، میں نے اسے اور ایک دوسرے بندے کو کل
شام میں کوٹ فرمانا پہنچایا تھا۔ وہ میرا آخری پھیرا تھا۔“
میں نے تھوڑی دیر پہلے خادم حسین کے بارے میں
جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ اب درست ثابت ہو رہا تھا۔ یقیناً
وہ اجنبی مقتول کے حوالے سے معلومات رکھتا تھا۔ میں اپنے
مخصوص انداز میں اس سے سوال کرنے لگا۔

”خادم حسین! تم نے لگ بھگ کتنے بچے ان دونوں
افراد کو کل کوٹ فرمانا پہنچایا تھا؟“

”جی، اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”وہ
ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا کوئی وقت تھا۔ میں
صبح نو بجے کشتی نکالتا ہوں اور سورج ڈوبنے سے پہلے آخری
چکر لگا کر واپس چلا جاتا ہوں کیونکہ میرا گھرا دھر فرید آباد ہی
میں ہے۔“

”خادم حسین!“ میں نے گہری سنجیدگی سے اسے
مخاطب کیا۔ ”جن دو بندوں کو تم نے کل شام کوٹ فرمانا
پہنچایا تھا، ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“
”جی..... میں سمجھا نہیں؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے
مجھے تنکے لگا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ”کیا تم ان دونوں کو
پہچانتے ہو؟“

اجنبی مقتول کی شناخت ہی سب سے بڑا مسئلہ بنی
ہوئی تھی لہذا میری تان بھی اسی پر آکر ٹوٹتی تھی۔ اس نے
بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”جناب! میں ان دونوں میں سے ایک کو کسی حد تک
جانتا ہوں۔“

”کس کو؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”بھولا کو.....“ اس نے بتایا۔

”بھولا.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف
دیکھا۔ ”کیا تم اس بندے کی بات کر رہے ہو جس کی لاش
کچھ دیر پہلے میں نے کانسٹیبل سلیم کے ہاتھ سرکاری اسپتال
بجھوائی ہے؟“

”نہیں جناب.....“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے
بولا۔ ”اس بندے کو تو میں نے کل پہلی بار دیکھا تھا اور
دوبارہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ.....“
اس نے افسوسناک انداز میں جملہ ادھر اچھوڑا تو
میں نے جلدی سے کہا۔ ”تو تم اس کے ساتھی کی بات کر
رہے ہو؟“

”جی۔ اس کا اصل نام تو اسحاق ہے۔“ خادم حسین
نے بتایا۔ ”مگر وہ ”بھولا“ کے نام سے مشہور ہے۔“
”تو تم اس اسحاق عرف بھولا کو کسی حد تک جانتے
ہو؟“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے..... پھر
بھولا ہی کے بارے میں بتاؤ؟“

”یہ بھولا چاچا اسماعیل کا بیٹا ہے جی۔“ وہ وضاحت
کرتے ہوئے بولا۔ ”فرید آباد کے لاری اڈا پر چاچا
اسماعیل کی چائے اور سگریٹ وغیرہ کی دکان ہے۔ بھولا بھی
کئی بار مجھے ادھر دکان پر نظر آیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر
خادم حسین سے پوچھا۔ ”کیا کل وہ دونوں ایک ساتھ ہی
تمہاری کشتی پر سوار ہو کر کوٹ فرمانا پہنچے تھے یا الگ الگ
تمہارے پاس آئے تھے؟“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا جی۔“ وہ مدبرانہ انداز
میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں ایک ساتھ ہی
باتیں کرتے ہوئے میری کشتی تک پہنچے تھے اور نہر عبور
کرتے ہوئے بھی ان میں بات چیت ہوتی رہی تھی۔ اس کا
بھی مطلب تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی تھے.....“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اچھا تو اب یہ بھی
بتا دو کہ وہ دونوں ہی نہر کے اس پار اتر گئے تھے یا بھولا
واپس آ گیا تھا؟“

”دونوں ہی ادھر رہ گئے تھے۔“ خادم حسین نے
جواب دیا۔ ”میں خالی کشتی لے کر واپس آیا تھا۔“
”اور آج صبح ہی سے تم اپنی کشتی پر نہر کے پھیرے لگا
رہے ہو؟“

”جی ہاں..... صبح نو بجے سے میں اپنے کام میں لگا
ہوا ہوں۔“

”کیا کوٹ فرمانا سے فرید آباد کی طرف آتے
ہوئے کسی پھیرے میں آج تم نے بھولا کو بھی بٹھایا ہے اپنی
کشتی میں؟“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”نہیں جناب..... میرا خیال ہے، بھولا ابھی تک
ادھر کوٹ فرمانا ہی میں ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”جی اچھا۔“ اس نے گردن کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”جو آپ کا حکم۔“

”میں تمہارے آخری پھیرے کے وقت سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”سورج غروب ہونے سے پہلے تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔“ اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نہر کے کنارے سے ”کوٹ فرمان“ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس بار میرے قدموں میں ایک خاص قسم کی تیز رفتاری پائی جاتی تھی جو سنسنی خیز اور پرجسس بھی تھی۔

☆☆☆

اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ فضا کی خشکی بھی چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اگرچہ سورج آسمان پر موجود تھا لیکن اس کی دھوپ میں حدت یا تپش نہیں پائی جاتی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں کوٹ فرمان کے اندر موجود تھا۔

آج صبح اس اجنبی شخص کی پراسرار موت نے پورے گاؤں میں خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔ لوگ کام میں کم اور... چہ میگوئیوں میں زیادہ مصروف تھے۔ کھیتوں کے اندر بھی وہ چہل پہل نظر نہیں آرہی تھی جو نارمل حالات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں اللہ رکھا کے گھر پہنچا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہر گھر کا ایک ایک آدمی وہاں جمع ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے ارد گرد ایک مجمع سا لگ گیا۔ میں نے اس جم غفیر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور یہ آواز بلند سوال کیا۔

”تم میں سے کون کون ”فرید آباد“ آتا جانتا رہتا ہے؟“ یہ سوال اگرچہ بادی النظر میں غیر اہم اور فضول لگتا تھا لیکن اس کے پیش نظر میرے کچھ مقاصد تھے جو اگلے سوالات میں کھل کر سامنے آنے والے تھے۔ کوٹ فرمان میں رہنے والوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو فرید آباد نہ آتا جاتا ہو کیونکہ ان لوگوں کی ہر ضرورت فرید آباد سے تعلق رکھتی تھی۔

سب نے اثبات میں جواب دیا یعنی ان سب کا فرید آباد جانا لگا رہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسی انداز میں پوچھا۔ ”فرید آباد کے لاری اڈے پر چاچا اسماعیل نامی ایک بندے کی سگریٹ اور چائے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ آپ میں سے جو لوگ چاچا اسماعیل کو جانتے ہیں، وہ ایک طرف ہو جائیں۔“

لگ بھگ بیس افراد مجھے میں سے الگ ہو گئے۔ سب کے چہروں پر اپنی اپنی سوچ کی نمائندگی کرنے والے سوالات چمک رہے تھے۔ میرے انداز نے انہیں عجیب

”اگر وہ واپس آتا تو میری کشتی میں ضرور بیٹھتا۔“ ”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”تھانے دار صاحب!“ خادم حسین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”آں..... ہاں.....“ میں نے خیالات سے باہر آتے ہوئے کہا۔

”جناب! ہم کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔“ خادم حسین نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟“ جب انسان کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے تو اس پر نئے نئے دروا ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے واپس کوٹ فرمان لے چلو۔“

چند لمحات تک وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر فرماں برداری سے بولا۔ ”جیسی آپ کی مرضی تھانے دار صاحب.....“ بات ختم کرتے ہی اس نے کشتی کا رخ پھیرا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

جب سے خادم حسین نے مجھے یہ بتایا تھا کہ بھولا ادھر کوٹ فرمان ہی میں رک گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا، میرے ذہن میں خیالات کی اٹھک بیٹھک لگی ہوئی تھی۔ گزشتہ شام میں اجنبی مقتول، بھولا کی محبت میں کوٹ فرمان پہنچتا ہے پھر اسی رات کے ابتدائی حصے میں اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے قتل کر کے اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے اور مصدقہ اطلاع کے مطابق اسحاق عرف بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے تو پھر..... یہ بھولا یقیناً، اس اجنبی کی موت کے راز سے واقف ہوگا اور بھولا ہی مجھے بتا سکتا تھا کہ وہ اجنبی مقتول آخر تھا کون.....؟

اسی سوال کی روشنی میں، میں نے فوری طور پر واپس کوٹ فرمان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”کوٹ فرمان“ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لگ بھگ سو گھروں پر مشتمل ایک مختصر سا دیہات۔ بھولا کو اس گاؤں میں تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایک بار بھولا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر میں اس کی زبان کو ہر راز اگلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

انہی سوچوں میں تم کشتی نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ میں نے کشتی میں سے باہر نکلنے کے بعد خادم حسین سے کہا۔

”جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم اپنی کشتی کے ساتھ اسی کنارے پر موجود رہو گے۔“

الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ایک تو آج صبح ہی سے نامعلوم شخص کی لاش نے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی میں خاصی افراتفری مچا رکھی تھی اور پھر اوپر سے میں جس انداز میں تفتیش کر رہا تھا، وہ ان کی الجھن میں اضافے کا باعث تھا۔ جو میں افراد الگ ہوئے تھے، ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھ سے سوال کیا۔

”تھانے دار صاحب! ادھر فرید آباد میں سب خیریت تو ہے نا.....“

”خیریت ہوتی تو پھر اس پوچھ گچھ کی ضرورت کیا تھی؟“

”نہ..... میرا مطلب ہے.....“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اسمعیل تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے گھور کر اس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھا اور پوچھا۔ ”چاچا! تم کون ہو اور..... تمہیں اسمعیل کے بارے میں اتنی تشویش کیوں ہو رہی ہے؟“

”میں اسمعیل کا بڑا بھائی ہوں جی..... ابراہیم!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی فکر نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی جناب.....!“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو تم اپنے بھتیجے بھولا کو بھی جانتے ہو گے؟“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں سرکار۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”اسمعیل میرا اکلوتا بھائی ہے اور بھولا اس کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں بھلا اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد کو کیسے نہیں جانتا ہوں گا۔“

ابراہیم کی شکل میں مجھے ایک کام کا بندہ مل گیا تھا۔ اس دوران میں اللہ رکھانے ایک درخت کے نیچے میرے لیے چار پائی بچھا دی تھی۔ میں ابراہیم کو لے کر اس چار پائی کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں جمع ہو جانے والے لوگوں کو میں نے واپس اپنے گھروں کو جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

میں چار پائی پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ ابراہیم نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ تو بتادیں کہ اسمعیل، آمنہ اور بھولا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا.....!“

آمنہ غالباً اسمعیل کی بیوی اور بھولا کی ماں کا نام تھا۔ بعد ازاں ابراہیم سے استفسار پر میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

”ابراہیم!“ میں نے بھولا کے تایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”وہاں تو سب خیریت ہے لیکن ادھر کوٹ فرمان میں تم بھی دیکھ رہے ہو آج صبح سے کیسی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ اجنبی شخص کی لاش نے گاؤں کے ہر

شخص کا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی صبح اس بندے کی لاش کو دیکھا تھا۔ کسی نے بڑی بے دردی سے اس بد نصیب کو موت کے گھاٹ اتارا ہے لیکن.....“ وہ بولتے بولتے تھما، ایک گہری سانس لی پھر الجھن زدہ انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس اجنبی شخص کے قتل سے میرے چھوٹے بھائی کا کیا تعلق ہے؟ آپ اسمعیل کے بارے میں کیوں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے ہیں؟“

”بہت گہرا تعلق ہے چاچا.....“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، اس واردات میں تمہارے بھتیجے بھولا کا ہاتھ ہے۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....؟“ اس کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں.....!“ میرے لہجے میں سختی اتر آئی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا.....!“

”تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بہ دستور سخت لہجے میں کہا۔ ”بھولا کل شام میں اس اجنبی شخص کے ساتھ فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ خادم حسین کشتی والا اس امر کا گواہ ہے۔ اس نے کل شام آخری پھیرے میں ان دونوں کو فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچایا تھا۔ میرا مطلب ہے، اپنی کشتی میں بٹھا کر بڑی نہر عبور کرائی تھی۔ خادم حسین اس وقت نہر کے کنارے کھڑا میری واپسی کا انتظار کر رہا ہے.....“

”بھولا اگر یہاں آیا تھا تو مجھے خبر کیوں نہیں ہے۔“ ابراہیم کی الجھن ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ”وہ مجھ سے ملے بغیر واپس کیسے چلا گیا.....“

”بھولا واپس نہیں گیا ابراہیم.....“

میرے اٹل لہجے نے ابراہیم کو الجھن میں ڈال دیا۔

”وہ واپس نہیں گیا تو..... پھر کہاں ہے؟“

”تم جانتے ہو، کوٹ فرمان سے فرید آباد جانے کا واحد ذریعہ یہ بڑی نہر ہی ہے۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور اس نہر کے اس پار یا اس پار آنے جانے کے لیے لوگ خادم حسین کی کشتی استعمال کرتے ہیں۔ کرتے ہیں یا نہیں.....؟“

”جی ہاں..... بالکل کرتے ہیں۔“ اس نے اثبات

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”خادم حسین کا دھوئی ہے کہ کل شام میں آخری پھیرا لگاتے ہوئے اس نے بھولا اور اس اجنبی شخص کو کوٹ پہنچایا تھا اور آج کا پورا دن بھولا واپسی کے لیے اس کی کشتی میں نہیں بیٹھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا.....“ لختی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس بات کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے۔“

”لیکن وہ ہے کہاں.....؟“

”اس سوال کا جواب تو تم دو گے ابراہیم۔“

”میں.....!“ وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں ابراہیم..... تم۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بھولا تمہارا بھتیجا ہے اور بھتیجا بھی اکلوتا..... کوٹ فرمان میں تم اس کے واحد رشتے دار ہو۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہوگا تو یقیناً تمہارے پاس ہی آتا ہوگا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہانے دار صاحب۔“ وہ بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے، وہ مجھ سے ملنے ہی یہاں آیا کرتا ہے لیکن آپ میری بات کا یقین کریں، وہ کل کوٹ فرمان نہیں آیا۔“

”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔“

”نہیں جی..... میں نے ایسا کب کیا ہے۔“

”اگر میں جھوٹ نہیں بول رہا تو پھر تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ کل شام میں بھولا اس اجنبی مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان آیا تھا اور..... ابھی تک ادھر ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“

”جناب! آپ کی باتیں بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ وہ تقریباً رو ہانسا ہو گیا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ کوٹ فرمان آیا تھا تو مجھ سے کیوں نہیں ملا۔ دوسرے، وہ اگر ابھی تک گاؤں میں موجود ہے تو پھر کہاں چھپا بیٹھا ہے.....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس بات پر میں یقین کرنے کو تیار نہیں کہ بھولا کسی قتل کی واردات میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”دیکھو ابراہیم.....!“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں نے بھولا کو قتل کی واردات کرتے دیکھا ہے یا یہ کہ میرے پاس اس خونیں واقعے کا کوئی چشم دید گواہ ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ کل

شام بھولا اس بد نصیب مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان کے اندر داخل ہوا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستوں کی طرح کھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول بھولا کے لیے قطعاً اجنبی نہیں تھا۔ بالفرض، بھولا نے اگر اس شخص کو موت کے گھاٹ نہیں بھی اتارا تو وہ اتنا ضرور جانتا ہوگا کہ پچھلی رات اس بد نصیب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینکنے کا کیا راز تھا۔“

”آپ کی بات کو میں کسی حد تک سمجھنے لگا ہوں۔“ وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ”لیکن ابھن یہ ہے کہ کوٹ فرمان آنے کے بعد بھولا مجھ سے کیوں نہیں ملا اور آپ کے مطابق اگر وہ کہیں چھپا بیٹھا ہے تو کہاں.....؟“

”ابراہیم!“ میں نے چپتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہانے دار تم ہو یا میں؟“

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”جی..... تمہانے دار تو آپ ہی ہیں۔“

”بس، تو پھر تمہانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو۔“

میں نے یہ دستور آواز میں کہا۔ ”یہ سوال پوچھنا میرا حق ہے کہ تمہارا بھتیجا اس وقت کوٹ فرمان میں کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ تم صرف جواب دو.....“

”جناب! اگر مجھے بھولا کے بارے میں کچھ پتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”آپ میری بات کا یقین کریں سرکار۔“

”یہ قتل کا معاملہ ہے ابراہیم.....“ میں نے اسے مٹولنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔“

”شک.....!“ وہ تھوک نچکتے ہوئے بولا۔

”تت..... تو کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں تمہانے دار صاحب!“

”تفتیشی معاملات میں ایک دیانت دار پولیس والے کو بعض اوقات اپنے باپ پر بھی شک کرنا پڑ جاتا ہے ابراہیم۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس سلسلے میں ہم اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کرتے.....“

میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

”مجھے جس بھولا کی تلاش ہے وہ رشتے میں تمہارا اکلوتا سگا بھتیجا لگتا ہے۔ اس گاؤں میں اس کا اور کوئی ایسا رشتے

دار یا دوست موجود نہیں جس کے پاس وہ تمہیں نظر انداز کر کے ٹھہر جاتا۔ اس امر میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کل شام کو بھولا اجنبی مقتول کے ہمراہ کوٹ فرمان آیا تھا۔ میں بھولا کی تلاش کے سلسلے میں تم پر شک نہیں کروں تو پھر کس پر کروں.....!“

”جناب! میں اپنی باتوں سے تو آپ کو یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میرے گھر کی تلاش لے لیں۔“

”تلاش تو میں تمہارے گھر کی لوں گا ہی ابراہیم۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ سوچ لینا کہ بعد میں اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے کسی مرحلے پر دروغ گوئی سے کام لیا ہے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔“

”منظور ہے، تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آپ صرف میرے گھر کی تلاش ہی نہ لیں بلکہ میری بیوی اور بچوں سے بھی بھولا کے بارے میں پوچھیں۔ اگر کسی بھی مقام پر میری کوئی بات غلط نکلے تو جو چور کی سزا وہی میری سزا.....“

میرا سالہا سال سے جرائم پیشہ افراد سے واسطہ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ چہرے کو سیانے دل کی کتاب کہتے ہیں۔ کچھ لوگ چہرے کو دماغ کا انڈیکس بھی کہتے ہیں۔ چہرے پر سب سے اہم چیز آنکھیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی بھی انسان کچھ بول رہا ہوتا ہے تو آنکھیں اس کی سوچ کی ترجمانی کر رہی ہوتی ہیں۔ انسان کوشش کر کے چہرے کے تاثرات سے تو دل کی کیفیت کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آنکھیں چھپی کھانے سے باز نہیں آتیں۔

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی مخصوص زبان سے میں یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ وہ بھولا کی کوٹ فرمان میں آمد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن عملی تفتیش اور کارروائی بھی ضروری تھی لہذا میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”چور کی سزا تو بہت معمولی ہوتی ہے ابراہیم..... اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے غلط بیانی کر کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہیں کتنی سخت سزا دلوا سکتا ہوں۔“ ”ٹھیک ہے جی، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میرا خدا جانتا ہے کہ میں سچا ہوں

اس لیے مجھے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ابراہیم کی معیت میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس گھر میں ابراہیم اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری کی بھی اگلے سال شادی ہونے والی تھی۔ وہ مفتی شدہ تھی۔ جبکہ دونوں بیٹے کامران اور عمران کھیتی باڑی میں ابراہیم کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کامران اور عمران دونوں جوان تھے۔ میں نے پندرہ بیس منٹ کے اندر بڑی باریک بینی سے ابراہیم کے گھر کا کونا چھان مارا لیکن کہیں پر بھی مجھے بھولا نظر نہ آیا اور نہ ہی اس گھر میں اس کی آمد کے کوئی آثار دکھائی دیے۔ ”میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا جناب کہ بھولا نہ تو ہمارے گھر میں آیا ہے اور نہ ہی ہم نے اسے کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔“ ابراہیم نے کہا۔

اس وقت میں گھر کی تلاش سے فارغ ہونے کے بعد ابراہیم کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابراہیم کے علاوہ اس کی بیوی شگفتہ اور دونوں بیٹے بھی وہاں موجود تھے جن میں کامران، عمران سے دو تین سال بڑا تھا۔ وہ دونوں جوانی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

”ابراہیم!“ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ”پولیس کی تفتیش کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور ہم اس پر عمل ضرور کرتے ہیں۔ اب یہ تو پتا چل گیا کہ بھولا پچھلی رات اس گھر میں نہیں آیا اور نہ ہی آپ لوگوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔“ ”کون سا مسئلہ تھانے دار صاحب؟“ شگفتہ نے مجھ سے پوچھا۔

جس وقت میں خانہ تلاشی کے کام میں مصروف تھا اسی دوران میں وقفے وقفے سے اس گھر کے کمینوں سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا اور میں نے انہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں یہ پتا چل چکا تھا کہ میں نہر عبور کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ فرمان کیوں آیا ہوں اور میری اس وقت ترجیحات کیا ہیں۔

”مسئلہ بھولا کی تلاش کا ہے۔“ میں نے شگفتہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھولا کل شام یہاں آیا ہے اور ابھی تک واپس نہیں گیا تو پھر وہ کہاں ہے؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے جناب..... کہ بھولا ادھر آیا ہی نہ ہو۔“ شگفتہ نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

”کشتی والے خادم حسین نے بڑے وثوق سے اس امر کی تصدیق کی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے

دو چیزیں

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے بیچ حائل ہو جاتی ہیں۔ ایک موت اور دوسری تقدیر۔

اس حقیقت کو جانے کہ آپ کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

مصیبت

ایک سردار جی صبح سویرے کوٹ پہن کر آفس جا رہے تھے۔ اچانک انہیں سڑک کے عین درمیان کیلے کا چھلکا پڑا نظر آیا۔ سردار جی وہاں ایک دم رک گئے اور خود سے کہنے لگے۔

”اویار! اے کی مصیبت اے..... مجھے آج پھر پھسلنا پڑے گا۔“

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

اس لیے اس کے کہیں اور چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
شگفتہ کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اس سے پہلے میں اللہ رکھا کے گھر کے سامنے ابراہیم سے بھی تفصیلی گفتگو کر چکا تھا لہذا اب میں نے اس کے بیٹوں کی جانب رخ کر لیا۔
”تم دونوں بھی لگ بھگ بھولا ہی کے ہم عمر ہو۔“
میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”جب بھولا کوٹ فرمان آتا ہوگا تو اس کا زیادہ تر وقت تم لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا ہوگا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ کامران نے اثبات میں گردن ہلائی۔

عمران بولا۔ ”بھولا جب یہاں آتا ہے تو وہ ہمارے ساتھ کھیتوں میں کام بھی کرتا ہے اور ہم لوگ خوب کھیلتے بھی ہیں۔“

”تم لوگ عموماً کون سا کھیل کھیلتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”کوئی کھیل مخصوص نہیں ہے جناب۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”فٹ بال، کبڈی اور نہر میں نہانا..... سب شامل ہے۔“

”اچھا..... تو تم لوگ نہر میں نہایا بھی کرتے ہو؟“
”جی ہاں..... بالکل۔“ عمران نے جواب دیا۔
”بھولا بہت اچھا تیراک ہے۔ اسی نے ہمیں نہر میں تیرنا سکھایا ہے۔ ویسے ہم زیادہ تر فٹ بال ہی کھیلتے ہیں۔“

ہوئے کہا۔
”شگفتہ والے کو مغالطہ بھی تو ہو سکتا ہے تھانے دار صاحب۔“ شگفتہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ”خادم حسین نے کل شام اجنبی شخص کے ساتھ جس نوجوان کو کوٹ فرمان پہنچایا تھا، وہ بھولا کے علاوہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے..... بھولا سے ملتا جلتا کوئی بندہ..... ایسا ناممکن تو نہیں۔“

”ناممکن تو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں شگفتہ۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس کیس میں پہلے ہی ”ملتی جلتی شکل“ والا ایک اتفاق موجود ہے۔ جس اجنبی بندے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کی شکل کافی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موسیٰ سے ملتی جلتی ہے۔“

”میں نے موسیٰ کو تو ہزار بار دیکھا ہے لیکن اس اجنبی بندے کی لاش کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا.....“
”ہم نے دیکھا ہے۔“ کامران اور عمران بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ”یہ بات صحیح ہے کہ یہ بندہ بڑی حد تک موسیٰ جیسا تھا مثلاً قد کاٹھ، چہرے کے نقش اور ڈاڑھی کا انداز وغیرہ.....“

”میرا خیال ہے۔“ ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ فرید آباد میں اسماعیل کے گھر جا کر تفتیش کریں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“
”آپ نے کوٹ فرمان میں تو بھولا کو اچھی طرح تلاش کر لیا ہے۔“ شگفتہ اپنے شوہر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”وہ آپ کو کہیں نہیں ملا۔ اگر وہ ادھر فرید آباد میں موجود ہے تو پھر اس کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ کوٹ فرمان آیا ہی نہیں اور اگر خادم حسین کسی چالاکی سے کام نہیں لے رہا تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسے بھولا کے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”اس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ میں فرید آباد پہنچ کر سب سے پہلے بھولا اور اسماعیل ہی کو چیک کروں گا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک بھولا کی تلاش میں میری ناکامی کا سوال ہے تو یہ بات درست نہیں۔ میں نے صرف ابھی تک تمہارے گھر کی تلاشی لی ہے۔ باقی لوگوں سے صرف پوچھ گچھ کی ہے۔“

”آپ ضرور پورے گاؤں کے گھروں کی تلاشی لیں جناب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”لیکن بھولا ہمارا رشتے دار ہے۔ وہ جب بھی کوٹ فرمان آتا ہے تو صرف ہمارے ہی پاس آتا ہے۔ اس کا کسی اور گھر سے کوئی تعلق واسطہ نہیں

میں نے گفتگو کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تمہاری بڑی بیٹی کی شادی کہاں ہوئی ہے؟“
 ”نسیم کی شادی میری بڑی بہن کے بیٹے سے ہوئی
 ہے تمہارے دار صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اب تو اس
 بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے تو ماشاء اللہ چار بچے
 بھی ہیں۔“

”ماشاء اللہ.....!“ میں نے خلوص دل سے کہا پھر
 پوچھا۔ ”اور چھوٹی بیٹی کی مکمل کہاں کی ہے؟“
 ”نسیم کا رشتہ میرے بھائی کے بیٹے سے طے ہوا
 ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اگلے سال انشاء اللہ اس کی بھی
 شادی کر دیں گے۔“

گفتگو کی بات مجھے ہضم نہ ہو سکی۔ اس کی دو بیٹیاں
 تھیں اور دونوں کے رشتے ان کے نکاح یعنی گفتگو کے
 خاندان میں طے کیے گئے تھے جبکہ ابراہیم کا صرف ایک ہی
 بھائی تھا..... اسلعل اور اسلعل کا بھی ایک ہی بیٹا تھا.....
 اسحاق عرف بھولا..... اس قسم کی صورت حال میں تو ابراہیم
 کی محبت کو جوش مارنا چاہیے تھا۔ وہ کم از کم ایک بیٹی کی شادی
 تو اپنے اکلوتے بھائی کے اکلوتے بیٹے سے کر سکتا تھا۔ اگر
 ایسا نہیں ہوا تھا تو اس کا راز کیا تھا۔ یہ راز جاننے کے لیے
 میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

”ابراہیم! تمہاری دو بیٹیاں ہیں۔“ میں نے گہری
 سنجیدگی سے کہا۔ ”اور صرف ایک بھتیجا۔ تمہیں اپنی بیٹیوں
 کے رشتے طے کرتے ہوئے بھولا کا خیال کیوں نہیں آیا؟“
 ”مجھے تو بھولا کا بڑا خیال تھا۔“ وہ ایک افسردہ سی
 سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آمنہ کی وجہ سے
 ساری گڑ بڑ ہو گئی۔“

”آمنہ.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”یہ آمنہ کون ہے؟“
 ”آمنہ، اسلعل کی گھر والی ہے جی۔“ گفتگو
 وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ابراہیم کی تو یہی خواہش تھی
 کہ نسیم کی شادی بھولا سے ہو کیونکہ نسیم اور بھولا کی عمریں
 ایک ہی جیسی ہیں لیکن اسلعل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔
 آمنہ نے اس رشتے کی مخالفت کر دی تھی۔“
 ”مخالفت کی کوئی وجہ؟“

”جی ہاں۔“ ابراہیم نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”وہ بھولا کو اپنے خاندان میں بیاہنا چاہتی ہے۔“
 ”اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب
 گفتگو اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے کو دے سکتی ہے تو میں

بھولے کی شادی اپنی بھانجی سے کیوں نہیں کر سکتی حالانکہ میں
 نے نسیم اور نسیم کے رشتے کرتے وقت ابراہیم پر ایسی کوئی
 شرط عائد نہیں کی تھی۔ اب یہ بات الگ کہ ابراہیم کا صرف
 ایک ہی بھائی ہے اور اس کا بھی صرف ایک ہی بیٹا بھولا.....“
 ”اسلعل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے جناب۔“
 ابراہیم دھمی لہجے میں بولا۔ ”ویسے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ
 رشتے نصیبوں کا کھیل ہیں۔ جوڑے آسانوں پر بنتے ہیں،
 زمینوں پر نہیں.....“

”ابراہیم! یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی
 ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر روئے سخن
 اس کے بیٹوں کی طرف پھیر لیا۔

”جب بھولا ادھر کوٹ فرمان میں آتا تھا تو اس کا
 یہاں کے لوگوں سے بھی میل جول ہوتا ہوگا؟“
 ”جی ہاں..... ہم سب مل جل کر ہی کھیلتے ہیں۔“
 کامران نے جواب دیا۔

”یہاں کسی لڑکے کے ساتھ اس کی گہری دوستی بھی
 ہو گئی ہوگی؟“
 ”نہیں جناب! دوستی تو صرف ہم ہی سے تھی۔“
 عمران نے بتایا۔

”میرا مطلب ہے.....“ یہی سوال میں نے ایک
 دوسرے زاویے سے کیا۔ ”وہ زیادہ تر کن لڑکوں کے ساتھ
 گھٹنا ملتا پسند کرتا ہے؟“

”زیادہ تر.....“ کامران نے سوچتے والے انداز
 میں کہا۔ ”میرے خیال میں اس کی جمیل اور منظور کے ساتھ
 زیادہ بنتی تھی۔“

”جی بالکل۔“ عمران نے اپنے بڑے بھائی کی
 تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جمیل اور منظور کے ساتھ وہ گپ
 شپ کر لیتا ہے کیونکہ ان دونوں کے مزاج بھولا سے بہت
 ملتے ہیں۔“

”مزاج ملتے ہیں.....“ میں نے خود کلامی کے انداز
 میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ میں سے کوئی جمیل اور منظور کو بلا
 کر یہاں لا سکتا ہے؟“

”جی ضرور۔“ عمران اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں ابھی
 انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ عمران
 اگلے ہی لمحے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں کامران،
 ابراہیم اور گفتگو کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ اس
 دوران میں اللہ رکھا کا بیٹا موٹی بھی زیر بحث آیا۔ ان تینوں

کی رائے میں موئی ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ موئی کے بارے میں یہی رائے باقی گاؤں والوں کی بھی تھی لیکن ان سب میں سے کوئی یہ نہیں بتا سکا تھا کہ موئی اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا اور اجنبی شخص کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے کیوں پھینکا گیا تھا۔

”میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے تھانے دار صاحب!“ ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے فوراً پوچھ لیا۔“ کون سی بات ابراہیم؟“

”یہ ٹھیک ہے کہ موئی بہت ہی شریف اور بیباک بندہ تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس گاؤں میں اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، یہاں سے جانے کے بعد اس نے کسی کو اپنا دشمن بنالیا ہو اور اسی دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔“

”ابراہیم.....!“ میں نے گھور کر اس ادھیڑ عمر، سادہ دل دیہاتی کی طرف دیکھا۔ ”موئی کو کسی نے موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔ ہم اس وقت ایک اجنبی شخص کے قتل کی بات کر رہے ہیں۔“

”وہ جی..... میرا بھی وہی مطلب تھا، بس الفاظ آگے پیچھے ہو گئے۔“ وہ جلدی سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا جناب کہ اس اجنبی بندے کی شکل صورت بڑی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موئی جیسی ہے۔ ہو سکتا ہے، کسی دشمن نے موئی سمجھ کر اس کا تعاقب کیا ہو اور پھر موقع ملے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینک دیا ہو تاکہ باپ کو بیٹے کی لاش کا تھلہ دے سکے۔“

”ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے جناب.....!“ کامران نے کہا۔

”کون سی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”جس کسی نے بھی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے وہ اسی کا دشمن ہو۔“ کامران وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”قاتل کہیں پیچھے سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا ہو اور پھر موقع ملے ہی اسے ٹھکانے لگا دیا ہو۔“

”اور پھر اس کے بعد.....؟“ میں نے کامران کی طرف دیکھا۔

”وہ ہو کھلا گیا۔“ جی، میں سمجھا نہیں؟“

”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس کے بعد قاتل کہاں گیا؟“

”وہ جدھر سے آیا تھا، واپس ادھر ہی چلا گیا ہوگا۔“

”لیکن مقتول کے ساتھ تو تمہارا چچا زاد بھولا یہاں آیا

تھا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کامران کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر فرید آباد سے یہاں تک آ گیا ہو۔“

کامران نے اپنی دانت میں بہت عقل مندی کی بات کی تھی لیکن میں چونکہ بہت سی حقیقتوں سے آگاہی حاصل کر چکا تھا اس لیے اس کی عقل مندانہ بات مجھے ہنسنے نہ ہوئی اور میں نے کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا برخوردار..... اور اس کی چند وجوہات ہیں۔“

وہ کچھ نہیں بولا اور سوالیہ نظر سے مجھے ہنسنے لگا۔ ابراہیم اور شگفتہ کی نگاہیں بھی مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

”نمبر ایک..... میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش کے مطابق، اجنبی مقتول کو اس گاؤں میں کوئی جانتا یا پہچانتا نہیں لہذا اس کے ادھر رخ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”جناب! ممکن ہے، اسے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا ہو۔“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کشتی میں بیٹھ کر نہر کے اس پار آنے کا فیصلہ کر لیا ہو لیکن بد قسمتی سے قاتل بھی اس کے پیچھے یہاں پہنچ گیا ہو۔“

اس کی قطع کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا۔ ”پہلے میری بات مکمل ہو جانے دو پھر تم بولنا۔ ہو سکتا ہے پھر تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔“ وہ ندامت آمیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

”جب کوٹ فرمان میں مقتول کا کوئی جاننے والا موجود نہیں تو پھر کشتی کے ذریعے نہر پار کر کے یہاں تک آنے کی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔“ میں نے اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اگر اس گاؤں میں آیا تھا تو اس کے پیش نظر کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ بغیر کسی کام کے یہاں نہیں آ سکتا تھا۔“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس بات میں شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ کل شام خادم حسین نے اپنی کشتی کے آخری پھیرے میں صرف دو افراد کو نہر عبور کرا کے کوٹ فرمان پہنچایا تھا یعنی اجنبی مقتول اور تمہارا چچا زاد اسحاق عرف بھولا۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص کشتی پر سوار نہیں ہوا تھا لہذا قاتل کے تعاقب والی بات کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔“

”تو کیا آپ بھولا پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟“

شگفتہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔
”شک کرنا تو پولیس والوں کی کھٹی میں شامل ہوتا ہے بی بی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
”ہاں، یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے بھولا پر شک ہے لیکن اس شک کی نوعیت کا تعین میں اس وقت کر سکوں گا جب بھولا میرے ہاتھ چڑھے گا.....“ میں نے ایک بار پھر توقف کر کے باری باری ان سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”یا تو بھولا ہی نے اس اجنبی شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یا پھر وہ اس کے قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔“
”بھولا ابسا نہیں کر سکتا.....“ شگفتہ اضطرابی انداز میں بولی۔

ابراہیم نے کہا۔ ”اس کی ذات کے حوالے سے اس قسم کی مجرمانہ شکایت کبھی سننے کو تو نہیں ملی۔“

”اماں اور ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔“ کامران جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ بھولا کھیل میں بے ایمانی کرنے کا ماہر ہے لیکن کبھی اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ اس کی سرگرمیاں مار پٹائی تک ہی محدود ہیں۔“

”جھوٹ بولنا یا بے ایمانی کرنا میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”باقی تمام برائیاں اسی کے پیٹ سے جنم لیتی ہیں۔ جو شخص جھوٹ بول سکتا ہے اور بڑی صفائی کے ساتھ بے ایمانی کر سکتا ہے وہ اس سے کہیں آگے بڑھ کر کوئی بھی سنگین جرم کر سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بھولا نے ہی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ بھولا اس قتل کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے۔ میں بھولا سے اس لیے بھی پہلی فرصت میں ملنا چاہتا ہوں کہ یہ بات وہی بتا سکتا ہے کہ اجنبی مقتول کے ساتھ اس کی ملاقات کب، کیوں اور کیسے ہوئی تھی۔ اگر وہ پہلے سے مقتول کو جانتا ہے تو پھر مجھے اس کیس کو حل کرنے میں کافی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ جب مقتول کا پس منظر میرے سامنے کھلے گا تو قتل کا محرک اور قاتل تک رسائی کے راستے کی تمام رکاوٹیں خود بہ خود دور ہو جائیں گی اور اگر بھولا اجنبی شخص کو پہلے سے نہیں جانتا تو.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے باری باری ان لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا

پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”پھر بھولا کو بتانا پڑے گا کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ کیسے کھل ملی گیا تھا۔ وہ ایک دوست کی حیثیت سے مقتول کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کیوں اور کس مقصد سے کوٹ فرمان آیا تھا اور یہاں سے اچانک کہاں غائب ہو گیا۔“
”تھانے دار صاحب! سچ پوچھیں تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ بھولا پچھلی رات یہاں آیا تھا۔“ کامران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کس بنا پر یقین نہیں آ رہا؟“
”وہ جی، ظاہری بات ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسا کیسے ممکن ہے کہ بھولا کوٹ فرمان میں آئے اور ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے.....“

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”وہ واپس نہیں گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک شہر عبور کر کے فرید آباد نہیں گیا۔“

شگفتہ نے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ فرید آباد پہنچ کر تفتیش کریں گے تو انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“
”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے شگفتہ۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔ ”میں تو خود بھی اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتا ہوں لیکن پتا تو چلے کہ تم نے یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہی ہے۔“

”وہ جی، مجھے پکا یقین ہے، بھولا آپ کو یا تو اسماعیل کے ہوٹل پر ملے گا یا پھر گھر پر مل جائے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس سے مل کر آپ کی تسلی ہو جائے گی کہ وہ نہ تو پچھلی رات کوٹ فرمان آیا تھا اور نہ ہی وہ قتل کی کسی واردات میں ملوث ہے۔“

یہ ایک چاچی بلکہ تائی کا اپنے بھتیجے پر یقین اور اعتماد تھا کہ وہ بھولے کو بے قصور اور بے گناہ سمجھ رہی تھی۔ میں جب تک بھولا سے ایک تفصیلی تفتیشی ملاقات نہ کر لیتا، اس وقت تک شگفتہ کے اعتماد اور یقین کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری جانب خادم حسین کا وثوقی بیان تھا۔ اس نے بھولا کی معیت میں اجنبی مقتول کو اپنی کشتی کے ذریعے شہر کے پار کوٹ فرمان میں پہنچایا تھا اور اس کے بیان کے مطابق آج دن بھر اس نے جتنے بھی پھیرے لگائے تھے، ان میں بھولا اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا ابھی تک گاؤں کے اندر یا گاؤں کے باہر کہیں موجود تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس بڑی شہر پر میلوں دور تک کوئی پل نہیں بنا ہوا تھا لہذا کوٹ فرمان سے فرید آباد

جانے کے لیے کشتی ہی کے ذریعے سفر کرنا پڑتا تھا۔ ایک اور موہوم سا امکان بھی تھا کہ بھولا نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ میلوں دور تک چلا گیا ہو اور پھر کسی پل کے ذریعے نہر عبور کر کے، دوبارہ میلوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد واپس فرید آباد پہنچ گیا ہو۔ اس امکان کو زیر غور لانے کے لیے بھی بھولا کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق اجنبی مقتول کی موت گزشتہ شب رات کے ابتدائی حصے میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی کی حالت، چہرے اور گردن کے زخموں اور وہاں سے خارج ہونے والے خون کی کیفیت بتاتی تھی کہ اس بد نصیب کو رات سات اور نو کے درمیان کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن اور لباس کے مختلف حصوں پر جسنے والے خون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اور یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی تھی کہ اسے قتل کے فوراً بعد اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے نہیں پھینکا گیا تھا۔ جس جگہ پر میں نے اس اجنبی شخص کی لاش کا معائنہ کیا تھا وہاں پر قتل و غارت گری کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا آثار بھی دریافت نہیں ہو سکا تھا۔

جب کسی بھی شخص کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے حتی المقدور کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ کوشش مزاحمت کی شکل میں بھی ہو سکتی تھی اور راہ فرار کی صورت میں بھی۔ میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ وہاں راہ فرار اختیار کرنے کے آثار بھی ناپید تھے۔ زمین پر قدموں کے ایسے نشانات کہیں بھی دکھائی نہیں دیے تھے جن کی مدد سے کہا جاسکتا ہو کہ وہاں دو یا دو سے زیادہ افراد کے پیچ کھینچا تانی اور پکڑ جکڑ یا کھم گتھا ہوئی ہو۔

اگر مزاحمتی کوشش کو تفصیلی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس صورت میں، کسی بے رحم قاتل کے شکنجے میں پھنسا ہوا کوئی شخص اپنی جان کی سلامتی کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہی اپنی زبان اور حلق کا بھی بے دریغ استعمال کرتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ ہاتھ پاؤں سے اپنے دشمن کے وار روکنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری جانب وہ چیخ چلا کر لوگوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے واویلا بھی مچاتا ہے۔

اگر اس اجنبی کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تو پھر لازماً اس نے بھی خود کو بچانے کے لیے چیخ و پکار کی ہوگی۔ اگر اس نے اپنے بچاؤ

کے لیے یہ حربہ آزمایا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ گلی کے دروازے دھڑا دھڑکھل نہ جاتے اور لوگ اس کی مدد کو نہ لپکتے۔ میں نے جتنے لوگوں سے بھی پوچھا پوچھا کی بھی ان میں سے ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے رات میں کسی قسم کی کوئی آواز نہیں سنی۔ ان شواہد کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ اس بد قسمت شخص کو کسی اور مقام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور وہ بھی رات کے ابتدائی حصے میں اور پھر رات کے آخری حصے میں اس کی تشدد زدہ لاش کو لا کر اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔

ہم اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ عمران واپس آ گیا۔ وہ خالی نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ وہ ان دو بندوں کو بھی لے کر آیا تھا جن کے ساتھ بھولا کی اچھی گپ شپ تھی۔ میرا اشارہ جمیل اور منظور کی جانب ہے۔

یہ دونوں بندے عمر کے لحاظ سے انیس بیس کے فرق سے کامران کے برابر ہی تھے۔ کامران نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ بلاوا لے کر جانے والے نے انہیں راستے میں اس ملاقات کے پس منظر سے تفصیل آگاہ کر دیا تھا۔

وہ دونوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کا خوف و ہراس یا پریشانی نہیں پائی جاتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کے جرم یا مجرمانہ کارروائی میں ملوث نہیں تھے۔ ”میں نے تم دونوں کو ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ کامران اور عمران کا چچا زاد بھائی اسحاق عرف بھولا تم دونوں کے ساتھ کافی گھلا ملا ہوا ہے۔“ میں نے بدستوران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی..... یہ بات تو بالکل سچ ہے۔“ منظور نے کہا۔ ”بھولا کھیل کے معاملے میں گڑبڑ کر جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔“

”اس کے ساتھ ہمارا وقت ہنسی مذاق کرتے گزر جاتا ہے۔“ جمیل، منظور کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کافی دنوں سے اس نے ادھر کا چکر نہیں لگایا۔ مجھے اس کی یاد بہت ستاتی ہے لیکن.....“

وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا جمیل؟“ ”وہ جی عمران نے راستے میں ہمیں بتایا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ کل شام بھولا ادھر آیا تھا اور ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“ وہ اپنے ”لیکن“ کی

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔

نہر اور کوٹ فرمان نامی اس گاؤں کے بیچ کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جمیل نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ ”میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑے فاصلے پر بھولا جا رہا ہے.....“ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اسے آواز دی تو اس نے میری آواز پر کان نہیں دھرے اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے یہ آواز بلند اسے پکارا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا.....“ وہ چند لمحات کے لیے تھما، ایک آسودہ سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”شاید وہ کوئی اور تھا۔ اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر پلٹ کر ضرور دیکھتا۔ رات کی تاریکی میں کسی اور کو میں نے بھولا سمجھ لیا تھا۔ بہر حال، وہ شخص کھیتوں میں غائب ہو گیا اور میں واپس گھر آ گیا۔“

جمیل کے اس سنسنی خیز بیان نے میرا کام آسان بنا دیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ جمیل کو مغالطہ نہیں ہوا ہوگا۔ وہ بھولا ہی تھا لیکن چونکہ وہ کسی خفیہ مشن پر تھا اس لیے اس نے جمیل کی آواز پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ کوٹ فرمان میں اپنی موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

”کیا تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو جہاں پچھلی رات تم نے کسی ایسے شخص کو کھیتوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا جسے تم بھولا سمجھ بیٹھے تھے؟“ میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ضرور۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“

اگلے چند لمحات میں، میں جمیل کی معیت میں مذکورہ مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں گزشتہ شام اس نے بھولا کی جھلک دیکھی تھی۔ کوٹ فرمان نامی یہ گاؤں نہر کے کنارے سے کم و بیش نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ گاؤں اور نہر کے بیچ میں سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ایک جگہ پر رک کر جمیل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے وہاں سے بھولا کو جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ نہیں گئی تاہم اس کے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول سے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بھولا ہے جیسی میں نے اسے آواز بھی دی تھی لیکن وہ

”ہاں..... یہ ایک حقیقت ہے۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس اس بات کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ بھولا کل شام کو اس شخص کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان آیا تھا جسے رات کے کسی حصے میں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”جی..... اس شخص کی لاش ہم نے بھی دیکھی ہے۔“ منظور نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”مگر بھولا ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ رات میں اور نہ ہی صبح سے لے کر اب تک.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اگر وہ کوٹ فرمان آتا تو ہم سے ملے بغیر کیسے جاسکتا تھا۔“

”منظور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب!“ کامران نے اپنے مشترکہ دوست کی تائید میں کہا۔ ”وہ اور کسی سے ملے یا نہ ملے لیکن ہم تو اس کے سگے رشتے دار ہیں۔ وہ ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔“

”تم کیا کہتے ہو جمیل؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی، یہ لوگ غلط تو نہیں کہہ رہے۔“ جمیل الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”بھولا جب بھی ہمارے گاؤں آتا ہے، چند دن رہے بغیر واپس نہیں گیا اور یہ تو بالکل ہی ممکن نہیں کہ وہ ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے مگر.....“ ”مگر“ پر پہنچ کر وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مگر کیا جمیل؟“

”وہ جی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بات کی کوئی اہمیت بھی ہے یا نہیں۔“

ابھی تک اس کے لہجے سے الجھن ٹپک رہی تھی۔ میں نے بہ دستور ورشتہ انداز میں استفسار کیا۔ ”کسی بات کی اہمیت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔ تم بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا جناب.....!“

”منہ سے کچھ بولو گے تو پتا چلے گا نا؟“

”کل رات مجھے بھولا کا مغالطہ ہوا تھا.....!“ وہ

متذبذب انداز میں بولا۔

میں چونک اٹھا اور جلدی سے پوچھا۔ ”بھولا کا مغالطہ..... کیا مطلب؟“

”میں کھیتوں کی طرف سے گاؤں کی جانب آ رہا

پہنچایا تھا۔ یہ لگ بھگ مغرب کا وقت تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جمیل نے (اس کے گمان کے مطابق) بھولا کو گاؤں سے نکل کر نہر کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا محض اس اجنبی نوجوان مقتول کو کوٹ فرمان پہنچانے ہی آیا تھا لیکن یہاں پر ایک سوال ذہن کو الجھاتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہو گیا؟ میری ابتدائی تفتیش کے مطابق وہ کوٹ فرمان کے کسی گھر میں موجود نہیں تھا اور اس امر کا بھی کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا تھا کہ وہ کوٹ فرمان سے کہیں چلا گیا ہو حتیٰ کہ کوٹ فرمان میں کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا، سوائے جمیل کے اور..... وہ بھی ایک مخالف کی حالت میں۔ اگر یہ بھولا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو اس معاملے کو بہ آسانی سلجھایا جاسکتا تھا۔ شام ہونے کو آ رہی تھی لہذا میں نے واپسی کا قصد کیا۔

فوری طور پر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کل کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ ادھر کا رخ کروں گا۔ اگر بھولا اور اجنبی مقتول کا کھرا ہاتھ لگ جاتا تو پھر یہ بتا چلایا جاسکتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہوا ہے اور نامعلوم نوجوان کو کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔

میں نے واپسی کے سفر سے پہلے ابراہیم اور اس کے

رکائیں۔“
”تم اس وقت کھیتوں سے گاؤں کی طرف جا رہے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”جی..... جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بھولا نہر کی طرف جا رہا تھا.....!“
”ہاں نہیں جناب، وہ بھولا تھا بھی یا نہیں۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر رکتا ضرور.....“

”وہ جو کوئی بھی تھا، ہم اس پر بحث نہیں کر رہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم صرف یہ بتاؤ کہ جس شخص پر تمہیں بھولے کا گمان ہوا، وہ گاؤں کی طرف سے نہر کی جانب جا رہا تھا؟“

”جی..... بالکل ایسا ہی ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ملاح خادم مجھے بتا چکا تھا کہ اس نے گزشتہ روز آخری پھیرے میں بھولا اور اس اجنبی نوجوان کو فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچایا تھا جس کی تشدد شدہ لاش آج صبح اللہ رکھا کی دہلیز پر پڑی ملی تھی۔ خادم کے مطابق اس نے ان دونوں افراد کو ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کوٹ فرمان

”یہ کہاں بچیں کہ دل ہے“

نت نئے کرداروں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتی پُر اثر تحریروں کی خالق اور..... ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی.....

مایہ ناز مصنفہ
دفعہ سراج
کے قلم کا ایک اور شاہکار

جدد ہی پاکیزہ کے صفحات کی زینت بنے جا رہا ہے

دونوں بیٹوں کو خصوصی ہدایات دیں پھر خادم حسین کی سستی میں بیٹھ کر فرید آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میری معلومات کے مطابق بھولا کے والد چاچا اسماعیل کی دکان فرید آباد کے لاہری اڈے پر تھی۔ تھانے کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اسماعیل سے ملنا ضروری سمجھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بھولا بھی چائے سگریٹ کی اس دکان پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

اسماعیل کی شکل بڑی حد تک اپنے بڑے بھائی ابراہیم سے ملتی جلتی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اٹیشن ہو گیا پھر قد و یا نہ لہجے میں بولا۔

”ست بسم اللہ سرکار۔ حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟“

”اسماعیل!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں خدمت کرانے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ امید ہے، تم مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔“

”جی ضرور.....“ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں استفسار کیا۔ ”تمہارا بیٹا بھولا کہیں نظر نہیں آ رہا.....“

”وہ جی اچھا نہیں لگ رہا..... آپ پہلی مرتبہ میری دکان پر آئے ہیں۔“ وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”چائے بالکل تیار ہے اور موسم بھی خاصا ٹھنڈا ہو رہا ہے.....“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ”ایک کپ چائے چلے گی۔“

اس نے جلدی سے مجھے چائے اور ایک پیس پیش کر دیے۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”اسماعیل! تمہارا بیٹا کدھر ہے؟“

”وہ تو جی یہاں نہیں ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

میری معلومات اور تحقیق کے مطابق اسے فرید آباد میں ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ حالات و واقعات کی روشنی میں وہ ابھی تک کوٹ فرمان ہی میں تھا۔ میں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“

”وہ جی جھنگ گیا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ کب جھنگ گیا ہے؟“ میں نے چوکتے ہوئے پوچھا۔ ”اور وہاں وہ کیا کرنے گیا ہے؟“

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کہے گا، بھولا کل شام کو جھنگ گیا تھا لیکن اس کے جواب نے میری توقع کی ایسی کم تھیں پھیر دی۔

”وہ آج صبح جھنگ گیا ہے سرکار۔“ اس نے بتایا۔

”وہ وہاں اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے۔“

”آج صبح.....“ میں نے اسماعیل کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا

مطلب یہ ہے کہ وہ پچھلی رات اپنے گھر پر ہی تھا؟“

”جی بالکل.....“ وہ گھر پر ہی تھا۔“ اس نے الجھن

زدہ لہجے میں جواب دیا پھر سوال کیا۔ ”تھانے دار صاحب!

آپ بھولا کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کر رہے

ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

”پولیس اور خیریت ایک ساتھ کیسے چل سکتی ہیں؟“

میں نے کبھی انداز میں کہا۔

”کچھ پتا تو چلے جناب، آخر معاملہ کیا ہے؟“ اس کی

پریشانی دو چند ہو گئی۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے

صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اس کے چہرے پر فکر

کے سائے لہرانے لگے۔ بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! یہ بات تو میرے علم میں آچکی

ہے کہ ساتھ والے پنڈ میں قتل کی کوئی واردات ہو چکی ہے

لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ایسے کسی معاملے میں بھولا کا

ہاتھ ہو۔“

”ادھر کوٹ فرمان میں جس نو جوان کی لاش ملی ہے،

وہاں کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی ہے۔“ میں نے واقعے کی

روح بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ اجنبی نو جوان تمہارے

بیٹے بھولا کی سنگت میں کل شام فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا

تھا۔ اس بات کا چشم دید گواہ خادم حسین ملاح ہے جس کی کستی

میں بیٹھ کر وہ نہر کے اس پار گئے تھے اور حالات یہ بتاتے

ہیں کہ بھولا ابھی تک واپس نہیں آیا جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ

گزشتہ رات وہ گھر پر موجود تھا اور آج صبح جھنگ کی طرف

روانہ ہوا ہے۔“

”میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا جناب۔“

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ کہیں گے تو میں بڑی

سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”قسم چھوٹی ہو یا بڑی، اس کے کھانے یا پینے سے

معاملے کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیا تھا۔ اگر اسماعیل کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تو پھر بھولا نے گزشتہ رات اپنے گھر پر گزاری تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ رات ہی میں کسی وقت نہر پار کر کے کوٹ فرمان سے فرید آباد آ گیا تھا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کشتی کے بغیر اس نے نہر کو کیسے عبور کیا تھا؟ وہ نام کی نہر تھی مگر اس کا پاٹ کسی دریا سے کم نہیں تھا۔ اس سوال کا بہتر جواب خود بھولا ہی دے سکتا تھا اور..... مجھے اس جواب کو حاصل کرنے کے لیے بھولا کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں نے تھانے پہنچ کر متعلقہ عملے کو ضروری ہدایات دیں پھر اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا جو تھانے کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ آئندہ روز مجھے کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ کوٹ فرمان کا رخ کرنا تھا تا کہ نہر کے کنارے سے بھولا اور اس اجنبی نوجوان کا کھرا اٹھایا جاسکے۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ میں فجر کی نماز کے لیے بیدار ہوا تو گرج چمک کے ساتھ بوند باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ رات کے آخری پہر میں بارش کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو تاحال جاری تھا۔ اپنے کوارٹر کے تریتر مچن کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال ابھرا، وہ یہ تھا کہ اب کسی کھوجی یا کھرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بارش نے زمین پر سے ہر قدم کے نشان کو مٹا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے مایوسی کا احساس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے ذہن سے ہر قسم کے دل شکنہ خیالات کو جھٹک دیا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر یہ مصلحت سر دست انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی سمجھ کا علاج کرانا چاہیے۔ میں مایوسی اور ناامیدی کو کفر کے خانے میں رکھتا ہوں۔

دقتے دقتے سے برسات کا سلسلہ جاری تھا کہ دوپہر ہو گئی۔ اس روز مطلع ابر آلود تھا۔ تاہم سورج آسمان پر دکھائی دے یا نہ دکھائی دے، دوپہر تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔ دس فروری کی اس پنج بے دوپہر کے بعد سرکاری اسپتال سے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ میں نے فوری مذکورہ رپورٹ کھول کر پڑھی۔ انگریزی کی تحریر میں کچھ اس نوعیت کا مضمون تھا۔

اس رپورٹ کی روشنی میں نا معلوم نوجوان کی موت آٹھ فروری کی شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع

بات نہیں بنے گی اسماعیل۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ قتل کا معاملہ ہے اور مقتول گزشتہ شام تمہارے بیٹے کے ہمراہ فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستانہ ماحول میں ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر بھولا میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کیس کو حل کرنا آسان ہو جائے گا۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب.....“ وہ مریل سی آواز میں بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ..... کیا کل شام کے وقت بھولا یہاں دکان پر تمہارے ساتھ موجود تھا؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

”نن..... نہیں جی۔“ اس نے متذبذب انداز میں سر کو نفی میں جنبش دی پھر اگلے ہی لمحے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ بھولا ہر وقت میرے ساتھ دکان پر موجود نہیں ہوتا۔ وہ من موچی ہے سرکار..... اس کا جب دل چاہتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے میرا ہاتھ بٹانے ادھر آ جاتا ہے ورنہ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ”تو گزشتہ شام بھولا تمہارے ساتھ دکان پر موجود نہیں تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ پچھلی رات کو وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ آج صبح جھنگ گیا ہے اور کل واپس آئے گا؟“

”جی تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہی حقیقت ہے۔ میں نے آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔“

”اور اگر بعد میں کسی مرحلے پر مجھے پتا چلا کہ تم نے دانستہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کی ہے تو پھر مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنا اسماعیل!“ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”جی بالکل!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میرا دل مطمئن ہے کہ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

میں نے اسماعیل کو چند ہدایات دیں اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اس بات کی تاکید کر دی۔

”بھولا جیسے ہی جھنگ سے واپس آئے، تم پہلی فرصت میں اسے لے کر میرے پاس تھانے آؤ گے۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ جب میں تھانے پہنچا، ماحول پر تاریکی چھا چکی تھی اور ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اسماعیل سے ہونے والی ملاقات نے اس

ہوئی تھی۔ موت کا سبب اس بد قسمت کے سر پر لگنے والی وہ شدید چوٹیں تھیں جنہوں نے اس کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ مقتول کے بدن کے مختلف حصوں پر بھی چوٹوں کے متعدد نشانات پائے گئے تھے۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بیک وقت دو تین افراد نے لاشیوں کی مدد سے اس پر تازہ توڑ حملے کیے تھے۔ حملے کی نوعیت بتاتی تھی کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دلوں میں شدید ترین نفرت رکھتے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی منسلک تھا۔ وہ ایک تحریری رقعہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ پرچہ مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا۔ جب جائے وقوعہ پر میں نے مقتول کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے اس کی جامہ تلاشی لی تھی تو اس کی جرابوں کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ جرابوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے چھپنے ہوئے تھا۔ مذکورہ رقعے کی تحریر نہایت ہی مختصر مگر سنسنی خیز تھی۔ اس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

”ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔“

اس مختصر تحریر کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک بیٹے نے اپنی ماں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے عنقریب ملاقات کی نوید سنائی تھی مگر کون بیٹا اور کون ماں؟ یہ دو نہایت ہی اہم سوال تھے۔ یہ رقعہ اجنبی مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا لہذا بیٹا وہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کوٹ فرمان میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی شخص مقتول کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول کی ماں کوٹ فرمان میں نہیں رہتی تھی۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ مقتول کسی بیٹے کا رقعہ اس کی ماں کو پہنچانے کوٹ فرمان آیا تھا مگر کون ماں؟ کس کی ماں؟.....

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور آپوں آپ میرا دھیان اللہ رکھا کی بیوی کرم بی بی کی طرف چلا گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اللہ رکھا اور کرم بی بی کا جوان بیٹا موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ اجنبی مقتول کو موسیٰ ہی نے کوٹ فرمان بھیجا ہو؟ لیکن شاید ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے گزشتہ روز موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے اللہ رکھا اور کرم بی بی سے کرید کرید کر متعدد سوالات کیے تھے لیکن انہوں نے موسیٰ کے بارے میں اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا جبکہ مذکورہ رقعے کی تحریر بتاتی تھی کہ یہ بیٹا اپنی ماں سے رابطے میں تھا جیسا کہ اس نے اپنی

خیریت سے مطلع کرتے ہوئے جلد ملاقات کی امید دلائی تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی نے موسیٰ کے حوالے سے کوئی بات مجھ سے چھپائی تھی اور یا پھر اس رقعے کا گم شدہ موسیٰ سے کوئی تعلق نہیں تھا..... تو کیا کوٹ فرمان کی کسی اور ماں کا بیٹا بھی اس سے بچھڑا ہوا تھا؟

مختلف نوعیت کے سوالات میرے ذہن میں چکر رہے تھے۔ میں نے سوچا، جیسے ہی بارش کے سلسل میں تعطل واقع ہوگا، میں کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اس رقعے کی روشنی میں نئے زاویے سے تفتیش کو آگے بڑھانے کی کوشش کروں گا۔

بارش نے مجھے تھانے سے نکلنے کا موقع تو نہیں دیا البتہ سہ پہر کے وقت مجھے ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی کہ اسٹیشن چائے والا مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس کے ساتھ بھولا بھی تھا۔ اسٹیشنل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں آپ کے حکم کے مطابق بھولا کو لے کر آپ کے پاس حاضر ہو گیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے چاچا! تم ذرا باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں بھولا کے ساتھ علیحدگی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

چند لمحات کے مذبذب کے بعد اسٹیشنل اٹھا اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے بھولا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ”تم صرف نام ہی کے بھولا ہو یا عمل میں بھی بھولے بھالے ہو؟“

”جی.....“ اس سمجھا نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”جب ٹرائل روم میں تمہاری چھترول ہوگی تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔

وہ سہم کر امداد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”آٹھ فردری کی شام تم کہاں تھے؟“

”میں ادھر ہی تھا جی۔“ وہ تھوک نکلتے ہوئے بولا۔

”فرید آباد میں۔“

”لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آٹھ فردری کی شام تم کسی نوجوان کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ نوجوان کون تھا؟ اور تم کوٹ فرمان سے واپس کب اور کیسے آئے تھے؟“

بتانے لگا۔ ”وہ صدیق پہلوان کا بیٹا ہے۔ مجھے کشتی اور کبڈی کے مقابلے دیکھنے کا بہت شوق ہے تھا نے دار صاحب اور میں گوگا پہلوان کو بہت پسند کرتا ہوں اسی لیے میں نے آنکھیں بند کر کے اس کا کام کرنے کی ہامی بھری۔ اس کام کے لیے گوگانے مجھے پورے سو روپے دیے تھے۔“

”اور اس نے تمہیں کام کیا بتایا تھا؟“ بھولا سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوال کر دیا۔

”چند روز پہلے وہ مجھ سے علیحدگی میں ملا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کوٹ فرمان والے موسیٰ کو جانتا ہوں۔“ بھولا تفصیلات سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جواب دیا کہ میں موسیٰ کو نہیں جانتا۔ پھر اس نے مجھے موسیٰ کے قد کاٹھ اور حلیے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں لاری اڈے پر آنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھوں۔ ایک دو دن میں موسیٰ یہاں پہنچے گا۔ وہ فرید پور سے کوٹ فرمان جائے گا۔ تم نے کسی طرح اس سے دوستی کرنا ہے۔ موسیٰ کی منزل کوٹ فرمان میں اللہ رکھا کا گھر ہے لیکن تم نے کسی طرح بہلا پھسلا کر اسے چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم اور ہاں..... بات کے اختتام پر گوگانے مجھے تنبیہ کی تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تمہیں کوئی کام سونپا ہے۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ کیا اور گوگانے سو روپے نکال کر مجھے دے دیے۔ یہ ہے ساری کہانی جناب۔“

”یہ ساری کہانی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔“ میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تم نے آٹھ فروری کی شام موسیٰ کو چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا؟“

”جی بالکل، میں نے اپنا کام مکمل کر دیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”گوگا سے ملاقات کے بعد میں نے لاری اڈے کی ایک ایک بس اور وٹکین سے اترنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پھر آٹھ فروری کی شام مجھے موسیٰ ایک وٹکین سے اترتا دکھائی دیا تو میں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کوٹ فرمان کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ موسیٰ سے دوستی کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی لہذا ہم خادم حسین کی کشتی میں بات چیت کرتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ موسیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے اور اسے کسی اللہ رکھا کے صر جانا ہے۔ اس بات نے میرا

”میں کسی اجنبی نو جوان کو نہیں جانتا۔“ وہ باغیانہ انداز میں بولا۔ ”میں کوٹ فرمان نہیں گیا۔ میں تو اس رات اپنے گھر میں تھا اور اگلی صبح یعنی نو فروری کو میں جھنگ چلا گیا تھا اور وہاں سے ابھی واپس آیا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ میں نے خوشخوار نظر سے اسے گھورا۔ ”لہذا مجھے کوئی ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

”آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے سچ اور جھوٹ کا ٹیسٹ ڈرائنگ روم میں ہوگا بھولا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تم اس طرح نہیں مانو گے۔“

میں نے ایک اہلکار کو بلا کر بھولا کو اس کے حوالے کیا اور کہا۔ ”یہ صرف نام کا بھولا ہے۔ ذرا ڈرائنگ روم میں لے جا کر اسے ابتدائی ٹیسٹ سے گزار دتا کہ پتا چلا یا جاسکے کہ اس بھولے کے اندر کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں۔“ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ بھولا زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ ابتدائی لات جوتا کھانے کے بعد ہی شرافت کی زبان بولنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ پولیس اہلکار اسے واپس میرے پاس چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس کے چہرے پر نگاہ کاڑتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں بھولا! کچھ یاد آیا، وہ اجنبی نو جوان کون تھا جس کے ساتھ تم آٹھ فروری کی شام خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے؟“

”میں اس نو جوان کو نہیں جانتا جناب۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

”اگر تم اسے نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ کوٹ فرمان کیوں گئے تھے؟“ میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا۔ ”خادم حسین نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس نو جوان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر بات چیت کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ تمہاری برسوں کی یاری ہو؟“

”وہ سب کچھ میں نے گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا تھا۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں لالچ میں آ گیا تھا جناب۔“

”یہ گوگا پہلوان کون ہے؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اور اس نے تمہیں کون سا لالچ دیا تھا؟“

”گوگا پہلوان ادھر گروالی میں رہتا ہے جناب۔“ وہ

وقت تیر کر نہر پار کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔
 ”بھولا! جب تک میں اس کیس کو حل نہیں کر لیتا تم
 سرکاری مہمان رہو گے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ
 کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب جناب؟“ وہ ہٹکا ہٹکا ہو کر میرا منہ شکنے لگا۔
 ”مطلب یہ کہ تمہیں تمہانے کی حوالات میں قیام کرنا
 ہوگا۔“ میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔
 ”لیکن میرا قصور کیا ہے جناب؟“ وہ احتجاجی انداز
 میں مستفسر ہوا۔

”تمہارے قصور کا فیصلہ ایک آدھ دن میں ہو جائے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال اتنا سمجھ لو کہ گوگ نے تمہیں عقیدت کی مار ماری ہے.....“ وہ حیرت اور فکر مندی کے طے چلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”مجھ پر رحم کریں جناب۔“ ”رحم ہی کر رہا ہوں جو حوالات میں بند کر رہا ہوں۔“ میں نے حسی لہجے میں کہا۔ ”ورنہ اب تک میں تمہیں پھانسی چڑھا چکا ہوتا۔“

وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کیس کے دوسرے میرے ہاتھ میں آگئے تھے یعنی گوگا پہلوان آف لکروالی اور چودھری فیضان علی کا ڈیرا۔ بھولا کے مطابق اس نے مقتول کو موسیٰ کے مغالطے میں چودھری کے ڈیرے تک پہنچایا تھا۔ اگر میں عطاء روی سے پیش قدمی کرتا تو قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔

میں نے اسی وقت ایک اے ایس آئی اور دو کانٹینبلز کی ایک ٹیم بنا کر موضع نگر والی روانہ کر دی۔ نگر والی، کوٹ فرمان کے جنوب میں سات میل کے فاصلے پر واقع ایک درمیانے سائز کا گاؤں تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو سختی سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ ہر حال اور ہر قیمت پر گوگا پہلوان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لانا ہے۔ میں نے خود ایک کانٹینبل کو ساتھ لیا اور بارش کی پروا کیے بغیر چودھری فیضان علی کے ڈیرے کی سمت چل پڑا۔

☆☆☆

چودھری فیضان علی کا ڈیرا شہر اور گاؤں کے درمیان کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ یہ پچی چھتوں والے تین کمروں پر مشتمل تھا جہاں پر مال مویشیوں کے علاوہ جانوروں کا چارا وزرعی آلات بھی موجود تھے۔ ڈیرے کا ایک کمر چودھری کے ملازموں نے اپنی رہائش کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس ڈیرے پر طفیل اور مراد حسین نامی دو ملازم رہا کرتے

پر مشتمل تھا جہاں پر مال مویشیوں کے علاوہ جانوروں کا چارا و زرعی آلات بھی موجود تھے۔ ڈیرے کا ایک کمرہ چودھری کے ملازموں نے اپنی رہائش کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس ڈیرے پر طفیل اور مراد حسین نامی دو ملازم رہا کرتے

تھے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو صرف مراد حسین وہاں موجود تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں نے خادم حسین کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ نہر کے کنارے پر رک کر میرا انتظار کرے گا۔

مراد حسین مجھے ڈیرے پر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں سے مراد حسین کی ”خاطر تواضع“ کی اور آٹھ فروری کی رات ڈیرے پر پیش آنے والے خونچکاں واقعے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ میں نے اسے جھکڑی پہنا کر کاشییل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تم سے باقی باتیں تھانے میں ہوں گی۔“

پھر میں ڈیرے کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔ یہ خانہ تلاشی جلد ہی رنگ لے آئی اور چارے والے کمرے میں مجھے دو لاشیاں مل گئیں۔ ان لاشیوں کے سروں پر جما ہوا خون بگی نظر آ رہا تھا۔ جب میں نے خون آلود لاشیوں کا بغور جائزہ لیا تو وہاں چند بال بھی چپکے دکھائی دیے۔ یقیناً یہ خون اور بال اسی بد نصیب نوجوان کے تھے جس کی کھوپڑی پر یہ لاشیاں برسا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسی دوران میں مراد حسین کا ساتھی طفیل احمد بھی ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں نے فوراً سے میسٹر اسے بھی آہنی زیور پہنا دیا پھر میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ گیا۔

آلہ قتل یعنی وہ خون آلود لاشیاں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں لہذا طفیل اور مراد کی زبان کھلوانے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے چودھری فیضان علی کے ان دونوں ملازموں کو ایک سخت گیر حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے صبح تک رزلٹ چاہیے.....!“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔“ حوالدار نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں پوری رات ان کی ایسی مکینیکی کروں گا کہ صبح تک یہ کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح فر فر بولنے لگیں گے۔“

حوالدار نے جو کہا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ اگلی صبح جب میں حسب معمول تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو حوالدار نے میرے پاس آ کر یہ نوید سنائی۔

”ملک صاحب! دونوں ملازموں نے اس اجنبی نوجوان کے قتل کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ اپنا اقبالی بیان لکھوانا چاہتے ہیں۔“

میں نے طفیل احمد اور مراد حسین کو اپنے پاس

بلالیا۔ چودھری فیضان علی کے دونوں ملازموں نے اجنبی نوجوان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اقرار تو کر لیا تھا لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری اس بے چارے کے ساتھ کیا دشمنی تھی تو مراد حسین نے کہا۔

”ہم تو اس کو جانتے تک نہیں تھے۔ دوستی اور دشمنی کا کیا سوال۔“

”ہم نے یہ کام دولت کے لالچ میں گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا ہے۔“ طفیل نے بتایا۔ ”اس نے ہمیں ایک ہزار روپے دیے تھے۔“

اس زمانے کے ایک ہزار روپے آج کل کے پانچ لاکھ سمجھ لیں۔ بھولا، مراد اور طفیل کے بیانات سے یہی ثابت ہو رہا تھا کہ اس اجنبی نوجوان کا اصل دشمن گوگا پہلوان ہی تھا اور اس نے یہ کام کرائے کے قاتلوں سے کرایا تھا۔ گوگا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا تھا۔

”تم لوگوں نے گوگا سے پوچھا نہیں کہ وہ بندہ ہے کون اور اسے کیوں موت کی نیند سلاتا ہے؟“ میں نے ناپسندیدہ نظر سے باری باری ان کے چہروں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”پوچھا تھا۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا، تم لوگ آم کھاؤ، پیڑ نہیں گنو۔ اگر پیڑ گنتے میں لگ گئے تو پھر تمہارے پیٹ میں پیڑ ہوگی۔“

مراد بولا۔ ”میں نے گوگا سے اس بندے کی نشانی پوچھی تو اس نے مذکورہ بندے کا قد کاٹھ بتانے کے بعد کہا کہ وہ چاچا اسماعیل چائے دالے کے لڑکے بھولا کے ساتھ ڈیرے پر آئے گا۔ بھولا اسے ڈیرے پر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم لوگوں نے اپنا کام کرنا ہے۔ میں نے گوگا سے بندے کا نام بھی پوچھا تھا مگر اس نے بتایا نہیں۔ بس اتنا کہا کہ..... ایک ہزار روپے پر نظر رکھو اور جو کہا جا رہا ہے بس وہی کرو۔“

میں نے دونوں قاتلوں کو حوالات میں بند کر دیا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اسے ایس آئی کا انتظار کرنے لگا جو گوگا پہلوان کو لینے نگر والی گیا ہوا تھا۔ یہ گوگا بہت زیادہ پراسرار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک بار وہ میرے قابو میں آ جاتا تو پھر میں اس کی ساری پراسراریت ناک کے راستے نکال کر رکھ دیتا۔

اگرچہ قاتل میری گرفت میں آ چکے تھے لیکن ابھی تک مقتول کی شناخت نہیں ہو سکی تھی اور پھر دو پہر تک یہ

معاملہ بھی صاف ہو گیا۔ اے ایس آئی مگر والی سے گومگا پہلوان کو گرفتار کر کے لایا تو اس کیس کی گمشدہ کڑیاں آپس میں جڑ گئیں۔

گومگا پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ بھولا، طفیل اور مراد کو تھانے کی حوالات میں دیکھ چکا تھا لہذا اس نے زبان کھولنے ہی میں اپنی عاقبت جانی۔ اس کا حلفیہ بیان سسٹنی خیز اور عبرت انگیز تھا۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

چار سال پہلے جب موسیٰ کوٹ فرمان سے غائب ہوا تو اس کے ٹھیک دس دن کے بعد صدیق پہلوان کی بیٹی اور گومگا پہلوان کی اکلوتی بہن بھی مگر والی سے غائب ہو گئی تھی۔ دونوں گاؤں میں اتنا فاصلہ تھا کہ کوئی ان دونوں کی گمشدگی کو ایک دوسرے کے ساتھ نہیں جوڑ سکا۔ صدیق پہلوان مخائیں کے طعنے برداشت نہ کر سکا اور ایک روز اس نے خیریت میں آکر خود کشی کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد گومگا کی ماں بھی اپنی بیٹی رخسانہ کی جدائی میں آنسو بہا بہا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب گومگا اکیلا رہ گیا تھا۔ ان کی اتنی زمین تھی کہ کسی کی محتاجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلوانی کے ساتھ ساتھ اس نے رخسانہ کی تلاش کا کام بھی جاری رکھا اور بالآخر چار سال بعد وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ موسیٰ کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ آج کل وہ لاہور کے علاقے چمرہ میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے شادی کر لی تھی اور اس دوران میں ان کے دو بچے بھی ہو گئے تھے۔ موسیٰ فرنیچر مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ اس صورت حال میں گومگا نے موسیٰ سے بھیانک انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس کام کے لیے اس نے تین افراد بھولا، طفیل اور مراد کا انتخاب کیا تھا تاکہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ وہ پیسا خرچ کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے موسیٰ کو ایک خط ارسال کیا جو اس کی ماں کرم بی بی کی طرف سے تھا جس میں کرم بی بی نے اپنے ایک خواب کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ اسے موسیٰ کی رخسانہ سے شادی اور دو بچوں کی پیدائش کا علم ہو گیا ہے اور کرم بی بی (گومگا) نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ موسیٰ کے سارے دشمن اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لہذا ایک ماں کی التجا ہے کہ وہ ایک دن کے لیے کوٹ فرمان آکر اسے اپنی شکل دکھا جائے۔

گومگا کو یقین تھا کہ یہ خط ملتے ہی موسیٰ لاہور سے اپنی

ماں کو ملنے کے لیے روانہ ہو جائے گا لیکن اس وقت ساری گڑبڑ ہو گئی جب موسیٰ نے اپنی جگہ اپنے ایک دوست حیدر کو گاؤں جانے کے لیے تیار کیا۔ حیدر اس کے ساتھ ہی فرنیچر کا کام کرتا تھا اور قد و قامت و جسامت میں اسی کے جیسا تھا۔ دراصل موسیٰ حیدر کے ذریعے پہلے کوٹ فرمان کے حالات و واقعات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے حیدر کو ماں کے نام یہ مختصر سا پیغام دے کر کوٹ فرمان روانہ کر دیا۔ ”ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔“

موسیٰ کی احتیاط پسندی اپنی جگہ درست تھی تاہم حیدر کی شامت اعمال یا بدبختی کہہ لیں کہ وہ قربانی کا بکرا ثابت ہوا۔ عین ممکن تھا کہ اگر حیدر کی جگہ موسیٰ خود آتا تو یہ حالات پیش نہ آتے لیکن تقدیر کے سامنے اگر مگر نہیں چلتے۔ نصیب میں جو رقم ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

میں نے گومگا سے پوچھا۔ ”تم انتقام میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ تم نے اپنی اکلوتی بہن اور اس کے دو ننھے منے بچوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا؟“

”کیا رخسانہ نے گھر سے بھاگتے وقت ہمارے بارے میں، گھر کی عزت کے بارے میں کچھ سوچا تھا جو مجھے اس کا احساس ہوتا۔ اس کی بے غیرتی نے میرے ماں باپ کی جان لے لی۔ میں موسیٰ کو موت کے گھاٹ اترا کر رخسانہ کو بے آسرا و بے سہارا چھوڑ دیتا لیکن اس بار بھی اس کج بخت کی قسمت نے ساتھ دیا ہے مگر.....“

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا؟“

”ایک بار میں قانون کی گرفت سے نکل جاؤں تو اس دفعہ میں کسی بھولا، مراد اور طفیل کا سہارا نہیں لوں گا بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے موسیٰ اور اس کے بیوی بچوں کو قتل کے گھاٹ اتاروں گا.....“

گومگا پہلوان کے یہ دھمکی آمیز الفاظ میں نے اس کے بیان میں ریکارڈ کے طور پر شامل کر لیے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

گڑے مردوں کو اکھڑنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ماضی کا ایک سربستہ راز چار سال کے بعد اچانک کھل کر سامنے آ گیا تھا تو مستقبل میں بھی بہت کچھ پیش آ سکتا تھا..... بہت کچھ!

(تحریر: حسام بٹ)

Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

سلیم انور

مسب

وہ ایک ایسا جراح تھا جسے اپنے پیشے سے عشق تھا اور عشق کی خاطر تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بشرطیہ کہ وہ سب کچھ اس کی نظر میں درست ہو۔ لہذا اس نے بھی بلا خوف و خطر وہی کیا جو اس کے پیشے کا تقاضا تھا لیکن کچھ فرائض انسانیت کے ناتے بھی اسے ادا کرنے تھے، سو کیے۔ مگر اس کے نتائج وہ نہ نکلے جو بہت سے لوگ چاہتے تھے۔

بال برابر فرق سے صحیح اور غلط کی پہچان کرنے والے مسیحا کا ماجرا

کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی جب اس نے وہ آواز دوبارہ سنی۔ اس مرتبہ اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے داخلی دروازے پر تین مرتبہ زوردار دستک دی تھی۔ اس کے برابر میں سوئی ہوئی اس کی بیوی مائرا کی آنکھ

بوڑھے ڈاکٹر ویش کو جب پہلی بار وہ آواز سنائی دی تو وہ بھی سمجھا کہ یہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ سوتے میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ چکا تھا اور دوبارہ اس آواز کو سننے کی کوشش میں بیڈ پر تن کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اچانک اس

بھی کھل گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا بازو پکڑ لیا۔
”دستک کا جواب مت دینا، ویلش۔ جو کوئی بھی ہے
شاید پلٹ جائے۔“

اتنے میں باہر بجلی کڑکی اور کیرا چانک نیلی سفید روشنی
میں نہا گیا۔ یہ چمک ایک لمحے کی تھی اور اسی ایک لمحے میں
ڈاکٹر نے اپنی بیوی کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔
اس کا چہرہ زرد، خوف زدہ اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔
”جواب دینا ہوگا، مائرا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شدید
بیمار ہو۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

بادلوں کی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے
ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار دستک دی۔

ڈاکٹر ویلش اکتائے ہوئے انداز میں بیڈ سے نیچے
اترا، پاؤں میں سلپرز پہنے اور گاؤن اٹھالیا۔ اس کی کمر میں
درد ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے کتنی ڈاکٹر کے
بجائے وکیل یا پلمبر بننے کو ترجیح کیوں نہیں دی۔ وہ گاؤن
پہن کر لڑکھڑاتے قدموں سے وینٹک روم سے ہوتا ہوا داخلی
دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

اتنے میں دروازے پر ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار
دستک ہوئی۔

”آل رائٹ، آل رائٹ! میں آ رہا ہوں۔ اپنے منہ
زور گھوڑوں کی لگا میں تھام کر رکھو۔“ اس نے چھوٹے دال
لیمپ کا سوچ آن کرتے ہوئے بلند آواز سے جواب دیا اور
دروازہ کھول دیا۔

باہر زوردار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے زوردار سر
جھکنوں اور اور بارش کے پھیڑوں نے بوڑھے ڈاکٹر کے
چہرے اور بدن پر کچکی سی طاری کر دی۔ وہ آنکھیں
پھاڑے ان دو آدمیوں کو دیکھنے لگا جو دروازے کی دلیز پر
کھڑے تھے۔

”ڈاکٹر ویلش؟“ ان میں سے دروازہ قامت نے کہا
جس کی آنکھیں بے بہرہ و سالک رہی تھیں۔

”میں ہی ہوں۔“ ڈاکٹر نے دروازے کو قدرے
واکرتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہارے لیے چھوٹا سا کام لائے ہیں، ڈاکٹر۔
تمہیں چھوٹی سی سرجری کرنی ہوگی۔“ اسی دروازہ قامت نے کہا۔
”سوری، میں سرجن نہیں ہوں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں،
پیٹ کا درد اور بچوں کے امراض میرا خاصہ ہیں۔ تم لوگوں کو
سرجری کے لیے ڈاکٹر بنجامن کے پاس ناؤن میں جانا
پڑے گا۔ وہ سرجن ہے۔“ ڈاکٹر ویلش نے اپنے خاکسری

بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا۔
”اب تم ہی سرجن ہو، ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش کی نگاہ دروازہ قامت کے ہاتھ میں
دبے ہوئے اعشاریہ تین آنٹھ کے ریوالور پر پڑی جس کی
چمک دار نیلی ٹال ڈاکٹر ویلش کے پیٹ سے صرف چند انچ
کے فاصلے پر تھی اور اس کے دستے پر دروازہ قامت کی گرفت
مضبوط تھی۔ ان دونوں نے ریوالور کے زور پر زبردستی
دروازہ کھلوا لیا۔

”ایک اچھے پیارے ڈاکٹر کی طرح برتاؤ کرو تو تمہیں
کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو ہم تمہیں
ازا کر رکھ دیں گے۔۔۔۔۔ اوکے؟“

ڈاکٹر خاموش رہا۔ پھر وہ دروازہ قامت اپنے پیٹہ قد
ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”فیلکس! جاؤ مریض کو لے آؤ۔“
اس کا ساتھی فیلکس باہر کھڑی کار کی طرف چلا
گیا۔ ڈاکٹر ویلش ہال دے کی مدھم روشنی میں پیچھے آگیا اور
دروازہ قامت کا جائزہ لینے لگا جس کی نگاہیں ایک لمحے کے
لیے بھی اپنے ہاتھ میں تھے ہوئے اعشاریہ تین آنٹھ کے
ریوالور سے نہیں ہٹیں اور وہ ڈاکٹر کی جانب سے قطعی
خاف نہیں تھا۔

وہ پلمبر کیوں نہیں بنا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سوچنے لگا۔ پلمبروں کو
رات کے تین بجے بھی پیٹ میں ریوالور کی ٹال کھبو کر جگانا
نہیں جاتا۔ انہیں پانچوں کے علاوہ کسی اور شے کی فکر لاحق
نہیں ہوتی۔

پھر ڈاکٹر ویلش نے راہداری میں آتے ہوئے فیلکس
اور مریض کی جانب گھوم کر دیکھا۔ فیلکس اپنی سانسیں
درست کرنے کے لیے چند ساعت کے لیے وہاں رک گیا
تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو، مریض کے سینے کے گرد
پیٹ لیے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا
تھا۔ وہ بہ مشکل تمام اس مریض کو جو بظاہر بے ہوش لگ رہا
تھا، گھسیٹا ہوا ہال دے میں لے آیا۔ اس کے پیچھے فرش پر
بچے ہوئے پھول دار قالین پر بارش کے پانی اور خون کے
قطروں کی لکیر جتنی چلی آ رہی تھی۔

دروازہ قامت نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔
اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور بدستور تھاما ہوا تھا اور
اس کی ٹال ڈاکٹر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

”اوکے ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ہمیں سرجری میں لے چلو اور کسی
تسم کی چال بازی مت کرنا۔“
”تم لوگ سزا سے نہیں بچ سکو گے۔“

وہ خواجواد اس منظر میں آن کوئی اور بنانا یا کھیل بگاڑ دیا۔ پھر ڈاکٹر نے لائٹ کا جن دبان دیا۔

”آل رائٹ لیڈی۔ ادھر ڈاکٹر نے پاس چلی جاؤ۔“
دراز قامت نے اپنا ریوالور ابرائے ہوئے کہا۔

تب مارا کی نگاہ دراز قامت کے ہاتھ میں دب ہوئے ریوالور پر پڑی تو اس نے خوف زدہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”کم آن، جلدی کرو۔“

”بہتر ہوگا جیسا یہ کہہ رہے ہیں، وہی کرو مارا۔“

مارا چھوٹے تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی سر میں ہاتھ ڈال کر اسے دگلا سا دیا۔

فیلکس اور اس کا ساتھی اپنے دوست کو جو بدستور بے ہوشی کے عالم میں تھا، گھسیٹتے ہوئے کمرے کے وسط میں موجود فیمل کے پاس لے آئے اور اسے اٹھا کر فیمل پر لٹا دیا۔

”آل رائٹ ڈاکٹر۔ آپ ریٹ کرو۔“

کراچی



میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ”باتیں بہار و خزاں کی...“ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہنامہ پائیز

اپنے باکرے تک کرالیں

”مقلین کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر۔ آگے بڑھو۔“

ڈاکٹر نے قدرے تذبذب کیا پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تو وہ سفید پیش والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے جو گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں ایٹھر کی تیز بو رہی ہوئی تھی۔ اور تب ہی ڈاکٹر کے ذہن میں ایک آئیڈیا ابھرا۔

”کم آن ڈاکٹر..... لائٹ تو جلا لو!“

”مجھے سوچ تو تلاش کرنے دو۔ تم سے ذرا سا صبر بھی نہیں ہو سکتا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر وہ کمرے کے دوسرے سرے پر دیوار گیر الماری نما خانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں پر ایک خانے میں کنسنٹرینڈ امونیا کا جگ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ لائٹ آن کرنے سے قبل اگر وہ جگ اس کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو وہ امونیا ان کے چہروں پر اچھال کر انہیں وقتی طور پر اندھا کر دے گا اور چند سیکنڈ کے لیے ان کا دم گھٹ جائے گا۔ اور ڈاکٹر کو بھی صرف چند سیکنڈ کی مہلت درکار تھی۔

تب وہ ان پر دیر چیزیں پھینکنا شروع کر دے گا۔ کرسی، مزید جگ اور بوتلیں وغیرہ۔ پھر کسی نہ کسی طرح ان کے ریوالور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ انہیں بتا دے گا کہ بوڑھا مونا اور رحم دل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پھر وہ تقریباً دبے پاؤں آہستگی سے چلتا ہوا کیبنٹ تک جا پہنچا۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر جگ کو ٹھولا اور اس کے دستے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کے ڈھکن کو گھما کر کھولنے لگا۔

اچانک کمرے کا سکوت ایک گھٹی گھٹی چیخ نے توڑ دیا۔ وہ تیزی سے گھوم گیا۔ اسے دروازے پر مارا کا ہولا دکھائی دیا۔

”اوئے لیڈی، جہاں ہو وہیں کھڑی رہو۔“ دراز قامت نے کہا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ”کم آن ڈاکٹر..... لائٹ آن کر دو۔“

اب بہادری دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں، ڈاکٹر نے سوچا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مارا کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔ اب اسے وہی کرنا چاہیے جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کی زندگیاں بچ جائیں۔ وہ دل ہی دل میں مارا کو کونسنٹرینڈ

ڈاکٹر ویلش نے ایک نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی۔ مائرا کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹ بھی کھپکھپا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے اس کی کمر چھتپائی اور قدرے ہچکچاتے ہوئے ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔

اس نے ٹیبل پر موجود شخص کا بصری معائنہ کیا اور پھر چند ہی سیکنڈ میں صورت حال بھانپ لی۔

”سنو، لگتا ہے تم لوگوں نے اسے یہاں لانے میں دیر کر دی ہے، لڑکوا تمہارا سا بھی مر چکا ہے۔“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“ دراز قامت نے کہا۔ اس کی سیاہ آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

”تم آپریٹ کرو، ڈاکٹر۔“

”آپریٹ؟ وہ کس لیے؟ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ شخص مر چکا ہے۔“

”جیسا میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ڈاکٹر۔ اسے چیر دو۔“

ڈاکٹر یہ سن کر ابھین میں پڑ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دراز قامت کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کیا یہ لوگ پاگل تو نہیں ہیں؟ ڈاکٹر سوچنے لگا۔

”فیلکس! بہتر ہوگا کہ تم ڈاکٹر کو وضاحت سے سمجھا دو۔“ دراز قامت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اسے بتا دو کہ اسے کیا کرنا ہے۔“

پچھلے قد فیلکس ڈاکٹر کے قریب آ گیا اور اپنا ریوالور اس مردہ شخص کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے کہ ہمارے دوست کے معدے میں کوئی تکلیف ہو رہی تھی، ڈاکٹر۔ اس نے کچھ ہیرے نگل لیے تھے جو اسے نگلنے نہیں چاہیے تھے۔“

ڈاکٹر ویلش اب بھی معاملے کو سمجھ نہیں پایا۔

”وہ سرحد پر واقع دریا پار کر کے پڑوسی ملک جانے کا ارادہ رکھتا تھا..... ان تمام ہیروں کے ساتھ جو اس کے پیٹ میں موجود تھے۔ ہم نے بس ایک گولی اس کی پیٹھ میں اتار دی اور اس سے سچ اگلا لیا۔ اب تم اسے چیر دو، ڈاکٹر۔ وہ ہیرے پلاسٹک کی کونٹنگ میں ہیں۔ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔“

تب اچانک ڈاکٹر ویلش پر پوری بات واضح ہو گئی۔ وہ اس سہ پہر ٹاؤن گیا تھا تو کافی کا ایک کپ پینے کے لیے ریفل شاپ پر رک گیا تھا۔ وہاں اس کا سامنا شریف سے ہوا تھا جو اپنی پسندیدہ ڈش کھانے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس وقت

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

بات ڈاکٹر کے سر پہ سے گزر گئی تھی لیکن اب اسے وہ بات یاد آگئی تھی۔ شریف نے جیولری اسٹور میں ایک بڑی ڈیمینٹی کی واردات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تین افراد تیس لاکھ ڈالر زماہیت کے ہیرے چھین کر لے گئے ہیں۔

تو پھر یہ تینوں وہی ڈاکو ہیں جنہیں پوری ریاست میں تلاش کیا جا رہا ہے، ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔

ڈاکٹر میز کی طرف گھوم گیا اور مردہ شخص پر نظریں جمادیں۔ لگتا ہے کہ اس شخص نے عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے بقیہ دو ساتھیوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ہیروں پر کسی قسم کی پلاسٹک کی کونٹنگ چڑھا دی تھی اور انہیں ایک ایک کر کے نگل لیا تھا۔ اس کا ارادہ تنہا سرحد پار میکسیکو فرار ہونے کا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے ساتھی زیادہ ہوشیار نکلے اور انہوں نے اسے مار ڈالا۔

”او کے ڈاکٹر! ہمارے پاس پوری رات کا وقت نہیں ہے۔ اسے چیر ڈالو!“ دراز قامت گرجا۔

”فرض کرو اگر میں انکار کر دوں تو؟“

”فرض کرو اگر تم انکار کرتے ہو تو.....!“ دراز قامت کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ زہر خندہ منی کے ساتھ اپنا ریوالور مائرا کی سمت لہراتے لگا۔

ڈاکٹر نے اس کا حکم ماننے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس نے ایک ریپک پر سے اپنا سفید لیبارٹری کوٹ اتارا اور اسے پہن کر ٹیبل کے پاس چلا گیا۔ اس نے مردہ شخص کی قمیص اور بنیان کاٹ کر اس کے بدن سے الگ کر دی۔ پھر اس کی پتلون نیچے کھسکا کر اس کے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

وہ دونوں ڈاکو پیچھے کھسک کر دیوار کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ انہیں چیر پھاڑ دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں ربر کے دستانے چڑھا لیے، پھر سٹک کے پاس لگے ہوئے ایک کیبنٹ کے پاس چلا گیا اور ان اوزاروں کو نکالنے لگا جن کی ضرورت اسے پیش آ سکتی تھی۔

لاش کے پاس پلٹ کر اس نے قدرے توقف کیا۔

اشین لیس اسٹیل کا چمک دار تیز دھار نشتر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں گھما کر ان دونوں ڈاکوؤں کی طرف دیکھا جو دیوار کے پاس سائے میں کھڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کو اپنی جانب متوجہ پا کر دراز قامت چیخ پڑا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

لینن کیبنٹ کے برابر میں لگی ہوئی گھڑی کی سوئیاں
دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں..... پانچ..... دس.....
پندرہ منٹ.....

اور پھر ڈاکٹر ویلش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس
کے چہرے پر ایک اطمینان تھا جو اپنا پیشہ ورانہ فرض سمجھتی
سے سرانجام دینے پر کسی بھی ڈاکٹر کو مل سکتا.....
ہے۔ وہ مردہ شخص کا پیٹ چاک کر چکا تھا اور اسے وہ مل گیا
تھا جس کی اسے تلاش تھی۔

”ڈاکٹر! میری انگلیوں میں کھلی ہو رہی ہے۔ ان
قیمتی پتھروں کو نکالنا شروع کرو..... اور جلدی کرو۔“

ڈاکٹر نے چلیوں اور مونچے کی مدد سے گیلے پتھروں
کو باری باری نکالنا شروع کر دیا۔ پھر احتیاط کے ساتھ ان
پتھروں کو ایک بڑے سے گاج کے ٹکڑے پر رکھنے لگا۔

اسے آخری پتھر چننے میں دس منٹ لگ گئے۔ گاج
پر موجود ان پتھروں کی تعداد پندرہ سے بیس کے درمیان
تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی نگاہیں ان پتھروں پر جماتے ہوئے
کہا۔ ”تمام کے تمام بس یہی ہیں۔“

”آل رائٹ ڈاکٹر۔ اب تم ان پر سے پلاسٹک
کوٹنگ علیحدہ کرو۔“ دراز قامت نے کہا۔

ڈاکٹر ایک طویل لمبے تک خاموش کھڑا رہا۔
”کام شروع کرو، ڈاکٹر!“

”اس پلاسٹک کوٹنگ کو اتارنے کے لیے تمہیں ایک
گلا دینے والے محلول کی ضرورت ہے میں اس کا نام لکھ دیتا
ہوں۔ اس سے کوٹنگ اتر جائے گی۔“ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر
قدرے توقف کیا۔ ”لیکن وہ محلول اس وقت میرے پاس
نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

تب ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے
کھراکیں۔ ڈاکٹر نے دراز قامت کے تیور بھانپتے ہوئے
بات آگے بڑھائی۔ ”وہ محلول تمہیں کسی بھی پرچون اسٹور
سے مل جائے گا۔“

”پھر کیا کرنا ہوگا؟“

”ویل، ان ہیروں کو محلول والے پین میں ڈال دینا اور
اس محلول کو پانچ منٹ تک ایلٹے دینا۔ اس طرح پلاسٹک کوٹنگ
علیحدہ ہو جائے گی اور ہیروں کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔“

وہ دونوں افراد نیل پر پڑی اپنے سامنے کی لاش سے
نظریں چار رہے تھے۔ دراز قامت کے ہونٹوں پر ایک
فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے گاج کو دیو بوج کر
اس کا ایک ہنڈل سا بنایا اور اسے اپنے کوٹ کی جیب میں

رکھ لیا۔ پھر بوڑھے ڈاکٹر کی جانب پلٹ گیا۔
”تم نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، ڈاکٹر! اور تم پر یہ
 واضح کرنے کے لیے کہ ہم تمہارے کام کی کتنی ستائش کرتے
ہیں تو یہ لیں.....“

ساتھ ہی اس نے اپنے ریوالور کے دستے سے
اچانک ڈاکٹر کے منہ پر ایک ضرب لگا دی۔ ڈاکٹر چاروں
خانے چت فرش پر گر پڑا۔ ماڑا کے حلق سے ایک پتھر بلند
ہوئی اور وہ اپنے شوہر کی جانب دوڑ پڑی۔

”او کے ڈاکٹر!“ دراز قامت نے اپنے کوٹ کی
ابھری ہوئی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ ”ونڈر
فل سرجن!“

اور پھر وہ دونوں ڈاکٹر قہقہے لگاتے ہوئے کمرے سے
نکل گئے۔

ڈاکٹر ویلش اس وقت تک کچھ نہیں بولا جب تک اس
کے کالوں میں ان ڈاکٹروں کی کار کے اسٹارٹ ہونے اور
کنٹری لین کی پتھریلی سڑک پر دوڑنے کی آواز بتدریج
معدوم نہیں ہو گئی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر اپنی بیوی ماڑا کی طرف دیکھا۔
ماڑا پریشان نظروں سے خون کی اس بوند کو دیکھ رہی تھی جو
ڈاکٹر کے زخمی ہونٹوں سے بہتی ہوئی دھیرے دھیرے اس
کی ٹھوڑی تک آچکی تھی۔ اس کے باوجود ڈاکٹر کے ہونٹوں
پر ایک مسکراہٹ تھی۔

پھر یہ مسکراہٹ ایک قہقہے میں بدل گئی۔

”جانتی ہو، ماڑا۔ میں ان ڈاکٹروں کے چہرے کے
تاثرات اس وقت دیکھنے کا متمنی ہوں جب وہ ان پتھروں
کو ہیرے سمجھ کر غیر قانونی طور پر فروخت کرنے کی کوشش
کریں گے۔ جاؤ شیرف کوفون کرو کہ وہ یہاں آجائے۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ماڑا نے تیزی سے پلکیں

جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

”نیل پر پڑی اس لاش کے پتے میں اتنی تعداد میں
پتھریاں موجود تھیں کہ کسی بھی دریائی کشتی کو لنگر انداز کرنے
کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اصلی ہیروں کی جگہ اس
لاش کے اندر سے پتے کی پتھریاں نکال کر گاج پر اکٹھا
کر دی تھیں۔ ویل، مجھے ایسی نظروں سے مت گھورو۔
شیرف کوفون کرو اور اسے بتادو کہ ڈاکٹروں کے لوٹے ہوئے
تمام کے تمام ہیروں ہمارے پاس موجود ہیں اور پھر چھوٹا
خستہ کیک بھی بنا لو۔ شیرف خستہ کیک کا دیوانہ ہے۔“



محفلِ شعر و سخن

✽ ماریہ چودھری..... پاکپتن
بجھدار ہی کرتے ہیں اکثر غلطیاں و نشیں
کبھی دیکھا ہے کسی پاگل کو عشق کرتے؟

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ہارون آباد
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
ماہوسیوں نے چھین لیے دل کے دلوے
وہ بھی نشاطِ روح کے سماں نہ کر سکے

✽ محمد ابرار حسین سبکی..... جھنگ
منزلیں کسی کے گھر حاضری نہیں دیتیں
راستوں پہ چلنے سے راستے نکلتے ہیں



✽ معاویہ مغل..... ایبٹ آباد
کلیاں چنچ رہی ہیں آج کل
لگتا ہے کھل کر مسکرایا ہوگا وہ

✽ ملائکہ حریم..... اوکاڑہ
اگر ہوتا ہے اتفاق تو، یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
اک نظر ڈال کبھی میرے مسیحا مجھ پر
تیرا کیا جائے گا بیمار کو اچھا کر کے
میں بہت جلد بھنور میں یاد آؤں گا تجھے
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کر کے

✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ
اجالا بن کے آجاؤ مرے تاریک لمحوں میں
کہ ترے بن سبھی خوشیاں مجھے غمگین لگتی ہیں

✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لیہ
اس کے نزدیک غم ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ، جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
وہ سمجھتا ہے مجھے اس سے گلہ کچھ بھی نہیں

✽ اشفاق شاہین..... کراچی
اس کے سوا تو میں دو ٹیل کسی کو نہ دوں
دل تو بہت دور کی بات ہے

✽ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ
ہماری روح پہ جب بھی عذاب اتریں گے
تمہاری یاد کو اس دل کی ڈھال ہونا ہے

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف
ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
اک تیری دید چھین گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

✽ وفا کی آس اسی یار بے وفا سے ہے
بدن ہے راکھ مگر دوستی ہوا سے ہے

✽ احسان سحر..... میانوالی

سرعام محبت کا اعلان کیا ہے
تیرے نام اپنا یہ دیوان کیا ہے
بن سنور کے بڑے اہتمام کے ساتھ
دل نے تیری یاد کو مہمان کیا ہے

✽ معراج محبوب عباسی..... ہری پور، ہزارہ

ضری، وحشی، الہڑ، چنچل، میٹھے لوگ، رسیلے لوگ
ہونٹ ان کے غزلوں کے مصرعے آنکھوں میں افسانے تھے
وحشت کا عنوان ہماری، ان میں سے جو نار ٹھہری
دیکھیں گے لوگ تو کہیں گے، انشاء جی دیوانے تھے

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور

باقی ہے لبو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانیوال

بہت مشکل سے ہوتی ہے تجارت تیری یادوں کی
منافع کم سہی لیکن گزارہ ہو ہی جاتا ہے

✽ ڈاکٹر ظفر اسلام..... مظفر گڑھ

تیری الفت کی راہوں میں لٹا دی زندگی میں نے
دل و جاں سے لوٹنے والے تو کتنا بے وفا نکلا

✽ ایم یوسف..... نور پور

میرے ہاتھ کی لکیروں میں یہ عیب چھپا ہے حسن
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں ہوتا

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

پھر جھیل سی آنکھوں کی پلکوں کو اٹھاتا ہے
ٹھہرے ہوئے پانی میں اک آگ لگاتا ہے
اس پار بھی چاہو تو رہ رہ کے مہک لینا
اب سخن میں پھولوں کی دیوار اٹھاتا ہے

✽ عذرا ہاشمی..... گڑھ موڑ

خود سے فرصت ہی میسر نہیں آئی ورنہ
ہم کسی اور کے ہوتے تو تمہارے ہوتے

✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی

ڈھانچوں کے اک ڈھیر کی گنتی سے کیا فائدہ
کھل ہو رہی ہیں شہر میں مردم شماریاں

✽ اطہر حسین..... کراچی

یہ تو بات الگ ہے پھول اور خوشبو سے بھر جاؤ گے
لیکن اب کے عشق کیا تو جیتے جی مر جاؤ گے
لوگ تو چھپ چھپ کر بیٹھے ہیں روزن و در سب بند کیے
دھڑکن کی آواز کے پیچھے اب کس کے گھر جاؤ گے

✽ احمد جہانزیب..... میانوالی

وہ جو ملزم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حسن سے غداری کا
منصب دار پہ فائز ہو تو کچھ بات بنے
تاج ہم بھی اسے پہنائیں گے سرداری کا

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

یہ کائنات سٹ جائے تو وفا کی قسم
تمہارے نقش کف پا سے کچھ زیادہ نہیں
یہ آسمان و زمیں اوڑھ کر بھی دیکھوں اگر
تو ماں کی گود سے بڑھ کر کوئی لبادہ نہیں

✽ شیخ خرم ریاض..... دہلی چوک، لاہور کینٹ

ہم اہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

✽ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

ان کی فطرت ہے کہ مجھ کو بھول جاتے ہیں مگر
میری عادت ہے کہ ان کو یاد کر لیتا ہوں میں

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال

تم رنگ ہو خوشبو ہو، دھیان سے رہنا
صحرائے محبت کی ہوا تیز بہت ہے

✽ محمود علی..... اسلام آباد

جو کاغذی ہے وہ ہر ناؤ ڈوب جائے گی
تو سطح آب پہ کھل جائے گا بھرم اس کا
جو سر نہیں ہے تو دستار کی ضرورت کیا
سروں کے ساتھ عبارت ہے پیچ و خم اس کا

✽ سید عیادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

کیا دشمنی تھی چاند کو گھر کے چراغ سے
چراغ بجھ گیا تو چاند ندی میں اتر گیا

✽ رضیہ عمیر..... کراچی

شعور و فکر کے ہے میکدوں میں سناٹا
خرد کے نام پہ ذہنوں کا جام خالی ہے

✽ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
ستم گری نگی ابھی تو تمہاری باری ہے
کبھی تو آئے گا تم دیکھنا ہمارا دن
✽ علی مراد.....لاہور

تتلی بن کر اڑنے والا لوٹ کے شاید آئے
گلدانوں میں پھول سجائے خواب اسی کے دیکھوں
✽ اور لیس احمد.....حیدر آباد

ہم نے دیکھا تو افق پر تھا سمندر کا سکوت
ہاں ترے ساتھ جو گزرے تھے نظارے چمکے
✽ عظیم الیاس.....فیصل آباد

پہلے تو وہ کھو جائے گا رسموں کے مگر میں
پھر مگود میں رکھا ہرا سر یاد کرے گا
✽ زرین نیازی.....مظفر آباد

مل جانے کی خواہش بھی پھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجب تھی
✽ محمد جہانگیر.....پشاور

میں اس کا درد کسی کو بھی دوں تو کیسے دوں
وہ زخم میں نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے
✽ منصور اختر.....سیالکوٹ

تنہا چھوڑ کے جانے والا آنچل لوٹ کے آیا تو
ہم نے اس کی یاد میں کیسے وقت گزارا جانے کا
✽ شازیہ کمال.....کراچی

اک میں ہی خاموش رہوں کیا سارے شہر کے بچ
جیسے بلبلیہ جھاگ کا کوئی اونچی لہر کے بچ
✽ محمد رشید.....بہاولپور

اک روز میں بھی کہہ گیا بچوں سے دل کی بات
اب کیا ملے گا ٹوٹے کھلونوں کو جوڑ کر
✽ محمد آریز ملک.....کراچی

یا تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا

✽ وزیر محمد خان.....پہل ہزارہ
آئی نہ رات بھر کوئی پتکھٹ پہ سانولی
پانی میں چھپ چکے بیٹھا رہا بے قرار چاند
✽ یوسف رضا کاظمی.....لیہ

کھیتوں میں پھر سے سوسوں کی رت آگئی
دیکھے ہوئے تمہیں آج اک سال ہو گیا
✽ مدحت.....کراچی

دل کو غم حیات سے ابھی نجات نہیں
نگاہ یار سے کہہ دو کہ انتظار کرے
✽ اظہر حسین پچار.....ہزاری، جتوئی

پھر یوں ہوا کہ جب بھی ضرورت پڑی مجھے
ہر شخص اتفاق سے مجبور ہو گیا
✽ سید عرفان شاہ، عمران عارف.....فیصل آباد

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے منن نشیلے تھے
✽ بلقیس خان.....واہ کینٹ

یہ سال بھی پچھلے کئی برسوں کی طرح ہے
اس سال بھی ہر سانس گراں بار بہت ہے
✽ انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی.....گلبرگ، لاہور

قید میں گزری ہے جو عمر بڑے کام کی تھی
کیا میں کرتا کہ زنجیر میرے نام کی تھی
✽ مرزا گل، رمن گل.....ڈیرہ اسماعیل خان

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
✽ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
✽ مشال اینڈ نوال.....جہلم

اس شہر کے انداز عجب دیکھے ہیں یارو
گوگنوں سے کہا جاتا ہے بہروں کو پکارو

مخفہ شعرو سحر

کوین

برائے
شمارہ

مئی

2016

نام:

پتا:



استحقاق

ڈاکٹر شیر شاہ سید

بعض اوقات انسان کتنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔ تمام عمر مخالف سمت چلتا ہے اور درست سمت میں منزل چاہتا ہے مگر... اس شخص کو سمتوں کا ادراک تھا اور سفر کرنے کا ہنر بھی آتا تھا جب ہی تو راستوں کی کٹھنائیوں میں ثابت قدم رہنے کے تمام تر تقاضوں سے واقف تھا... بس یہی ایک احساس اسے زندگی و موت کی کشمکش میں بھی رعنائیوں کی جانب نہ دھکیل سکا اور بالآخر پُر خار سفر اس کا مقدر تھرا۔

پل صراطِ لمحات کو عبور کرنے کی تکالیف کا ادراک

کینسر ہو گیا تھا ان کو۔ پچھپھڑوں کا کینسر۔ بائیوپسی کے بعد پیتھالوجسٹ نے یہی رپورٹ دی تھی۔ رپورٹ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اہل خانہ کو اب بتانا ہوگا اور بہتر ہے کہ میں ہی بتاؤں۔ گزشتہ تین چار دنوں میں ان سے اور ان کی بیوی، بیٹی سے باتیں ہوتی رہی تھیں پھر پتا چلا کہ وہ عامر کے والد ہیں۔ عامر میرے ساتھ ہی تھا کالج

میں۔ ہم دونوں نے ساتھ ایم بی بی ایس کیا، میں ڈاکٹر بن کر لندن چلا گیا جبکہ عامر امریکا کا امتحان پاس کر کے وہاں چلا گیا تھا۔ پھر کچھ پتا نہیں چلا۔ تین سو کی کلاس میں کون کہاں جاتا ہے، کسے پتا لگتا ہے۔

وہ اپنی بیٹی کے ساتھ میرے کلینک میں آئے تھے۔ کئی دنوں سے انہیں کھانسی تھی اور اب تو بلغم کے ساتھ خون بھی آجاتا تھا کبھی کبھی۔ پہلے تو انہوں نے کسی کو بتایا بھی نہیں مگر جب ایک دن کھانسی کھانسی کے بے حال ہو گئے تو ان کی بیوی نے بیٹی کو فون کر کے بتایا جو دوسرے دن انہیں لے کر میرے پاس آگئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ انہیں ٹی بی ہو گئی ہے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال بھی ٹی بی کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ دبیلے پتلے، سادے سے آدمی تھے۔ گہرا سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سر پر گھنے سفید بال۔ ان کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں اور ہونٹ تھے۔ دور سے ہی نظر میں جیسے چمٹ جاتی تھیں۔ وہ خاکی رنگ کی پینٹ اور سفید قمیض پہنے ہوئے تھے۔ پینٹ اور قمیض دونوں گھبرائی دھلی ہوئی تھیں اور کسی نے گھر میں ہی استری کی تھی۔ بکلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھے لگے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اچھے لگتے ہیں یا پھر ان سے نفرت ہی ہو جاتی ہے۔ ان میں کوئی خاص کشش تھی کہ وہ مجھے متاثر کر گئے تھے۔

تفصیل سے ہسٹری لینے اور معائنے کے بعد میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی کہ شاید انہیں کچھ خطرناک بیماری ہے۔ شاید کینسر۔ میں نے ان کی گھبرائی ہوئی بیٹی کی طرف دیکھا، پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ داخلہ، بلغم، خون کا ٹیسٹ، بروٹکوا سکوپ، ایکس رے، سی ٹی اسکین، ایم آر آئی، آپریشن، کیوتھراپی۔ یہ تو بڑا خرچ ہو جائے گا۔ کیسے کریں گے یہ لوگ۔ بچہ کی آمدنی دلتی ہی کتنی ہے۔

وہ لائڈھی میں رہتے تھے اور ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ تین سال ہوئے وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر ایک ٹیوشن سینٹر کھول لیا تھا انہوں نے۔

میں نے انہیں کاؤچ پر لیٹے رہنے کو کہا اور ان کی بیٹی صائمہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ ”انہیں داخلہ

کرنا پڑے گا۔ کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے پھر فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے نا۔ ابو ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے بہت پریشانی سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”نہیں، ٹھیک نہیں ہیں۔“ میں کبھی بھی مریضوں سے ان کی تشفی اور ان کی حالت چھپاتا نہیں ہوں۔ خاص طور پر مریضوں کے رشتے داروں سے۔ یہ بہتر ہے کہ مریض کے رشتے داروں کو پتا ہو کہ مریض کو کیا مرض ہے اور اس سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ مریض کو بھی اندازہ ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اگر مریض کو کینسر وغیرہ ہو تو مریض کو یہ بتانا چاہیے کہ زندگی کتنی باقی ہے۔ مریض پریشان ضرور ہوتے ہیں، ڈپریشن ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ڈاکٹر پر ناراض ہونا شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ بہت کم وقت کے لیے ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ اپنے آپ میں واپس آ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی کو پلان کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

”کیا ہوا ڈاکٹر صاحب! نہیں..... خدا نخواستہ، علاج تو ہو سکے گا نا؟“ اس نے روپائی آواز میں پوچھا تھا۔ ”ٹھیک ہو جائیں گے نا۔؟“ اس کی آواز میں پریشانی بھری ہوئی تھی۔

”دیکھیں ایسا ہے کہ ابھی داخلہ ہوگا پھر کچھ ٹیسٹ کرائیں گے ہم لوگ۔ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ صحیح نکل آئے مگر شاید کوئی خطرناک بات بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

اسی وقت صائمہ نے مجھے بتایا کہ اس کا بھائی بھی ڈاکٹر ہے اور سندھ میڈیکل کالج سے پڑھ کر ڈاکٹر بنا ہے۔ نام سنتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عامر کی بات ہو رہی ہے۔ ”ارے، وہ تو میری کلاس میں تھا بلکہ میرا دوست تھا، اچھا دوست لیکن ایسے بچہ مرے ہم لوگ کہ پھر کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہاں ہے وہ؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”وہ تو امریکا میں ہیں۔“ اس کی آواز کی اداسی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے امریکا میں ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی اور سلسلہ بھی ہے۔

پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”ابو کو مت بتائیے گا ڈاکٹر

سنہری باتیں

☆ جب عقل پختہ ہو جاتی ہے تو گفتگو کم ہو جاتی ہے۔

☆ انسان سمندر میں ڈوب کر بچ سکتا ہے لیکن آنسوؤں میں ڈوب کر نہیں۔

☆ جسے ہارنے کا خوف ہوتا ہے، وہ ضرور ہارتا ہے۔

☆ خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔

☆ شیریں کلام اور خوش خلق کے ساتھ محبت واجب ہو جاتی ہے۔

☆ اسلام کے نقش قدم پر چلو کیونکہ اسلام کا دامن حکمت و دانائی کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆ ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں باعث دولت اور آخرت میں باعث نجات ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

مشعل راہ

اے ابن آدم جب تو دیکھے تیرا پروردگار تجھے پے در پے نعمتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا کیونکہ درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو سزا دینے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔ خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو جائے بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہاری بردباری کی صفت بڑی ہو جائے اور اپنے رب کی عبادت میں تم لوگوں سے آگے نکل جاؤ۔

اے ابن آدم تو آج کے دن کی فکر کر اور آئندہ کی فکر طاری نہ کر..... جلدی کرنے کی ضرورت نہیں اگر کل تجھے موت نہیں آئی تو کل کی روزی تیرے پاس خود ہی آجائے گی اور اچھی طرح سمجھ لے کہ تو اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا کما رہا ہے وہ دوسروں کے لیے جمع کر رہا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ہلال بزارہ

صاحب کہ میں نے آپ کو عام بھائی کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ نام نہیں سننا چاہتے اب بھائی کا۔ انہوں نے عاق کر دیا ہے ان کو۔ بس آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں جا کر بتاتی ہوں انہیں کہ داخل کرنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں سوچتا رہا کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا باپ، بیٹے کے درمیان۔ عاق وغیرہ تو بڑے انتہائی اقدامات ہوتے ہیں۔

میں نے انہیں وارڈ کے سائڈ والے کمرے میں داخل کر لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ باتھ روم کے ساتھ تھا۔ عام طور پر ہم لوگ ڈاکٹروں کے جاننے والے مریضوں کو اسی کمرے میں داخل کرتے تھے۔ جنرل وارڈ اور جنرل وارڈ کے نوٹس کا تو برا حال تھا۔ سرکاری اسپتالوں کا جو حشر ہے ویسا ہی حشر ہمارے وارڈ کا بھی تھا۔ میں نے خود ان کے داخلے کا فارم بھرا اور ڈاکٹر شازیہ سے کہا کہ انہیں داخل کر کے جوئیٹ لکھے ہیں ان کے کرانے کا انتظام کرے۔

عام طور پر شام کو میں اسپتال نہیں جاتا ہوں۔ ویسے بھی سرکاری اسپتالوں میں سینئر ڈاکٹر کہاں جاتے ہیں۔ بارہ ایک بجے کے بعد، صرف جو نیئر ڈاکٹر ہوتے ہیں اور ان کی مرضی سے اسپتال چلتا ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں نہ جانے کیسے ایک ضروری خط بھول کر آ گیا تھا۔ اپنے پرائیویٹ کلینک جانے سے پہلے شام تقریباً پانچ بجے میں نے سوچا کہ اپنے وارڈ سے وہ خط لیتا چلوں۔ وارڈ کے باہر میں بے شمار لوگوں کو کھڑا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عام طور پر مریضوں سے ملنے کے وقت پر جمع تو ہوتا ہے لیکن اتنے زیادہ لوگ میں نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ اپنے کمرے سے خط لے کر میں نرسوں کے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر شازیہ مل گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سارے لوگ میرے مریض سے ملنے آئے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے آج ایک مریض داخل کیا ہے۔ میں بھی انہیں دیکھنے چلا گیا۔

ان کا کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ صائمہ اور اس کی ماں وہاں موجود تھیں اور مجھے دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ میں نے خیریت پوچھی تو ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! خیریت کہاں ہے، سارے اسٹوڈنٹ مجھے دیکھنے آئے ہیں جیسے میں مرنے والا ہوں۔ آپ بتا دیں

ڈاکٹر صاحب کہ سب خیر ہے تاکہ مزید نہ آئیں اور دودن میں تو میں ویسے ہی گھر چلا جاؤں گا۔“

میں نے سوچا کہ ماسٹر صاحب بھی غضب کے ماسٹر ہوں گے۔ داخلے کے چھ سات گھنٹوں کے اندر اتنے لوگ ملنے چلے آئیں، ایسا تو میں نے کم ہی ہوتے دیکھا ہے۔ میں مسکرا دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔ شاز یہ کو میں نے ہدایت دی کہ ماسٹر صاحب کو کھانسی کے لیے دوا دے کر رات کو سلا دے۔ کل میں بروکھو اسکول کی کا انتظام کروں گا پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

میرے خدشات صحیح نکلے، ابتدائی رپورٹ سے ہی پتا لگ گیا کہ انہیں بروکھو جے تک کاری نوما ہے۔ یہ پھیپھڑے کا کینسر ہوتا ہے جو عام طور پر سگریٹ پینے والوں کو ہوتا ہے۔ مستقل دھواں جو سانسوں سے پھیپھڑوں میں جاتا ہے پھر پھیپھڑوں میں آہستہ آہستہ کینسر کو جنم دیتا ہے۔ کراچی میں تو کینسر کے لیے سگریٹ ضروری نہیں ہے کیونکہ شہر میں ٹریفک کا دھواں اتنا کثیر ہے کہ سگریٹ پیے بغیر بھی پھیپھڑوں کا کینسر ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کراچی کے اسپتالوں میں پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ماسٹر صاحب نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ پان کھاتے تھے۔ صرف چائے پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ سادہ سی زندگی تھی ان کی۔ تمام عرصہ صبح سے شام تک اسکول میں پڑھایا تھا انہوں نے۔ جب تک اسکول میں پڑھاتے رہے نہ کوئی ٹیوشن سینٹر کھولا اور نہ ہی پیسے لے کر ٹیوشن پڑھائی۔ اسکول میں گھر میں جب بھی کوئی طالب علم کچھ پوچھنے آ گیا پڑھا دیا۔ یہی زندگی تھی ان کی۔ آج کل ایسے پھر کہاں ملتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہوئے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنایا تھا انہوں نے اور تین بیٹیوں کی شادیاں عزت سے کر دی تھیں۔ اب سلیقہ مند بیوی کے ساتھ سلیقے سے اپنے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی غصہ تھا نہ ملال۔ ایک قسم کا سکون تھا ان کی شخصیت میں۔ میں سوچتا رہا، کھوجتا رہا، بوجھتا رہا کہ غربت کے باوجود بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ کیا بغیر جھکے بھی کھڑا رہ سکتا ہے۔

ماسٹر صاحب کی تین بیٹیوں اور داماد سے بات کرنے کے بعد میں نے انہیں تفصیل سے بتا دیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ ان کا سینہ کھولا جائے گا۔ پھیپھڑوں کے کینسر

زدہ حصوں کو نکالا جائے گا، پھر بجلی بھی لگے گی اور دوائیں بھی دی جائیں گی۔ کیونچہ راپی ہوگی ان کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کینسر کے خلاف دوا دی جائیں گی جن کا اپنا بھی ری ایکشن ہوتا ہے اور یہ دوائیں تھوڑی مہنگی بھی ہیں۔“ دیکھتے ہیں کچھ کریں گے آپریشن کے بعد۔“ میں نے انہیں تسلی دی تھی۔

ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا، پریشانی کی ایک لہر پھر وہ رک کر بولے تھے۔“ ڈاکٹر صاحب! جو بھی علاج ہے وہ تو کرانا ہی ہوگا مگر یہ بتائیں کہ زندگی کی کتنی امید ہے۔ ایک خواہش تھی کہ بیوی کے ساتھ حج کر لوں۔ اس نیک بخت نے زندگی میں کوئی بھی خواہش نہیں کی مجھ سے۔ غربت میں، مجبوری میں، جیسی زندگی گزرتی رہی وہ بھی گزارتی رہی۔ ہر بات مانی ہے اس نے، ہر فیصلہ قبول کیا ہے میرا..... کیا حج ہو جاؤں گا؟ حج کر لوں گا؟ بچیوں سے فارغ ہو کر ہوائی جہاز کا کرایہ جمع کر لیا ہے میں نے۔ بس اس سال نیت تھی میری حج پہ جانے کی کہ اب بیمار پڑ گیا، وہ بھی کینسر۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

دل میں آیا کہ میں عامر کے بارے میں پوچھ لوں، امریکا میں رہنے والے ڈاکٹر کے ماں باپ کے لیے حج و عمرہ کوئی مسئلہ تھوڑی ہے۔ ایک ہفتے سے بھی کم تنخواہ میں یہ سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ایسی کون سی بڑی بات تھی مگر میں خاموش رہا، صائمہ نے منع کیا تھا۔ صائمہ نے بتایا تھا کہ بھائی کو عاق کے اب گیارہ سال ہو گئے ہیں، کسی سے بھی تعلق نہیں ان کا۔ امریکا سے پانچ سال کے بعد آئے تھے تو جیسے گھر میں بیمار آ گئی تھی۔ ابو نے ان کے سامنے ہی آپ کی شادی کی تھی اور بھائی سے کہا تھا کہ اگلے دو سال کے بعد....

جب باجی کی شادی ہوگی تو اس کی بھی شادی کریں گے پھر دو سال کے بعد بھائی پھر آئے۔ باجی کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد بھائی نے کہہ دیا کہ وہ کسی امریکن لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ابو کے لیے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عامر کو واپس آ جانا چاہیے، کراچی میں رہنا چاہیے، اس ملک میں جہاں اس کے باپ نے ماں نے زندگی گزاری ہے۔ اس کی مٹی سے جھکے چن کر گھر بنایا ہے۔ بچوں کو پڑھایا ہے۔ اس ملک نے اس قابل کیا

کہ امریکا جا کر امتحان پاس کرے، قابل بنے، پیسے کمائے اور اب اس قابل ہو گئے کہ کچھ کر سکتو کہتے ہو کہ امریکی لڑکی سے شادی کرو گے یعنی اب امریکا میں ہی رہو گے۔ یہ مجھے قبول نہیں ہے۔ مجھے ایسی زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں ہے جس میں میں اپنے پوتوں کے لیے بے قرار رہوں، جو تمہارے بیٹے مگر میرے پوتے بھی ہوں گے۔ میری نسل، میرے باپ دادا اور پرکھوں کی نسل۔ میرا تشخص اسلام ہے، میں پاکستانی ہوں۔ تمہاری بیوی کرپین ہوگی، امریکن ہوگی۔ اس بے چاری کا کیا قصور۔ وہ تو وہی کرے گی جو کرنا چاہیے اسے۔

انہوں نے عامر کو سمجھایا۔ مجھے امریکی لڑکی سے کوئی بیر نہیں ہے، نہ اس پر میرا زور ہے، میرا تو تم پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو کسی پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو صرف اپنے پر زور ہے بیٹے۔ میں سمجھوں گا تمہاری موت ہوگئی، کسی ایکسیڈنٹ میں، کسی حادثے کا شکار ہو گئے تم۔ لوگ تو مرتے ہی ہیں، یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہوگی۔ میں سمجھوں گا تم مر گئے۔ ایک دفعہ ہی مرد گئے نا۔۔۔ میں روز روز نہیں مرنا چاہتا۔ واپس چلے جاؤ پھر نہ ملنا مجھ سے۔ جہاں رہو خوش رہو۔ مردے کے لیے تو دعا ہی کرتا ہے آدمی، دعا ہی کریں گے ہم۔ بھائی پھر نہیں آیا۔ ابو نے ایسا ہی کیا جیسا کہا تھا انہوں نے۔ شروع شروع میں بھائی خط بھی لکھتا رہا فون پر بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر ابو نے اسے بھلا دیا، جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ہم بھی ان کے سامنے کچھ نہیں بولتے ہیں بھائی کے بارے میں اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی سے تعلق بھی نہیں ہے ان کا۔

میں نے صائمہ کو بتایا کہ ابھی جج میں آٹھ مہینے باقی ہیں مجھے پتا نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ ٹیوٹر کتنا بڑا ہے، علاج کے قابل بھی ہے کہ نہیں۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ ماسٹر صاحب اچھے ہو جائیں اور اگر جج کر سکیں تو بہت ہی اچھا ہے مگر مجھے لگتا ہے شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔

صائمہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان کیا سوچتا ہے اور کیا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ عامر بڑا اچھا دوست تھا میرا۔ بہت اچھی طرح زندگی گزار رہی تھی اس نے کالج میں، سلجھا ہوا بندہ تھا وہ۔ پھر کیوں کیا اس نے ایسا؟ بہت کچھ چھوڑ دیا۔ گھر، ماں، باپ، بہنیں، لائڈھی، کراچی، پاکستان۔ زندگی میں

انسان کو انتخاب کرنا پڑتا ہے، فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ پیار، محبت، وفا، وعدے، زندگی گزارنا کسی ایسے کے ساتھ جس سے ذہن بھی ملا ہو، یہ ضروری ہے لیکن ہمارے سماج کے اپنے بھی تو کچھ اصول ہیں۔ صدیوں کے بنے ہوئے رشتے ہیں اور ان کے اپنے مطالبے ہیں۔ میں شاید وہ نہیں کرتا جو عامر نے کیا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں کوئی فیصلہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور میں فیصلہ کرنے والا تھا بھی کون مگر سوچنے پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ذہن جلتا رہا، سوچتا رہا اور خود ہی سمجھتا رہا۔

ماسٹر صاحب سے ملنے کے لیے آنے والے بہت سے لوگ مجھ سے بھی ملتے۔ بہت سے لوگوں کا فون آتا، ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے بڑی محنت، ایمانداری سے بچوں کو اسکول میں پڑھایا تھا۔ ایک تعلق، رشتہ تھا ان کا اپنے طالب علموں کے ساتھ جس کی بنیاد سادگی اور ایمانداری پر تھی۔ بہت محبت کرنے والے استاد رہے ہوں گے وہ، تبھی تو لوگوں کا تعلق ہے کہ ٹوٹا ہی نہیں ہے۔

جس دن ان کا آپریشن تھا اس دن مجھے پتا چلا کہ لائڈھی کے اس اسکول میں صبح اسمبلی کے بعد ان کے لیے دعا کی گئی ہے اور آپریشن تھیر کے باہر اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ٹیچروں اور اسکول کے بچوں کی ایک فوج بھی کھڑی تھی۔

صائمہ نے مجھے بتایا کہ آپریشن کی رات کو انہوں نے اپنے بڑے داماد کو بلا کر کہا کہ وہ اب بچ نہیں سکیں گے کیونکہ آپریشن ٹیوٹر کو پیچھڑوں سے نکالے گا مگر جسم کے دوسرے حصوں سے نہیں نکال سکے گا، زندگی شاید تھوڑی بڑھ جائے مگر بچ نہیں سکے گی۔ انہوں نے جمع کیے ہوئے ایک لاکھ انہتر ہزار دو سو تالیس روپے کا ایک چیک بھی انہیں دیا اور کہا کہ بیٹے میں مروں کہ جیوں، مگر تمہیں اس رقم سے اپنی ساس کو ج ضرور کرانا ہے۔ میرا اب کچھ نہیں ہو سکے گا، وہ جج کر لے گی تو میں سمجھوں گا میرا بھی جج ہو گیا۔ جتنی محبت اس نے ساری زندگی مجھ سے، میرے بچوں سے کی ہے اس کا بدل تو کوئی نہیں ہے لیکن اس کے دل کی یہ آرزو کہ وہ جج کر لے، اگر پوری ہوگئی تو میں سکون سے مر سکوں گا اور اگر میں مر گیا تو اس کے جج کی خبر ہی میرے لیے جنت ہوگی۔

میرے دل میں نہ جانے کیا کیا خیال آئے۔ میں نے سوچا کہ شاید زندگی میں کبھی انہوں نے ملحدستہ بھی نہیں بھیجا ہوگا اپنی بیوی کو، کوئی کارڈ نہیں لکھا ہوگا اور شاید منہ سے ایک بار اپنی محبت کا اقرار بھی نہیں کیا ہو۔ شاید انہیں پتا بھی نہ ہو کہ ان کی سالگرہ کا کون سا دن ہے؟ کس رنگ کا جوڑا دینا چاہیے؟ کیسا کیک ہونا چاہیے؟ اور شاید ان کی بیوی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہوگی لیکن آج کا کوئی پیمانہ اس محبت، الفت کی اتھاہ گہرائیوں کو ناپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ محبت جو بڑی خاموش ہوتی ہے، چھپی ہوئی، سادہ، صرف گرم احساس لیے ہوئے۔

آپریشن تو ہو گیا اور پچھپھڑوں سے نیو مر جتنا ممکن تھا، نکال بھی دیا گیا اور ساتھ ہی فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اب کیمو تھراپی کی ضرورت ہے۔ تین مختلف دواؤں کو مشترکہ طور پر دینا تھا۔ کم از کم سات دفعہ اور ہر دفعہ کی ڈوز کی قیمت تقریباً پینتیس ہزار روپے تھی۔ سرکاری اسپتال میں آپریشن تو تقریباً مفت میں ہو گیا مگر کیمو تھراپی کے لیے حکومت کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ مرینس کو خود ہی دینا پڑتے ہیں یا پھر خیرات زکوٰۃ کے پیسوں سے ممکن تھا۔ میں نے شازیہ سے کہا کہ زکوٰۃ کے فارم وغیرہ بھر لیں کیونکہ ان کے مالی حالات تو ایسے نہیں تھے کہ وہ خود اتنا مہنگا علاج کرا سکتے۔ بیٹیاں شاید مل کر پیسے جمع کر لیں مگر یہ بھی ایک طرح سے بوجھ ہوگا اور پھر زکوٰۃ کے فنڈ میں رقم موجود تھی۔ فارم کے بعد میں خود پیروی کروں گا اور دواؤں کا انتظام ہو جائے گا۔

دوسرے دن شازیہ نے بتایا کہ انہوں نے زکوٰۃ کے استحقاق کے فارم پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ساتھ ہی بیٹیوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ کیمو تھراپی کے لیے پیسے نہ جمع کریں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر صاحب نے معاملے کو خواجواہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ان کے دستخط کے بعد بہت آسانی کے ساتھ ان کا علاج شروع ہو سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی ان سے بات کر لیتا ہوں۔

اس دن وہ مجھے ذرا کمزور سے لگے تھے۔ آپریشن کے بعد ایسا لگتا ہے۔ صائم نے کرا بہت صاف ستھرا کیا تھا۔ وہ صاف ستھرے دو تین تکیوں سے ٹیک لگا کر لیٹے

ہوئے تھے۔ چہرا کمزور اور نڈھال سا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی محسوس کی تھی میں نے۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر آہستہ سے انہوں نے شکر یہ ادا کیا تھا میرا۔

”شکریہ، ڈاکٹر صاحب! بہت خیال رکھا ہے آپ نے۔ خدا خوش اور زندہ رکھے آپ کو کہ آپ علاج کرتے رہیں ہم جیسے لوگوں کا۔ زندگیاں بانٹتے رہیں اسی طرح، خوش رہو ہمیشہ خوش رہو بیٹے۔“

”لیکن آپ علاج کرنے کہاں دے رہے ہیں۔“ میں نے فوراً ہی جواب اس طرح سے دیا کہ گنگو جندی آگے بڑھ سکے۔ ”میرا مطلب ہے کہ آپ استحقاق کے فارم پہ دستخط کر دیں کیونکہ استحقاق تو بنتا ہے آپ کا۔ اس کے بعد ہم لوگ دوا منگوا کر فوراً ہی علاج شروع کر دیں گے۔ آج کل بہت اچھی دوائیں آئی ہوئی ہیں اور سارے کینسر کے مریضوں کا علاج ہو رہا ہے۔ تھوڑا ری ایکشن ضرور ہوتا ہے۔ بال گر جاتے ہیں الٹی ہوتی ہے مگر زندگی مل جاتی ہے تھوڑی سی اور۔ بس اب آپ دستخط کر دیں تاکہ میں دوائیں منگوا سکوں۔“

وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ ”استحقاق تو بنتا ہے بیٹے، تم صحیح کہہ رہے ہو۔ غریب آدمی ہوں میں..... اتنا مہنگا علاج نہیں کرا سکتا۔ علاج تو زکوٰۃ سے ہی ہو سکے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ خاموش سے ہو گئے پھر آہستہ سے گلا کھنکھار کے انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”مگر بیٹے یہ جن لوگوں نے زکوٰۃ نکالی ہے اپنی آمدنی، اپنے منافع سے انہوں نے کوئی فارم بھرا ہے کہ جس آمدنی اور نفع پر یہ زکوٰۃ نکالی گئی، وہ آمدنی، وہ نفع کسی لوٹ مار، اسمگلنگ، بے ایمانی، بلیک مارکیٹنگ، رشوت دہاندگی سے حاصل نہیں کی گئی ہے۔ کوئی فارم بھرا ہے انہوں نے زکوٰۃ دینے سے پہلے کہ کسی اور کے استحقاق کو پامال نہیں کیا ہے ان لوگوں نے؟“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور پھر انہوں نے آہستہ آہستہ رک رک کے کہا۔ ”بغیر اس فارم کے یہ فارم تو بے معنی ہے۔“

اور اتنی گہری سوچ پر میں صرف انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

س



بچے برائے فروخت

منظر امّا

کبھی کبھی مجبوری میں انسان کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھاتا ہے جس کا مقصد ناقابل برداشت دکھ سے چھٹکارا پانا یا لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوتا ہے مگر بدنیت انسان ان ہمدردیوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں... وہ بیوپاری بھی اپنے جگر گوشوں کو غیروں کی آغوش میں دے کر مطمئن تھا کہ لوٹ کر تو اسی کے آنگن میں یہ کبوتر اتریں گے۔

رشتوں کی تجارت اور..... نرم فطرت لوگوں کے مابین عجب تماشا

دفتر جا کر وہ مصروفیات میں انہیں بھول گیا تھا مگر جب واپسی میں اس نے پھر اس شخص کو اسی جگہ ان ہی بچوں کے ساتھ دیکھا تو گاڑی روک کر ان کے پاس آگیا۔ ”بھائی صاحب! کیا آپ صبح سے یہیں کھڑے

وہ ایک درد بھرا دل رکھنے والا انسان تھا۔ دفتر جاتے ہوئے اس نے پریس کلب کے سامنے ایک معقول صورت شخص کو دیکھا جو دو عدد بچوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بچے نو دس برس سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔

ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں بھائی!“ اس آدمی نے ایک گہری سانس لی۔
 ”کئی گھنٹے ہو گئے ہیں کھڑے ہوئے۔“
 ”لیکن کیوں؟“

”تو کیا کروں..... کوئی مناسب خریدار ہی نہیں ملا۔“ اس نے بتایا۔

”کس چیز کا خریدار؟“ انور نے حیرت سے پوچھا۔

”ان دونوں بچوں کا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں انہیں بیچنے نکلا ہوں۔“ پھر اس نے ایک بچے کی طرف دیکھا۔
 ”بابی! انکل کو اپنے دانت دکھاؤ۔“

بابی نامی اس بچے نے انور کو اپنے صاف سحرے دانت دکھا دیے۔ پھر اس نے دوسرے سے کہا۔ ”ٹوٹی! انکل کو اپنے ناخن... چیک کراؤ۔“

”جناب! آپ کے بچے بالکل صاف سحرے ہیں۔“ انور جلدی سے بولا۔ ”لیکن آپ انہیں کیوں بیچ رہے ہیں؟“

”اور کیا کروں جناب..... کون اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے اپنے بچے بیچتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بچے کھانے تک کو ترس کر رہ گئے ہیں۔ اب میرے پاس دو ہی طریقے ہیں..... یا تو ان کو زبردستی کر مار دوں یا پھر ان کو بیچ دوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، کیا دام لگایا ہے؟“
 ”یہ بڑا والا ہے بابی، پچیس ہزار کا۔“ اس نے بتایا۔ ”بابی انکل کو وہ انگلش کی لقمہ سناؤ۔“

بابی نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ انور جلدی سے بولا۔ ”او کے او کے..... میں سمجھ گیا۔ پڑھے لکھے بچے ہیں اور یہ چھوٹا والا۔ یہ کتنے ملے دے رہے ہیں؟“

”اس کا نام ٹوٹی ہے اور یہ بیس ہزار کا ہے۔“
 ”اگر کسی ایک کو لینا چاہوں تو؟“

”نہیں جناب! لینا ہے تو۔ جوڑی لینی ہوگی۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”ان دونوں میں بہت محبت ہے۔ یہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

انور کو خود بچوں کی ضرورت تھی۔ گھر میں دو ہی افراد تھے۔ انور اور اس کی بیوی اسما۔ شادی کو پانچ برس گزر چکے تھے لیکن اولاد کے آثار نہیں پیدا ہو سکے تھے۔ اسما نے بچوں کی بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ محلے کے

بچوں کو پکڑ کر لے آتی اور دن بھر ان کے ساتھ لگی رہتی۔ انور اس سے کہا کرتا تھا۔ ”خدا کی بندی، بچوں سے اتنی محبت نہ کیا کر۔ ورنہ لوگ تجھے بچے اغوا کرنے والے گروہ کی ممبر سمجھنے لگیں گے۔“

”تو کیا کروں، بغیر بچوں کے رہ بھی تو نہیں سکتی۔“
 ایک دن وہ انور کو ایک پیر صاحب کے پاس پکڑ کر لے گئی۔ پیر صاحب نے پانچ سو لینے کے بعد کہا۔ ”ایسا کرو، جو شانہ پیا کرو۔“

”جو شانہ..... لیکن وہ تو نزلہ بخار کے لیے ہوتا ہے۔“

”یہ بتاؤ دونوں میں سے پیر کون ہے..... میں یا تم؟“

”ظاہر ہے کہ آپ ہی ہیں۔“
 ”تو پھر میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“ پیر صاحب نے کہا۔ ”کم از کم پندرہ گلاس روزانہ۔“

”پیر صاحب! میرے پیچھے تباہ ہو جائیں گے۔“
 ”لیکن اولاد ہو جائے گی۔“ پیر صاحب نے کہا۔ ”میں نے اپنے ماموں زاد بھائی کو بھی یہی مشورہ دیا تھا۔“

”تو کیا ان کے یہاں اولاد ہو گئی تھی؟“
 ”اگر کچھ دن زندہ رہتا تو ہو ہی جاتی۔ وہ تو ساتویں دن چل بسا تھا۔“ پیر صاحب نے فرمایا۔

”سن لیا تم نے۔“ انور نے باہر آ کر اسما سے کہا۔ ”تمہارے یہ پیر صاحب مجھے مارنے کے چکر میں ہیں۔“
 ”ان کے مشورے پر عمل تو کر کے دیکھو۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے عمل کرنے کی۔“ انور نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ ”ہم بغیر بچوں کے صحیح ہیں۔ کیا کمی ہے ہماری زندگی میں؟“

”بچوں کی۔“ اسما نے کہا۔ ”پلیز! کسی طرح بندوبست کر دو۔ محلے کے بچوں کے لیے تو تم نے منع ہی کر دیا ہے۔“

اس کی حالت دیکھ کر انور نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بچوں کا بندوبست کر دے گا۔ اس نے کئی یتیم خانوں وغیرہ کے چکر لگائے لیکن بات نہیں بن سکی۔ بالآخر یہ آدمی اپنے دو بچوں کو فروخت کرتا ہوا دکھائی دے گیا تھا۔

”دیکھو بھائی! میں دونوں کے بیس بیس ہزار روپے دوں گا۔“ انور نے کہا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دونوں ہی بہت

پیارے دانے ہیں۔“ وہ آدمی ایک بچے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ”بابی! ذرا فلائنگ کلک لگا کر دکھاؤ۔“
 ”نہیں۔ نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے دونوں بچے بہت ہوشیار ہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی قانونی چکر پڑ جائے۔“

”کوئی قانونی چکر نہیں پڑے گا۔“ وہ آدمی جلدی سے بولا۔ ”میں باقاعدہ حلف نامہ دینے کو تیار ہوں اور کورٹ میں معاملات طے ہوں گے۔“
 ”ٹھیک ہے۔ توکل یہیں آ جانا۔ میں دونوں کو خرید لوں گا۔“

انور نے گھر آ کر اسما کو بتایا۔ ”نیک بخت! اب تو خوش ہو جاؤ۔ تمہارے لیے بندوبست ہو گیا ہے۔“
 ”میرے لیے کس کا بندوبست کر دیا؟“

”دو بچوں کا۔ دونوں کو خرید کر لارہا ہوں۔ صرف پینتالیس ہزار میں۔“

”یہ تو بہت ظلم کی بات ہے۔ آپ بچوں کو ماں باپ سے الگ کر رہے ہیں۔“ اسما نے کہا۔

”ارے وہ بچے خود ہی الگ ہونے کو تیار ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“
 ”اور ہیں کیسے؟“

”بہت پیارے۔ بہت کیوٹ۔“ انور نے بتایا۔
 ”انہیں دیکھ کر تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔“

”تو جائیں، خدا کے لیے جلدی لے کر آجائیں۔“
 ”کل ملیں گے۔ قانونی کارروائی بھی تو مکمل کرنی ہوگی۔ ان کے لیے کمر اتیار رکھنا۔“

دوسری صبح انور نے بینک سے پینتالیس ہزار نکالے اور اس جگہ پہنچ گیا۔ وہ آدمی اپنے وعدے کے مطابق دونوں بچوں کو لیے کھڑا تھا۔

”آئیں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”یہ دونوں تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

ایک گھنٹے کی کارروائی کے بعد دونوں بچے انور کے حوالے کر دیے گئے۔ اس آدمی نے دونوں بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، اب کو زیادہ تنگ مت کرنا۔“

”یہ میرے ابو نہیں ہیں۔“ بابی نے احتجاج کیا۔
 ”نہیں بیٹا۔ آج سے ان ہی کو اپنا ابو سمجھو۔ یہ تمہیں کھلائیں گے، تمہاری پرورش کریں گے۔ تمہارا خیال رکھیں گے۔“

”اور تمہانے بھی لے جائیں گے؟“ ثونی نے

کاش...

کاش کا لفظ بہت چھوٹا سا ہے۔ اس کو بول کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سمندر کی موجیں آپس میں ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں۔ جیسے مٹی ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام تک جانے کی آرزو کر رہی ہو۔ یہ لفظ بار بار کہنے کی وجہ سے انسان کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ایسے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کچھ لفظ انسان کو بکھیر دیتے ہیں اور اس کو مکمل طور پر بے صبر بنا دیتے ہیں۔

”کاش“ بھی انہی الفاظ میں سے ایک ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس لفظ میں اضطرابی کیفیت اور بے چینی بہت زیادہ ہے۔ کاش کا لفظ ہر دم استعمال کرنے والوں کے دلوں میں ہر آن بے چینی رہتی ہے اس لیے اس لفظ کا استعمال کم ہی کریں۔
 مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

شیخی خوارے

تین دوست اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وہ پیسے کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے ماچس کی تیلی جلا کر راکھ کر دیا۔ دوسرے نے جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکالا اور اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ”بس اتنی ہی ہمت تھی۔ یہ دیکھو۔“ اس نے جیب سے چیک بک نکالی، ایک چیک پھاڑ کر اس پر ایک ہزار روپے لکھے اور اسے لائٹر کے شعلے سے راکھ کر دیا۔“

لومڑی اور چھتری

ہالی وڈ کی ایک اداکارہ ایک دکان پر لومڑی کی کھال کا کوٹ خریدنے گئی۔ دیر تک جھک جھک کرنے کے بعد کوٹ پسند کیا۔ دام چکانے کے بعد بولی۔ ”یہ کوٹ بارش میں بھیگ تو نہیں جائے گا۔“
 دکاندار جو پہلے ہی اس کی بے تکلی بحث سے تنگ آچکا تھا، جھٹکا کر بولا۔ ”محترمہ! آپ نے کسی لومڑی کو بارش میں چھتری لگائے دیکھا ہے؟“
 مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دیکھا۔ ”انور پلیز! واپس کر آؤ ان بچوں کو۔“
 ”کیا پاگل ہو گئی ہو۔ ان بچوں پر پینتا لیس ہزار
 روپے خرچ ہوئے ہیں۔“

”اب تو ہم بھی کہیں نہیں جائیں گے۔“ ٹونی نے
 کہا۔ ”واہ، ایک تو اتنی مشکل سے اپنے گھر سے جان چھوٹی
 ہے اور آپ لوگ ہمیں دوبارہ بھیج رہے ہیں۔“
 ”اچھا بابا! کوئی نہیں بھیج رہا۔“ انور زچ ہو گیا تھا۔
 ”تم دونوں کو یہیں رہنا ہے۔“

اسما نے ان دونوں کے لیے ایک کمر اٹھیک کر دیا
 تھا۔ اس میں ان کی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ ان کی تفریح
 کے لیے کمرے میں ایک ویڈیو گیم بھی رکھ دیا گیا۔
 انور اور اسما بچوں کو کمرے میں بھیجنے کے بعد بہت
 دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔
 کس اسکول میں ایڈمیشن دلاتا ہے، ان کی ڈریسنگ کیسی
 ہونی چاہیے، ان کو ایڈاپٹ کرنے کی خوشی میں تقریب
 کب ہو۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو
 چوٹ کا دیا۔ انور نے دروازہ کھولا۔ ٹونی کھڑا ہوا منہ بسور
 رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ انور نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”ابو! مجھے اس کمرے میں نہیں سونا۔“ ٹونی نے
 کہا۔ ”میں تو آپ دونوں کے ساتھ سوؤں گا۔“
 ”ہم دونوں کے ساتھ؟ نہیں بیٹا، تمہارے لیے وہ
 الگ کمر ہے نا۔ تم وہاں سو گے۔“
 ”نہیں۔ میں بابی کے ساتھ نہیں سوؤں گا اور اگر
 آپ نے نہیں سلا یا تو پھر میں زور زور سے رونے لگوں
 گا۔“

”اچھا اچھا روئے کی ضرورت نہیں ہے، آ جاؤ۔“
 اسما نے اسے دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ ”یہ تم اس کو
 کیوں لے کر آ رہے ہو؟“
 ”بچہ ہے۔ ہمارے ساتھ سونے کی ضد کر رہا
 ہے۔“ انور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ہاں امی! صرف آج رات۔“ ٹونی نے کہا۔
 ”صرف ایک رات آپ دونوں کے ساتھ سونا ہے اور کل
 سے اپنے کمرے میں سوؤں گا اور بھائی آپ دونوں کے
 ساتھ سوئے گا۔“

”کیا! پھر بابی سونے کے لیے آ جائے گا؟“
 ”ہاں امی۔ باری باری..... ایک رات میں تو ایک

پوچھا۔ ”کیوں نہیں بیٹا۔ خوب سیر کراؤں گا۔“
 ”اب جاؤ تم دونوں۔“

بچے بھی عجیب مزاج کے تھے۔ انہوں نے مڑ کر بھی
 باپ کی طرف نہیں دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ”ابو! یہ
 گاڑی آپ کی ہے؟“ بابی نے راستے میں پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا۔ یہ میری ہے۔“
 ”لیکن میرے امی ابو کے پاس تو بایک بھی نہیں
 ہے۔“

”بھائی! تمہیں نہیں معلوم۔“ ٹونی نے جیسے سمجھانے کی
 کوشش کی۔ ”جو ابو اصلی ہوتے ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں
 ہوتا اور جو نقلی ہوتے ہیں، ان کے پاس سب کچھ ہوتا
 ہے۔“

انور بچوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ یہ اچھی بات
 تھی کہ بچے کچھ بے پروا قسم کے تھے۔ ورنہ ماں باپ سے
 جدا ہو کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔
 اسما نے والہانہ انداز میں دونوں بچوں کا استقبال کیا
 تھا۔

”بچو! انور نے اسما کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ
 تمہاری امی ہیں۔“
 ”یہ کیسی امی ہیں بابی۔“ ٹونی نے بابی سے پوچھا۔
 ”بھائی! اب یہ جیسی بھی ہیں، ان ہی پر گزارہ
 کرو۔“ بابی نے کہا۔

انور اور اسما دونوں یہ جملہ سن کر حیران رہ گئے
 تھے۔ کم بخت نے اپنی عمر سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ انور
 کا تو جو بھی رد عمل ہو لیکن اسما بھنا کر رہ گئی تھی۔ ”خدا کی
 پناہ۔ یہ تم کیسے بچوں کو پکڑ کر لائے ہو۔“
 ”اسما! جلدی میں یہی ملے تھے لیکن ہیں بہت
 ذہین۔“

”ان کی ذہانت تو ابھی سے پتا چل رہی ہے۔“
 ”امی۔“ بابی نے اسما کی طرف دیکھا۔ ”بہت زور
 کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے میں کیا ہے؟“
 ”واہ۔ کیا بچے ہیں۔“ اسما بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی
 گئی۔

”ابو! آپ بہت اچھے ہیں۔“ ٹونی نے کہا۔ ”لیکن
 یہ جو امی ہیں، یہ کچھ پاگل معلوم ہوتی ہیں۔“
 ”ارے تو خود پاگل ہو گا۔“ اسما کی آواز آئی۔ اس
 نے ٹونی کی بات سن لی تھی پھر اس نے انور کی طرف

رات بابی۔ پھر ایک رات بابی تو ایک رات میں۔“
”انور! اب یہ بچے ناقابل برداشت ہوتے
جارہے ہیں۔“ اسما دھیرے سے بولی۔

”امی! آپ اور ابو باتیں کرتے رہیں۔ میں کچھ
نہیں سن رہا۔“ ٹونی نے دونوں کے درمیان لیٹ کر
آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ٹھیک چار بجے کے قریب بابی بھی اپنے بھائی کو
ڈھونڈتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ انور کو اسے بھی اسی
بستر پر ملانا پڑا تھا۔

”انور! کیا تم مجھے پاگل کرنے کے لیے ایسے بچے
اٹھا کر لے آئے ہو؟“ اسما دانت پیٹتے ہوئے بولی۔
”ارے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دونوں ایسے نکلیں
گئے۔“

”میں تو کہتی ہوں کہ ان کے باپ نے انہیں بیچا
نہیں ہے بلکہ ان سے جان چھڑا لی ہے۔“

”اب کچھ بھی ہو۔ یہ بچے ہمارے گھر کے ہیں۔
ہمارے اپنے ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ ہی گزارہ کرنا
ہے۔“

”آپ دونوں اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں۔“ ٹونی
اچانک بول پڑا۔ ”کیا آپ لوگوں کو نیند نہیں آتی؟...
خواجہ ہمارے نیند بھی برباد کر رہے ہیں۔“
”میرے خدا! یہ بچے ہیں یا مصیبت ہیں۔“ اسما
بوکھلا کر بولی۔

”یہ تمہارا ہی شوق تھا۔ اب خود ہی بھگتو۔“
دوسرے دن وہ لوگ بہت دیر سے اٹھے۔ دونوں
بچے کمرے میں نہیں تھے۔ ”خدا کی پناہ..... کہاں چلے
گئے دونوں؟“ انور نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ
بھاگ گئے ہوں۔“

”بھاگ جائیں تو اچھا ہی ہے۔“
”کیسی بات کر رہی ہو۔ ہم قانونی چکر میں پھنس
جائیں گے۔ میں باقاعدہ عدالت سے لے کر آیا ہوں
دونوں کو۔ عدالت ہماری جان کھا جائے گی۔“

کچھ دیر بعد باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے
لگیں۔ انور اور اسما دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے۔ محلے
کے ایک شخص نے دونوں بچوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے
اور زور زور سے شور کیے جارہا تھا۔ ”نالائق، بدتمیز..... نہ
جانے کس کی اولاد ہیں۔“

”امی۔“ بابی اسما کو دیکھ کر ٹھنکا۔

”ابو۔“ ٹونی نے انور کی طرف آنے کی کوشش کی۔
”انور صاحب! یہ کیا سلسلہ ہے۔ یہ بچے آپ کے
کیسے ہو گئے؟“

”یہ ایک درد بھری داستان ہے اکرم بھائی۔ آپ
یہ بتاؤ ہوا کیا ہے؟“

”اب کیا بتاؤں۔ یہ دونوں بچے میرے گھر میں
گھس گئے تھے۔“ اکرم نے بتایا۔ ”پھر ایک عجیب حرکت
کی کم بختوں نے..... سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے بچوں کو
کیسی تربیت دی ہے۔ پھر اب سے پہلے تو ان کو کبھی نہیں
دیکھا۔ پھر یہ اچانک آپ کے بچے کہاں سے ہو گئے۔“

”میں نے بتایا تا کہ یہ ایک درد بھری داستان ہے
لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”وہ بھی ایک درد بھری داستان ہے انور بھائی۔“
اکرم نے کہا پھر اپنی آواز نیچی کی۔ ”یہ کم بخت مجھ سے کہہ
رہا تھا انکل، انگلش فلموں میں جس طرح پیار کرتے ہیں،
آپ بھی انہی کو اسی طرح پیار کریں۔“

”لاحول ولا۔“ انور اچھل پڑا۔ ”معاف کرنا اکرم
بھائی۔ میں ابھی ان کے دماغ درست کرتا ہوں۔“

وہ دونوں بچوں کو پکڑ کر گھر لے آیا۔ ”چلو بچو.....
اب تم دونوں اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”ہاں ہاں، واپس کریں کم بختوں کو۔ یہ اگر رہ گئے
تو پھر ہم محلے میں نہیں رہ سکیں گے۔“

ایک گھنٹے کے بعد انور دونوں بچوں کو لے کر ان
کے باپ کے پاس کھڑا تھا۔ ”خدا کے لیے بھائی۔ اپنے
بچے واپس لے لو۔“ اس نے کہا۔

”اب تو یہ نہیں ہو سکتا جناب۔ آپ سودے سے
انکار نہیں کر سکتے۔ اب میں آپ کو پیسے کہاں سے واپس
کروں گا۔ وہ تو سب ادھار میں چلے گئے۔“

”ارے بابا! تم سے پیسے کون واپس مانگ رہا
ہے۔ بس تم اپنی امانت کو سنبھالو۔ ہمارے لیے یہی
بہت ہے۔“

”مرضی ہے آپ کی۔ چھوڑ جائیں دونوں کو۔“
دوسری شام کو دفتر سے واپسی پر انور کو وہی آدمی
ایک فانیو اسٹار ہوٹل کے سامنے بیٹھا ہوا دکھائی دے
گیا۔ اس کے ساتھ وہی دونوں بچے تھے اور اس کے
ہاتھ میں ایک پلے کارڈ تھا جس پر لکھا تھا..... ”بچے برائے
فروخت۔“

2016 اپریل

سپینس ڈائجسٹ

www.pdfbooksfree.pk



محی الدایر جواب

انتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسین ہوا یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل بنے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ رو داد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk





یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر اور چاہی جی جی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوثھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منگی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے رواجی ذہنیت کے بالک تھے اور انہوں نے جامعہ ادب پانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنا یا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضائقاتی علاقے میں گوثھ آ گئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاہی جی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو کہ میرا سبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی میرا سبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے سبک کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوثھ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف چلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکرٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دبا، وجہ سے مرثا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سبلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوثھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کور ہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے فکے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور چلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاہی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جامِ تھارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو ٹنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر یعنی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کھڈی بھی آ گیا۔ ادھر مرینہ یا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر جرنل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر یعنی سن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں سکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور سکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ

ماروی

چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لگانے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب وہ غبارے مغرب کی سمت جارہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بھڑکتے نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا سہانہ بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوا لیا اور بشری اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ وہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چھوئے ادھر دشمن مراد پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنا دی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور مکی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد شریک حیات کے ساتھ اپنی ریاست جارہا تھا کہ اسے دشمنوں نے گھیر لیا۔ اس کے جہاز کو چھ راستے میں ہی روک لیا گیا۔ دشمن اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے تاہم مراد نے انہیں دھمکی دی اور چہرے کھٹے انتظار کرنے کو کہا اس نے جہاز سے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ دشمن ناچار انتظار کرنے لگے کہ چہرے کھٹے بعد کیا ہوگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد اور ہم زاد کے لیے بازی پلٹنا بہت ہی آسان تھا۔ وہ دونوں نادیدہ ہو کر ان کے ہوش اڑا سکتے تھے لیکن ایسا کرنے سے یہ بھید کھل جاتا کہ وہ نادیدہ ہو جایا کرتے ہیں اور اس بھید کو اس لیے قائم رکھنا تھا کہ ان کے نادیدہ ہونے کی صلاحیت دائمی نہیں تھی۔ کسی دن کسی وقت بھی یہ صلاحیت ختم ہونے والی تھی۔ اس لیے مراد دوسری تدابیر سے اپنے بچاؤ کی کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے ہم زاد کو کچھ اہم ہدایات دی تھیں۔ وہ مراد کی ہدایت کے مطابق اپنی ریاست میں ایک جوان حسینہ کو تلاش کرتا ہوا ایک ایسے گھر میں پہنچا جہاں ایک حسین لڑکی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کا نام زیب النساء عرف زہی تھا۔ اس کے دن پھرنے والے تھے۔ خوش نصیبی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ماں بیٹی ریاست کے حکمران کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

اس نے مکان کے اندر آ کر کہا۔ ”حیران اور پریشان نہ ہوں ماں جی! میں نے آپ کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ اسے ریاست کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا زیب النساء مجھے قبول کرے گی؟ کیا آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا چاہیں گی؟“

زہی نے سر پر آٹھل رکھ کر اسے گھونگھٹ بنالیا۔ مراد نے ہم زاد کو سختی سے کہا تھا۔ ”جیسے بھی پسند کرو، اس سے فوراً نکاح پڑھاؤ۔ فی الحال کسی قاضی وکیل اور گواہوں کو نہیں

بلا سکو گے۔ ابھی رازداری ضروری ہے۔ اس لیے لڑکی کے والدین کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے شریک حیات بناؤ۔ بعد میں اس سے باقاعدہ نکاح پڑھواؤ گے اور خبردار! جب تک باقاعدہ نکاح نہیں پڑھایا جائے گا تب تک تم اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

ہم زاد نے ایک بار مراد کو ناراض کیا تھا۔ اب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زہی کی والدہ کے سامنے کلام پاک کی ایک آیت پڑھی اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر پوچھا۔ ”کیا تم مجھے اپنے خاوند اپنے مجازی خدا کی حیثیت سے قبول کرتی ہو؟“

اس نے تین بار قبول کیا۔ ہم زاد نے بھی اسے تین بار قبول کرنے کے بعد کہا۔ ”میں تمہاری حیا کا محافظ ہوں۔ موجودہ الجھنوں سے نکلنے کے بعد باقاعدہ تم سے نکاح پڑھوانے کے بعد تمہیں ہاتھ لگاؤں گا۔ اس وقت تک ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔ چلو اٹھو۔ ابھی تمہیں ملکہ عالیہ کا اہم رول ادا کرنا ہے۔ میں راستے میں سمجھاؤں گا کہ معاملات کیا ہیں؟“

زہی دوسرے کمرے میں گئی۔ اس کے پاس جو بہترین لباس تھا، اسے پہن کر باہر آ کر ایک کار میں بیٹھ گئی۔ ہم زادات کی تاریکی میں اسے ڈرائیو کرتا ہوا سرحد کے پار چلا آیا۔ وہاں سے اس نے ریاست کے منتظم اعلیٰ بشری اور بے کو فون پر کہا۔ ”میں فضائی راستے سے تمہیں خشکی کے راستے سے آرہا ہوں۔ اپنی سرحد کے قریب پہنچ گیا ہوں۔“

ریاست کے حکمران اور ملکہ کے استقبال کے لیے عوام کثیر تعداد میں انرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ پریس میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے رپورٹرز کیمرا مین اور مووی کیمرے سب ہی وہاں موجود تھے۔

جب یہ اطلاع ملی کہ ان کا حاکم اعلیٰ اپنی دلہن کے ساتھ خشکی کے راستے سے آرہا ہے تو سب ہی ادھر دوڑ پڑے پھر ایک گولی چلائے بغیر ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مراد نے فون پر سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے کہا۔ ”ٹی وی آن کرو اور ہماری ریاست کا چیلن دیکھو۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم جہاز میں نہیں ہو؟ یہ تمہارا فون نمبر ہے..... تم کہاں ہو؟“

”میں نے کہا تھا کہ ٹی وی آن کرو پھر کسی وقت باتیں کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے ٹی وی آن کرتے ہوئے دوسرے تمام اتحادی ممالک کو اطلاع دی۔ وہ سب اپنے اپنے ٹی وی اسکرین کے سامنے آ بیٹھے پھر انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ ریاست کی سرحدی چوکی پر عورتوں اور مردوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ نغمے اور موسیقی کا شور تھا۔ پٹانے پھوٹ رہے تھے اور آسمان پر آتش بازی کے رنگارنگ پھول کھل رہے تھے۔

مراد علی منگی ایک کھلی کار میں اپنی نئی دلہن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ریاست کے عوام والہانہ جوش و جذبے سے ان کا استقبال کر رہے تھے اور انہیں محل کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ سب حیرانی اور بے یقینی سے دیکھ رہے تھے اور دوسری اسکرین پر اسکاٹپ کے ذریعے ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ ”وہ جو طیارے میں ہے اور ہماری حراست میں ہے، وہ مراد علی منگی کی ڈی ہے۔ ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔“

سپر پاور کی آرمی کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”میں شروع سے کہتا آرہا ہوں کہ ابھی اس سے دشمنی نہ کرو۔ اسے بخیریت ریاست پہنچا کر اس کا اعتماد حاصل کرو۔ اب دیکھو کہ ہم کیسی نادانی سے اس کا اعتماد کھو چکے ہیں۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”مائی گاڈ...! اب وہ ہمارا بدترین دشمن بن جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس کی دشمنی کو کم سے کم کرنے کے لیے دانشمندی یہ ہوگی کہ فوراً ہی اس کی ڈی کو اور اس کے ذاتی طیارے کو رہا کیا جائے۔“

”ہاں، اب تو اس ڈی کی رہائی کی شرط پر ہی کسی حد تک سمجھوتا ہو سکے گا۔“

انہوں نے اسی لمحے میں کنٹرول ٹاور کے فوجی کو حکم دیا۔ ”مراد علی منگی سے فوراً معذرت چاہو۔ اسے عزت و احترام سے اپنی ریاست میں جانے دو۔“

سپر پاور کے اعلیٰ حکام نے فون پر مراد سے رابطہ کر کے کہا۔ ”مسٹر ڈی مراد! تم نے درست کہا تھا۔ ہمیں چھ گھنٹے کے اندر ہی حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ تم طیارے کو یہاں سے لے جاسکتے ہو۔“

رہائی ملتے ہی طیارے کا انجن چاگ گیا۔ ماہ نور خوش ہو کر مراد کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمال کیا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھے ہی بیٹھے دشمنوں کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف اسے لے جا رہا تھا۔

ہم زاد نے محل میں پہنچ کر بشریٰ اور بلے سے تنہائی میں کہا۔ ”میں مراد نہیں ہوں اور یہ ماہ نور نہیں ہے۔ وہ دونوں طیارے میں ہیں اور دو گھنٹے کے اندر یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

اس نے تفصیل بتائی کہ دشمن ممالک نے کس طرح مکاری سے مراد کو طیارے کے ساتھ ٹریپ کیا تھا اور کس طرح مراد اور ہم زاد نے انہیں الٹو بنایا ہے۔

بشریٰ نے زمینی کو گلے لگا کر کہا۔ ”میری ایک بھابی آرہی ہیں۔ ایک اور ہوئیں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”ابھی پوری طرح تمہاری بھابی نہیں ہوئی ہیں۔ ہمارا باقاعدہ نکاح پڑھایا جائے گا۔“

بلے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تمہاری آدمی دائف ہے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے صرف زمینی کی والدہ کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے اپنی شریک حیات بنایا ہے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے قبول کیا ہے، تاکہ یہ میرے لیے ناجہرم نہ رہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ جب تک باقاعدہ نکاح خوانی نہیں ہوگی، تب تک ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔“

بلے نے کہا۔ ”یہ تم نے بالکل مراد کی طرح شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ تم دونوں کا پورا نکاح آج صبح سے پہلے ہی ہوگا۔ میں ابھی قاضی صاحب کو کال کرتا ہوں۔ مراد کے آتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھایا جائے گا۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”پہلے مراد کو آجانے دو۔ ابھی بہت ہی اہم معاملات سے گزرنا ہے۔ اس کا ذہن الجھا ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی میری شادی خانہ آبادی کو مناسب نہ سمجھے۔ وہ میرے معاملے کو ایک آدھ روز کے لیے ٹال سکتا ہے۔“

میں مرد خوشخوار ہوتے ہیں۔ مردوں کی اس دنیا میں کوئی بھی حسین عورت تنہا رہ کر سلامتی سے نہیں رہ سکتی۔

وہ مست ہو کر بل کھا کر سوچتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اب کوئی میرے خوب صورت بدن کو چھو سکے۔ گاڈ مجھے میری خواہش کے مطابق سلامتی دے رہا ہے۔ میں آدمی رات کو اکیلی عیاشوں اور بد معاشوں کے درمیان سے گزرتی رہوں گی تو میرے قریب آنے والوں کی شامت آجائے گی اور میں کتنی دولت مند ہوگئی ہوں۔ وہ مجھے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے دے کر گیا ہے۔ آئندہ میں دریائے سین کے کنارے سب سے مہنگا اور شاندار بنگلا خرید سکوں گی۔

ماڈلنگ کی دنیا میں سب حیران تھے۔ اشتہاری فلم کے پروڈیوسروں نے اور کئی لوگوں نے اس سے پوچھا تھا کہ جو لوگ فائرنگ کرتے ہوئے اسے کہیں لے گئے تھے، ان خطرناک لوگوں سے بچ کر وہ کیسے صحیح سلامت آگئی تھی؟ وہ بڑے فخر سے کہتی پھر رہی تھی کہ ایک جن اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ کسی کو میرے قریب آنے نہیں دیتا۔ اب کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی مجھے کمزور عورت سمجھ کر چھونے آئے۔ جو آئے گا اسے میرا جن عاشق الٹا لٹکا دے گا۔ اس کی اس بات پر کسی کسی نے یقین کیا۔ باقی سب نے کہا۔ ”وہ خطرناک لوگوں سے بچ کر آ ہی نہیں سکتی تھی۔ کسی نے اسے اچھی طرح استعمال کرنے کے بعد واپس بھیج دیا ہے۔“

یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پارسائی جتانے کے لیے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس سائنسی دور میں ایک جن کا قصہ سنا رہی تھی۔ یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ کوئی یا عاشق ہے اور وہ نظر نہیں آتا ہے۔

جینی کو پروا نہیں تھی کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے سوچا۔ ”جو آزمانے آئے گا۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں سے اپاچ ہو جائے گا۔“ راجڑی سوزا کی انگلی کسی ہتھیار کے بغیر کیسے کٹ گئی تھی یہ منظر جینی نے دیکھا تھا۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے چھونے والے کو اس نے خود سزا دی ہو۔ اب اس کے دل میں رہ رہ کر تجسس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

”مائی گاڈ! کتنا پراسرار ہے۔ مجھے چھو لیتا ہے۔ میرے چہرے سے سفر کرتا ہوا کہاں کہاں پہنچتا رہتا ہے۔ تیز روشنی میں بھی نظر نہیں آتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔“

دو گھنٹے بعد ماہ نور اور مراد اپنی ریاست میں پہنچ گئے۔ وہ سب ان کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ آئے تھے۔ بشری نے ماہ نور کو گلے لگا کر پیار کیا پھر مراد سے کہا۔ ”بھائی! میری بھائی کو بتائیں کہ میں آپ کی کون ہوں اور آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟“

ماہ نور نے کہا۔ ”آپ کے بھائی نے بتایا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی ایک پاگل لڑکی آکر گلے سے لگ جائے گی اور مجھے پیار کرے گی۔ ایسے وقت مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ماہ نور اس کے دونوں رخساروں کو چومنے لگی۔ مراد نے محل میں آکر زہی کو دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”میں تمہاری ہدایت کے مطابق زیب النساء کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اس نے ہماری پلاننگ کے مطابق ہم سے بھرپور تعاون کیا ہے۔“

مراد نے ہلے سے کہا۔ ”قاضی صاحب کو کال کرو۔ کل صبح آٹھ بجے ان کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ زیب النساء کی والدہ کو یہاں عزت و احترام سے لایا جائے۔ آئندہ وہ اسی محل میں رہیں گی۔“

ہم زاد نے دور ٹیٹھی ہوئی زہی کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ اسے چھونے کے لیے دوسرے دن تک انتظار کرنا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ ”تو نہ سہی اور نہ سہی اور نہ سہی اور نہ سہی۔ جینی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج کی رات اس کے ساتھ گزرے گی۔“

مراد اسے اور ہلے کو اور شہر کے میئر کو ہدایات دے رہا تھا کہ ریاست میں کل بھی عام تعطیل ہوگی اور جشن منایا جائے۔ اپنے جینٹل سے نشر ہونے والی خبروں میں اور بریکنگ نیوز میں کہا جائے کہ ریاست کا حکمران مراد علی منگی کل صبح اپنی قوم سے اور دنیا والوں سے مخاطب ہوگا۔

وہ سب ہی ٹھکے ہوئے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ آج رات بے خوف و خطر گہری نیند سوایا جائے۔ دوسرے دن سے پھر دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوگا۔ وہ سب اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ ہم زاد نے اپنے کمرے میں آکر لباس تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھتے ہوئے ایک خوشبو لباس پر اسپرے کی۔ پھر وہ آئینہ اچانک اس کے وجود سے خالی ہو گیا۔

وہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

جینی کو اچانک ہی پراسرار طاقت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حیوانوں میں شیر اور انسانوں

”اپنے بدن کے مسافر کو سب ہی دیکھتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ پاتی۔ ایسا تجسس ایسی سنسنی سی جاری رہتی ہے کہ میں اسے چھوٹی پکڑتی رہتی ہوں اور اس کی آنکھ پھولی ختم نہیں ہوتی۔ وہ نادیدہ مسافر مجھے تھکا مارتا ہے۔“

اچانک اس کی سانسیں خوشبو خوشبو سی ہو گئیں۔ اس نے ہم زاد سے کہا تھا کہ تم اچانک آکر پکڑو گے تو ڈر جاؤں گی۔ میری سانسیں رک جائیں گی۔ پلیز آنے سے پہلے کوئی ہلکا سا اشارہ دیا کرو۔

ہم زاد نے کہا تھا۔ ”میں اچانک آکر نہیں پکڑوں گا اور نہ ہی آواز دوں گا۔ جب بھی خوشبو محسوس کرو تو مجھ لیا کرو کہ خوشبو خوشبو ہونے آگیا ہوں۔“

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”مائی گڈنس۔ تم آگے ہو؟“

وہی سی سرگوشی سنائی دی۔ ”ہاں...!“

اس نے آواز کی سمت دیکھ کر پوچھا۔ ”یہاں ہو؟“

اس کا ہاتھ پیٹنے کے سرے پر رکھا ہوا تھا۔ خوشبو وہاں پہنچ گئی۔ اسے اپنی پھٹلی کی پشت پر سفاک ہونٹوں کا یوسر محسوس ہوا۔ آواز آئی۔ ”یہاں ہوں...“

جینی نے وہاں دوسرا ہاتھ رکھا۔ اچانک اس کی گردن سے زلفیں ایک طرف سٹ گئیں۔ گردن پر سلکتے ہوئے ہونٹ آگئے۔ ”میں یہاں ہوں...“

”پلیز اپنی جینی کو ایک بار دکھائی دو۔“

”مجھے افسوس ہے۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

”تم پیدا کی ایسے نہیں ہو گے تمہارے ماں باپ نے تمہیں دیکھا ہوگا۔ تمہارے قریبی رشتے داروں نے بھی تمہیں دیکھا ہوگا؟“

”کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے بھی اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بھی پیدا کی نادیدہ تھے۔“

”او گاڈا ایسا تو بھی دیکھنے میں سننے میں نہیں آیا۔“

”تم نے بھی نہیں پڑھا کہ پورا خاندان نادیدہ ہوتا ہے۔“

”تم نے نہیں پڑھا...؟“ گردن پر سانسوں کا بھیجا پہنچا۔

”دنیا والوں نے بھی نہیں دیکھا...“ اک بوسہ لہرایا۔

”اس کے باوجود حقیقت سامنے ہے میری جان...!“

تم ایک نادیدہ کی آغوش میں ہو۔ وہ آغوش میں تھی اور ایسی انوکھی سریتیں حاصل کر رہی تھی جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی تھیں۔

شاور کے بعد جینی نے کہا۔ ”ابھی ہم آؤنگ کے لیے جائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”تجربہ خانے شراب خانے اور ٹائٹ کلپس ساری رات مستی میں رہتے ہیں۔ یہاں کے ایک مہنگے ٹائٹ کلپ میں دنیا کے امیر ترین عیاش آتے ہیں۔“

وہ بولے۔ ”میں چاہتی ہوں، وہ مجھے تجھ دیکھ کر لپچائیں اور مجھے حاصل کرنے کے لیے کمینگی پر آمادہ ہوں۔“

وہ سینہ تان کر بولی۔ ”میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھ اکیلی کو بڑے سے بڑا شہ زور بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہاں سب کو حیران کرنا چاہتی ہوں۔ دنیا والوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایک جن مجھ پر عاشق ہے۔ وہ کسی عیاش دولت مند کو کسی تیس مار خاں کو میرے قریب پہنچنے نہیں دے گا۔“

وہ ایک مختصر سا پرکشش لباس پہن کر باہر آئی۔ باہر سرخ رنگ کی اسپورٹس کار چھت کے بغیر کھلی تھی۔ دور سے نظر آسکتا تھا کہ ایک اکیلی حسینہ تھا کار ڈرائیو کرتی ہوئی جاری ہے پھر یہ کہ کار کی طرح مختصر سا لباس بھی کھلا کھلا سا تھا۔ اس کے بدن کا نظارہ جگہ جگہ سے دعوت دے رہا تھا۔

”مرد کے بچو! آؤ مجھے ہاتھ تولگاؤ۔“

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی ایک شاہراہ پر آگئی۔ اس نے اونچی آواز میں آڈیو کیسٹ کو آن کر رکھا تھا۔ پاپ میوزک اور گیت کی آواز دور تک گونجتی جارہی تھی اور یہ بتاتی جارہی تھی کہ جینی جوزف ہوا میں اڑتی جارہی ہے۔ اسے پکڑو۔

ہم زاد برابر والی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس حسینہ کی مسرتوں سے اور جوش و جذبوں سے مفلوظ ہو رہا تھا۔ پھر مچلے جوانوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ تعداد میں دس تھے اور پانچ موٹر سائیکلوں پر تھے۔ سیٹیاں بجاتے اور ہلاک کرتے مستیاں کرتے آرہے تھے۔

اس ٹولی کی دو موٹر سائیکلیں اس کے دائیں بائیں آگئیں۔ ایک نے اس کے بالکل قریب ہو کر موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے کہا۔

”ہے... تم جینی جوزف ہونا؟“

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”ہاں۔ میں بہتی ہوئی ہوا ہوں۔ کوئی ہوا کو کھنی میں پکڑ نہیں سکتا۔“

اس نے بھی زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ ”چیلنج نہ کرو۔ ہم ابھی اٹھا کر لے جائیں گے۔“

”میں پھول کی طرح ہلکی اور پہاڑ کی طرح بھاری ہوں۔ تمہارا باپ بھی مجھے اٹھا کر نہیں لے جاسکے گا۔“

”اچھا تو دیکھو۔ ہم کس طرح تمہیں کار روکنے پر

مجبور کرتے ہیں۔“

وہ دو موٹر سائیکلوں والے اس کا راستہ روکنے کے لیے رفتار بڑھا کر آگے جانے لگے۔ پیچھے ان کے ساتھی بھی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ آگے جا کر تمام موٹر سائیکلوں کو بریک لگا کر اسے آگے جانے سے روک سکتے تھے۔

ایسے ہی وقت ایک کے سینے پر لات پڑی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ موٹر سائیکل ان کے نیچے سے نکل کر آگے کی طرف دوڑتی ہوئی سڑک کے کنارے گر پڑی۔ دونوں سوار سڑک پر پڑے کراہ رہے تھے۔ دوسرے دو ساتھیوں کو بھی لاتی پڑیں۔ وہ موٹر سائیکل بھی ان کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسری تین موٹر سائیکلیں رک گئی تھیں وہ اپنے زخمی ساتھیوں کو سنبھال رہے تھے۔

جینی کا روک کر باہر آگئی۔ باپ میوزک شور مچا رہا تھا۔ وہ اس کی دھن پر بچ سڑک پر ناپچنے لگی۔ کہنے لگی۔ ”تم آن۔ تمہیں لاتی مار کر مارج رہی ہوں۔ آؤ مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔“

ان میں سے ایک جوان طیش میں آ کر اسے دیوچ لینے کے لیے دوڑا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اچھل کر اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے یار نے آنے والے کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔ جینی تھپہ لگانے لگی۔ باقی پانچ جوانوں میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ ہماری مردانگی کو لٹکا رہی ہے۔“

دوسرے نے پوچھا۔ ”لیکن ہمارے چار ساتھی گاڑیوں پر سے کیسے گر پڑے؟ اور وہ راجہ جینی کے سامنے اوندھے منہ کیسے گر پڑا ہے؟ کیا یہ بلیک میجک جانتی ہے؟“ تیسرے نے کہا۔ ”اگر ہم بیک وقت اس پر حملہ کریں گے تو اس کا بلیک میجک دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔“ بات ختم ہوتے ہی کہنے والے کے منہ سے ایک کراہ نکلی وہ پیٹ پکڑ کر جھکنے لگا۔ دوسرے کے منہ پر کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ تیسرے کے سینے پر فلائنگ کک لگی۔ باقی دو جوان ٹھونسنے اور کراٹے کے ہاتھ ادھر ادھر چلاتے ہوئے چیختے لگے۔ ”کون ہے؟ یہاں کون حملہ کر رہا ہے؟ ہمارے سامنے آؤ۔“

ایک کی کمر پر لات پڑی۔ وہ دوسرے سے ٹکرا گیا پھر وہ سب اٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگے۔ اس شاہراہ پر کئی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ کشتی پولیس کی دو گاڑیاں آگئی تھیں۔ وہ تمام نو جوان پولیس والوں سے اور دوسرے لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ ”آپ سب جانتے ہیں۔ یہ مشہور ماڈل جینی جوزف ہے۔ یہ بلیک میجک جانتی ہے۔ اس نے ہمارے

چار ساتھیوں کو زخمی کیا ہے اور ہم سب کی پٹائی کی ہے۔“ جینی نے کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ دس نو جوانوں سے چھیڑ چھاڑ کروں گی۔ یہ سب مجھے لوٹ کا مال سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔“ پولیس افسر نے پوچھا۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ، تم نے ان سے تنہا کیسے مقابلہ کیا ہے؟“

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”ایک جن میرا پلار دلدار ہے۔ یہ مجھ پر عاشق ہے۔ یہ ابھی یہاں موجود ہے، کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔ مجھے اپنی ملکیت بنا چکا ہے۔ جو بھی مجھے چھونے آتا ہے، اس کی اچھی طرح پٹائی شروع کر دیتا ہے۔“

افسر نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا بکو اس کر رہی ہو؟ بلیک میجک قانوناً جرم ہے۔ تم اپنا جرم چھپانے کے لیے کسی جن کی بات کر رہی ہو۔ تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو اور کسی جن کا وجود ثابت کرو۔“

”کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی سب کے سامنے یہیں ثابت کر دوں گی۔“

وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر بولی۔ ”میں جا رہی ہوں۔ میرا جن کسی کو میرا راستہ روکنے نہیں دے گا۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ افسر نے کہا۔ ”سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو۔ ورنہ...“

بات ادھوری رہ گئی۔ افسر کے ہولسٹر سے آپ ہی آپ ریوالتور نکل گیا۔ اس نے یوگھلا کر دیکھا۔ وہ خود اپنے ریوالتور کے نشانے پر آ گیا تھا۔ پھر ایک گولی اس کے قدموں کے پاس چلی۔ وہ اچھل کر پیچھے چلا گیا۔

تمام سپاہیوں نے اپنی اپنی کنٹینر سنبھال لیں لیکن وہ کس پر گولیاں چلاتے؟ ان کے افسر کا ریوالتور بھی غائب ہو گیا تھا۔

ہم زاد نے کہا۔ ”آفسر! ہم قانون کا احترام کرتے ہیں۔ جینی کوئی جادوگر نہیں ہے۔ میں اس کا عاشق جن ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اسے پریشان نہ کریں، جانے دیں۔“

پھر اس افسر نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کا ریوالتور اس کے ہولسٹر میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے حیرانی اور پریشانی سے جینی کو دیکھا پھر کہا۔ ”تم جاسکتی ہو۔“

اس نے خوشی سے مٹھی باندھ کر اسے فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”ہپ ہپ ہرے...“

پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔ سب پیچھے رہ گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”گھر واپس چلو۔“

وہ بولی۔ ”ابھی نہیں۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔ ہم یہاں کے سب سے مہنگے نائٹ کلب میں جائیں گے۔ وہاں امیر ترین لوگوں سے جوا کھیلنے کا مزہ آئے گا۔“

”نائٹ کلب کل جائیں گے۔ ابھی میرا دایاں جانا بہت ضروری ہے۔“

وہ ناراض ہو گئی۔ دایاں پر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا خڑے دکھا کر اسے راضی کرنا چاہتی تھی۔ ہم زاد مجبور تھا۔ اسے محل میں جا کر نیند پوری کرتی تھی۔ دوسری صبح ایک نئی نوپلی دلہن اس کی زندگی میں آنے والی تھی۔

وہ گھر پہنچ کر بولا۔ ”تمہاری یہ ناراضگی یہ خڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ بڑا پیارا آرہا ہے تم پر..... لیکن تمہیں منانے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف رہوں گا۔ اس لیے تیس گھنٹے کے بعد آ کر تمہیں مناؤں گا۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”تیس گھنٹوں تک انتظار نہیں کر سکتی گی۔ اس دوران میں کوئی دشمن آ کر مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”جیسے ہی خطرہ محسوس کرو فوراً مس کال دو۔ میں آ جاؤں گا لیکن یہ اچھی طرح یاد رکھو۔ جب زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور تم بہت مجبور ہو جاؤ، تب ہی مجھے کال کرنا۔ محض ملاقات کرنے اور ہوس مٹانے کے لیے بلاؤ گی تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ ساری عمر مجھے ڈھونڈتی رہ جاؤ گی۔“

جینی نے آواز کی سمت ہاتھ بڑھا کر اسے ٹھولا پھر اسے پا کر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ وہ پیار سے اس کے آنسو پونچھ کر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

پچھلی رات سے ریاستی چیمپل کے ذریعے یہ خبر سنائی جا رہی تھی کہ ہزہائی نس مراد علی منگی اپنی قوم سے خطاب کر س گئے۔ اس اطلاع نے تمام دشمنی کرنے والے ممالک میں ہپنل پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ سننے کے لیے بے چین ہو گئے تھے کہ مراد ان سے کیا کہنے والا ہے؟ انہوں نے اپنی دانست میں مراد کی ڈی کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اس سے بدسلوکی نہیں کی تھی۔ صرف اس کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی پھر معذرت چاہتے ہوئے اسے اپنے طیارے میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ امید کر رہے تھے کہ مراد ان سے راضی رہے گا کیونکہ انہوں نے غلطی کرنے کے بعد فوراً ہی عطا کی تھی۔ وہ دس بجے سے پہلے ہی مراد کے فون نمبر پر چیخ کر رہے تھے اور مایوس ہو رہے تھے۔ اس نے سم بدل دی تھی۔

آٹھ بجے زیب النساء کا نکاح ہم زاد سے پڑھایا

گیا۔ وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ویسے کوہا دلہن کوئی الحال تنہائی میں ملنے کا اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ پہلے اہم سیاسی معاملات سے نمٹنا ضروری تھا۔ محل کے ایک کمرے میں۔ ٹی وی کمرے اور ساؤنڈ ریکارڈنگ کے آلات سیٹ کیے جا رہے تھے۔

ٹھیک دس بجے ریاست کے عوام نے اور دشمن ممالک کے حکمران اور تمام عہدیداران نے ہم زاد اور زیب النساء کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”میں اپنے عوام کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کل رات میرا اور میری دلہن کا والہانہ استقبال کیا اور ہمیں بھرپور محبتیں دیں لیکن میں اپنے عوام سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ میں اس ریاست کا حاکم اعلیٰ مراد علی منگی نہیں ہوں۔“

یہ سن کر تمام مخالفین بے چینی سے پہلو بد لئے گئے۔ وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ”ہزہائی نس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مجھے اپنا ہم شکل بنایا ہے۔“

سپر پاور اور اتحادی ممالک اسے اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جسے وہ اصلی مراد سمجھ رہے تھے وہ نقلی تھا۔ مراد کی ڈی تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے عوام توجہ سے سنیں۔ ہمارے ہزہائی نس اپنی دلہن کے ساتھ کراچی سے یہاں آنا چاہتے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں یہاں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ ان کا اندیشہ درست نکلا۔ ہزہائی نس گو یہاں آنے سے پہلے ہی ٹریپ کیا گیا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا جہاز ایک زیرانے میں اتاریں اور ان کے قیدی بن جائیں۔ انہوں نے جہاز اتار دیا۔ ایک پوری فوج انہیں گرفتار کرنے آئی تھی لیکن ہزہائی نس نے جہاز سے باہر آ کر قیدی بننا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے چھ گھنٹے کی مہلت حاصل کی۔ ان چھ گھنٹوں کے اندر دشمنوں نے ٹی وی چیمپل کے ذریعے دیکھا کہ ریاست کے عوام ہائی وے پر اپنے حاکم اعلیٰ کا کیسا شاندار استقبال کر رہے ہیں۔ ان دشمنوں سے کہا گیا کہ انہوں نے ہزہائی نس کے ڈپلیکیٹ کو ٹریپ کیا ہے۔ اصل تو اپنی ریاست میں پہنچ گئے ہیں۔ تب انہوں نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے ہزہائی نس کو ڈپلیکیٹ سمجھ کر رہا کر دیا۔“

یہ تو بنا دینے والی ایسی بات تھی کہ تمام ممالک کے حکمران اور اکابرین اسکا ٹپ پر ایک دوسرے کا منہ ٹکٹے لگے۔ ہم زاد کہہ رہا تھا۔ ”میرے ہم وطنو...! آپ کے

تھا، اسے وہاں سے بھی نکال لایا۔ اب وہ دونوں کراچی کی ایک کوشی میں ہیں۔ اگر ہم اس کوشی کو ان کا قید خانہ بنادیں، جگہ جگہ ان کے قدموں کے بارود پھٹادیں اور انہیں یہ بتادیں کہ جب بھی وہ کوشی سے باہر قدم رکھیں گے، ایک دھماکے سے ان کے چوتھڑے اڑ جائیں گے، تب مراد ضرور مجبور ہو جائے گا۔“

ایک نے کہا۔ ”بہت کمزور پلان ہے۔ جو شخص سچ سمندر سے محبوب کو نکال کر لاسکتا ہے، کیا وہ اس کی کوشی سے اسے نکال کر نہیں لاسکے گا؟ سوچو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یقیناً پھر ہماری شامت آجائے گی۔“

پلان میکے نے کہا۔ ”پہلے میری پوری بات سنیں۔ ہم ماروی اور محبوب کا محاصرہ نہیں کریں گے۔ ہماری آرمی یا پاکستان کے زر خرید سپاہی وہاں نہیں جائیں گے۔ ہم بیان دیتے رہیں گے کہ مجرموں کی وہ خطرناک تنظیمیں جو ہڑپائی ٹرس سے خدا واسطے کا بیرہگتھی ہیں، وہ ایسی دشمنی کر رہی ہیں۔ ہمارا ایک بھی سپاہی ایک بھی ہتھیار وہاں نہیں پایا جائے گا۔ مراد کو ہمارے خلاف نہ کوئی ثبوت ملے گا، نہ وہ ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرے گا۔“

کئی حکمران اور فوجی افسران نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ”ہاں۔ اس منصوبے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے قابل عمل بنا سکتے ہیں۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”آپ حضرات کتنے ہی منصوبے بنالیں۔ میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں۔ وہ نمازی ہے۔ پکا عبادت گزار ہے۔ اسے کوئی روحانی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ ہم اسے کبھی زیر نہیں کر سکیں گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور میں کہتا ہوں، انسان سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر روحانی قوتوں سے ڈرتے ہو تو یہ تمہاری کمزوری ہے۔ یہ جو آندھی طوفان آتے ہیں اور زلزلوں سے تباہی ہوئی ہے تو یہ کیا ہیں؟ یہ قدرتی آفات ہیں۔ انہیں روحانی غضب ناک قوتیں کہہ لو۔ ہم انسان آندھیوں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ تباہ کرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہم پھر سے نیا شہر آباد کر لیتے ہیں اگر مراد نے کوئی روحانی قوت حاصل کی ہے تو ہم اپنی ذہانت سے اور حکمت عملی سے اس طاقت کو کمزور بنا سکیں گے۔ ایک بار معلوم تو ہو جائے کہ اسے کیسی قوت حاصل ہو گئی ہے اور وہ کیسے طریقہ کار سے ہمیں ڈراتا آرہا ہے۔ جب راستہ دکھائی دے گا تو ہم ہزار راستے بنا کر اسے دبوچ لیں گے۔“

مے کہ اسے کیسی پر اسرار قوتیں حاصل ہو گئی ہیں؟“
ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ وہ کبھی طرح کی پر اسرار قوت کا حامل ہے۔ اس کے پاس آبدوز کشتی نہیں ہے اور اس نے گہرے سمندر میں پہنچ کر پہلی کو پٹرز کو تباہ کیا تھا۔“

ایک نے تائید کی۔ ”ہاں۔ یہ ثابت ہوتا آرہا ہے کہ وہ کسی پر اسرار قوت کے ذریعے ہی ہماری آرمی کو شکست دے چکا ہے۔ آئندہ بھی وہی قوت ہمیں شکست سے دوچار کرے گی۔“

”اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم اس قوت کے مقابلے میں پھر اپنی فوج کو استعمال کرنے کی غلطی کریں گے؟“

سپر پاور کے فوجی افسر نے کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ سب سے زیادہ ہم نے نقصان اٹھایا ہے۔ ہمارے سیکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔ ہمارے طیارے اور ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے ہیں۔ ہم فی الحال اپنی فوجی قوت ضائع نہیں کریں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے؟ اسے سہرا اور تسلیم کر لیں گے؟“

سپر پاور کے ماہر سیاستداں نے کہا: ”ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کسی ریاست کو سپر پاور مان لیں۔“

وہ منہ ہی باغیہ کر پولا۔ ”ہم عسکری جنگ نہیں لڑیں گے۔ سیاسی حربے آزمائیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”وہ سیاسی حربے کیا ہوں گے؟“
 ”یہی کہ فی الحال ہم اس کے ہر فیصلے کو تسلیم کریں

گئے۔ اسے یہ تاثر دیں گے کہ ہم شکست خوردہ ہیں۔ اس کی انتقامی کارروائی کو برداشت کر لیں گے۔ جوانی کارروائی نہیں کریں گے اور چپ چاپ کئی طرح کے ہتھکنڈے سے اس کی پراسرار قوت کا سراغ لگائیں گے۔ پھر اس قوت کا توڑ معلوم کریں گے۔ اس سے نمٹنے کے لیے اچھا خاصا وقت لگے گا۔ مہینوں گزر جائیں گے لیکن ہم اس کا پتہ معلوم کر کے اس کا توڑ ضرور کریں گے۔ ہمیں بہت صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔“

ایک ماہر پلان میکر نے کہا۔ ”ہم مراد کی ایک اور بڑی کمزوری سے متعلّق رکھتے ہیں۔“

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”ماروی اور محبوب کو وہ دل و جان سے چاہتا ہے۔ ان دونوں سے کتنا گہرا لگاؤ ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کریں کہ وہ لندن میں ماروی کو تحفظ فراہم کرتا رہا پھر اسے کراچی لے آیا۔ محبوب کو بیچ سمندر میں قیدی بنا کر رکھا گیا

مراد وہاں موجود تھا۔ ان کی تمام باتیں سن رہا تھا۔ وہ اجلاس کے اختتام پر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

کاتب تقدیر نے دو دنوں تک عیش و آرام لکھ دیا تھا۔ ماہ نور، مراد، زیب النساء، ہم زاد، بشری اور بے نے تمام مسائل کو اور تمام دشمنوں کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ یہ طے کر لیا تھا کہ ہر غم سے بے نیاز ہو کر ہنستے بولتے، ناچتے گاتے اور خوب گھومتے پھرتے رہیں گے۔ ریاست کے عوام بھی دل کھول کر جشن منارہے تھے۔

ہم زاد کو نئی دہن مل گئی تھی۔ وہ تیس گھنٹے کے لیے جینی کو بھول گیا تھا۔ وہ نئی کے سامنے ذرا پرانی ہو گئی تھی۔ زمی اس پر سحر طاری کر رہی تھی۔ وہ اچھی لگ رہی تھی اور پتا نہیں وہ کب تک اچھی لگتی رہتی۔ وہ پارہ صفت تھا۔ ریل گاڑی کی طرح ہڈیاں بدلتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔

مراد ماہ نور کو پا کر بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔ وہ اس کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر پوری ریاست میں گھومتا پھرتا رہا۔ بشری اور بے بھی ان کے ساتھ رہے۔ ایسے وقت وہ اپنے ساتھ ایک بھی سکیورٹی گارڈ نہیں رکھتے تھے۔ مراد اور ہم زاد دو مقام فوق تمام دشمنوں کے اجلاس میں جاتے تھے۔ ان کی تنہائی میں ہونے والی رازدارانہ گفتگو بھی سنتے تھے پھر خاموشی سے واپس آ جاتے تھے۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ دو روز تک کوئی دشمنی کرنے نہیں آئے گا۔

حالات رہ رہ کر وٹس بدلتے رہتے ہیں۔ اب اس طرح گروٹ بدل رہے تھے کہ ہیروں کی کان کے مالک راجرڈی سوزا نے اخبارات میں بیان دیا تھا۔ جینی اس کے قلعے سے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے لے گئی ہے لیکن میں اسے نہ روک سکا نہ اور کوئی روک سکے گا۔ اس نے مزید کہا تھا کہ جینی کے پیچھے کوئی پراسرار قوت ہے کوئی شخص چھپا رہتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا۔ وہ راجرڈی سوزا کے کئی سکیورٹی گارڈز کو ہلاک کر چکا ہے۔

راجرڈی سوزا نے کہا تھا کہ وہ جینی کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائے گا۔ اس کے نادیدہ مددگار سے دشمنی مول لینے کی غلطی نہیں کرے گا۔

اس سے سوال کیا گیا۔ ”کیا جینی کو کسی طرح کی پراسرار قوت حاصل ہو گئی ہے یا واقعی اس کے ساتھ کوئی نادیدہ ہستی ہے جو اس کی محافظ ہے اور اسے فائدہ پہنچاتی ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جن بھوت کو مانتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ کوئی جن اس پر عاشق ہو گیا ہے۔“ جلد ہی اس کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ دوسری رات شہر کے ایک پولیس افسر نے اور دس نوجوانوں نے بیان دیا کہ جینی کو پراسرار قوت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی کہ اس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔ کوئی مائی کالال اسے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔

پولیس افسر نے بیان دیا تھا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار ایسا جادو کی تماشا دیکھا ہے۔ میرا ریوالور میرے ہولسٹر سے خود بخود نکل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ اس جن نے مجھے گولی نہیں ماری۔ میرے قدموں کے پاس قائم کرنے کے بعد ریوالور کو واپس میرے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ کوئی بہت ہی نیک جن ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے بلکہ دل چھینک بد معاش جوانوں کو سزائیں دیتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے دو چار جن اور پیدا ہو جائیں تو یہاں سے بے شرعی، گناہ اور جرائم ختم ہو جائیں گے۔“

یہ بیانات یورپ کے تمام اخبارات میں جینی کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ کئی ملکوں کے حکام اور فوجی افسران نے ان بیانات کو پڑھا۔ ان سب کے دماغوں میں الجھن سی پیدا ہوئی۔ یہ خیال آیا کہ وہ سچ کچھ کوئی جن ہے تو اس سے بہت بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک بار پھر تمام اعلیٰ حکام اور فوجی افسران اسکا پ کے ذریعے ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”وہ جن نادیدہ رہ کر مراد کی پراسرار قوتوں کا راز معلوم کر سکے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور وہی جن اس کی پراسرار قوتوں کا توڑ کر سکے گا۔ مراد اس نظر نہ آنے والے جن کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ یعنی ہمارے قدموں میں آ جائے گا۔“ تیسرے نے شبہ ظاہر کیا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کہیں یہ قصے کہانیوں والی بات نہ ہو؟“

دوسرے نے کہا۔ ”سناچ کو کیا آج؟ جینی کو گورنر ہاؤس میں طلب کریں۔ اگر کوئی جن ہوگا تو اس کے ساتھ آئے گا۔“

فوراً ہی سرکاری طور پر جینی کو گورنر ہاؤس میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی۔ سوچنے لگی کہ ایک ملک کے حکمران اسے کیوں بلارہے ہیں؟ سپاہی چاہتے تو اسے گرفتار کر کے لے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے بڑی عزت سے اسے حاضر ہونے کو کہا تھا۔

پھر اس نے سوچا۔ ”مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

کوئی گزبڑ ہوگی تو فوراً ہی اپنے جن کوس کال دوں گی۔ وہ پلک جھپکتے ہی میرے پاس آ جائے گا۔“

وہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر اور سپاہیوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس میں پہنچی۔ وہاں حکومت کے چند اعلیٰ عہدیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے عزت دی، اسے خوش آمدید کہا۔ وہ ان کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”مس جینی! ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں جن اور بھوتوں کی باتوں کو محض بچکانا مانتے ہیں لیکن تم کہتی ہو، کوئی جن تم پر عاشق ہو گیا ہے اور وہ کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”جی ہاں۔ مجھے بھی نظر نہیں آتا ہے۔“

”پھر تم اس سے کس طرح ملتی ہو؟“

”جس طرح خوشبو نظر نہیں آتی اور ہم اسے پالیتے ہیں۔“

اسی طرح میں اسے پالیتی ہوں۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی۔ وہ میرے قریب آتا ہے تو میں اسے چھو لیتی ہوں۔ پکڑ لیتی ہوں۔ پیار کی یہ آنکھ چھوٹی مجھ پر جادو کرتی رہتی ہے۔“

”کیا تم ابھی اس سے مل سکتی ہو؟“

”نہیں۔ اس نے کل رات کہا تھا کہ تیس گھنٹے بعد آئے گا۔ بائیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔“

”تم بے چمن ہوتی ہو، اس سے ملنا چاہتی ہو تو کیا اسے پکارنے سے وہ آ جاتا ہے؟“

”پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ہے۔“

میں فون کے ذریعے مس کال دیتی ہوں۔ وہ آ جاتا ہے۔“

”ابھی مس کال دو۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں۔ اس نے سختی سے تاکید کی ہے کہ صرف اہم ضرورت کے وقت اسے کال کروں۔“

”عقل سے سمجھو، کیا یہ اہم نہیں ہے کہ اس ملک کا حکمران تمہیں حکم دے رہا ہے؟“

”آپ کا حکم میرے لیے اہم ہے۔ اس کے لیے نہیں ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں وہ صرف میرے پاس آتا ہے اور کسی سے ملنے نہیں آئے گا۔“

”ابھی تم نے کہا ہے وہ تمہاری اہم ضرورت کے وقت آتا ہے۔ وہ اہم ضرورت کیا ہوتی ہے؟“

”مجھ پر کوئی مصیبت آئے، میں خطرات میں گھر جاؤں، تب اسے کال کر سکتی ہوں۔“

ان تمام عہدیداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ بولنے لگے۔ پھر ایک نے جینی سے کہا۔ ”سمجھ لو کہ تم ابھی مصیبت میں ہو۔ ہم نے تمہیں حراست میں رکھا ہے۔ جب تک اسے نہیں بلاؤ گی تمہیں رہائی نہیں ملے گی۔“

”مجھے حراست میں لینے کی بات کرو گے تو وہ آپ حضرات کا دشمن بن جائے گا۔ اس کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔“

”ہم اسے دشمن نہیں بننے دیں گے۔ اسے سمجھائیں گے کہ صرف اس سے ملاقات کرنے کے لیے دشمنی کا بہانہ کیا ہے۔“

”وہ اسے دھوکا سمجھے گا۔ وہ بہت غصے والا ہے۔“

جھوٹ بول کر اسے بلاؤ گے تو وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گی تب بھی نہیں سمجھے گا۔“

ایک نے کہا۔ ”آٹھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ ہم اسے دوست بنائیں گے۔ دشمن نہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”جینی! تم اگلے آٹھ گھنٹے تک یہاں آرام سے رہو۔ ہمیں اس کا انتظار کرو۔“

وہ بولی۔ ”سوری۔ یہاں جتنا بھی آرام ملے گا، وہ میرے اپنے گھر جیسا نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اسے سمجھا بجا کر آپ سے ملاقات کرنے کو کہوں گی۔“

”ہمیں اطمینان نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے پاس آنے سے انکار کر سکتا ہے۔ پلیز یہاں رہ جاؤ۔ صرف آٹھ گھنٹے کی تو بات ہے۔ ہم اسے دوست بنانا چاہتے ہیں۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ایک ملک کا حکمران تم سے گزارش کر رہا ہے۔ پلیز مان جاؤ۔“

وہ مان گئی۔ اگلے آٹھ گھنٹے اس محل میں گزارنے لگی۔ وہ نمبرون ماڈل گرل اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اسے دیکھ کر سب ہی للچاتے تھے۔ بے اختیار اسے چھونے کو جی چاہتا تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر کتنے ہی عہدیداروں کے دل پھلنے لگے تھے۔ وہ اسے تصور کی چور تھائی میں حاصل کر رہے تھے۔

وہ سب بے حد طاقتور تھے۔ وسیع اختیارات کے مالک تھے۔ اسے جبراً حاصل کر سکتے تھے لیکن اس انمول بدن کے جملہ حقوق صرف ایک نادیدہ جن کے لیے تھے اور ان میں سے کوئی ایک جن سے پنکا نہیں لے سکتا تھا۔

آخر آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ وہ خوشبو محسوس کرتے ہی خوش سے کھل گئی۔ ”ٹھیکس گاڈ! تم آ گئے۔“

”ہاں مگر یہ تم کہاں ہو؟“

”میں گورنر ہاؤس میں ہوں۔ میں کیا بتاؤں۔ میری عزت اور شان و شوکت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت کے

تمام اعلیٰ عہد یدار اور حاکم اعلیٰ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ وہ تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔
”وہ مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں؟“

”تم ایسے عجیب و غریب ہو کہ سب ہی تم سے ملنا اور دوستی کرنا چاہیں گے۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ پورا حکمران طبقہ مجھے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔“
”تم بہت چھوٹی ہو کر سوچ رہی ہو۔ اعزاز انہیں حاصل ہو رہا ہے کہ تمہارے ذریعے وہ مجھ سے باتیں کریں گے۔ میں انکار کر دوں تمہیں یہاں سے لے جاؤں تو وہ ہماری خوشامدیوں کرنے لگیں گے۔“

”تم درست کہتے ہو۔ پلیز ڈرائنگ روم میں چلو۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے دوستی کرو۔“

”میں تمہارے کہنے سے آنکھیں بند کر کے دوستی نہیں کروں گا، مگر تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہ معلوم کروں گا کہ وہ مجھے دوست کیوں بنانا چاہتے ہیں؟“

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ حاکم اعلیٰ اور دوسرے تمام عہد یدار اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جینی کو تہنید کیے ہوئے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں سوال تھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا آپ حضرات کچھ تہذیبی محسوس کر رہے ہیں؟ خوشبو محسوس کر رہے ہیں؟“

ایک عہد یدار نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں، تمہارے آتے ہی خوشبو آئی ہے۔“

”یہ میرے عاشق کی خوشبو ہے۔“
انہیں آواز سنائی دی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔“

وہ سب چونک کر جینی کے آس پاس آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم زاد نے کہا۔
”میں یہاں موجود ہوں۔ جینی میری جان ہے۔ اس کی خاطر اپنی آواز سن رہا ہوں۔ آپ حضرات کھڑے نہ رہیں۔“

وہ سب بیٹھ گئے۔ ایک اعلیٰ عہد یدار نے کہا۔ ”ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”ضرور پوچھیں۔ جواب دوں گا۔“
اس نے سوال کیا۔ ”کیا آپ کی صرف آواز ہے یا وجود بھی ہے؟“

وہ بولا۔ ”وجود ہے۔ تب ہی جینی میری آغوش میں کھلتی ہے۔ یہ میرے وجود کی گواہ ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”کیا ہم سے مصافحہ کریں گے؟“
”کسی ایک سے کروں گا۔“

اعلیٰ حاکم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ

بڑھایا تو ہم زاد نے اسے تھام لیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اومائی گاڈ! آپ کا وجود ہے۔ آپ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں۔“
وہ دونوں ہاتھوں سے ہم زاد کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہا تھا۔
”کتنا عجیب لگ رہا ہے۔“

ہم زاد اپنا ہاتھ چھڑا کر جینی کے پاس آ گیا۔ اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”مسٹر! ہم آپ کو کس نام سے پکاریں؟“
وہ بولا۔ ”جو دیکھنا نہ جائے اسے ان سین کہنا چاہیے۔ مجھے ان سین کہا جائے۔“

”مسٹر ان سین! ہم بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہم سے ہمدردی کرو۔ ہم سے دوستی کرو۔“

وہ بولا۔ ”مجھے آپ حضرات سے ہمدردی بھی ہے اور میں آپ کا دشمن بھی نہیں ہوں۔ مصیبتیں کیا ہیں؟“

توجہ کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ہمارے ایک دشمن کو نہ جانے کیسی پراسرار قوتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ اس نے تہا ہو کر ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو مار ڈالا ہے۔ ہمارے طیاروں کو اور ہیلی کاپٹروں کو پرواز کے دوران تباہ کر دیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ایسی جادوئی قوت کہاں سے حاصل ہو گئی ہے۔“

ہم زاد نے پوچھا۔ ”یا اللہ خیر۔ کیا آپ مراد علی منگل کی بات کر رہے ہیں؟“

وہ سب ہی ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ”آپ اسے جانتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ میں اپنے دشمن کو صرف جانتا ہی نہیں، پہچانتا بھی ہوں۔“

وہ سب خوشی سے محل گئے۔ اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہمارا دشمن آپ کا بھی دشمن ہے۔ پھر تو آپ ہماری مدد ضرور کریں گے۔“

”میں مدد نہ کروں، تب بھی مدد ہوتی رہے گی۔ وہ اس طرح کہ میں اس دشمن سے لڑتا رہوں گا تو گویا تمہارے لیے بھی لڑائی جاری رہے گی۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ پلیز ہمیں بتائیں۔ اس کی پراسرار قوتیں کیا ہیں؟ اور اسے کہاں سے حاصل ہو گئی ہیں؟“

”وہ بہت بڑا عامل ہے۔ جنات کو تسخیر کرنے کا پراسرار علم پڑھتا رہتا ہے۔ اس وقت میں جنات اس کے معمول مطیع اور فرمانبردار ہیں۔“

”میں جنات۔۔۔۔۔“ ان سب نے حیرانی اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مایوسی سے پوچھا۔

”وہ معمول اور مطیع بن کر رہنے والے جنات بھی آپ کی طرح نادیدہ رہتے ہوں گے۔“

متفرق معلومات

- ☺ دنیا میں سب سے پہلے تو مل انعام مادام کیوری نامی عورت نے حاصل کیا۔
- ☺ دنیا کا سب سے بڑا موجود سائنس دان امریکا کا ایڈیسن ہے۔
- ☺ دنیا کا سب سے تیز رفتار جانور چیتا ہے۔
- ☺ دنیا میں سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑ فلپائن میں پھٹتے ہیں۔
- ☺ دنیا کی سب سے قیمتی دھات پلائیم ہے۔
- ☺ دنیا میں سب سے پہلے ایٹم بم اوپن ہیر نامی سائنس دان نے بنایا۔
- انتخاب۔ رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل، لاہور

گا۔ پھر وہ نہیں رہے گا تو وہ بیس جنات ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔“

”ایسی کوئی زبردست پلاننگ ہوگی تو میں ضرور اس کے مطابق عمل کروں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کسی بھی اجلاس میں یا بند کمرے میں جو بھی پلاننگ کرتے ہیں یا رازداری سے کوئی بھی بات کرتے ہیں تو مراد کا کوئی جن آکر سن رہا ہے۔ وہ آپ کو نظر نہیں آتا اور مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ آپ کیا کرنے والے ہیں۔“

وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”واقعی ماضی میں ایسا ہو چکا ہے۔ ہم کہیں بھی چھپ کر باتیں کرتے رہے ہیں، وہ راز میں نہیں رہی ہیں۔ مراد ان سے آگاہ ہوتا رہا ہے۔“

ان کی تنہائی کی اور رازداری کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت بھی مراد کا کوئی جن وہاں موجود ہے اور ان کی تمام باتیں سن رہا ہے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا اس کا کوئی جاسوس جن ابھی یہاں موجود ہوگا؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”نہیں۔ پریشان نہ ہوں۔ ہم جنات ایک دوسرے کی بو پا لیتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی یہاں ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔“

ان سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک عہدیدار نے کہا۔ ”ہم کیا کریں؟ رازداری کی باتیں کہاں کریں؟ یہ تو بہت ہی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”بے شک! ہم جنات ہیں کسی کو نظر نہیں آتے لیکن کسی کی صورت بنا کر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک جن مراد علی منگی کی صورت بنا کر اس کے ساتھ محل میں رہتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے ڈمی مراد بن گیا ہے۔ سب اسے مراد کا ہم زاد کہتے ہیں۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ہاں۔ ہم نے اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ کیا باقی جن بھی مراد کے ساتھ محل میں رہتے ہیں؟“

”نہیں۔ صرف وہ ہم زاد اس کے ساتھ دن رات رہتا ہے۔ باقی جن پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس وقت آتے ہیں، جب مراد کسی کام سے انہیں کال کرتا ہے۔ وہ چشم زدن میں اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”اب معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی پراسرار قوت کیا ہے؟ بیس جنات نے اس کے حکم سے ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے حکم سے چشم زدن میں جا کر ہمارے ہیلی کاپٹروں کو تباہ کر کے محبوب علی چانڈیو کو بحری جہاز سے نکال لائے تھے۔“

دوسرے عہدیدار نے تائید کی۔ ”یہ انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ جنات نے اس کے سارے کام کیے ہیں۔“

ایک نے کہا۔ ”اور آئندہ بھی کریں گے۔“

”مسٹر ان سین! ہم برباد ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اس کے حملوں کو روک سکیں گے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”اس نے پراسرار عمل کے ذریعے بیس جنات کو تخریر کیا ہے۔ مجھے بھی جکڑنا چاہتا ہے لیکن میں اس کے علم کا توڑ کرنا جانتا ہوں۔ اس کے حملوں سے بچتا آ رہا ہوں۔ ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس پر کس طرح کامیاب حملے کر سکتا ہوں۔ ابھی تدبیر سوچ رہا ہوں۔“

”ہم تمہارے لیے آسانی کریں گے۔ ہم پلاننگ کریں گے۔ تم اس پر عمل کرو گے تو تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے اس سے نجات مل جائے گی۔“

”آپ کوئی بھی تدبیر سوچیں، اس پر عمل کرنے کے لیے مراد سے ٹکرانا ہوگا۔ اس سے ٹکرانے کا مطلب ہے بیس جنات سے مقابلہ کرنا اور میں تنہا ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا گا۔“

فوجی افسر نے کہا۔ ”کسی سے لڑنا ضروری نہیں ہوگا۔ ہم ایسی پلاننگ کریں گے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی اور تم نا دیدہ رہ کر اپنا کام کر جاؤ گے۔ ایک بار ہماری پلاننگ پر عمل کرو گے تو مراد ہمارے قابو میں آ جائے گا یا مارا جائے

دوسرے نے کہا۔ ”آئندہ ہم جب بھی راز داری سے کوئی پلاننگ کرنا چاہیں گے تو ان سین کو بلا لیا کریں گے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”میں وہاں جنات کی بو محسوس کروں گا تو وہ بھی میری بو محسوس کر لیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوگا؟“
”یہ ہوگا کہ میں انہیں دیکھتے ہی بھاگ جاؤں گا ورنہ وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

وہ مابوس ہو گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”ویسے میں وہاں سے فرار ہو کر کہیں جا کر فون کے ذریعے تم سب کو ان کی موجودگی کی خبر کر دوں گا۔“

وہ خوش ہو گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”اب میں جا رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“
”یہ تو بتا دو، ہم تم سے رابطہ کیسے کریں؟“

”جینی کے ذریعے.....“
پھر خاموشی چھا گئی۔ جینی نے کہا۔ ”وہ جا چکا ہے۔ میرے گھر میں انتظار کرے گا۔ مجھے فوراً جانا چاہیے۔“

وہ اسے سرکاری گاڑی میں گھر پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ بولی۔ ”میں یہاں سے پیدل جاؤں گی۔ وہ میری اسپورٹس کار لے کر آ رہا ہے۔“

وہ پیدل جانے لگی تو یورپ کی سب سے حسین ٹاپ ماڈل گرل کو دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ درجنوں سپاہی اس کے چاروں طرف آگئے اور لوگوں کو اس کے قریب آنے سے روکنے لگے۔ ادھر ہم زاد اس کے بچلے سے اسپورٹس کار ڈرائیو کرتا آ رہا تھا۔ وہ کار جہاں سے گزر رہی تھی لوگ حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اس کا ڈرائیو نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگ اس کار کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ کسی ڈرائیو کے بغیر جا رہی تھی۔

بے شمار کاریں اور موٹر سائیکلیں اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں دوڑنے لگیں۔ لڑکیوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہائے یہ تو وی جینی کا عاشق ہے۔ وہ کتنی خوش نصیب ہے، اسے ایسی شہرت مل رہی ہے۔“

پورا مجمع شور مچاتا ہوا اسپورٹس کار کے ساتھ اپنی گاڑیاں دوڑا رہا تھا۔ کتنے ہی اشل اور مووی کمرے والے اس کے قریب ہونے کی کوششیں کر رہے تھے اور خالی دوڑتی ہوئی کار کی تصویریں اتار رہے تھے۔

وہ کار جینی کے قریب آ کر رکی تو وہاں بھی تماشاخیوں کا جھوم تھا۔ کئی ٹی وی چینلز کے کمرے آگئے تھے۔ موبائل

پولیس کی درجنوں گاڑیاں لوگوں کو دور بھگانے کے لیے بکھیر گئی تھیں۔ پھر ٹی وی چینلز کے ذریعے ساری دنیا نے دیکھا کہ ایک خالی کار دوڑتی جا رہی تھی۔ کوئی ڈرائیو نہیں تھا اور ٹریفک کے جھوم میں لو جوانوں کی موٹر سائیکلیں اسپورٹس کار کے ساتھ دوڑتی جا رہی تھیں پھر یہ عجیب جذباتی تماشا دکھائی دیا کہ جینی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھی تو وہ سیٹ سے کچھ اوپر دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے نادیہ عاشق کی گود میں بیٹھی ہے۔ اس کی پشت اسٹیرنگ کی طرف تھی۔ وہ کار نہیں چلا رہی تھی۔ کسی سے ہم آغوش ہو گئی تھی اور کار خود بخود اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ رہی تھی۔

ٹی وی کے ناظرین گم سم سے ہو کر وہ منظر دیکھ رہے تھے اور کنٹری کرنے والے کہہ رہے تھے۔ ”یہ کمپیوٹر اٹر کی ہوئی کوئی گرافک فلم نہیں ہے۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں سچ سچ ایسا ہو رہا ہے۔ یہ لائیو مناظر پیش کیے جا رہے ہیں۔“

تبصرہ کرنے والے کہہ رہے تھے۔ ”جینی اور مسٹر آن سین کو سرعام ایسا تماشا نہیں کرنا چاہیے۔“

اور جینی نے ٹی وی چینلز کے ذریعے کہا تھا کہ وہ آئندہ لوگوں سے کترائے گی اور چھپ کر رہا کرے گی۔

☆☆☆

مراد اپنے بہت سے معاملات میں مصروف تھا۔ اس نے ایک بار ہم زاد کو جینی کے ساتھ دیکھا تھا لیکن اس کا محاسبہ کرنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس نے ٹی وی پر جینی کے ساتھ ہونے والے تماشے کو دیکھا تو اسے بلا کر پوچھا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم نے جینی کو باقاعدہ اپنی شریک حیات بنایا ہے یا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”گناہ اور ثواب کی باتیں رہنے دو۔ میں تمہارا ہم زاد ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک ٹیکیلو پہلو ہوں۔ ٹیکیلو ہی رہوں گا۔“

مراد نے سختی سے کہا۔ ”میں اپنے وجود کا کوئی پہلو بھی داغ دار نہیں رکھنا چاہتا۔“

”نہ جاننے کے باوجود انسان ہو۔ بے داغ فرشتہ نہیں بن سکو گے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ کسی نہ کسی پہلو سے خطا کا مرتکب ہوتا ہی رہتا ہے۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ خطا کرنے والوں کے دلوں میں بھی خوف خدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں اس حد تک خوف ہے کہ میں شر پسندوں سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔ عبادت کرتا رہوں گا۔ انصاف کے تقاضے پورے کرتا رہوں گا۔ پلیز میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرو۔“

مراد خاموش ہو گیا۔ اس نے بحث نہیں کی۔ یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس کے اعمال اس کے ساتھ ہیں۔ خدا کو منظور ہوگا تو وہ راہِ راست پر آجائے گا۔

ہم زاد نے اسے بتایا کہ دشمن ممالک کے ایک حاکم اعلیٰ اور اس کے اہم عہدیداروں سے کس طرح ملاقات ہوئی اور کیا باتیں ہوئیں۔ وہ سب اس بات سے پریشان ہیں کہ مراد کے بیس صدو جن چپ چاپ آکر ان کی خفیہ باتیں سنتے رہتے ہیں۔

جشن منانے کے دو دن گزر گئے۔ مراد نے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلان کیا کہ اب وہ سیاسی امور پر باتیں کرے گا۔ کسی بھی ملک کے اکابرین اسکاٹپ کے ذریعے گفتگو کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے سپر پاور کے اکابرین نے ہی رابطہ کیا اور کہا۔ ”ہم ہر ہائی ٹس سے گفتگو کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے اکابرین بھی اسکاٹپ کے ذریعے ہم سے رابطہ کرتے رہیں گے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کے طیارے کو اور آپ کو گھیرنے اور حراست میں لینے کی بہت بڑی بھول کی تھی۔“ مراد نے کہا۔ ”آپ نے بھول نہیں کی تھی۔ سچ بچ مجھے حراست میں لیا تھا۔ البتہ مجھے رہا کرنے کی سب سے بڑی احمقانہ غلطی کی ہے۔“

”یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے احمقانہ غلطی کی اور آپ کو رہا کر دیا۔ آپ ہماری اس غلطی کو نظر انداز کر دیں۔“ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم لوگوں نے مراد علی منگی کو حراست میں لے کر مار ڈالا ہے۔ وہ مرچکا ہے۔ یہ جو یہاں بیٹھا ہے، یہ نیا مراد ہے۔ میرے اللہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ سیدھی سی بات ہے میں اس نئی زندگی میں سانپوں کو دودھ نہیں پلاؤں گا۔“

”تم سے اور تمہارے تمام اتحادی ممالک سے سفارتی تعلقات نہیں رکھوں گا اور نہ ہی تمہارے ملکوں کے انجینئروں و ڈاکٹروں کو اور مختلف شعبوں کے ماہرین کو اپنی ریاست میں آنے کی اجازت دوں گا۔ تمہارے ملکوں کے جو باشندے یہاں ملازمت کر رہے ہیں انہیں اس وقت تک عزت اور سلامتی دی جائے گی، جب تک وہ ہماری ریاست کے وفادار رہیں گے۔ ورنہ ان کی بھی پھٹی کر دی جائے گی۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سفارتی تعلقات نہیں رکھیں گے تو آپ کے عوام بیرونی ممالک جانے کے لیے ویزا کہاں سے حاصل کریں گے؟“

دوسرے ملک کے حاکم نے کہا۔ ”آپ اور آپ کے عوام تقریباً آدمی دنیا سے کٹ جائیں گے۔ ہمارے زیر اثر جو چھوٹے ممالک ہیں، وہ بھی اپنی سرحدیں بند کر دیں گے۔ آپ کی ریاست کے طیاروں کو کسی بھی ملک کی سرحد سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”ہم تمہاری یا کسی بھی ملک کی اجازت حاصل نہیں کریں گے۔ ہمارے عوام ویزا حاصل کیے بغیر جس ملک میں جانا چاہیں گے آزادی سے جائیں گے۔ اثر ہو جاؤ۔ کل ایک طیارہ ہماری ریاست کے سیاحوں کو لے کر جرمنی، فرانس اور یو کے جائے گا۔ ان کے پاس صرف اس ریاست کا پاسپورٹ ہوگا۔ یہ میرا چیلنج ہے کوئی میری ریاست کے کسی ایک فرد کو بھی وہاں آزادی سے گھومنے پھرنے سے نہیں روک سکے گا۔ ہمارا طیارہ ان تین ممالک کی سرحدیں عبور کرے گا۔ اس طیارے کے اترنے کے لیے تمام ملکوں کے رن وے کو خالی رکھنا ہوگا۔ ہمارا شیڈول نوٹ کرو۔ ہمارا طیارہ کل صبح دس بجے یہاں سے روانہ ہوگا اور پہلے جرمنی کے شہر فریکفرٹ میں پہنچے گا۔ چالیس گھنٹے کے بعد وہ طیارہ فرانس کے شہر پیرس جائے گا۔ پھر چالیس گھنٹوں کے بعد یو کے کے شہر لندن پہنچے گا۔ یوں سمجھو کہ مجھے حراست میں لینے کی جو دشمنی کی تھی، اس کا انتقام لینے کے لیے میں جبراً سرحدی قوانین کی خلاف ورزی کروں گا۔ دنیا والوں کے سامنے تمام سپر طاقتوں کو جھاگ کی طرح بٹھا دوں گا۔ آئندہ کسی بھی معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے میری وزارت داخلہ سے رابطہ کیا جائے۔ میں کسی سے براہ راست گفتگو نہیں کروں گا۔“

اس کے بعد اس نے کسی کی بات نہیں سنی۔ رابطہ ختم کر دیا۔ ہم زاد سے کہا۔ ”ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے اس فیصلے کا رد عمل کیا ہو رہا ہے۔ میں جرمنی جا رہا ہوں۔ تم فرانس جاؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں وہ دونوں ہوا ہو گئے۔

☆☆☆

مراد نے فیصلہ ستانے کے بعد ان کی ایک نہیں سنی تھی۔ رابطہ ختم کر کے یہ اچھی طرح جتایا تھا کہ اس کے سامنے سپر طاقتیں کچھ نہیں ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ وہ جب چاہے گا، اپنے فیصلے کے آگے انہیں جھکا تا رہے گا اور وہ بے بسی سے جھکتے رہیں گے۔ وہ سب غصے سے تھلا رہے تھے۔ لندن کے اکابرین نے تمام اتحادی ممالک کو یہ چشم دید واقعہ سنایا تھا کہ انہوں نے ایک نادیدہ جن سے ملاقات کی

ہے۔ اس سے مصافحہ کیا ہے۔ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ وہ نادیدہ جن مراد کا دشمن ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ بیس عدد جن مراد کے معمول اور تابعدار ہیں۔ ان ہی جنات نے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کیا تھا اور بیچ سمندر میں کھڑے ہوئے بحری جہاز سے محبوب علی چانڈی کو کال لائے تھے۔

پہلے تو وہ جن نامی مخلوق کو مانتے نہیں تھے پھر ایک ملک کے اکابرین نے گواہی دی کہ وہ ایک جن سے ملاقات کر چکے ہیں۔ پھر انہوں نے نی وی کی خبروں کے دوران میں ڈرائیور کے بغیر چلنے والی کار کو دیکھا تھا اور سرعام جینی سے اس کا رومانس دیکھا تھا۔ اس طرح وہ قائل ہو گئے تھے۔ یہ مان لیا تھا کہ مراد نے بیس عدد جنات کو تسخیر کیا ہے اور وہ دوسرے دن ریاست کے طیارے کو اپنی سرحد میں داخل ہونے اور فریکفرٹ کے ائر پورٹ پر اترنے سے نہیں روک سکیں گے۔

ایک اکیلے مراد کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آرمی کے ایک اعلیٰ افسر نے ناگواری سے کہا۔ ”میں کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ جاہلانہ باتیں ہیں۔ میں حکم دیتا ہوں۔ جیسے ہی وہ طیارہ ہماری سرحد میں داخل ہو، اسے مار گراؤ۔“

وہ حکم دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ وہ کرسی اچانک پیچھے ہٹ گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ جہاز کو گرانے سے پہلے خود ہی گرا پھر فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے گھوم کر سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کس مردود نے یہ حرکت کی ہے؟“

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سراہم سب دور کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ کرسی خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھی۔“

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”واٹ نان سنس۔ یہ آپ ہی آپ پیچھے کیسے جاسکتی ہے؟“

وہ کرسی آہستہ آہستہ اچھل کر ناجاتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ وہ بے یقینی سے دیدے بھاڑ بھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے چھو کر یقین کرنے لگا کہ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، وہ درست ہے اور کرسی اس کے قریب آگئی ہے۔

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ”ادھر آؤ۔ کرسی پر بیٹھو۔“ وہ قریب آ کر کرسی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر بہت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کرسی پہلے جہاں تھی، اب وہیں آگئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو ہوا، وہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ اس نے سپاہی کو حکم دیا۔ ”اٹھو۔“

وہ اٹھ گیا۔ اس نے دو سپاہیوں سے کہا۔ ”اسے اچھی طرح مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اسے نہ چھوڑنا۔“ انہوں نے کرسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کچھ نہیں ہوا۔ کوئی جن بھوت نہیں تھا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا ہکواس ہے۔ ابھی جو ہوا اس پر غور کرنا ہوگا۔ چلو ہٹو یہاں سے۔“

وہ سپاہی کرسی کو چھوڑ کر دور ہو گئے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ۔۔۔“ وہ بات پوری نہ کر سکا۔ مراد اور ہم زاد نے کرسی کو اٹھا کر فضا میں ڈرا بلند کیا۔ پھر اسے دور پھینک دیا۔ وہ چنٹا ہوا کرسی کے ساتھ فضا میں اڑتا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے افسران بھی دوڑے چلے آئے۔ وہ اسے فرش سے اٹھا کر کرسی کو سیدھا کر کے پھر اسے بٹھانا چاہتے تھے۔ وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل کر دور بھاگتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بیٹھوں گا۔ اس کرسی پر وہ۔۔۔۔۔ وہ بیٹھا ہے۔“

ایک افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کون بیٹھا ہے؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ جن ہے۔ میں مانتا ہوں۔ جنات کا وجود ہے اور وہ جنات مراد علی منگلی کے سپاہی ہیں۔“

ایک افسر نے کہا۔ ”آپ اتنی جلدی ہار مان گئے۔ اگر اس نے آپ کو اٹھا کر پھینکا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہماری پوری آرمی سے بھی ٹکرا جائے گا۔ ہم سپاہی ہیں میدان نہیں چھوڑیں گے۔ اسے چل کر رکھ دیں گے۔“ یہ کہتے ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ منہ پر گھونسا پڑا تھا۔ پھر دوسرا گھونسا پڑا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تب انہوں نے آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”سپر پاور کی آرمی میرے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ تمہاری کیا حیثیت ہے؟ باہر بالکونی میں جاؤ اور اپنے طیاروں کو دیکھو۔“

وہ حیرانی سے سن رہے تھے۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب بالکونی میں آئے۔ سامنے وسیع و عریض گراؤنڈ میں کئی جنگی طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ ”تم کہتے ہو میں تمہاری پوری آرمی سے مقابلہ نہیں کر سکتا گا اور ابھی میں چاہوں تو ان تمام طیاروں کو تباہ کر سکتا ہوں لیکن پہلے کسی ایک کو تباہ کر رہا ہوں۔“

ہم زاد ایک طیارے کے اندر ٹائم بم رکھ کر چلا آیا۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ”اس اڑتے کے اندر اور باہر سخت سکیورٹی ہے۔ یہاں ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہ لو

پرندہ وہاں پہنچ گیا۔“

اسی لمحے میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ایک جنگی طیارے کے پرچے اڑنے لگے۔ وہ شدید حیرانی اور پریشانی سے اپنے ایک طیارے کی تباہی دیکھ رہے تھے۔

جب دھماکے کا شور کم ہوا تو مراد نے کہا۔ ”یہ ہماری طاقت کا ایک نمونہ ہے۔ اب بولو تمام طیاروں کی تباہی کا منظر دیکھنا چاہو گے؟ ہمیں روک سکو گے؟“

سب ہی جلدی جلدی انکار میں سر ہلانے لگے۔ مراد نے کہا۔ ”کل ہمارا طیارہ اس ملک کی سرحد میں داخل ہوگا اور تم اسے نشانہ بنانا چاہو گے تو اس سے پہلے ہی تمہارے تمام طیاروں کو نابود کر دیا جائے گا۔ اب کل ملاقات ہوگی۔“

اس نے ایک افسر کے سر پر چیت مار کر کہا۔ ”وش بویڈلک۔“

وہ دونوں وہاں سے آری ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ وہاں یہ خبر پہنچی تھی کہ ان کے اڑنے کے ایک طیارے کو تباہ کر دیا گیا ہے اور کسی جن نے ایک اعلیٰ افسر کی پٹائی کی ہے۔

وہ سب پریشان تھے۔ انہوں نے بڑے حوصلے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریاست کا طیارہ ان کی سرحد میں داخل ہوگا تو اسے زمینی حملوں سے مار گرائیں گے لیکن وہ فوجی عزیمت سے کیا ہوا فیصلہ اب کمزور پڑ گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر میں آری کے کمانڈر اور کئی افسران نے کسی نادیہ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کل جو ہونے والا ہے، وہ آج ہو جائے۔ اس ہیڈ کوارٹر میں کل جو تباہی ہونے والی ہے، اس کا ایک نمونہ پیش کرنے آیا ہوں۔“

کمانڈر نے کہا۔ ”پلیز مسٹران سین اہم آپ کو چیلنج نہیں کر رہے ہیں۔ کل آپ کے طیارے کی طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔“

”اپنے وعدے پر قائم رہو گے تو تمہاری سلامتی ہے۔ ورنہ ایک ناقابل برداشت نقصان اٹھانے کے لیے تیار رہنا۔ کل تمہاری ایک قلعی کے باعث ہزاروں فوجیوں کے گھروں سے ماتم کرنے کی آوازیں گونجتی رہیں گی۔“

مراد اور ہم زاد وقت سے پہلے انہیں تباہی کا منظر دکھا کر وارننگ دے چکے تھے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ریاست سے آنے والے سیاحوں کو نقصان پہنچانے کی غلطی نہیں کریں گے۔ دیکھا جائے تو دشمن مرعوب ہو چکے تھے۔ ان پر اچھی خاصی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ وہ آری کے حوالے سے بڑے نقصانات اٹھا چکے تھے یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ

مراد کے خلاف محاذ آرائی کی جرأت کرنے کی نادرانی نہیں کریں گے۔ اب سے پہلے بھی مراد نے یقین سے یہی سوچا تھا اور ان کی دوستی پر بھروسہ کیا تھا لیکن انہوں نے اچانک ہی اسے طیارے سمیت ٹریپ کر لیا تھا۔ ان کی دوغلی دوستی سے سبق حاصل ہوا تھا کہ آئندہ بھی ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔

سانپ کی فطرت ہے ڈسٹا۔ انہیں لاکھ دودھ پلاؤ۔ وہ ڈسنے سے باز نہیں آئیں گے۔ مراد نے اسکا پ کے ذریعے پھر ان سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”میں نے اپنے پروگرام میں ایک تبدیلی کی ہے۔ یہاں کے سیاح ریاست کے طیارے میں نہیں جائیں گے۔ آپ حضرات ایک خصوصی طیارہ یہاں بھیجیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”میری ریاست میں دوغلی مسافر بردار طیارے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو سیاحوں کے لیے استعمال کروں گا تو دوسرے مسافروں کو پریشانی ہوگی۔ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کروں گا۔ آپ ایک طیارہ ان کے لیے بھیج دیں۔“

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اسکا پ کو آف کر کے ایک دوسرے سے بولتے رہے۔ ایک نے کہا۔ ”وہ بہت گہرا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہم سے ہمارے طیارے کا مطالبہ کیا ہے۔“

دوسرے نے ناگواری سے اور بے بسی سے کہا۔ ”مطالبہ تو پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ رجسٹریشن اور بڑھیں گی۔ ہم اس کی باتیں مان کر ہی اختلافات کو کم کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے پھر اسکا پ کے ذریعے کہا۔ ”ویل ہز ہائی نس! ہم آپ کو خوش کرنا اور اختلافات کو کم سے کم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اور چوبیس گھنٹے کا وقت دیں۔ ہم کل نہیں، پرسوں صبح آپ کے پاس ایک طیارہ پہنچا دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”شکریہ۔ آپ مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ واقعی آپ حضرات کے ایسے ہی طرز عمل سے اختلافات ختم ہوتے رہیں گے۔“

ان سنے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہاں مراد کے ساتھ اس کا ہم زاد بشری اور بلا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ”تم تینوں توجہ سے سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ دشمن پھر چال بازیوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اس بار وہ ہمارے طیارے کو صرف ٹریپ نہیں کریں گے، اسے اپنی سرحدی حدود میں مار گرائیں گے۔ اب یہ اندیشہ ختم ہو گیا ہے۔ طیارہ ان کا ہوگا۔ مسافر ہمارے ہوں گے۔“

ہم زاد نے سر ہلا کر کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ اس طرح وہ اپنے طیارے کو تباہ نہیں کریں گے۔ یہاں سے جانے والے ہمارے سیاح محفوظ رہیں گے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”بھائی! ان امیر کبیر ممالک کے لیے ایک چھوٹا طیارہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے ان کے کئی طیارے مار گرائے ہیں۔ ایک طیارہ اور سبھی۔ وہ اسے مار گرائیں گے تو ہمارے تمام سیاح مارے جائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”درست کہتی ہو۔ کتوں کی دم ٹیڑھی رہتی ہے۔ وہ ٹیڑھے ہی رہیں گے۔ پھر نقصان اٹھائیں گے۔ ہم انہیں پھر سبق سکھائیں گے۔ وہ اپنا طیارہ تباہ کریں گے اور اپنا سر پکڑ لیں گے۔ ہمارا ایک بھی سیاح مارا نہیں جائے گا۔“

تینوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”ہمارا کوئی سیاح کوئی معصوم شہری اس طیارے میں نہیں جائے گا۔ صرف بہروپے سیاح جائیں گے۔“

بلے نے پوچھا۔ ”وہ بہروپے سیاح کون ہوں گے؟“

مراد نے کہا۔ ”وہ ہوں گے جن کے مقدر میں موت لکھی جا چکی ہے۔ جنہیں ہر حال میں مرنا ہی مرنا ہے۔“

وہ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”میں نے جیلر سے معلوم کیا ہے۔ ہماری ریاست کی جیل میں چھ قیدی ایسے ہیں جو بہت ہی بے رحم اور سنگدل مجرم ہیں۔ جن کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ عدالت انہیں سزائے موت کا حکم سن چکی ہے۔ اب انہیں یہاں پھانسی نہیں دی جائے گی۔ وہ طیارے میں جا کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”واہ بھائی! کیا زبردست آئیڈیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”اور چار مجرم ایسے ہیں جو عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ انہیں بھی طیارے میں بھیج دیا جائے گا۔ اب سوچو کہ وہاں کیا ہوگا؟ اگر دشمنوں نے اپنے جہاز کو تباہ نہ کیا اور وہ دس مجرم زندہ رہ جائیں گے تو وہاں پہنچتے ہی ہماری ریاست کے عدالتی فیصلے سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہاں واپس نہیں آئیں گے۔ وہ سب ان ممالک سے پناہ کی درخواست کریں گے۔ انہیں پناہ نہیں دی جائے گی تو وہ وہاں کے شہروں اور مختلف علاقوں میں بھاگتے اور چھپتے پھریں گے۔ ہماری ریاست میں واپس نہیں آئیں گے۔ یہاں انہیں موت ملے گی۔ وہاں روپوش رہ کر زندگی ملتی رہے گی۔ وہ دس مجرم بہت خطرناک ہیں۔ جہاں جائیں

گے وہاں قانون کے محافظوں کی نیندیں حرام کر دیں گے۔“

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”بھئی میری انتقامی کارروائی ہوگی۔“

بشریٰ نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ”واہ بھائی! کیا کمال کا آئیڈیا ہے۔ آپ یہاں بیٹھے رہیں گے۔ کچھ نہیں کریں گے اور وہاں بڑے بڑے سے انتقامی کارروائی ہوتی رہے گی۔“

اس نے بشریٰ سے کہا۔ ”تم بلے کے ساتھ ان قیدیوں سے ملنے کے لیے جیل میں جاؤ گی۔ ان میں سے دو قیدی عورتیں ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ ان سب کو ایک طیارے میں فریگٹرٹ بھیجا جا رہا ہے۔ وہ سیاحوں کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنی اصلیت بیان کریں گے اور ان سے پناہ مانگیں گے۔ اگر انہیں پناہ نہیں ملے گی اور وہ واپس آئیں گے تو ان کے لیے سزائے موت اور عمر قید لازمی ہوگی۔ لہذا وہ واپس آنے کی نادانی نہ کریں۔ وہیں کسی طرح زندہ رہیں۔“

پھر اس نے ہم زاد سے کہا۔ ”تم ان دس مجرموں کی نگرانی کرو گے اور دشمنوں کا رد عمل دیکھتے ہوئے اپنے طور پر کارروائی کرتے رہو گے۔ میں ماروی اور محبوب صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ وہاں دشمن ایک نئی چال چل رہے ہیں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں ماہ نور کے پاس آیا۔ وہاں ایک دیوار پر ایک بڑی سی اسکرین تھی۔ اس اسکرین پر انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے کئی اہم عہدیدار نظر آرہے تھے۔ ریاست کے تمام حساس شعبوں میں خفیہ کیمرے اور مانک نصب کیے گئے تھے۔ ماہ نور وہاں بیٹھی چھتیل بدل بدل کر ہر شعبے کے عہدیداروں کو اور دیگر اہم افراد کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ ہم زاد کی شریک حیات زیب النساء بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اپنی خواب گاہ میں اسی طرح مصروف رہتی تھی۔ چالاک جاسوس اور آرمی کے افسران ان خفیہ کیمروں اور مانکروں سے اس لیے بے خبر تھے کہ مراد اور ہم زاد نے نادیدہ ہو کر بڑی رازداری سے انہیں وہاں نصب کیا تھا۔

ان میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی خفیہ باتیں محل کی خواب گاہوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ماہ نور اور زمینی اہم اور قابل اعتراض باتوں کی ریکارڈنگ کو محفوظ کرتی رہتی تھیں۔ جو لوگ حکومت کے اور ریاست کے خلاف باتیں کرتے تھے، ان کے نام بلیک لسٹ میں آ جاتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف باتیں کرتے ہیں لیکن مراد کے

آفس گیا تھا، اسی کار میں اسی سوٹ میں واپس آیا ہے۔ وہ سب اچھی طرح نگرانی کر رہے تھے۔ جلد بازی میں دھوکا کھانا نہیں چاہتے تھے۔ دن رات یہی دیکھ رہے تھے، محبوب معمول کے مطابق کوٹھی سے آفس جاتا تھا۔ اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شام کو محبوب آفس کا دروازہ اندر سے بند کرتا تو مراد حاضر ہو جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لباس تبدیل کرتے تھے۔ پھر مراد کبھی دن کو برقع پوش کنیز کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے بھی جاتا تھا۔ اسے شاپنگ بھی کراتا تھا۔

دشمنوں کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ماروی اور محبوب اسی کوٹھی میں ہیں۔ ایسے وقت مراد اس نامحرم کنیز کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہتا تھا۔ اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے ماہ نور کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ رات گزارتا تھا۔ شاور لے کر فجر کی نماز پڑھنے محبوب کی کوٹھی میں آ جاتا تھا۔

تین دن اور تین راتوں تک اچھی طرح نگرانی کے بعد دشمنوں کو یقین ہو گیا کہ وہ دھوکا نہیں کھا رہے ہیں۔ انہوں نے جینی کے ذریعے اس کے ناویدہ پار مسٹران سین کو بلایا۔ اس سے کہا۔ ”محبوب کی کوٹھی میں جا کر دیکھو۔ وہاں وہ ماروی کے ساتھ موجود ہے یا نہیں؟“

ہم زاد نے تھوڑی دیر بعد آ کر کہا۔ ”وہاں محبوب ہے لیکن میں ماروی کو صورت سے پہچانتا نہیں ہوں۔“ انہوں نے اسے نمرہ کی تصویر دکھائی۔ وہ آخری بار لندن سے نمرہ کی صورت لے کر آئی تھی۔ محبوب نے رازداری سے پھر اس کی پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔ ماروی کو اس کا اصلی چہرہ واپس مل گیا تھا۔ یہ دشمن۔ نہیں جانتے تھے۔

ہم زاد نے نمرہ کی تصویر دیکھ کر کہا۔ ”ایسی صورت والی اس کوٹھی میں نہیں ہے۔ محبوب نے کسی ماہر سے اس کا چہرہ بدل دیا ہوگا۔ تمہارے وہ تمام نگرانی کرنے والے کیا کہتے ہیں؟“

”انہوں نے ماروی کو ہمیشہ عبا اور نقاب میں دیکھا ہے۔ اسے صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ ماروی کسی دوسرے روپ میں وہاں ہے یا نہیں؟“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹران سین! پلیز وہاں تھوڑی دیر رہ کر دیکھیں۔ ماروی ہوگی تو محبوب اس کے ساتھ بیڈ روم میں جائے گا یا کسی وقت اسے ماروی کے نام سے پکارے گا۔“

”اچھی بات ہے، میں وہاں جا کر تھوڑی دیر تک

خلاف عملی طور پر کچھ کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور دس بار اپنے کان پکڑتے تھے اور جو عملی طور پر کچھ کرنا چاہتے تھے ان کی لاشیں شہر کے چوراہوں پر الٹی لٹکی ہوئی دکھائی دیتی تھیں اور بڑے سے بلیک بورڈ پر ان کے جرائم کی تفصیل لکھی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔ اس کے بہترین نتائج سامنے آرہے تھے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ حقائق نقش ہو گئے تھے کہ موجودہ حکمران کی سیکرٹ فورس بہت فعال ہے۔ وہ تاریکی میں بھی ان کی حرکتوں کو دیکھ لیتے ہیں۔

☆☆☆

مراد نے پہلے ہی محبوب کو یہ بتا دیا تھا کہ دشمن اب اس کے اور ماروی کے لیے پرابلم بننے والے ہیں۔ اس بار وہ بڑی پلاننگ سے دشمنی کرنے والے ہیں۔ جرائم کی دنیا کی جو بحرمانہ تنظیمیں ہیں ان کے ہی ناموں سے مجرموں کا لشکر کراچی سمجھنے والے ہیں۔ لہذا اس سے پہلے ہی بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرنا لازمی ہو گیا تھا اور وہ عمل کر رہے تھے۔ ماروی جس کوٹھی میں رہتی تھی، وہاں تین کنیزیں خدمت گزاری کے لیے آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک کنیز پردے کی سخت پابندی تھی۔ کوٹھی کے باہر نہیں آتی تھی۔ چھپ کر نگرانی کرنے والے دشمنوں نے اس کو اور ماروی کو کبھی کھڑکی اور دروازے پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

محبوب کے آفس کے پیچھے ایک بہت ہی آرام دہ کمر تھا۔ وہ کنج کے بعد وہاں ایک آدھ گھنٹے کے لیے لیٹنے جاتا تھا۔ اس نے اس کمرے کو عارضی طور پر اپنی رہائش گاہ بنالیا۔ ایک رات ماروی کو بڑی رازداری سے وہاں لے آیا۔ تمام سیکورٹی گارڈز کو تائید کی۔ یہ کہا کہ کسی سے یہ ذکر نہ کیا جائے کہ اس کے ساتھ ایک خاتون وہاں آ کر رہنے لگی ہے۔

وہ تمام گارڈز وفادار تھے۔ کسی سے ذکر کرنے والے نہیں تھے۔ یوں ماروی کو کوٹھی سے چپ چاپ وہاں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد محبوب کو مراد کا انتظار تھا۔ جب وہ آیا تو اس روز محبوب شام تک دفتر میں مصروف رہا۔ پھر مراد نے کہا۔ ”دروازہ بند کرو۔“

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسی لمحے میں مراد بالکل اسی سوٹ میں حاضر ہو گیا جیسا کہ محبوب نے پہنا ہوا تھا۔ محبوب اس سے مصافحہ کر کے پیچھے رہائشی کمرے میں ماروی کے پاس چلا گیا۔ مراد دروازہ کھول کر آفس سے باہر آیا تو سب اسے محبوب سمجھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر آ کر محبوب کی کار میں بیٹھ کر کوٹھی میں پہنچ گیا۔ نگرانی کرنے والے دیکھ رہے تھے کہ محبوب جو سوٹ پہن کر جس کار میں

رہوں گا۔“

وہ چلا گیا۔ سب ہی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔۔۔۔۔
بہن زاد نے پندرہ منٹ بعد آکر کہا۔ ”وہ اس حسینہ کے ساتھ بیڈروم
میں گیا ہے، اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا ہے۔“

پھر کسی طرح کے شے کی گنجائش نہیں رہی۔ انہوں نے
اسی وقت فون کے ذریعے کہا۔ ”تصدیق ہو گئی ہے۔ ماروی اور
محبوب ابھی کوٹھی کے اندر ہیں۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے
گھیر لو۔ پھر ہمیں رپورٹ دو۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی مراد نے اسکاٹپ کے ذریعے ان
سے رابطہ کیا۔ پھر غصے سے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی محبوب
صاحب نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کی کوٹھی کو درجنوں مسلح
افراد نے گھیر لیا ہے اور حکم دے رہے ہیں کہ کوٹھی کے اندر
جتنے ہتھیار ہیں، انہیں باہر پھینک دیا جائے۔ سامنے کا
دروازہ کھلا رکھا جائے۔ وہ مسلح افراد اندر آ کر انہیں قیدی
بنانے والے ہیں۔“

یہ سن کر وہ سب ہی اندر سے خوش ہو رہے تھے۔
بظاہر پریشانی ظاہر کر رہے تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔
”ہز ہائی نس! ہم سے قسم لے لو۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ
باتیں ہم آپ کے منہ سے سن رہے ہیں۔ ہم ابھی اپنے
ذرائع سے معلوم کرتے ہیں کہ وہاں کون لوگ ہیں اور ایسی
حرکتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

مراد محل میں بیٹھا اسکاٹپ کے ذریعے انہیں دیکھ رہا
تھا۔ ایک فوجی افسر کئی اعلیٰ عہدیدار فون پر کسی نہ کسی سے
بول رہے تھے۔ پھر ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہز ہائی نس! یہ
معلوم ہو رہا ہے کہ مجرموں کی ایک خطرناک تنظیم ریڈ الرٹ
اور اس کی اتحادی تنظیمیں آپ کے خلاف ایسا کر رہی ہیں۔
میں نے انہیں آپ کا فون نمبر دیا ہے۔ وہ آپ سے باتیں
کرنے والے ہیں۔“

دس منٹ کے بعد ہی کسی نے مراد سے کہا۔ ”ہیلو! کیا
تم مراد علی منگی ہو؟“

”ہاں۔ میں ریاست ارض اسلام کا حاکم اعلیٰ مراد علی
منگی ہوں۔ تم کون ہو؟“

وہ حقارت سے بولا۔ ”اونہ۔۔۔۔۔ ایک بدترین مجرم،
ایک سفاک قاتل سر پر تاج پہن کر بادشاہ نہیں بن جاتا۔ تم
دو کوڑی کے مجرم ہو، مجرم ہی رہو گے۔“

مراد اسکاٹپ کو آف کر کے چمک چمکتے ہی بولنے
والے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم
میں فون ہوکان سے لگائے بیٹھا تھا۔

مراد نے پوچھا۔ ”یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟“

”میں ریڈ الرٹ کا موجودہ سربراہ جنکی براؤن ہوں۔ تم
نے میرے باپ کو چچا کو اور میرے بزرگ برنارڈ کو موت کے
گھاٹ اتارا ہے۔ آج تم میری منگی میں آرہے ہو۔ میرے
چار درجن شوٹرز نے تمہاری چیتھی ماروی کو اور محبوب علی چانڈیو کو
ان کی کوٹھی میں قید کر دیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر ان
دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔“

”پہلے تو یہ کہہ دوں کہ میں جنکی براؤن کے لب و لہجے
کو خوب پہچانتا ہوں۔ تم جنکی براؤن نہیں ہو۔ اگلا کوئی قدم
اٹھانے سے پہلے سچ بولو تم کون ہو؟ اور کس کے اشارے پر
ناچنے کے لیے ماروی اور محبوب کی طرف گئے ہو؟“

”تم نہ مانو کہ میں جنکی براؤن ہوں۔ کوئی فرق نہیں
پڑے گا۔ یہ دیکھو کہ وہ دونوں میری قید میں ہیں اور اپنی
زندگی کی چند آخری سانسیں لے رہے ہیں۔“

”اچھا تو چلو اپنے اوپر والوں سے پوچھ لو کہ
تمہارے آدمیوں کو کب اس کوٹھی کے اندر جا کر ان دو
قیدیوں کو ہلاک کرنا ہے۔ میں انہیں بچانے کے لیے کراچی
جار ہا ہوں۔“

مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس شخص نے فوراً ہی اپنے
فون پر نمبر شیخ کیے۔ مراد اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے
رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ”سر! میں نے مراد سے باتیں کی ہیں۔
وہ دھونس میں نہیں آرہا ہے۔ اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ وہ
کہتا ہے کہ میں جنکی براؤن نہیں ہوں۔ آپ بتائیں، اب
مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اسی وقت مراد نے اس سے فون چھین کر اپنے کان
سے لگایا۔ وہ شخص حیرانی سے اور خوف سے منہ کھول کر دیکھنے
لگا۔ اس کا فون فضا میں معلق تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے
اپنے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو منہ پر کرائے کا ہاتھ پڑا۔
وہ صوفے پر سے نیچے فرش پر گر پڑا۔ پھر وہاں سے اٹھنے کی
جرات نہ کر سکا۔

دوسری طرف سے ایک حاکم اعلیٰ کہہ رہا تھا۔ ”اپنے
شوٹرز سے بولو، وہ کوٹھی میں گھس کر ماروی اور محبوب کو ہتھکڑیاں
پہنائیں۔ یہ یقین کر لو کہ وہ واقعی شکنجے میں آگئے ہیں۔“

مراد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا تو مسٹر
سیر پاؤر! یہ تم ہو۔ کرائے کے شوٹرز کے کاندھوں پر بندوق
رکھ کر چلا رہے ہو۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“
مراد نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ہز ہائی نس

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بے گھر

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

یہ دن ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C II، انٹرنیشنل فیس باؤنڈ، قادیان، پاکستان

فون: 021-35895313، 021-35802551

... کا ایک تابعدار جن ہوں۔ ابھی تمہاری اصلیت بتانے
اپنے آقا کے پاس جا رہا ہوں۔“

ادھر اس نے فون بند کیا، ادھر سپر پاور اور اس کے
اتحادیوں کے ہوش اڑ گئے۔ اگر مراد اتنی لمبی چال نہ چتا تو دشمن
کبھی اعتراف نہ کرتے کہ وہ پھر کمینگی دکھا رہے ہیں۔ اعلیٰ حاکم
نے دوسرے ماتحت سے کہا۔ ”ہمارا بھید کھل رہا ہے۔ فوراً کوٹھی
میں گھس کر ماروی اور محبوب کو اپنے شکنجے میں لو۔ مراد کی یہ بہت
بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ میں رہے گی۔“

پھر اس نے جینی کے ذریعے مسٹران سین کو بلایا اور
کہا۔ ”مراد کے سامنے پھر ہماری دشمنی کھل رہی ہے۔ پلیز
اس کوٹھی میں جاؤ۔ مراد کے کسی جن کور کاوٹ نہ بنے دو۔“
ہم زاد نے کہا۔ ”میں ابھی جاتا ہوں۔ مراد سے
انتقام لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔“

ادھر کئی شوٹر ہاتھوں میں گن لیے محتاط انداز میں کوٹھی
کے اندر آئے۔ وہ بار بار لٹکا رہے تھے۔ ”خبردار! کوئی
گولی چلائے گا تو ہم یہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔
محبوب علی چاندیو! زندہ رہنا چاہتے ہو تو ماروی کے ساتھ
ہمارے سامنے آ جاؤ۔“

وہ لٹکا رہے تھے اور کوٹھی کے ایک ایک حصے میں
جا رہے تھے۔ تین کنیزوں کو گرفتار کیا گیا اور کوئی نظر نہیں
آیا۔ ایک نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں؟“
ایک کنیز نے کہا۔ ”ہماری مالکن کوئی چار دن پہلے
کہیں چلی گئی ہیں۔ پھر واپس نہیں آئیں۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ہم نے کل ہی دیکھا ہے۔
وہ محبوب کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شاہجنگ کے لیے گئی تھی۔“
کنیز نے کہا۔ ”وہ میں تھی۔ عبا اور نقاب میں باہر
جاتی ہوں۔ گھر کی ضرورت کا سامان لانے کے لیے مالک
کے ساتھ گئی تھی۔“

”تمہارا مالک محبوب کہاں ہے؟“
”وہ ایک گھنٹا پہلے یہاں اپنی خواب گاہ میں تھے۔“
”ہم خواب گاہ میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ نہیں ہے۔ وہ
اس کوٹھی سے باہر کیسے جاسکتا ہے؟“

دوسری کنیز نے کہا۔ ”ہم خود حیران ہیں کہ وہ کہاں گم
ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔“
ایک شوٹر نے کنیز کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک
جھکادیتے ہوئے کہا۔ ”سیدھی طرح نہیں بتاؤ گی تو.....“
بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ
نکلی۔ اس نے جس ہاتھ سے اس کے بالوں کو پکڑا تھا، اس

ہاتھ پر کوئی کیلی چیز چبھی تھی وہاں سے لہو بہہ رہا تھا۔

پھر دوسرے ہاتھ میں وہی تکلیف دہ چبھن ہوئی تو گن چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اس ہاتھ سے بھی لہو بہہ رہا تھا۔ پھر دوسرے تیسرے شوٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے خون آلود ہاتھوں سے ہتھیار نکل کر فرش پر گر پڑے۔ وہ سب ہم گئے۔ ان کینیزوں سے دور ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں کوئی ہے۔ ہم پر حملے کر رہا ہے اور نظر نہیں آرہا ہے۔“

وہاں مراد کے علاوہ ہم زاد بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ وہ ایک ایک شوٹر پر چاقو چلانے لگے۔ انہیں ہلاک نہیں کر رہے تھے، صرف زخمی کر رہے تھے۔ وہ سب چیختے چلاتے ہوئے کوشی سے باہر بھاگنے لگے۔ باہر جن شوٹرز نے کوشی کا محاصرہ کیا تھا، ان پر بھی یہ عذاب نازل ہونے لگا۔ وہ سب زخمی ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زخمی کرنے والے کہاں ہیں اور انہیں کس سمت گولی چلانا چاہیے؟ وہ اپنی سلامتی کے لیے بھاگتے چلے گئے۔

ذرا سی دیر میں کوشی کے اندر اور باہر ویرانی چھا گئی۔ وہاں ایک بھی ہتھیار والا نہ رہا۔ کوشی کے اندر صرف تین کینیز رہ گئیں۔ محبوب نے فون کے ذریعے انہیں تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آرام سے کوشی میں رہیں۔ وہ سب محفوظ ہیں۔ اب کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

سپر پاور اور اس کے اتحادی اسکا پ کے ذریعے رابطے میں تھے۔ ہم زاد نے آکر کہا۔ ”ہم سب دھوکا کھا گئے۔ اس کوشی میں ایک جن محبوب کی صورت بنا کر رہتا تھا۔ تمہارے شوٹرز اور نگرانی کرنے والے جاسوس اسے محبوب علی چاند یو سمجھتے رہے۔“

ایک نے سوال کیا۔ ”تم اسے کیوں نہ پہچان سکے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ایک جن دوسرے جن کے اندر گھس نہیں سکتا، اس کی اصلیت معلوم نہیں کر سکتا۔ جب محبوب اچانک اس کوشی سے غائب ہوا، تب پتا چلا کہ وہ ایک جن تھا۔ اس کے بعد کئی جن وہاں آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں چاقو تھے اور وہ تمہارے درجنوں شوٹرز کو زخمی کرتے جا رہے تھے۔ میں چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن اکیلا ان تمام جنات سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ نہ مراد نے نہ محبوب نے کسی سے مقابلہ کیا ہے، وہ اپنے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور آپ حضرات مات کھا رہے ہیں۔ وہاں میدان صاف ہو چکا ہے۔ اب آپ کیا

کریں گے؟“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”تم ہمارے لیے کچھ نہ کر سکتے۔ تمہاری جناتی قوتیں ہمارے کسی کام نہیں آئیں۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ تمہا ہوں اور وہ کئی تھے۔ ان کی جناتی قوتیں مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں آئندہ بھی تمہارے کام نہیں آسکوں گا۔ آئندہ جینی کی طرف رخ نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ عیش و آرام سے رہوں گا۔ کسی نے جینی کو نقصان پہنچانا چاہا تو اس کی شامت آجائے گی۔ میرے خلاف نیا محاذ کھولنے کی حماقت نہ کرنا۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹر ان سین ایلیز ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ ہم تم سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔“

انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ جا چکا ہے۔ ایک پلان میکر نے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟ آپ حضرات اپنی ہتھیلیوں پر دیکھتے ہوئے انگارے رکھ کر مراد سے دوستی کی قسمیں کھائیں گے، تب بھی وہ ہم پر یقین نہیں کرے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اب تو وہ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کرے گا۔ پتا نہیں وہ کیسی انتقامی کارروائیاں کرنے والا ہے۔ اب ہمیں صرف اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ کر ان پر عمل کرنا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم نظر نہ آنے والے جنات کی دشمنی سے خود کو بچا نہیں پائیں گے۔“

ایک مشیر نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے۔ ہم مراد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا اعلان کریں۔ بین الاقوامی عدالت کی طرف سے مراد کو کھپا جائے گا کہ ہتھیار ڈالنے والے سپاہیوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ لہذا وہ انتقامی کارروائی نہ کرے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”اس طرح ہم اس کی انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رہیں گے لیکن ہم پوری دنیا میں سپر پاور کہلاتے ہیں۔ ہماری بڑی توہین ہوگی۔ ہمارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ وہ ناخن برابر ریاست سپر پاور کہلائے گی۔ ہم کئی معاملات میں اس کے تابعدار بن کر رہ جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”نہیں۔ ہمیں اس قدر خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے؟“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اسے انتقامی کارروائیاں کرنے دو۔ دیکھتے ہیں کیا ہوگا؟ ہم کچھ نقصان اٹھاتے رہیں گے اور بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

پولیس انہیں زبردستی طیارے میں بٹھا کر ریاست میں پہنچا دیتی۔

مجرموں کو کسی مجرم کے ہی گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ وہ دس مجرم کئی کئی منزل تنظیموں کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ایسی تنظیموں سے رابطے کیے اور کہا کہ وہ ان کے لیے واردات کرتے رہیں گے۔ فی الحال ان کی مدد کی جائے۔ ان سب نے التجا کی کہ انہیں فی الحال ایسی جگہ چھپا دیا جائے، جہاں قانون کے محافظ انہیں گرفتار نہ کریں اور انہیں ریاست میں واپس جانے پر مجبور نہ کر سکیں۔

ریڈ الرٹ کے سربراہ جنگی براؤن نے کہا۔ ”ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ مراد کو گولی مار دے۔“

ایک نے کہا۔ ”ہم مراد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں اور آپ ہمیں اس کے پیچھے لگانے کی بات کر رہے ہیں۔“

جنگی براؤن نے کہا۔ ”وہ روز اول سے ہمارا ایک ایسا دشمن ہے جو ہمارے نشانے پر نہیں آ رہا ہے۔ اسے مار کر ہی تم سب ہماری پناہ میں رہ سکو گے۔“

”ہم ریاست میں نہیں جائیں گے۔ وہ ریاست سے باہر کسی بھی ملک میں آئے گا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”چلو یہی سہی۔ اسے ہلاک کرنے تک تم ہمارے لیے دوسرے کام کرتے رہو گے۔ ہم لوے گھنٹے پورے ہونے سے پہلے تم سب کو کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔“

بہر حال وہ چھٹے ہوئے بد معاش تھے۔ انہوں نے اپنے لیے پناہ حاصل کرنے کی جگہ ڈھونڈ لی۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک سہمے ہوئے سے انتظار کر رہے تھے مراد کی طرف سے کسی وقت بھی انتقامی کارروائی ہونے کی توقع تھی لیکن ایک دن اور ایک رات گزرنے کے بعد بھی اس کی طرف سے بڑی پراسرار خاموشی تھی۔ وہ کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اور یہ اس لیے کہ مراد علی منگی کے غبارے سے ہوا نکل رہی تھی۔ بابا اجیری نے کہا تھا کہ نادیہ ہونے اور چشم زدن میں کہیں بھی پہنچ جانے کی صلاحیتیں عارضی ہیں کسی وقت بھی یہ صلاحیتیں نابود ہو جائیں گی اور وہ وقت آئی گیا۔

انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ ہمیشہ جوانی کی چھلانگیں نہیں مار سکتا۔ جوانی کو زوال ہے اور بڑھاپے میں جینا محال ہے اور آدمی نہ ہی سدا با کمال رہتا ہے۔ اس دنیا میں اس سے سب کچھ چھن جاتا ہے۔

نادیدہ ہو جانے کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ اس نے

وہ ٹوٹ جانا چاہتے تھے لیکن جھکنا نہیں چاہتے تھے۔

☆☆☆

وہ جہاز ریاست کے دس نام نہاد سیاحوں کو لے کر فریکفرٹ پہنچ گیا۔ وہاں کی پولیس اور ایٹمی جنس والے یہ شبہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ریاست کے دس محسوم ہیں۔ سیاح بن کر آئے ہیں۔ اوپر سے یہ احکامات جاری ہوئے تھے کہ ان سب کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا جائے لیکن انہوں نے اخبارات اور ٹی وی والوں کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ خطرناک مجرم ہیں، قاتل ہیں۔ ریاست کی عدالت نے انہیں سزائے موت کا اور عمر قید کا حکم سنایا ہے۔

یہ حیرانی کی بات تھی کہ موت کی سزا پانے والوں کو اور آہنی سلاخوں سے بھیجا باہر نہ آنے والوں کو مراد نے ان کے ملک میں بھیج دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا۔ ”وہاں تمہیں دی ہوئی سزاؤں پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟ تم سب کو رہا کیوں کر دیا گیا ہے؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمیں بظاہر رہائی ملی ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ریاست میں واپس جائیں گے تو سزائے موت کے احکامات کے مطابق ہمیں پھانسی کے پھندوں سے لٹکا دیا جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم اسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں کہ یہاں سے واپس نہ جائیں۔ آپ کی حکومت سے التجا کر رہے ہیں کہ ہمیں یہاں کی شہریت دے کر ہم پر احسان کریں۔ ہم یہاں شرافت سے اور امن و امان سے رہیں گے۔“

حکومت کے اکابرین نے ان کے بیانات سن کر کہا۔ ”ہر ہائی نس مراد علی منگی نے ہم سے کہا ہے کہ ان کے دس سیاحوں کو یہاں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ وہ تیس گھنٹے جرمنی میں، تیس گھنٹے فرانس میں اور تیس گھنٹے یو کے میں گزاریں گے۔ نوے گھنٹوں کے بعد انہیں خیر خیریت سے ریاست واپس بھیجا جائے۔ ہمیں افسوس ہے۔ ہم تمہیں یہاں کی شہریت نہیں دیں گے۔ ہر ہائی نس سے جو معاملات ملے ہو چکے ہیں اس کے مطابق ٹھیک تیس گھنٹے کے بعد ہمارا طیارہ تمہیں اس ملک کی سرحد سے باہر کر کے فرانس کے شہر پیرس پہنچا دے گا۔“

وہ دس مجرم گرداب میں پھنس گئے۔ نہ اس کنارے اتر سکتے تھے نہ اس کنارے جا سکتے تھے۔ وہ ریاست واپس جا کر موت کو گلے نہیں لگا سکتے تھے اور وہ تینوں ملکوں میں نوے گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزار سکتے تھے۔ وہاں کی

خواب میں حضرت صلاح الدین اجمیری کو دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے۔ ”انسان اپنی دنیا میں انسانی صلاحیتوں سے کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ روحانی صلاحیتیں صرف ان مومنین کو حاصل ہوتی ہیں جو دنیاوی مصروفیات کم سے کم کر کے دین و ایمان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ تم اپنی ذات تک عبادت گزار ہو۔ نیک اعمال کے حامل ہو لیکن دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کبھی جھوٹ بولنے اور فریبی چالیں چلنے پر مجبور ہو جاتے ہو۔ دنیاوی معاملات میں الجھنے والے ہمیشہ سچ نہیں بول سکتے۔ میرا پھیری سے باز نہیں آسکتے۔ بے شک تم نیک مقاصد کے لیے ایسا کرتے ہو لیکن مومن وہ ہے، جو جان دے دیتا ہے لیکن جھوٹ نہیں بولتا۔ چالبازیاں ہمارے دین میں ممنوع ہیں اور تم حالات سے مجبور ہو کر کبھی دینی احکامات کے خلاف زندگی گزارتے رہو گے۔ اس لیے اس لمحے سے تمہاری روحانی صلاحیتیں ختم ہو رہی ہیں۔ یہ تمہارے لیے بد نصیبی کی بات ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری عبادت گزاری اور نیک اعمال کے باعث اللہ تم سے راضی ہے۔ لہذا میں بھی تمہاری راہ نمائی کے لیے آتا رہوں گا۔“

خواب تمام ہوا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب تک کی شد زوریوں کے بعد کمزوری نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اندر سے روح نکل گئی ہے۔ وہ فقط جسمانی ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ وہ حوصلہ ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن اچانک ملنے والی توانائی اچانک ہی چلی گئی تھی۔ اس لیے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ سنبھلنے میں وقت لگ رہا تھا۔

ماہ نور شاہور لے کر آگئی تھی۔ وہ بھی شاہور لینے کے بعد بالکوئی میں آکر اس کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ وہ دونوں خاموشی سے عبادت میں مصروف رہے۔ پھر مراد نے دعا مانگنے کے بعد ماہ نور سے کہا۔ ”تم میری راز دار ہو۔ ایک اور راز کی بات سنو۔ میری نادیدہ ہو جانے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔“

اس نے چونک کر مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا آئندہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکیں گے؟“

”نہیں۔ وہ ایک عارضی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔“ وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”یا اللہ...! آپ کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ دشمن بے حساب ہیں اور وہ بے حساب عسکری قوتیں رکھتے

ہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ تنہا کس طرح ان سے نمٹ سکیں گے؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کے لیے کیا کروں؟“

”دل سے عبادت کرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ بابا اجمیری نے بشارت دی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ رب راضی تو جگ راضی۔“

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ہم زاد کھڑا تھا۔ چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔ اس نے سر جھکا کر بڑے کرب سے کہا۔ ”میں ابھی غائب ہو کر کہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جاسکا۔“

مراد نے جبراً مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”پریشان کیوں ہو؟ ہم جیسے تھے ویسے ہی رہیں گے۔“

وہ ایک سر دآہ بھر کر بولا۔ ”بابا صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں عارضی صلاحیتیں مل رہی ہیں۔ یہ کسی وقت بھی ہوا ہو جائیں گی لیکن ہم بھول گئے تھے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نہیں بھولا تھا۔ ہر نماز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا اور کسی دن محرومیت کا جھٹکا کھانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یہ جھٹکا تم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔“

”ہاں، محرومیت نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔“

”صاف بولو کہ اب جینی کے پاس نہیں جا سکو گے۔ اب راستے میں سمندر ہے، پہاڑ ہیں، دشمن ہی دشمن ہیں۔ کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اب دنیا والوں کو اندھا کر کے چشم زدن میں وہاں پہنچ نہیں پاؤ گے۔“

وہ بڑی پریشانی سے خلا میں تک رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ ہمیں یہ عارضی صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں لیکن عشق و محبت کی رنگینیوں میں بھول گئے تھے۔“

”نہیں۔ مجھے یاد تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ہی یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اب کیا ہوگا۔ میں جینی کے پاس کیسے پہنچوں گا؟ وہ ہزاروں میل دور ہے۔“

”تجربہ ہے۔ تمہیں صرف جینی کی فکر ہے۔ بے شمار دشمنوں کی طرف سے تشویش نہیں ہے۔“

”میں ابھی یہی کہنے والا تھا۔ آئندہ ہم ان سے کیسے نمٹ سکیں گے؟ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی جن ہمارا تابعدار نہیں ہے۔“

”انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی ایک عرصے تک ان کے دلوں پر دہشت طاری رہے گی۔ وہ نادیدہ جنات

ہماری کوشش ہوگی کہ دشمنوں کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ وہ اسی فریب میں مبتلا رہیں کہ میں اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے انہیں سزا میں دے سکتا ہوں۔ جب تک ان پر دہشت طاری رہے گی تب تک ہم اپنی سلامتی کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔“

وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ محبوب اپنے طور پر مشورے دیتا رہا پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے بشری اور بے کو بھی موجودہ مشکلات سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں مراد کے بہت قریب رہتے آئے تھے۔ اس کے احسان مند بھی تھے اور اس کے لیے جان کی بازیاں لگانے والے ساتھی بھی تھے۔

بشری پریشان ہو گئی تھی۔ بے نے کہا۔ ”ہم پہلے بھی کسی غیر معمولی صلاحیت کے بغیر بدترین حالات سے نمٹتے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی حالات کے زلزلے ہمیں توڑ پھوڑ نہیں سکیں گے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔۔۔“

مراد نے اسکاپ کے ذریعے سپر پاور کے اکابرین سے رابطہ کیا۔ ان اکابرین نے دوسرے لی وی پر اپنے اتحادیوں سے رابطہ کر لیا۔ یوں مراد کی باتیں ان تمام حکمرانوں تک پہنچ گئیں۔

اس نے کہا۔ ”میں نے ایک طویل خاموشی اختیار کی تھی۔ اپنے حالات اور آپ حضرات کے موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس دنیا میں ڈنڈے کے زور پر اپنے آپ کو منوایا جاتا ہے اگر میں غلط بول رہا ہوں تو آپ بولیں۔ میرے ڈنڈے کو مان رہے ہیں؟ کیا مجھے اپنے برابر ایک طاقتور حکمران تسلیم کر رہے ہیں؟ اگر تسلیم کر رہے ہیں تو میں برابری کی سطح پر دوستی کروں گا۔ ہمارے درمیان پھر سے سفارتی تعلقات قائم ہوں گے۔“

سپر پاور کے حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”ہم تسلیم کرتے ہیں۔ بے شک ہر ہائی نس ایک طاقتور حکمران ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ مل جائیں تو ہم پوری دنیا پر حکومت کر سکیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں پوری دنیا پر حکومت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کرنا چاہوں تو مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے بیس جنات ہی مجھے پوری دنیا کا ناقابل شکست حکمران بنادیں گے۔“

”ہر ہائی نس کیا چاہتے ہیں؟“

”میں بین الاقوامی قوانین کا پابند رہوں گا۔ آئندہ سیاسی اور عسکری معاملات میں اپنے جنات کو استعمال نہیں کروں گا۔ وہ جنات میرے بہت سے پرسنل معاملات میں

سے ڈرتے رہیں گے۔ یہ بھید کھلنے تک ہم آزاد خارجہ پالیسی کے ذریعے امریکا، روس اور چین سے مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بڑا ملک ہم پر تاج تزد باؤ ڈالے گا تو ہم باقی دو بڑے ملکوں سے فوجی امداد حاصل کریں گے۔ جب ہم ایک کے مقابلے میں دوسروں کو اہمیت دیں گے تو وہ ایک خود بخود درست ہو جائے گا۔ آئندہ ہمیں سیاسی حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔“

پھر وہ دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آنے والے دن ان کے لیے پیچ بن گئے تھے۔ اگر دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی پراسرار قوتیں ختم ہو چکی ہیں تو وہ اپنی تمام فوجی قوتوں کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑتے۔ پھر اسی طرح روپوش رہ کر زندگی گزارنے کے دن آجاتے۔ تمام بادشاہت خاک میں مل جاتی۔

ماروی اور محبوب کی سلامتی کا بھی مسئلہ تھا۔ اب وہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی پریشانیاں تھیں۔ بڑے پیچیدہ مسائل تھے۔ بے حساب مسائل سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔

اس نے فون کے ذریعے محبوب سے پوچھا۔ ”وہاں کے کیا حالات ہیں۔ آپ دونوں خیریت سے ہیں؟“

اس نے پوچھا۔ ”فون پر کیوں بول رہے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ۔ یہاں باتیں ہوں گی۔“ وہ بہت ہی اداس لہجے میں بولا۔ ”محبوب صاحب! بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے نادیہ ہو جانے کی عارضی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ عارضی وقت گزر چکا ہے۔ میں اس روحانی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یا خدا! ہم سب پر رحم فرما۔ یہ کیا ہو گیا مراد؟ اب تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ تمہاری ریاست پر ہر طرف سے حملے ہوں گے۔“

”آپ ریاست کی بات چھوڑیں۔ یہ پہلے بھی نہیں تھی، اب بھی نہیں رہے گی۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے اپنی بھی فکر نہیں ہے۔ میں روپوش رہ کر گوریلا جنگ لڑنا جانتا ہوں۔ فکر آپ کی اور ماروی کی ہے۔ میں یہاں سے آپ دونوں کی سیکورٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہوں گا۔“

”میں فی الحال ماروی کے ساتھ آفس کے پچھلے حصے میں چھپ کر رہوں گا۔“

”آپ ابھی روپوشی اختیار نہ کریں۔ ابھی تمام دشمن دہشت زدہ ہیں۔ وہ آپ کی طرف رخ نہیں کریں گے۔“

کام آتے رہیں گے۔ میں ایک طرح سے آپ سب کو خوف و دہشت سے نکال رہا ہوں۔ یہ اطمینان کر لیں کہ اپنی پر اسرار قوتیں کسی بھی بڑے یا چھوٹے ملک کے خلاف استعمال نہیں کروں گا لیکن یاد رہے۔ کوئی مجھے مجبور نہ کرے۔ کوئی بارودی اور محبوب علی چانڈیو کی طرف رخ نہ کرے۔ آئندہ کسی نے سازش کی اور چھپ کر دشمنی کرنی چاہی تو میں منٹوں میں اس کی فوجی قوت کو نیست و نابود کر دوں گا۔“

پھر وہ ٹھہرے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ”اور تباہی کیسے آتی ہے۔ اس کے کئی نمونے آپ حضرات دیکھ چکے ہیں۔“
 ”بے شک ہم نے دیکھا ہے اور تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ طاقت میں اور حاکمیت میں ہم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔“
 ”میں چاہوں گا کہ آپ حضرات مجھے پھر بھی دشمنی اور انتقامی کارروائیوں پر مجبور نہ کریں۔ آئیں دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اپنے نمائندوں کو یہاں بھیجیں اور بھرپور اعتماد کے ساتھ سفارتی تعلقات کا پھر سے آغاز کریں۔“

انہوں نے خوش ہو کر دلی مسترتوں سے مراد کو ویکلم کہا اور کہا کہ ان تمام ممالک کے نمائندے دوسرے ہی دن ریاست میں پہنچیں گے اور باہمی تعاون سے دوستی کو مضبوط کریں گے۔ وہ مراد سے رابطہ ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ آئندہ اس سے بے تکی دشمنی نہیں کی جائے گی۔ گو یادہ اپنے اپنے کان پکڑ رہے تھے۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مراد کو اپنی سطح کا طاقت ور حکمران مان لینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح نقصانات پہنچا کر اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا ہے۔ اب ہم نقصانات اٹھانے والی کوئی غلطی نہیں کریں گے۔“
 ایک حاکم نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں کئی طاقتور اور خود مختار ممالک ہیں۔ ان کے بعد ریاست ارض اسلام کا اضافہ ہو جائے گا تو ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“
 دوسرے نے کہا۔ ”فرق اس وقت پڑے گا جب ہم دوستی اور باہمی مفادات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ہماری غلطی یہ ہے کہ ملکہ نگارا کے بعد ہم نے مراد کو وہاں کا حکمران تسلیم نہیں کیا۔ اسے ایک عالمی سطح کا مجرم سمجھ کر اس خوش فہمی میں رہے کہ جلد ہی اسے پھل ڈالیں گے۔ بہر حال سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوا چکا ہے اور اسے مان کر ہی ہم باہمی بہتری کی راہوں پر چلتے رہیں گے۔“

مراد نے ٹیڑھا ہو کر سب کو سیدھا کر دیا تھا۔ فی الحال

آئنا یہ تھے کہ آئندہ اسے جنات کا ڈراما پلے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آنے والے دنوں میں سیاسی سطح پر تعلقات قائم رہیں گے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ نادیدہ ہونے والی غیر معمولی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس نے فون پر محبوب سے کہا۔ ”میں سیاسی حکمت عملی سے کام لے رہا ہوں۔ دشمن دوست بن رہے ہیں۔ آئندہ بھی سیاسی چالیں چلتا رہوں گا۔ کسی کو جانی دشمن نہیں بننے دوں گا۔ آپ وہاں آزادی سے رہیں۔ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آئے گا۔“

محبوب نے کہا۔ ”شاہاش مراد اتم بڑی ذہانت سے دشمنوں کو دوست اور سیاہ کو سفید بنا رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”میں جلد ہی پاکستان سے سفارتی تعلق قائم کروں گا۔ اس طرح ہمارے آنے جانے اور ایک دوسرے سے ملنے کے سلسلے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“
 وہ خوش ہو کر بولا۔ ”واہ کیا بات ہے مراد واقعی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ہم کسی روک ٹوک کے بغیر جب چاہیں گے، ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”فی الحال دور تک آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ بہت مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

واقعی مصروفیات حد سے زیادہ تھیں۔ اس کا ہم زاویہ اور بشری کے علاوہ ریاست میں کئی ماہر سیاستدان اور مختلف شعبوں کے ماہرین مراد کے ساتھ دن رات مصروف ہو گئے تھے۔ دوسرے دن سے کئی ممالک کے نمائندے آنے لگے۔ ان سے مذاکرات ہونے لگے اور معاملات طے ہونے پر تحریری معاہدے ہونے لگے۔ پھر کئی ملکوں کے سفارت خانے قائم ہو گئے۔ ان کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ پاکستان سے بھی سفارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

ان تمام معاملات سے نمٹنے میں کئی ماہ گزرتے جا رہے تھے اور ریاست ارض اسلام کی سیاسی حیثیت مسلم ہوتی جا رہی تھی۔ مراد کی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ریاستی چینل کے ذریعے ہم زاد کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے آتا تھا اور کہتا تھا۔ ”ایک نیام میں دو ٹکواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو حکمران بھی نہیں ہوتے لیکن دنیا والوں کو یہ نئی اور انوکھی بات معلوم ہو جائے کہ ہم دونوں ہی مراد علی منٹلی ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم

دونوں ہی اس ریاست کے حکمران ہیں۔“
ہم زاد کہتا تھا۔ ”حکمران ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں۔ مراد علی منگی۔ والی ریاست ارض اسلام۔“

اس کے ساتھ کھڑا ہوا مراد کہتا تھا۔ ”حکمران میں ہوں مراد علی منگی۔ والی ریاست ارض اسلام۔۔۔۔۔ اور یہ بھید بھی نہیں کھلے گا کہ ہم میں سے کون پیدائشی مراد علی منگی ہے۔“

مختلف ملکوں کے نمائندوں سے علیحدہ میٹنگ ہال میں گفتگو ہوتی تھی اور وہ نمائندے یہ دیکھتے تھے کہ ایک ہی وقت میں دو مراد ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ اصلی مراد اور اصلی حکمران ان میں سے کون ہے؟

مراد کی اس حکمت عملی کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ سپر پاور نے اسے اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس نے فوراً ہی دعوت قبول کر لی۔ اب سپر پاور اور دوسرے تمام ممالک کے اکابرین کے ذہنوں میں ایک سوال چبچ رہا تھا۔ ان دو مراد میں سے کون دعوت نامہ قبول کر کے آنے والا ہے؟ کیا روپوش رہنے والا اور کبھی منظر عام پر کھلم کھلا نہ آنے والا مراد آزادانہ سپر پاور کے ملک میں آئے گا؟

کسی نے کہا۔ ”نہیں۔ وہ اتنا نادان نہیں ہے۔ ہم نے پچھلی بار اسے طیارے سمیت اپنے گھنچے میں لے لیا تھا اور وہ بڑی چالاکی سے بچ نکلا تھا۔ وہ پھر یہی غلطی نہیں کرے گا۔“

کسی نے کہا۔ ”جو مراد دوستی اور خیر سگالی کے نام پر دورہ کرنے آ رہا ہے، وہ اصلی نہیں ہوگا۔ اس کی ڈمی ہوگا۔“
حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اصلی مراد آئے گا، تب بھی ہم دشمنی کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ سیاسی سطح پر مضبوط تعلقات نہیں رکھیں گے تو روس اور چین اس سے دوستی بڑھانے کی کوششیں کریں گے۔“

دوسرے حاکم نے کہا۔ ”بے شک وہ ریاست جغرافیائی اور عسکری حوالے سے ہم تمام بڑے ممالک کے لیے اہم ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اسے دوستی کے گھنچے میں رکھنا ہے۔“

اب ہر پہلو سے حالات مراد کے موافق ہو گئے تھے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے خاص مشیروں کے ساتھ سپر پاور کے ملک میں پہنچا تو جہاز سے اترتے ہی اسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ تمام اکابرین اس کے استقبال کے لیے ائر پورٹ کے رن وے پر آئے تھے۔ وہاں کھڑی ہوئی آرمی کے سپاہی اسے گارڈ آف آنر پیش

کر رہے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی اسے ایک مجرم کہہ دیتا؟ ایک گدھا گاڑی والے کو دنیا سلام کر رہی تھی۔ اس معمولی شخص نے آگ اور لہو کے دریاؤں سے گزرتے ہوئے ایسے کارنامے انجام دیے تھے، ایسی ذہانت کا ثبوت دیا تھا کہ ایک معمولی انسان سے غیر معمولی اور ناقابل شکست حکمران بن گیا تھا۔

دنیا کے بے شمار ٹی وی چینلز اسے بھرپور کوریج دے رہے تھے۔ اس کے تمام اپنے پرانے تمام دوست اور دشمن اسے سپر پاور کے حاکم اعلیٰ کے ساتھ اخبارات کے پہلے صفحات پر دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین پر ان دونوں کی تقریریں سن رہے تھے۔

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”ہم والی ریاست ہزہائی نس مراد علی منگی کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہزہائی نس نے ہماری دعوت قبول کی ہے اور یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہمارے درمیان دوستی مستحکم ہوتی رہے گی۔ ہزہائی نس نے ہمیں بھی ریاست کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، ذلت دیتا ہے۔ یا اللہ! مجھے اپنے قہر و غضب سے بچالے آمین۔ میں نے ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد یہ موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔ آزر اسل حاکم اعلیٰ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ آنے والے دنوں میں ہماری دوستی مزید مستحکم ہوتی رہے گی۔“

اس نے ریاست کی بہتری کے لیے ان سے کئی معاہدے کیے۔ ان میں یہ معاہدہ اہم تھا کہ ریاست کے طلباء و طالبات کو یورپ اور امریکا کے کسی بھی شہر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیمات حاصل کرنے کی سہولتیں حاصل ہوں گی اور ریاست کے ضرورت مند افراد کو ان ممالک میں ملازمتیں دی جائیں گی۔ وہ اپنی ریاست کو مضبوط اور خوش حال بنانے کے کئی معاہدے کر رہا تھا۔

روحانی صلاحیت کے ختم ہونے کے بعد بڑی انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم زاد کو ایک نقصان پہنچا تھا۔ وہ حسینہ عالم جینی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے محروم ہونے کے چند گھنٹوں کے بعد ہی اسے فون پر مخاطب کیا وہ چیخ کر بولی۔ ”میرے یار! میرے دلدار! کہاں ہو تم؟ کیا تمہیں میری تنہائی اور بے چینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”آہ میری جان! میری جینی! میں مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے۔ تم بہت شکست خوردہ سے لگ رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں شکست کھا چکا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن مراد نے پراسرار عمل کے ذریعے میں جنات کو تسخیر کیا ہے، انہیں اپنا معمول اور تابعدار بنالیا ہے۔“

”ہاں تم نے بتایا تھا پھر...؟“

”پھر یہ کہ اس نے پراسرار عمل کے ذریعے مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ میں چونکہ باغی ہوں، اس کی غلامی قبول نہیں کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیریں پہنا دی ہیں اور مجھے پاتال کی تاریکیوں میں قیدی بنالیا ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ”اب کیا ہوگا؟ کیا تم میرے پاس نہیں آ سکو گے؟“

”نہیں۔ وہ مجھے پاتال سے باہر نہیں آنے دے گا۔“

”اوہ گاڈ! میں کیا کروں؟ تم نہیں ملو گے تو میں مرجاؤں گی۔“

”آہ جینی... میں کس دل سے کہوں کہ مجھے بھول جاؤ۔“

”تمہارے کہنے سے کبھی تمہیں بھول نہیں پاؤں گی۔ میں اپنے طور پر ہزار کوششیں کروں گی۔ تب بھی مجھے نظر آنے والا کوئی محبوب یا شوہر بھی متاثر نہیں کرے گا۔ میرے نادیدہ پار سے ہی میری تسلی ہوگی۔ میں تمہاری عادی ہو گئی ہوں۔ کوئی تدبیر کرو۔ کسی طرح ایک بار میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں مجبور ہوں جینی! شاید اس کی قید سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آئے گی تو پھر یہاں سے نکل سکوں گا۔“

”تم مجھے بتاؤ کہاں ہو؟ میں وہاں آؤں گی۔“

”میں گھپ اندھیرے میں ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ کہاں ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنی ریاست میں ہی کہیں کسی تہ خانے میں قید کیا ہے۔“

”میں تمہیں تلاش کرنے آؤں گی۔ مراد تک پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اس سے تمہاری رہائی کی بھیک مانگوں گی۔“

”ابھی نہ آؤ۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ اپنے دشمنوں سے نمٹ رہا ہے۔ تمہاری فریاد اور تمہارے آنسو اس پر اثر نہیں کریں گے۔ ذرا صبر کرو۔ مجھے اپنے طور پر رہائی کی کوشش کرنے دو۔“

”میں صبر سے انتظار کروں گی۔ تم سے فون پر تو باتیں ہوتی رہیں گی نا؟“

”ہاں۔ میں فون پر تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ آئی کو

یو جینی!“

”آہ! میں تڑپ رہی ہوں۔ میرے نادیدہ پار...! میں مرجاؤں گی۔“

ہم زادن نے اپنے فون کو چوما تو وہ رونے لگی۔ اس نے تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دینے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔ بڑی محبت سے سوچنے لگا کہ اس کے پاس کیسے جائے؟ اس کا پھول جیسا نرم و نازک بدن تصور میں مکمل رہا تھا۔

جینی کے پیار کی ایک ایک ادا اسے تڑپا رہی تھی۔ اگر وہ خود اس کے پاس جانا چاہتا تو کیا ہوتا؟ وہ پہلے کی طرح نادیدہ ہو کر نہیں جاسکتا تھا۔ اول تو وہ نظر آنے والے کو قبول نہ کرتی۔ اگر قبول کرتی تو ایک ریاست کے حکمران کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ صرف جینی ہی نہیں تمام دشمن بھی اسے ریاست سے پیرس تک سفر کرتے ہوئے دیکھتے تو کہیں نہ کہیں اس پر جال پھینکتے۔ وہ مراد کوئی الجھنوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ کسی وقت مراد سے جینی کے بارے میں باتیں کرے گا لیکن وہ بے حد مصروف تھا۔ ریاست کے سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ کئی ملکوں کے نمائندے مذاکرات کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان سے کئی معاملات پر فیصلے کرنے اور ان پر عمل کرنے میں کئی مہینے گزر رہے تھے۔

ادھر دو ماہ کے اندر ہی جینی نے فون پر خوشی سے چیخے ہوئے کہا۔ ”میرے پار! میرے دلدار! ایک بہت بڑی خوش خبری سنارہی ہوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”تم بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہو رہی ہو۔ تمہیں ایسی کیا خوشی مل گئی ہے؟“

”ہائے تم سامنے ہوتے تو مجھے سینے سے لگا کر خوب چومتے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

ہم زاد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی باپ بن جائے گا۔ وہ ایک طویل عرصے تک رنگینوں میں دن رات گزارنا چاہتا تھا لیکن اس خواہش کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

ویسے باپ بننے کا اعزاز حاصل کرنا بھی ایک بڑی بات تھی۔ جینی نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟ کیا خوش نہیں ہو؟ پلیز جلدی بولو۔“

وہ فون کو چومتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بڑی خوش خبری سنائی ہے لیکن مجھ پر یہ صدمہ حاوی ہو رہا ہے کہ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی ہوں۔ اگر آزاد ہوتا تو ابھی

تمہارے پاس ہوتا۔ ہم دونوں اتنی بڑی خوشی کو ایک ساتھ انجوائے کرتے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں بد نصیب ہوں۔ تمہاری قربت سے محروم ہوں اور خوش نصیب بھی ہوں۔ تمہارا بچہ تمہارے پیار کی نشانی میرے وجود کے اندر پرورش پائے گا۔ نو ماہ بعد اسے گود میں لے کر خوب پیار کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے، تم اس وقت تک آزاد ہو کر یہاں آ جاؤ گے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔ ہمیں کم سے کم باتیں کرنا چاہئیں کیونکہ فون کی بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی تو اسے ری چارج نہیں کر سکوں گا۔ یہاں یہ خانے میں بجلی نہیں ہے۔“

اس نے فون کے ذریعے اسے چوم کر رابطہ ختم کر دیا۔ وہ لمبے بوائے تھا۔ جوانی کی رنگینوں میں مست رہنا چاہتا تھا لیکن جینی نے اچانک اس کے مزاج کو بدل دیا تھا۔ باپ بننے والی بات خوش خبری بھی تھی اور پریشانی کا سبب بھی تھی۔ باپ بننا اچانک ہی اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے ہونے والے بچے کی ماں کو آخوش میں بھرنے کے لیے نہیں جاسکتا تھا۔ کئی مشکلات درپیش تھیں۔

بنیادی مشکل یہی تھی کہ وہ نادیدہ ہو کر نہیں جاسکتا تھا۔ بھیس بدل کر جانا تھا اور جینی کو قائل کرنا تھا کہ وہی اس کا نادیدہ یار دلدار ہے۔ وہ کسی طرح اسے راز رکھتا۔ لیکن ہمیشہ اپنے بچے اور اس کی ماں کے ساتھ بھردیا بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک باپ کو اپنی اصلی شکل سے جھوٹے بچے کے ساتھ رہنا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ بچے کی یہودی ماں پر بھروسہ کرنے اور خود کو مراد کی حیثیت سے ظاہر کرنے کے معاملے میں اسے ہزار بار سوچنا تھا۔ ایسے سنگین معاملے میں وہ مراد سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ادھر اس ملک کے دو اکابرین نے فون پر جینی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”ہم مسٹران سین سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کہو ہمارے پاس آئے۔“

جینی نے کہا۔ ”وہ نامعلوم مدت تک نہیں آسکیں گے۔ میں بہت بڑا صدمہ جھیل رہی ہوں۔ مراد علی منگی نے دوسرے جنات کی طرح میرے یار کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔“

یہ خبر سن کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”اس نے ہم سے کہا تھا کہ مراد پر اسرار علوم کے ذریعے اسے بھی تسخیر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس سے

بچتا پھر رہا ہے۔ آخر اس کے شکنجے میں چلا ہی گیا۔“ دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”مراد کا ستارہ بلندی پر چمک رہا ہے۔ یہاں ہم نے بھی اس سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ دوست بن کر رہنے میں ہی بہتری ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تمہارے نادیدہ یار کو رہائی پانے کی امید ہے؟“

”ہاں۔ وہ کوششیں کر رہا ہے اور میں دعائیں مانگ رہی ہوں۔ امید ہے کہ وہ رہائی حاصل کر لے گا۔“ ”جب بھی وہ تمہارے پاس آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دو۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہیں گے۔“

نہ وہ آنے والا تھا، نہ انتظار ختم ہونے والا تھا۔ دن اور مہینے گزرتے جا رہے تھے۔ سپر پاور اور دیگر ممالک سے جو معاہدے کیے گئے تھے، ان کے مطابق ریاست کے سیکڑوں افراد بیرونی ملکوں میں جا کر ملازمتیں حاصل کر رہے تھے۔ ان بیرونی ممالک سے بھی مختلف شعبوں کے ماہرین ریاست کے کئی پروجیکٹس میں کام کرنے آ گئے تھے۔ وہاں آنے والوں کو پولیس اور ایٹمی جنس والے سختی سے چیک کرتے تھے۔ جن پر ذرا بھی شبہ ہوتا تھا، انہیں فوراً واپس جانے کا حکم دیتے تھے۔

بشریٰ بلا اور سیکرٹ فورس کے جاں نثاران تمام آنے والوں کی اور تمام سفارت خانوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ایسے وقت ایک انوکھی بات ہوئی۔ بشریٰ اور بلا فرانسیزی سفارت خانے کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر چونک گئے۔

ان کے سامنے جیسے ماروی آ گئی تھی۔ وہ دوشیزہ ہو بہو ویسی ہی تھی۔ فرانسیسی سفیر کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ آئی تھی۔ بشریٰ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیلو تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ بڑے محسوم سے لہجے میں بولی۔ ”میرا نام...؟“ ”میرا نام...؟ پلیز ویٹ اے منٹ، ابھی بتاتی ہوں۔“ وہ سوچنے لگی۔ بتانے نے اس کے سفیر باپ سے پوچھا۔ ”مسٹر ہارورڈ! کیا آپ کی صاحبزادی اپنا نام بھول جاتی ہے؟“

ہارورڈ نے کہا۔ ”یہ بچپن سے کندھ بن ہے۔ یادداشت اتنی کمزور ہے کہ کبھی کبھی ہمیں بھی بھول جاتی ہے۔ ہم اسے کہیں تنہا جانے نہیں دیتے۔ یہ گھر کا راستہ بھی بھول جاتی ہے۔“

پھر اس نے بیٹی سے کہا۔ ”جیسی! کم آن اپنا نام بولو۔“ وہ تالی بجاتے کے انداز میں اپنی ہتھیلیوں کو ایک دوسری سے ٹکراتے ہوئے بولی۔ ”یاد آ گیا جیسیکا۔ میرا نام جیسیکا ہے۔ میری مام اور ڈیڈ مجھے جیسی کہتے ہیں۔ یہ جو جیسی

ہوئی ہیں، یہ میری مام ہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ میری یادداشت کمزور نہیں ہے۔“

ماں نے اس کے شانے کو چپک کر کہا۔ ”میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ تمام باتیں یاد رکھتی ہے۔“

بلے نے اس کے والدین سے کہا۔ ”ماروی کا نام دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ مراد کے حوالے سے کئی ٹی وی چینلز پر اس کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ کیا آپ نے ماروی کی تصویریں دیکھی ہیں؟“

مام نے کہا۔ ”دیکھی ہیں اور اس کی تصویریں ایک فائل میں حفاظت سے رکھی ہیں۔ ہم ماروی اور ہزہائی نس کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔“

اس کے ڈیڈی ہارورڈ نے کہا۔ ”ایک بار یہ گھر سے باہر ایک تھلی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دور تک چلی گئی۔ ایک اسٹریٹ سے دوسری اسٹریٹ میں پہنچ گئی۔ گھر کا راستہ بھول گئی۔ ہم یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ اسے ماروی سمجھ کر کسی نے اغوا کیا ہے۔ بہر حال کشتی پولیس نے اسے گھر پہنچا دیا۔“

مام نے کہا۔ ”ہمیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہزہائی نس کے دشمن اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ٹیکس گاڈا اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہمارے ملک اور آپ کی ریاست کے درمیان دوستی اور گہری محبت قائم ہو گئی ہے۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”جب مجھے یہاں کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تو جیسے میرے دل کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ ہماری بیٹی ہزہائی نس کی ریاست میں ان کے سائے میں رہے۔ ہم آج تک یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ ہزہائی نس باکمال ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی دشمن کو ماروی کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دیا۔ ہماری جیسی بھی یہاں محفوظ رہے گی۔“

بشری نے معنی خیز نظروں سے بلے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

مسز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشری نے جیسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”آپ کو یہ اعتماد ہے تو پھر ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”ابھی اچانک کیسے جاسکتے ہیں۔ پہلے ہزہائی نس کے پی اے سے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ لینا ہوگا۔“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ابھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ سب سفارت خانے سے باہر آ کر اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر محل کی طرف جانے لگے۔ بشری اور بلے کو محل کے اندر جانے سے کوئی گارڈ نہیں روکتا تھا لیکن اندر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر وہ مصروف بہت انہیں بھی وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا اور اس وقت وہ بہت مصروف تھا۔ ایک ہال میں تمام مشیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ اہم معاملات پر باتیں کر رہا تھا۔

اس کے پی اے نے اسے فون پر کہا۔ ”میڈم بشری ابھی آپ سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن...“

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”بشری سے بات کراؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں اس کی آواز سنائی دی۔ ”بھائی! تمام مصروفیات کو چھوڑ کر ابھی ہال سے باہر آئیں۔“

”ایسی کیا بات ہے؟ کیوں مجھے فوراً آنے کو کہہ رہی ہو؟“

”آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو ساری دنیا کو بھول جائیں گے۔“

”تم کیا دکھانا چاہتی ہو؟ کیوں میرا وقت ضائع کر رہی ہو؟“

”بھائی! میں کہتی ہوں سیدھی طرح آجائیں۔ ورنہ میں اس کا نام لوں گی تو یکلخت دوڑتے ہوئے آئیں گے۔“

”اگر یہ تمہارا چیلنج ہے تو میں نہیں آؤں گا۔“

”تو پھر کان کھول کر سنیں۔ ماروی آپ سے ملنے آئی ہے۔“

”کیا...؟“ وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ دیکھو بشری ایسا مذاق نہ کرو۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“

وہ تو ماروی کا نام سنتے ہی تڑپ گیا تھا۔ تمام مصروفیات کو بھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا پھر ماروی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

بلے، سفیر اور اس کی وائف احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی بھی اپنے والدین کے ساتھ کھڑی ہوئی تو مراد نے اس کا سراپا دیکھا پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ماروی کی ہم شکل ہے

لیکن ماروی نہیں ہے۔ اس نے جینز اور سیلو لیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ماروی ایسا لباس نہیں پہنتی تھی۔ اس کی گوری اور گلابی رنگت اور شانوں تک تراشیدہ زلفیں کہہ رہی تھیں کہ وہ یورپ کے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔

بلے نے کہا۔ ”یہ فرانس کے سفیر مسٹر جیمس ہارورڈ ہیں۔ یہ ان کی وائف مسز ہارٹھا ہارورڈ ہیں اور یہ ان کی صاحبزادی مس جیسیکا عرف جیسی ہیں۔“

مراد نے مسٹر اور مسز ہارورڈ سے مصافحہ کیا۔ جیسی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈ! یہ وہی ہیں۔ میں نے ان کو ٹی وی کے ایک ڈرامے میں دیکھا تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹی! یہ ڈرامے کے ایکٹر نہیں ہیں۔ اس ریاست کے بادشاہ ہیں۔ تم نے انہیں ٹی وی کے نیوز چینلز میں دیکھا ہے۔ تم تو اچھی بیٹی ہو۔ بھولتی نہیں ہو۔“

اس نے پوچھا۔ ”مام! یہ بادشاہ ہیں مگر ان کے سر پر تاج نہیں ہے۔ انہوں نے زرق برق لباس نہیں پہنا ہے۔ ان کی کمر سے لکوار نہیں لٹک رہی ہے۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں بعد میں سمجھائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”پلیز! اسے چپ نہ کرائیں۔ یہ چپکتی ہوئی چڑیا کتنی محسوس لگ رہی ہے۔ کیا یہ اینارل ہے؟“

”جی ہاں۔ اینارل کہہ سکتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ارداشت کمزور ہے۔ اسے بھولنے کی بیماری ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جیسی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔“

”آپ اجازت حاصل کرنے کے پابند نہ رہیں۔ جو بات دل میں ہے۔ اسے آزادی سے بیان کریں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ایسے علوم سے میری معصوم بیٹی کا علاج ہو سکے گا؟“

مراد نے کہا۔ ”آپ نے غلط سنا ہے۔ جو شخص زیادہ شہرت حاصل کرتا ہے، اس کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں پھیلتی ہی رہتی ہیں۔ آپ مشہور و معروف اور تجربہ کار دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ علاج کتنا ہی مہنگا ہو، میں اس کے اخراجات پورے کروں گا۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”ہم پیرس میں تھے۔ وہاں سرکاری طور پر بہت مہنگا علاج کرایا گیا۔ یہ ماروی کی ہم شکل ہے۔ ہمارے ملک کے اکابرین اس میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ آخر انہوں نے ناکام ہو کر کہا کہ یہ دماغی طور پر پوری

طرح نارمل ہو جاتی تو ہمارے بہت کام آسکتی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آئندہ مجھے اپنی بیٹی کو گھر میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ ورنہ مراد کے دشمن اسے ماروی سمجھ کر نقصان پہنچائیں گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے اکابرین کیوں اس سے دلچسپی لے رہے تھے؟ کیوں اس کا مہنگا علاج کر رہے تھے؟ اور اس کے نارمل ہونے کے بعد اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔ مجھے آپ کی بیٹی سے ہمدردی ہے۔“

جب سے جیسی محل میں آئی تھی، تب سے ہم زاد اسے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ ادھر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ادھر اس کا دل کھنچا جا رہا تھا۔ ایسی محسوس سی تھی کہ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ وہاں آیا تو دوسرے مراد کو ریاست کے دوسرے حکمران کو دیکھ کر سب ہی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی خوشی سے چیخ پڑی۔ تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”ایک سے دو ہو گئے۔“

وہ دوڑتی ہوئی ہم زاد کے پاس آ کر بولی۔ ”کیا تم بھی بادشاہ ہو؟ میں تمہیں چھو کر دیکھوں؟“

وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے شیک ہینڈ کرو گے؟“

ہم زاد نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ یوں لگا، مکھن کی ہڈی ہاتھ میں آگئی ہے۔ اگر وہ اسی طرح ہاتھ میں رہے گی تو پھٹکتی ہوئی اس کے اندر سما جائے گی۔

پھر اس نے سوچا۔ ”ماروی کا یہ چہرہ مراد کی جاگیر ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پاگل ہو رہا ہوگا۔ یہ اس کی امانت ہے۔ مجھے اس کی طرف نہیں پھسلنا چاہیے۔“

جیسی نے کہا۔ ”تم دونوں میں کون اصلی بادشاہ ہے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”ہم دونوں ہی اصلی بادشاہ ہیں۔“

وہ بولی۔ ”کیا دو ملک کا ایک بادشاہ بھی ہوتا ہے؟“

”ہم دو ملک کے ایک بادشاہ نہیں، ایک ملک کے دو بادشاہ ہیں۔ تم غلط بول رہی ہو۔“

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔ ”سوری۔ میں یہی بولنا چاہتی تھی۔ کیا کروں بھول ہو جاتی ہے۔“

اس کا ہاتھ ابھی تک ہم زاد کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا میں تمہارا ہاتھ چھوڑوں؟“

وہ چونک کر اپنا ہاتھ کھینچ کر بولی۔ ”اوہ سوری۔ میں بھول گئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا تھا؟“

وہ بولی۔ ”مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ پھر کبھی آؤں گی تو پھر میرا ہاتھ پکڑ دے گا؟“

اس بات پر اس کے ماں باپ جھینپ رہے تھے۔ ہارورڈ نے کہا۔ ”جیسی! پلیز اتنا تو سمجھو یہ حاکم اعلیٰ ہیں۔ ان سے اس طرح بے تکلفی سے نہیں بولنا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”مسٹر ہارورڈ! میں نے کہا تھا یہ چمکتی ہوئی چیز ہے۔ اسے بولنے دیں۔ یہ جو چاہتی ہے، وہ کرنے دیں۔“

پھر وہ ہم زاد سے بولا۔ ”یور ہائی نس! میں میٹنگ میں بہت مصروف ہوں۔ یہ ہمارے مہمان خصوصی ہیں۔ انہیں کچن دیں۔ یہ ڈنر کے بعد یہاں سے جائیں گے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”یور ہائی نس! آپ جائیں۔ میں مہمانوں کا خاص خیال رکھوں گا۔“

مراد چلا گیا۔ جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”میں حیران ہوں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو یور ہائی نس کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ جبکہ یہ کہاوت درست ہے کہ ایک سرنیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو بادشاہ بھی نہیں ہوتے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”یہاں ہو گئے ہیں۔ یہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ کہاوت پرانے زمانے کی ہے۔ جب تلواریں چلا کرتی تھیں، اب ہندو قس چلتی ہیں اور ایک ہندو قس میں کئی ہلٹس سما جاتے ہیں۔“

ادھر مراد میٹنگ ہال میں آیا۔ وہاں اس کے تمام مشیر اور آرمی کے اعلیٰ افسران کئی معاملات پر بحث کر رہے تھے اور ان معاملات پر مراد کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسی کو دیکھنے کے بعد ماروی اس کے اندر چھپ رہی تھی اور بول رہی تھی۔ ”میں آگئی ہوں۔ وہ جیسی نہیں ہے۔ وہ میں ہوں۔ میں نے شادی شدہ ماروی کو محبوب کے پاس چھوڑ دیا ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔ جس طرح تم ایک سے دوسرا ہو گئے ہو، اسی طرح میں ایک سے دو ماروی ہو گئی ہوں۔ یہ دوسری تمہارے پاس آگئی ہے۔“

مراد نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ایک مشیر اعلیٰ نے پوچھا۔ ”یور ہائی نس! آپ کچھ پریشان ہیں؟“

وہ سر اٹھا کر بولا۔ ”سوری جینٹلمین! میں واقعی اپ سیٹ ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میٹنگ برخاست کریں۔ ہم کل صبح نو بجے یہیں ملیں گے۔ میں تنہا چاہتا ہوں۔“

وہ سب وہاں سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہال خالی ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ جو دوسری ماروی آئی

ہے، یہ ہوں ہے۔ میری آزمائش ہے کہ ماہ نور جیسی بہترین عبادت گزار شریک حیات کے ہوتے ہوئے کیا مجھے دوسری عورت کی ہوس کرنی چاہیے؟ خواہ وہ ماروی ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، صابر و شاکر رہو۔ ضرورت سے زیادہ نہ چاہو۔ جوں رہا ہے اس پر قناعت کرو۔ میں نے مصلے پر بیٹھ کر اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ ماروی محبوب کے نکاح میں آکر میرے لیے نامحرم ہو گئی ہے۔ مجھے اس کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ زبان سے اس کے نام کو اور ذہن سے اس کے تصور کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینا چاہیے اور میں یہی کرتا آرہا ہوں۔ اب اگر جیسی کی ہوس دل میں ہوگی۔ اگر میں اسے طلب کروں گا تو گویا اس کے روپ میں ماروی پھر میری زندگی میں آجائے گی۔ میں جیسی کو مشکوچہ بنا کر اسے آغوش میں لوں گا تو لاشعوری طور پر ماروی کو دھڑکنوں سے لگاتا رہوں گا۔ حقیقتاً ماروی کی طرف بھٹکنے کے لیے جیسی کا وجود ایک بہانہ بن جائے گا۔ شیطان اسی طرح بہکاتا ہے۔ ہوس اسی طرح ذہن کو سوچے سمجھے کے قائل نہیں رہنے دیتی۔ نہیں، ماروی میرے لیے فنا ہو چکی ہے۔ اب ایک کے بعد دوسری تیسری آجائے تو میں کسی کو اپنی زندگی میں آنے نہیں دوں گا۔ جو میرے لیے فنا ہو چکی ہے اسے کسی بھی بہانے زندہ نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ اس ہال سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آیا۔ ماہ نور نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے آپ نے وقت سے پہلے اجلاس کو برخاست کر دیا ہے؟“

مراد نے اسے منہ سے گھنچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کی گردن کو اور چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں ڈوب رہا تھا اس لیے تمام مصروفیات کو ملتوی کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے کنارے لگا دو۔“

وہ کیا کنارے لگاتی؟ وہ تو اس کے والہانہ پیار میں غرق ہو رہی تھی۔ دونوں کی سانسیں تکرار ہی تھیں۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”میں نے سنا ہے، کوئی ماروی کی ہم شکل آئی ہے؟“

”میرا امتحان لینے آئی ہے لیکن میری ماہ نور کے حقوق مجھ سے نہیں لے سکے گی۔“

”میں آپ کی محبت پر اور دیانت داری پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ خدا آپ کو میرے بعد بھی سلامت رکھے۔“

دوسری طرف جیسی کی گفتگو اور لہجے میں ایسی معصومیت اور ایسا بچوں جیسا انداز تھا کہ ہم زاد دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”یا خدا۔۔۔ ایہ میرے سامنے کیوں آگئی ہے؟ میرا دل بے ایمان ہو رہا ہے۔ اب

سے پہلے میں ماہ نور کے سلسلے میں بے ایمان ہو گیا تھا۔ میں نے مراد کو دھوکا دیا تھا لیکن مراد اسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے گیا تھا۔ مجھے ماہ نور سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اس بار بھی وہ جیسی کو میرے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔ بہتر ہے کہ میں اس معصوم حسینہ سے دور ہو جاؤں۔ یہ سامنے رہے گی تو مجھے پاگل بنانی رہے گی۔“

وہ اس وقت جیسی اور اس کے والدین کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ بشریٰ اور تالا بھی تھے۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہوگا۔ سپر پاور کے حاکم اعلیٰ سے ایک اہم معاملے میں گفتگو کرنے کا وقت مقرر ہے۔ مجھے ابھی اسکائپ کے ذریعے ان سے رابطہ کرنا ہے۔“

اس نے بشریٰ اور تالے سے کہا۔ ”تم دونوں میزبانی کے فرائض ادا کرو۔ ہربائی نس تھوڑی دیر بعد یہاں آئیں گے۔“ جیسی نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں بھی اسکائپ کے ذریعے بولوں گی۔“

وہ بولا۔ ”سوری جیسی! کچھ سیاسی رازدارانہ باتیں ہیں۔ ایسی باتیں تمہاری میں کی جاتی ہیں۔“ ”تم جاؤ گے تو میں تنہا رہ جاؤں گی۔ تم بہت اچھے ہو۔ میری تعریفیں کرتے رہتے ہو۔“

”تم تنہا نہیں رہو گی۔ ابھی وہ میرے ہم شکل ہربائی نس.... آئیں گے۔ وہ بھی تمہاری خوب تعریفیں کریں گے۔“

وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”پھر تو تم جاؤ۔“ ہم زاد وہاں سے چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا مراد سے ملنے کے لیے اس کی خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر اٹھ رہا تھا۔ دستک کی آواز سن کر دروازہ کھول کر باہر آیا پھر پوچھا۔ ”کیا مہمان چلے گئے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”مہمان تمہارے ہیں۔ تم نے مجھے مہمان نوازی میں الجھایا ہوا ہے۔ پلیز جاؤ اور انہیں سنبھالو۔ میں انہیں کہتی نہیں دوں گا۔“

”کیا ان مہمانوں سے تکلیف پہنچ رہی ہے؟“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”تکلیف صرف اس حسینہ سے ہو رہی ہے جو ماروی کی ہم شکل ہے۔“

”کیا اس کے ایجنارٹل ہونے سے پریشان ہو گئے ہو؟“ ”اس کے ایجنارٹل ہونے کی اور ایک بھی سی ہنگی کی طرح بولنے کی ادائیں ایسی ہیں کہ دل بے ایمان ہونے لگا ہے۔ پھر تم سے بے ایمانی کرنے کو جی چاہنے لگا ہے۔“

”مجھ سے بے ایمانی کیسے ہوگی؟ میں نہیں سمجھا۔ مجھے سمجھاؤ۔“ ”وہ تمہاری ماروی ہے۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ اس پر میرا دل آ گیا ہے۔“

”ماروی کی ہم شکل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہوں۔ مجھے اس حسینہ جیسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری طرح جگہ جگہ دل پھینکتے والا عاشق نہیں ہوں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا سچ کہہ رہے ہو؟ تمہیں سچ سچ اس سے دلچسپی نہیں ہے؟“

”کہہ تو رہا ہوں نہیں ہے لیکن یہ بہت ہی غلط بات ہوگی اگر تم اس کے چکر میں پڑو گے۔ یہاں تمہاری محبت کرنے والی نیک سیرت شریک حیات ہے۔ اس کے علاوہ تم کسی جینی نام کی حسینہ سے...“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”ارے ہاں۔ اس حسینہ کے پاس تو تم جا نہیں سکتے ہو۔ کیا اسے دودھ کی مکھی کی طرح دل سے نکال کر پھینک دیا ہے؟“

”میں نے اسے دل سے نہیں نکالا ہے اور اب تو اس سے اور بھی گہرا رشتہ ہو گیا ہے۔“

وہ چند قدموں کے فاصلے پر آرام دہ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”جینی میرے لیے بہت اہم ہو گئی ہے کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

مراد نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں جینی سے فون پر باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تم اتنے مصروف رہتے ہو کہ تم سے اتنی اہم بات نہ کہہ سکا۔ آٹھ ماہ گزر چکے ہیں اور ایک ماہ بعد وہ بچے کو جنم دے گی۔ اسے الٹراساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ مراد...! جینی سے میرا رشتہ جائز ہے یا نہیں ہے؟ لیکن وہ بیٹا میرا ہے۔ اسے میرے سائے میں میرے دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا تو اس بچے کی ماں اسے یہودی بنا دے گی۔“

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یا اللہ.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم کیسی غلطی کر بیٹھے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں نے جینی سے کہا ہے کہ مراد نے دوسرے جنات کی طرح مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ میں مراد کی تابعداری سے انکار کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیریں پہنا کر ایک تہ خانے میں قید کر دیا ہے۔ اس نے میرے جھوٹ کو سچ مان لیا ہے کہ میں شکنجے میں ہوں،

اس کے پاس نادیدہ ہو کر نہیں جاسکوں گا۔ وہ میری رہائی کا انتظار کر رہی ہے۔“

”یہ بولو کہ بیٹے کو کیسے حاصل کرو گے؟ اسے ہمارے دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔“

”میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے۔ یہ تدبیر سمجھ میں آرہی ہے کہ تم فرانس کے اکابرین سے یہ بولو کہ تم نے جینی کے عاشق ان سین کو اپنے شکستے میں لے لیا ہے لیکن وہ تمہارا تابع دار بن کر رہنے کی ایک شرط پیش کر رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اگر تم جینی کو ریاست میں بلا کر اسے اس کے عاشق کے ساتھ رہنے دو گے تو وہ دوسرے جنات کی طرح تمہارا غلام بن جائے گا۔ اس طرح جینی یہاں آ کر رہنے لگے گی۔“

”ہوں۔ تدبیر اچھی ہے لیکن جب وہ یہاں آئے گی تو اپنے نادیدہ عاشق کے ساتھ رہنا چاہے گی اور تم نادیدہ نہیں ہو سکو گے۔ پھر کیا ہوگا؟“

”ہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔ اسے بھی کسی طرح حل کیا جائے گا۔ پہلے وہ آ تو جائے۔ میں بیٹے کو اپنی تحویل میں رکھوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مراد بن کر فرانس کے اکابرین سے باتیں کرو۔ جینی کو جلد ہی یہاں آنا چاہیے۔“

”میں کل کسی وقت ان سے اسکاٹپ کے ذریعے باتیں کروں گا۔ ابھی جیسی اور اس کے والدین ہمارے مہمان ہیں۔ میں مراد بن کر ان کے پاس جا رہا ہوں۔“

مراد نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا ارادہ کیا ہے؟ کیا جیسی سے بھی فلرٹ کرو گے؟“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ گناہ گار نہیں بنوں گا۔ وہ راضی ہوگی تو اسے اپنی منکوحہ بنالوں گا۔“

”لعنت ہے تمہاری ہوس پرستی پر۔ تم زیب النساء جیسی نیک سیرت شریک حیات پر سوکن لانا چاہتے ہو۔“

”میں زیب النساء کو راضی کر لوں گا۔ وہ میری دوسری شادی پر اعتراض نہیں کرے گی۔“

”دوسری نہیں، تیسری کہو۔ جینی یہاں آئے گی تو کیا اپنے بچے کی ماں کو منکوحہ نہیں بناؤ گے؟ کیا دنیا والوں کے سامنے اپنے بچے کو جائز نہیں بناؤ گے؟“

”ہاں، اس سے بھی نکاح پڑھوانا ہوگا۔ کوئی بات نہیں، دین میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔“

”عیاشی کے لیے چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔ اگر پہلی بیوی ازدواجی وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو، تب دوسری شادی لازمی ہے۔ دوسری کے ساتھ بھی ناقابل حل

مسائل پیدا ہو جائیں، تب تیسری شادی کی اجازت ہے۔“

”ہم زاد نے کہا۔“ میرے ساتھ بھی مسائل ہیں۔ اپنی اولاد کو مسلمان بنائے رکھنے کے لیے اس کی یہودی ماں سے شادی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہاں تک تو میں راہِ راست پر ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تیسری کے خواب نہ دیکھو۔ جیسی کو دل سے نکال دو۔ ابھی جاؤ اور انہیں یہاں سے رخصت کر دو۔ فضول بحث میں میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

مراد جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”جیسی میری آخری آرزو ہے۔ اس کے بعد میں کسی کی تمنا نہیں کروں گا۔“

”وہ آرزو نہیں ہے۔ گناہ کی طرف لے جانے والی ہوس ہے۔ باز آ جاؤ۔“

”پلیز! مولوی بن کر نصیحتیں نہ کرو۔ یہ زندگی صرف ایک ہی بار جینے کے لیے ملتی ہے۔ موت کے بعد پھر نہیں ملے گی۔ مجھے اپنے مزاج کے مطابق لائف کو انجوائے کرنے دو۔“

وہ فوراً ہی پلٹ کر مراد کی مزید کوئی بات سنے بغیر اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ وہاں زیب النساء عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے پھر جیسی اور اس کے والدین کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سب احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

لباس تبدیل ہونے کی وجہ سے یہی سمجھ میں آیا کہ دوسرا مراد آ گیا ہے۔ ہم زاد نے بھی یہی ظاہر کیا۔ جیسی نے پوچھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ جاؤ میں تم سے نہیں بولوں گی۔“

اس کی مام نے کہا۔ ”بیٹی ایہ وہ نہیں ہیں۔ وہ تم سے بول کر گئے تھے کہ یہ آنے والے ہیں۔ کیا تم بھول گئیں؟“

وہ بولی۔ ”مسٹر تم دونوں مجھے کنفیوز کر رہے ہو۔ تم وہ نہیں ہو۔“

ہم زاد نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ جو تھوڑی دیر پہلے گیا تھا وہ ایک اہم معاملے میں مصروف ہو گیا ہے۔ میں تمہیں تمہینی دینے آیا ہوں۔“

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”ہم آپ کے ممنون ہیں۔ آپ بہت زیادہ مصروف رہنے کے باوجود ہمیں اپنا وقت دے رہے ہیں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”مسٹر ہارورڈ! آپ خوب سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کی صاحبزادی میں دلچسپی لے رہا ہوں کیونکہ یہ ہو بہو ماروی دکھائی دے رہی ہے۔“

”یورہائی نس! میں سمجھ رہا ہوں۔ میں آپ سے اپنے

اندرو کی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ جب سے مجھے اور میری سسر کو معلوم ہوا ہے کہ ہماری بیٹی ماروی کی ہم شکل ہے اور آپ ماروی کی حفاظت اور سلامتی کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں، تب سے ہمارے دل میں یہ بات ہے کہ ہماری بیٹی ماروی بن کر آپ کی پناہ میں رہے۔ تب ہماری تمام فکر اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

ماں نے کہا۔ ”ایک تو ہماری بیٹی اینارمل ہے۔ اس کا دماغ بہت کمزور ہے۔ تھوڑی دیر پہلے کی باتیں بھول جاتی ہے۔ پھر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ آپ کے دشمن اسے مار دی سبھ کر کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یورہائی نس! ایک ماں آپ سے التجا کرتی ہے کہ اسے اپنی پناہ میں رکھ لیں۔ یہ آپ کے پاس محفوظ رہے گی۔“

وہ ماں باپ ہم زاد کے دل کی باتیں کر رہے تھے۔ جیسی کے قریب رہنے کا راستہ خود ہی ہموار ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جیسی میرے اس محل میں رہے؟“

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”بالی گاڈ ہم یہی چاہتے ہیں۔“
”کیا یہ اپنے مام اور ڈیڈ کے بغیر یہاں رہنا چاہے گی؟“
”ہم یہاں سے جائیں گے تو یہ چند گھنٹوں کے بعد ہمیں بھول جائے گی۔ جب ہم سامنے آئیں گے تو پھر ہمیں پہچاننے لگے گی۔“

ہم زاد نے دو کنیزوں کو بلا کر کہا۔ ”مس جیسیکا کے لیے ایک خواب گاہ مخصوص کرو۔ وہاں ان کی ہر ضرورت کا سامان پہنچاؤ۔ تم دونوں ان کا خاص خیال رکھو گی۔“

جیسی کی ماں نے کہا۔ ”بیٹی! یہ تمہاری کنیزیں ہیں۔ تمہیں اس محل کی سیر کرائیں گی۔ ان کے ساتھ جاؤ۔“

وہ محل کی سیر کرنے کے لیے راضی خوشی چلی گئی۔ جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”اچھا ہوا یہ چلی گئی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں یہاں سے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بھول جائے گی کہ کس کے ساتھ محل میں آئی تھی۔ ہمیں جانا چاہیے۔“

ہم زاد ان کے ساتھ چلتا ہوا صدر دروازے سے باہر ان کی کار کے پاس آیا پھر اس نے سکیورٹی افسر کو بلا کر کہا۔ ”یہ مسٹر جیمس ہارورڈ فرانس کے سفیر ہیں اور یہ ان کی سسر ہیں۔ ان کی صاحبزادی مس جیسیکا شاہی خاندان کی ایک فرد بن چکی ہیں۔ ان ماں باپ کو ہمیشہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ یہ جب بھی اپنی صاحبزادی سے ملنے آئیں انہیں کسی روک ٹوک کے بغیر آنے جانے دیا جائے۔“

سکیورٹی افسر نے ہارورڈ اور سسر ہارورڈ کو سیلیوٹ

کیا۔ ایک گارڈ نے ان کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں ہم زاد کے ممنون و مشکور ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد بیلے نے کہا۔ ”مراد! یہ تو میں جانتا تھا کہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھتے ہی پاگل ہو جاؤ گے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ۔۔۔ منکوحہ بنائے بغیر اس نامحرم کو اپنے محل میں رکھو گے۔“

وہ بولا۔ ”میں مراد نہیں ہوں۔“

بشری اور بیلے نے اطمینان کی سانس لی۔ بشری نے کہا۔ ”میرے بھائی جان سلامت رہیں۔ میں جانتی تھی۔ وہ دین کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔“

بیلے نے ہم زاد سے کہا۔ ”تم بعض اوقات مراد کے مزاج کے خلاف کام کرتے ہو اور وہ برداشت کر لیتا ہے۔ اس نے یقیناً تمہیں نیک ہدایات کی ہوں گی۔“

اس نے کہا۔ ”سوری۔ میں اپنے پرسنل معاملات میں تم سے اور بشری سے کبھی نہیں بولوں گا۔ تم دونوں مراد کے ہی رہو گے میرے کبھی نہیں ہو سکو گے۔“

وہ کوئی جواب سنے بغیر منہ پھیر کر چلا گیا۔ بیلے نے کہا۔ ”میں حیران ہوں۔ مراد ماروی کا دیوانہ ہے لیکن اس سے دور رہا اور یہ ہم زاد اس پر ڈورے ڈال رہا ہے۔“

بشری نے کہا۔ ”بھائی خوب سمجھتے ہیں کہ اس کی صورت ماروی کی ہے۔ جیسی بار بار پیدا ہو کر بھی ماروی جیسی نہیں بن سکے گی۔ میرے بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ ہمیشہ ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کرتے رہیں گے۔ وہ تیرے اور ہم زاد کے جیسے نہیں ہیں۔“

”اے! میں نے کہا کیا ہے؟ کیا تجھ پر سوکن لارہا ہوں؟“
”نہیں لارہا ہے لیکن دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی دن لے آئے گا۔ تم مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ اچھا ہے۔ جس بیوی کے دل میں سوکن کا دھڑکا لگا رہتا ہے، وہ تیری طرح دن رات شوہر کی خدمت گزار بن کر رہتی ہے تاکہ دوسری کا خیال ہی نہ آئے۔ اب چل یہاں سے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔“

وہ دونوں محل سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جیمس ہارورڈ اور اس کی بیوی دونوں ہی خوش تھے۔ ان کی اینارمل بیٹی شاہی محل میں عیش و آرام سے محفوظ رہنے والی تھی۔ جیمس نے گھر آ کر بیوی کو آغوش میں لے کر چوم لیا پھر اس نے فون پر اپنے ملک کے حاکم اعلیٰ سے رابطہ کیا۔

اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ”سر! بہت بڑی خوش

خبری سنار ہا ہوں۔ جیسی شاہی محل میں پہنچ گئی ہے۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”صرف پہنچی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نوسرا! مراد تو ماروی کا دیوانہ ہے۔ اس کی ہم شکل جیسی کو دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا ہے۔ اب جیسی اس کے ساتھ محل میں رہے گی۔ ہم اسے وہاں چھوڑ کر ابھی گھر آئے ہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”ویل ڈن مسٹر ہارورڈ! یہ کامیابی ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اتنی جلدی وہ ایک چھلانگ میں محل کے اندر رہنے چلی جائے گی۔“

”اور اب وہ دونوں مراد معما نہیں رہے۔ صاف سمجھ میں آ گیا ہے کہ جیسی کی طرف مائل ہونے والا اور اسے محل میں اپنے قریب رکھنے والا ہی اصلی مراد ہے۔“

”ہاں۔ یہ سمجھ میں آ رہا ہے لیکن یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ہم پہلے دھوکا کھا چکے ہیں۔ جیسی اس کے قریب رہے گی تو وہ اسے اپنی بیوی بنالے گا پھر بیرونی ممالک کے دوروں میں اپنے ساتھ لے جایا کرے گا تو ہمیں یقین ہوتا رہے گا۔“

”سرا وہ مراد کے اتنے قریب پہنچ گئی ہے کہ ہم اس کے بہت سے اندرونی رازوں تک پہنچتے رہیں گے۔“

”بے شک۔ بڑی سہولت سے بڑے اعتماد سے اپنے دشمن پر ڈٹے رہو۔ کسی بھی معاملے میں جلد بازی کرو گے تو ہم پہلے کی طرح نقصان اٹھائیں گے۔ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔“

”آل رائٹ سرا ہم بہت محتاط رہیں گے۔“

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ دوستی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ دشمنی مشکلات سے گزر کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ سپر پاور اور دوسرے تمام بڑے ممالک نے پہلے ہی پلاننگ کی تھی کہ مراد علی منگی جب دشمنی سے زیر نہیں ہوگا تو اسے محبت سے زیر کیا جائے گا۔ اسی پلاننگ کے مطابق ایک اینٹارٹل لڑکی کو پیار کے پھول کھلانے کے لیے وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ہم زاد نے دوسری صبح جینی سے فون پر کہا۔ ”میری کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی۔ میں مراد کے شکنجے سے نہیں بچ سکوں گا۔“

وہ بولی۔ ”میرا کیا ہوگا؟ کیا میں تمام عمر اکیلی رہوں گی؟ کسی دن بھی ڈیلیوری ہو سکتی ہے۔ تمہارا بیٹا میری گود میں آنے والا ہے۔ ایسے وقت تمہیں میرے پاس ہونا چاہیے۔“

”یہی میں نے سوچا ہے کہ مجھے تمہارے پاس رہنا چاہیے۔ اپنے بچے کو ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہیے۔“

”ہائے میرے دلدار! کسی طرح آ جاؤ۔“

”اس طرح آ سکتا ہوں کہ مراد کی غلامی منظور کر لوں۔ پھر وہ مجھے اس حد تک آزاد کرے گا کہ تم یہاں آؤ تو میں تم سے مل سکوں۔ میں تمہاری خاطر اس کا غلام بن جاؤں گا۔“

”کیا وہ ہمیں ہمیشہ ملتے رہنے کی اجازت دے گا؟“

”وہ کبھی بھی تم سے ملنے کی چھٹی دے دیا کرے گا۔“

”چلو یہی سہی۔ نہ ملنے سے بہتر ہے کبھی کبھی ملتے رہیں گے لیکن ایک پر اہلم ہے۔ ڈاکٹر حاملہ عورت کو لمبے سفر کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر یہ کہ میری میڈیکل رپورٹ تشویش ناک ہے۔“

”کیا رپورٹ ہے..... کیا ہمارا بچہ صحت مند نہیں ہے؟“

”بہت زیادہ صحت مند ہے۔ رپورٹ کے مطابق بچہ غیر معمولی جسامت رکھتا ہے۔ عام بچوں کی طرح نہیں ہے۔ اپنے حجم میں طویل قامت ہے۔ میجر آپریشن کے ذریعے ڈیلیوری ہوگی۔ یہ سن کر پریشان ہوں کہ زچگی معمول کے مطابق نہیں ہوگی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یا خدا یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یہ بچہ تو بڑے مسائل پیدا کر رہا ہے۔“

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ”نہیں جینی! ایسے وقت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے قریب رہوں گا لیکن...“

”لیکن کیا؟ کسی طرح آ جاؤ۔ اس کے غلام بن جاؤ۔“

”غلام بننے کے بعد اس کی شرط یہ ہوگی کہ وہ میرے نادیہ بننے کی قوت چھین لے گا۔ میں تمہارے پاس کسی انسان کی شکل میں آؤں گا۔“

”کیا پھر میں تمہیں دیکھ سکوں گی؟“

”ہاں۔ پوری دنیا مجھے دیکھے گی۔ جب مراد کو مجھ سے کوئی کام لینا ہوگا تو وہ مجھے نادیہ بنا دے گا۔ وہ بڑے خطرناک پراسرار علوم جانتا ہے۔ میں اس کے آگے بے بس ہوں۔“

”اس کی بات نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔ کیا تم کسی انسان کے روپ میں میرے پاس آؤ گے؟“

”ہاں انسان کے ہی روپ میں آؤں گا لیکن تمہارے پاس نہیں آ سکوں گا۔ اس کی شرط ہوگی کہ میں ریاست سے باہر نہیں نہ جاؤں۔ اس لیے تمہیں یہاں آنا ہوگا۔“

”اوہ گاڈ...! ایسا ہو کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ میں ابھی ڈاکٹروں سے التجا کروں گی کہ مجھے ریاست تک سفر کرنے کی اجازت دیں۔“

”میں ابھی مراد کا تابعدار بن جاؤں گا تو وہ تمہارے ملک

کے اکابرین سے کہے گا کہ تمہیں یہاں فوراً بھیج دیا جائے۔“
 ”پلیز! میری خاطر اس کے تابعدار بن جاؤ۔ میرے اندر یہ بات سناگئی ہے کہ زندگی کا بھروسہ نہیں ہے۔ میں ایسے وقت تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

اس نے وعدہ کیا کہ ابھی مراد سے معاملات طے کرے گا، اس کے آگے جھک جائے گا پھر جینی کو ریاست آنے کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

اس نے رابطہ ختم کر کے اس ملک کے اعلیٰ حاکم کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے شکریہ... میرے لائق کوئی خدمت؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”پیرس میں ایک مشہور ماڈل جینی جوزف ہے، جس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔“

”یہ یورپائی نس! ہمیں معلوم ہے۔ وہ ماڈل جینی ہم سے رابطے میں رہتی ہے۔“

”میں نے اس کے عاشق کو تنخیر کیا ہے۔ وہ میری قید میں ہے۔ وہ کمبخت بہت ضدی ہے۔ میری اطاعت قبول نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ اپنے پراسرار علوم سے اس کے نادیدہ ہونے کی صلاحیت چھین لی ہے۔“

وہ بولا۔ ”بے شک آپ پراسرار علوم کے زبردست حامل بن گئے ہیں۔ میں جینی کو اطلاع دوں گا کہ وہ آپ کی قید میں ہے۔“

”میں چاہتا ہوں، آپ جینی کو میری ریاست میں بھیج دیں۔ اس کا عاشق میرے آگے اس شرط پر گھٹنے ٹیکنا چاہتا ہے کہ میں اس کی محبوبہ کو اس کے پاس پہنچا دوں۔ میں چاہتا ہوں جینی کو جلد از جلد اس کے حوالے کر دوں تاکہ وہ میرا غلام بن جائے۔“

”یہ کوئی پرابلم نہیں ہے، میں جینی سے بات کرتا ہوں۔ کل ہی اسے یہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ ابھی اس سے باتیں کرنے کے بعد آپ کو کال کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا پھر اس نے ایک گھنٹے کے بعد کہا۔ ”یورپائی نس! ڈاکٹر کہتے ہیں بچہ دس بارہ دنوں میں جنم لے گا۔ ایسے وقت اسے طویل سفر نہیں کرنا چاہیے لیکن جینی اپنے محبوب کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں چل رہا ہے۔ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا فائدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ٹیم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟“

”ہم ایک خاص طیارے میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کر دیں گے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی ہوگی۔ ہنگامی سہولتیں میں آپریشن کرنے والے سرجن بھی ہوں گے۔“

”جب ایسے زبردست انتظامات ہو سکتے ہیں تو اسے کل ہی کسی وقت وہاں سے روانہ کر دیں۔“

معاملات طے ہو گئے۔ جینی دوسرے دن کسی وقت بھی ہم زاد کے پاس آنے والی تھی۔

مراد کی توجہ ماروی اور محبوب پر تھی۔ وہ ان سے ملتا اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ سکیورٹی کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صدر پاکستان سے گزارش کی تھی کہ وہ پیدائشی پاکستانی ہے اور دو چار دنوں کے لیے اپنے وطن میں آنا چاہتا ہے۔

صدر پاکستان نے کہا تھا۔ ”آپ کی آمد باعث مسرت ہوگی۔ آپ بعد شوق تشریف لائیں۔ ہمیں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔ پاکستان کے عوام بڑے جوش و خروش سے اپنے ہم وطن بادشاہ سلامت کا استقبال کریں گے۔“

یہ طے پا گیا کہ وہ چار دنوں کے بعد اپنے طیارے میں وہاں آئے گا۔ ماہ نور نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے؟ وہ میرا بھی وطن ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ تم نہ جاؤ تو؟“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ضد نہیں کروں گی لیکن میں افسوس کرتی رہوں گی۔“

مراد مسکراتے لگا۔ وہ بولی۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں نا؟ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے نا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں جاؤں گا تو تمہیں لے جاؤں گا اور میں نہیں جا رہا ہوں۔“

”ابھی آپ صدر پاکستان سے کہہ رہے تھے کہ...“

”سیاست میں کہا کچھ جاتا ہے، کیا کچھ جاتا ہے۔ میں پھر سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کو فریب دینے والا ہوں۔ ہم زاد... وہاں جائے گا۔ میں دشمنوں کو پھر الجھاؤں گا۔“

وہ بولی۔ ”یہ سب جانتے ہیں کہ ریاست کی ملکہ... ماہ نور بھی پیدائشی پاکستانی ہے۔ سوال پیدا ہوگا کہ ریاست کے بادشاہ کے ساتھ ملکہ اپنے وطن کیوں نہیں آئی ہے؟“

”تم دو روز بعد بیمار بن جاؤ گی۔ یہاں کے ڈاکٹر بیان دیں گے کہ تم سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ ہم زاد کے ساتھ اس کی وائف زیب النساء نہیں جائے گی۔ اس طرح سب ہی اسے مراد سمجھتے رہیں گے۔“

وہ چند لمحوں تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ہم زاد کے ساتھ جیسی جائے گی۔“

ماہ نور نے کہا۔ ”ہم زاد سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کیا اس کا ساتھ جانا مناسب ہوگا؟“

وہ بولا۔ ”یہ سیاسی چال بازی ہے۔ کل رات سے اب تک تمام مخالفین کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ مراد علی منگلی ماروی کی ہم شکل جیسیکا عرف جیسی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے جیسی کو اپنے محل میں رکھا ہے۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان جانے کی تو سب ہی کو پورا یقین ہو جائے گا کہ دیوانہ مراد اپنی دوسری ماروی سے دور نہیں رہتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”واقعی اس طرح سب ہی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ دوسری ماروی کے بھی دیوانے ہو گئے ہیں۔ اسے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔“

وہ مراد کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ آپ نے میری خاطر ماروی بن کر آنے والی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو میری زندگی بھی عطا کرے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اپنی دعاوا پس لو۔ تمہاری زندگی ملے گی تو میں عورت بن جاؤں گا۔ ماہ نور کہلانے لگوں گا۔“

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر مراد نے فون پر محبوب سے پوچھا۔ ”آپ خیریت سے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”اوپر خدا ہے اور نیچے تم ہو۔ پھر خیریت کیسے نہیں ہوگی۔ یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے مجھ پر مہربان ہو گئے ہیں۔ آئی جی آف پولیس اور انفارمیشن منسٹر نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کا پورا ڈیپارٹمنٹ میری سیکورٹی کے لیے شب و روز الرٹ رہے گا۔ میں ان سے جیسی بھی سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ مجھے فوراً ہی حاصل ہوتی رہیں گی۔“

مراد ہنستے ہوئے بولا۔ ”مراد علی منگلی کا ڈنڈا سروں پر بچ رہا ہے۔ میں آج سے چار دنوں کے بعد وہاں آنے والا ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ جسے قاتل اور مفرور مجرم کہا جاتا تھا اور جس کے لیے میرے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی تھی، اسی مجرم کا وہاں شاہانہ انداز میں استقبال کیا جائے گا۔“

”واقعی مراد! تم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ ایک عام سا پاکستانی ایک ریاست کا حکمران بن کر آ رہا ہے۔ پورا پاکستان تم پر فخر کرے گا اور میں تم پر کتنا فخر کرتا ہوں یہ میرا خدا جانتا ہے۔“

”ایک راز کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ صرف آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نہیں آ رہا ہوں۔ ہم زاد آنے والا ہے۔“

”یا خدا...! کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ دشمن پھر تمہیں

ٹریپ کرنے کی حماقت کریں گے؟“

”آپ دیکھتے آرہے ہیں۔ دشمن ہماری نقصانات اٹھانے کے باوجود دشمنی سے باز نہیں آتے ہیں۔ اس لیے میں احتیاطاً ایسی چال چل رہا ہوں۔“

”بے شک تم دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہو۔“

مراد نے اسے ماروی کی ہم شکل جیسی کے متعلق بتایا کہ وہ ایک اینٹارٹل دوشیزہ ہے۔ ہم زاد اس سے فلرٹ کر رہا ہے۔ دشمن دھوکا کھائیں گے کہ مراد پھر کسی ماروی کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اسے بیرونی ممالک کے دورے پر بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”دشمن اپنی چالیں چلیں گے۔ میں اپنی چل رہا ہوں۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ انجام کیا ہوگا؟“

محبوب نے کہا۔ ”مراد! یہ اچانک دوسری ماروی کہاں سے پیدا ہو گئی ہے؟ ایک تو ہم دونوں ہم شکل ہیں۔ اب ماروی کی بھی ہم شکل آگئی ہے۔ اتفاقاً یہ کیا ہو گیا کہ وہ سیدھی تمہاری ریاست پہنچی اور اس نے پہنچتے ہی تمہارے محل میں جگہ بنالی۔ مجھے تو یہ کھلم کھلا ٹوٹکی لگ رہی ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں فریب میں آنے والا نہیں ہوں۔ اسی لیے میں نے اس کا دیوانہ عاشق بننے سے گریز کیا ہے۔ جیسی اور اس کے ماں باپ ہم زاد کو مراد سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان کا دورہ کرے گا تو تمام مخالفین بھی اسے شک و شبہ کے بغیر مراد سمجھ لیں گے۔ جیسی کو محل میں آئے ہوئے ابھی بیس گھنٹے گزرے ہیں۔ محل کی تین کنیزیں اور ایک خادم میرے جاسوس ہیں۔ اب تک ان کا بیان یہی ہے کہ وہ سچ سچ اینٹارٹل ہے۔ سفیر جنیس ہارورڈ اور اس کے ملک کے اکابرین اس بنارٹل لڑکی کے ذریعے اپنا ٹیم پلے کر رہے ہوں گے۔ پھر یہ کہ ہم زاد اور گلین مزاج ضرور ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی میں محتاط اور حاضر دماغ رہتا ہے۔ ان کی سازشیں جلد ہی کھل کر سامنے آئیں گی۔“

”خدا کرے، سازشیں کرنے والے بے نقاب ہو جائیں۔ تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میں فون کے ذریعے تمہیں یہاں کے حالات بتاتا رہوں گا۔ جیسی کو بھی دیکھوں گا اور اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔“

ماہ نور نے آکر کہا۔ ”اپنی مصروفیت ختم کریں۔ عصر کی اذان ہو رہی ہے۔“

مراد نے فون پر کہا۔ ”اچھا محبوب صاحب! ہم پھر کسی وقت باتیں کریں گے۔ اللہ حافظ۔“

وہ فون بند کر کے نماز کے لیے اٹھ گیا۔

ہم زاد پورے محل میں جیسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے جیسی کی خاص کنیزوں کو بلا کر پوچھا۔ ”جیسی کہاں ہے؟“ ایک کنیز نے کہا۔ ”وہ آنکھ مچولی کھیلنے کی ضد کر رہی تھیں۔ ہم نے کہا کہ وہ کہیں جا کر چھپ جائیں۔ ہم انہیں تلاش کریں گے۔“

دوسری کنیز نے کہا۔ ”پتا نہیں، وہ کہاں جا کر چھپ گئی ہیں۔ ہم محل کے کئی حصوں میں دیکھ چکے ہیں۔“ ہم زاد نے کہا۔ ”اسے ڈھونڈو۔ گارڈز اسے محل سے باہر نہیں جانے دیں گے۔ وہ اندر ہی کہیں ہوگی۔“

وہ خود اسے ڈھونڈنے لگا۔ اس محل میں تقریباً سو چھوٹے بڑے کمرے ڈرائنگ روم، اسٹڈی روم، میٹنگ ہال اور اتنے ہی اسٹور روم تھے۔ کئی بیچ در بیچ راہداریاں تھیں۔ وہاں رہنے والوں کو ہی یاد رہتا تھا کہ وہ محل کے کس حصے میں ہیں اور انہیں کہاں سے گزر کر اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنا ہے اور جیسی کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کی یادداشت کمزور تھی۔ وہ ایک کمرے میں جا کر چھپ گئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ دراصل وہ مراد کا وہ پرائیویٹ روم تھا جہاں وہ بیٹھ کر اسکاٹپ کے ذریعے سپر پاور اور ان کے اتحادیوں سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس کی انتہائی خفیہ فائلیں اور ریاست کے تمام حساس اداروں کے اہم ریکارڈ وہاں رکھے ہوئے تھے۔

وہ اس کمرے میں بند ہو کر کمپیوٹر کے پاس آ کر چاروں طرف پوچھ دیکھنے لگی جیسے وہاں کی ہر چیز اس کے لیے نئی ہو اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کیا ہے؟ چند لمحوں کے بعد ہی بھول گئی کہ وہ پہلے کہاں تھی اب کہاں ہے؟

ہم زاد اور کنیزوں کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ وہ مراد کے کانسٹیبل روم کی طرف نہیں جائے گی۔ ایک ملازم نے دوڑتے ہوئے آکر ہم زاد کے سامنے تعظیم سے جھک کر کہا۔ ”عالی جاہ! وہ حضور کے اسٹڈی روم میں بند ہو گئی ہیں۔ اندر سے دروازہ پیٹ رہی ہیں۔ میں نے وہاں جا کر دروازے کو باہر سے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ مقفل ہو گیا ہے۔“

مراد کے اس کمرے کی ایک چابی ہم زاد کے پاس تھی۔ اس کا لاک ایسا تھا کہ کوئی چوری چھپے وہاں جاتا تو دروازہ از خود مقفل ہو جاتا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں قیدی بنی رہی۔ ہم زاد دوڑتا ہوا آیا تو اندر سے اس کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے فوراً ہی چابی سے دروازے کو کھولا۔ وہ فرش پر دوڑا ہوا ہو کر بیٹھی تھی اور رو کر

کہہ رہی تھی۔ ”دروازہ نہیں کھلتا ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دروازہ کھولو۔“

دروازہ کھلا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ مراد کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کون ہے؟ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ گلاب کا پھول شبنم میں نہا رہا تھا۔ روتے والی کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔ ہم زاد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یاد کرو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔“

وہ یاد کرنے کے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر سر ہلانے لگی۔ اسے کچھ کچھ یاد آرہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں اس کمرے میں کیسے آئی تھی؟“

وہ کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ یہاں چھپنے کے لیے آئی تھیں۔ تم تو بہت سمجھدار ہو، یاد کرو۔“

وہ پھر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ہم زاد نے کنیزوں اور ملازموں کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ پھر ان کے جاتے ہی دل بے ایمان ہونے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسی کے شانوں پر تھے۔ بدن سے آنچ آرہی تھی۔ وہ اس کے آنسو پونچھنے کے بہانے ملائم چہرے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ یاد آرہا ہے؟“

وہ اسے بڑے اعتماد سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔ تم بادشاہ سلامت ہو۔ تم نے میرا یہ ہاتھ پکڑا تھا۔ پھر ایک بار پکڑو۔“

اس نے بڑی مصحوبیت سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت ہی بھولے پن سے ہم زاد کو چھونے اور پکڑنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ تھام کر تعجب سے پوچھا۔ ”میں نے کب تمہارا ہاتھ پکڑا تھا؟“

”وہ جب میں یہاں آئی تھی تو تم نے مصافحہ کیا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ جب میں رات کو سونے لگی تو ایسا لگا کہ تم میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہو۔ ابھی تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی تو یاد آیا کہ تم نے ہی میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اسی لیے جلدی پہچان گئی۔“

”ابھی میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے۔ کیسا لگ رہا ہے؟“ ”بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم میرے آنسو پونچھ رہے تھے تو میں تمہاری انگلیوں اور ہتھیلیوں کے بیچ آ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ پلیز بولنا۔ مجھے کیا ہونے لگتا ہے؟“

وہ نہ تو دل بھانے والی ادا محسوس دکھا رہی تھی اور نہ ہی اپنے حسن و شباب کا چار اڈال رہی تھی۔ وہ اپنی معصومیت سے اسے لوٹ رہی تھی۔

وہ اسے آغوش میں سمیٹ کر بولا۔ ”تم خود ہی سمجھو کہ تمہیں کیا ہونے لگتا ہے۔“

وہ بھی سی چڑیا تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی صیاد کیسے جال بھینکتا ہے۔ اس کی مام سمجھایا کرتی تھی۔ ”بیٹی! مردوں سے دور رہنا۔ کبھی کسی کو چھونے اور پکڑنے نہ دینا۔ تمہاری دماغی کمزوری اور معصومیت نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میں جو سمجھاتی ہوں، وہ تمہیں یاد نہیں رہتا ہے۔“

اس کے باپ جیمس ہارورڈ نے کہا تھا۔ ”بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم دن رات اسے اپنی نظروں میں رکھیں۔ ہمارا ایک ہی مشن ہے، اسے مراد علی منگی تک پہنچانا۔ تب تک ہم اسے کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔“

ان لمحات میں اس چڑیا کو یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ”مام کہتی تھیں، کسی مرد کے قریب نہ جانا۔ یہ بات میں بھول گئی تھی، ابھی تم اپنے بدن سے لگا رہے ہو تو یاد آ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ، مام کیوں منع کرتی تھیں؟ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟ لیکن مجھے تو اچھا لگ رہا ہے۔“

اس نے سمجھایا۔ ”ایک جوان لڑکی کو کسی ایک لائف پارٹنر کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ کیا تم یاد رکھو گی کہ میں تمہارا لائف پارٹنر ہوں اور تم اسی طرح میری آغوش میں آ جا یا کرو گی؟“

وہ عیسائی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کی ایک چین کے ساتھ ایک صلیب تھا۔ اس نے ہم زاد سے الگ ہو کر اس صلیب کو تھام کر کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا ہے۔ مام نے کہا تھا۔ گاڈ سے مدد مانگنا ہو تو اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورے اعتماد سے چومو۔ پھر جو مانگنا چاہو مانگو۔ گاڈ تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ تم مجھے چھو رہے ہو۔ پکڑ رہے ہو تو بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ پلیز انتظار کرو۔ میں گاڈ سے تمہیں مانگ رہی ہوں۔“

وہ صلیب کو چوم کر اسے سینے سے لگا کر دھیمی آواز میں بولنے لگی۔ ”میرے خدا...! مجھ پر رحم فرما۔ مجھے عقل دے۔ مجھے اتنا سا حافظہ دے کہ مجھے سینے سے لگانے والے بادشاہ سلامت کو ہمیشہ یاد رکھوں۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اس کے سینے سے لگنے والی بات یاد رکھوں گی تو پھر اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ اے خدا...! میری مدد فرما۔ آمین۔“

وہ دعا ختم کرتے ہی اس کے سینے سے آ کر لگ گئی پھر

ایک ننھی سی بچی کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

ہم زاد نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہی ہو؟“

وہ سکتے ہوئے بولی۔ ”معلوم نہیں۔ مجھے رونے دو۔“

ہم زاد نے پہلی بار اپنی ہوس پرستی پر ندامت محسوس کی۔ وہ جوان تھی لیکن اس کے اندر ایک ایسی معصوم بچی تھی جس کی معصومیت اور پاکیزگی کو نہیں پہنچانا مناسب نہیں تھا۔

دوسرے پہلو سے یہ حقیقت تھی کہ دنیا کی ہر بچی جوان ہو کر جوانی کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ جیسی کی عمر کا بھی یہی تقاضا تھا۔ اسی لیے ہم زاد کی قربت سے بھٹک رہی تھی۔ اس کا بچکانہ ذہن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ سلامت سے کیا چاہتی ہے؟

ہم زاد نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کیا کہ اسے محض عیاشی کا کھلونا نہیں سمجھے گا۔ وہ کالج سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اسے کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا۔ اسے دل کی تجوری میں بڑی حفاظت سے رکھے گا۔ اسے بھٹکنے کے لیے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ہم زاد نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ مراد کی آواز سنائی دی۔ ”جہاں بھی ہو، ابھی یہاں آ جاؤ۔ میں محل کے اس حصے میں ہوں جہاں تمہاری جینی کے لیے ایک مینی اسپتال قائم کیا جا رہا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی آ رہا ہوں۔“ جیسی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر اس کے ساتھ باہر آیا تو وہ اس سے لگی ہوئی تھی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم زاد نے کنیزوں کو حکم دیا۔ ”جیسی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کا خیال رکھو۔ یہ اپنے کمرے سے باہر جائے گی تو پھر پورے محل میں بھٹکتی رہے گی۔“

وہ جیسی کو تھپک کر بولا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ۔ میں دیر نہیں کروں گا۔ جلدی آ جاؤں گا۔“

وہ چلی گئی۔ ہم زاد محل کے اس حصے میں آیا جہاں تین کمروں کو اسپتال بنا دیا گیا تھا۔ ایک کمرے کو لیبر روم اور آپریشن تھیٹر بنا دیا گیا تھا۔ وہاں نرسیں اور وارڈ بوائز آگئے تھے۔ دوسرے دن جینی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ریاست

کے ماہر ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔ ان کے علاوہ جینی کے ساتھ بھی اس ملک کی معروف لیڈی ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔

مراد اور ہم زاد وہاں کے انتظامات سے مطمئن ہو کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے جیسیکا میرے کانفیڈنشل روم میں گئی تھی اور وہاں ایک گھنٹے تک رہی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”تم تو جانتے ہو۔ اس کمرے کا دروازہ خود بخود لاک ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔“ اس نے سختی سے کہا۔ ”وہ کھیل تماشے کرنے نہیں گئی تھی۔ جان بوجھ کر لاکڈ ہو گئی تھی۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس نے ایک گھنٹے میں کمپیوٹر کے ذریعے ہمارے کتنے خفیہ معاملات کے کوڈز معلوم کیے ہوں گے اور کتنی اہم فائلیں پڑھ چکی ہوگی؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”وہ سچ مچ ذہنی مریضہ ہے۔ اس پر شبہ نہ کرو۔ اس کمپیوٹر کو اپن کرنے کے پاس ورڈ صرف ہم دونوں جانتے ہیں۔ کوئی تیسرا نہ جانتا ہے نہ جان سکے گا۔ پلیز اس پر شبہ نہ کرو۔ میں اسے اچھی طرح دیکھتا اور پرکھتا رہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ خدا کرے جیسیکا محصوم اور بے ضرر ہو۔“ دوسری طرف سپر پاور اور اس کے اتحادی اسکائپ کے ذریعے بول رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”جیسیکا کے محل میں پہنچتے ہی ہمیں پہلی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جیسیکا دو مراد میں جس سے بھی بولتی ہے، اس کی ریکارڈنگ ہمارے پاس پہنچ جاتی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ریکارڈنگ روم میں ہمارے جاسوس دن رات اس مشین کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی ایک آڈیو کیسٹ میرے پاس پہنچایا ہے۔ اسے آپ حضرات سنیں۔“

اس نے ایک ریکارڈر کو آن کیا۔ چند لمحوں کے بعد جیسیکا کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”دروازہ کھولو۔ یہ بند ہو گیا ہے۔ مجھ سے نہیں کھل رہا ہے۔ پلیز ہیلپ می۔ کم اوور ہیئر۔ فارگاڈ سیک اوپن اٹ۔۔۔“

وقتے وقتے سے دروازہ پیٹنے کی اور اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ”اوگاڈ! میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا یہاں کوئی دروازہ کھولنے والا نہیں ہے؟“

پھر ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”بی بی جی! کیا آپ کے پاس دروازے کی چابی نہیں ہے۔“ وہ روتے اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”نہیں ہے۔“

چابی نہیں ہے۔ تم کون ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو۔“ آپ نہ روئیں بی بی جی! میں ابھی حضور اعلیٰ کو خبر دیتا ہوں۔ وہ ابھی آ جائیں گے۔“

پھر دروازے کے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف جیسی کے رونے اور سسکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ملک کے حاکم نے پوچھا۔ ”یہ کبخت لڑکی کہاں جا کر پھنس گئی ہے؟ وہ آٹومیک لاکڈ ہو جانے والا دروازہ ہوگا۔ کسی خاص کمرے کے دروازے ہی ایسے ہوا کرتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، وہ محل کے کسی کانفیڈنشل کمرے میں جا کر پھنس گئی ہے۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”جیسیکا نے کچھ راز کی باتیں معلوم کی ہوں گی۔“

سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”قاریور انفارمیشن وہ نہیں جانتی کہ راز کیا ہوتا ہے اور جاسوسی کیسے کی جاتی ہے۔ وہ دماغی طور پر بہت کمزور ہے۔ حافظہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی ہے کہ اس کے گلے سے جو صلیب لٹک رہا ہے اس کے اندر موبائل فون کی ایک سم رکھی ہوئی ہے۔ وہ صلیب دراصل ایک فون ہے۔ اس کی بیٹری بہت پاورفل ہے۔ چوبیس گھنٹے آن رہنے کے باوجود کبھی ڈاؤن نہیں ہوگی۔ ہم وہاں ہونے والی تمام اہم اور غیر اہم باتیں سننے رہیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”صرف باتیں سننے سے کیا حاصل ہوگا؟“ ”بہت کچھ حاصل ہوگا۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان دو میں سے کون اصلی مراد علی منگی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج سے چار دنوں کے بعد پاکستان کے دورے پر مراد جا رہا ہے یا ڈمی مراد جانے والا ہے۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ریکارڈر سے مراد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جیسی کے پاس آ گیا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ”یاد کرو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔“

مراد اور جیسی کی باتوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کنیزوں کے ساتھ آنکھ مجھولی کھیلتے ہوئے اس کمرے میں چھپنے کے لیے آئی تھی۔ اب مراد کے سامنے رفتہ رفتہ اسے پہچان رہی تھی۔ وہاں تمام سننے والے اکابرین کو معلوم ہو رہا

تھا کہ وہ نوخیز دوشیزہ اپنی عمر کے فطری تقاضوں کے مطابق مراد سے متاثر ہو گئی ہے اور اسے بڑی مصومیت سے طلب کر رہی ہے۔ پھر وہ صلیب کو ہاتھوں میں لے کر اسے چوم کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

ایک حاکم نے کہا۔ ”یہ لڑکی عقل سے محروم ہے لیکن مراد کی آغوش میں جا کر اپنی مام کی گزری ہوئی باتیں یاد کر رہی ہے۔ اسے معجزہ کہنا چاہیے۔ یہ کچھ عقل کی باتیں کر رہی ہے۔ ایک مارٹل لڑکی کی طرح گاڈ سے مراد کو طلب کر رہی ہے۔“

وہ یونے والا چپ ہو گیا۔ اس وقت مراد فون اٹینڈ کر رہا تھا۔ پھر اس نے جواباً کہا۔ ”ابھی آرہا ہوں۔“ جیسی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔“ مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے دلاسا دینے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ میں ابھی آ جاؤں گا۔“

تمام ملکوں کے اکابرین یہ سن کر بے چین ہو گئے کہ وہ دوسرے مراد سے ملنے جا رہا ہے۔ پھر جلد ہی انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ جیسی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ خبریں پہنچانے والی صلیب بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔

انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دو مراد کہاں ملاقات کر رہے ہیں اور کن معاملات پر باتیں کر رہے ہیں۔ اکابرین میں سے ایک نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب اہم باتیں معلوم ہونے والی ہیں تو جیسی کو دور کر دیا گیا ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہمیں صبر سے انتظار کرنا چاہیے۔ ابھی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ آئندہ بھی کسی رکاوٹ کے بغیر معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔“

دوسرے حاکم نے کہا۔ ”اتنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ جیسیکا سے جو پیار کر رہا ہے، وہی ماروی کا دیوانہ مراد علی منگی ہے اور وہ مراد اپنی نئی ماروی کو اپنے ہم شکل کی آغوش میں جانے نہیں دے گا۔“

”ہاں۔ اصل مراد کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ پھر بھی ہماری طرف سے انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔ ہم ایک لمبی مدت تک ٹھہر کر رہیں گے۔ دونوں مراد کو مختلف حالات میں مختلف واقعات میں پرکھتے رہیں گے۔ اس دوران دوستی اور محبت کی سیاست کرتے رہیں گے۔ اگر ہماری سیاسی دوستی سے باہمی تعلقات بہتر ہوتے جائیں تو

ہم دوستی بحال رکھیں گے۔ دشمنی بھول جائیں گے۔“ پھر وہ جینی کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”مراد مسٹران سین (ہم زاد) کی محبوبہ سے اچانک ہی دلچسپی لینے لگا ہے۔ اس ماں بننے والی ماڈل کو اپنی ریاست میں بلارہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے۔ میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس ماڈل جینی کے پیچھے گہری رازداری ہے۔ مراد کسی خاص مقصد کے لیے اسے اپنے قریب بلارہا ہے۔“

”مقصد یہ ہے کہ جینی کا عاشق جن اسی وقت مراد کی تابعداری قبول کرے گا، جب اس کی محبوبہ کو اس عاشق کے پاس ریاست میں پہنچایا جائے گا۔“

”کیا وہ عاشق جن مسٹران سین اس ریاست میں رہتا ہے؟“

”مراد نے اسے وہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔“

آرمی کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ہمارا ذہن ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ یہ قہرے کہانیوں والی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”پہلے ہم بھی تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن ہماری آرمی کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے۔ ہمارے جہاز پہلی کا پٹر اور اسلحے کے گودام بم دھماکوں سے اڑ گئے۔ ہم نے دو ہی دنوں میں کروڑوں ڈالر کا نقصان اٹھایا ہے۔ ایک تہا مراد ہمیں اتنی بڑی تباہی سے دوچار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ہم نے مسٹران سین کو اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے درمیان موجود پایا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہم سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی حرکتوں سے یہ ثابت کرتا رہا ہے کہ ہماری دنیا میں جنات کا وجود ہے اور یہ قہرے کہانیوں والی باتیں نہیں ہیں۔ میں سو بات کی ایک بات کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک لمبی مدت تک مراد کے خلاف نہ سوچیں گے، نہ مخالفت میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ایبنا رٹل جیسیکا کے اور دیگر سراغ رسالوں کے ذریعے جو جاسوسی کر سکتے ہیں اور اہم خفیہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں، وہ چپ چاپ رازداری سے کرتے رہیں گے۔“

ان سب کے موجودہ فیصلے کے مطابق آئندہ مراد سے نہ جنگ ہونے والی تھی، نہ کسی طرح کی محاذ آرائی کی نوبت آنے والی تھی۔ دشمنوں کو عقل آگئی تھی۔ فی الحال جیسے کا تب تقدیر نے آرام و سکون اور امن و امان لکھ دیا تھا۔

لیکن دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ تماشے نہ ہوں تو دنیا دلچسپیوں سے خالی ہو جائے گی۔ لہذا ایک سمت سے ہنگامے رکھتے ہیں تو دوسری سمت سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ریاست

ناکام رہتی ہیں اسی لیے وہ خوب بھتی ہیں۔ وہ دس مجرم بھی بے لگام ہو گئے تھے۔

وہ اعلان کر رہے تھے۔ ”مراد ایک ہی شرط پر زندہ سلامت رہ کر لمبی عمر گزار سکتا ہے۔ وہ ایک ناقابل شکست اور طاقتور مجرم تھا۔ وہ مجرم اب بھی اس کے اندر ہے۔ اسے ہم نیک مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دنیا کے تمام مجرموں کا سرپرست بن جائے۔ اپنی ریاست کو ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ بنا دے۔ تمام مفرور اور روپوش رہنے والے مجرم اس کی ریاست میں آباد ہوں گے اور کسی اندیشے کے بغیر وہاں آزادی سے زندگی گزاریں گے۔ ریاست اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ مجرم ہے، مجرم ہی رہے گا۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ راضی خوشی تمام مجرموں کا سرپرست بن کر جرائم کی دنیا کا شہنشاہ کہلائے۔ اگر وہ ہماری یہ شرط تسلیم نہیں کرے گا۔ ہمارے نیک مشوروں پر عمل نہیں کرے گا تو ہم رفتہ رفتہ گوریلا جنگ لڑتے ہوئے اس کے محل میں گھس آئیں گے۔ اسے پھانسی پر لٹکا کر وہاں کے حکمران بن جائیں گے۔ مراد نے ایک ریاست کا حکمران بن کر ہمیں یہ سمجھا دیا ہے کہ ہم مجرم بھی اپنی ایک حکومت قائم کر سکتے ہیں اور اپنی مملکت میں اپنے مجرم بھائیوں کو پناہ دے سکتے ہیں اور ہم جلد ہی ایسا کرنے والے ہیں۔“

ہم زادن نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے کہا۔ ”مراد...! ہم بھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے خلاف مجرموں کا یہ نیا محاذ کھل جائے گا۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ان کم بختوں نے ایک نئی اور چولکا دینے والی بات کی ہے کہ دنیا کے تمام مجرموں کا ایک الگ ملک اور الگ حکومت ہونی چاہیے۔ یہ ایسی بات ہے کہ دنیا کی تمام انڈر ورلڈ مافیا اور سٹڈ کیٹ ان کا ساتھ دیں گی۔ تمام مجرموں کی یہ دلی خواہش ہوگی کہ وہ مفرور نہ کہلائیں۔ روپوش نہ رہیں۔ آزادی سے گھومنے پھرنے کے لیے ان کا ایک ملک اور ان کی اپنی حکومت ہو۔ وہ موت کی سزا پانے والے دس مجرم جو یہاں سے گئے تھے، بڑا زبردست گیم کھیل رہے ہیں۔ انہیں تمام انڈر ورلڈ کے چھٹے ہوئے مجرموں کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے۔“

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ ایسے وقت کہا جاسکتا ہے کہ دشمنوں نے بولتی بند کر دی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردنیں ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں سزائے موت اور عمر قید کی سزا پانے والے دس مجرموں نے مراد کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ ان کی پشت پر مجرموں کی سب سے خطرناک اور طاقت ور تنظیم ریڈ الرٹ تھی۔ باقی دوسری کرمٹل تنظیمیں بھی ریڈ الرٹ کے سربراہ جنکی براؤن کے ساتھ ہوگئی تھیں۔

ان دس مجرموں نے کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے مراد کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”ہمیں سزائے موت کا حکم سنانے والے اب تمہاری موت لازمی ہوگئی ہے۔ تم نے سوچا تھا کہ ہمیں ریاست سے باہر دوسرے ملکوں میں پہنچاؤ گے تو ہم بد نصیبوں کو کوئی ملک پناہ نہیں دے گا۔ ہم ان ملکوں میں مارے جائیں گے یا پھر سزائے موت پانے کے لیے ریاست واپس آئیں گے۔ تم یہ بھول گئے تھے کہ ہمیں کسی ملک میں پناہ ملے یا نہ ملے، جرائم کی دنیا میں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یہی ہو رہا ہے۔ ہمیں سلامتی مل گئی ہے۔ خفیہ پناہ گاہیں اور بے حساب اسلحہ مل گیا ہے۔ مختلف بینکوں میں ہمارے اکاؤنٹس کھل گئے ہیں۔ درجنوں تنظیموں نے بڑی فراخ دلی سے ہمارے اکاؤنٹس میں لاکھوں ڈالرز پہنچا دیے ہیں۔ اب ہم تمہاری طرف سے معتبوب کیے ہوئے دس مجرم نہیں ہیں۔ ہم دس ہزار ہو گئے ہیں۔ تمہاری زندگی حرام کر دیں گے۔ ابھی یہ لکھ لو کہ جب تک ریاست کے اندر ہو سلامت ہو۔ تم اور تمہارا وہ نوشکی... ہم مشکل مراد جب بھی اپنی سرحد سے باہر آئے گا مارا جائے گا۔ اگر کسی ملک کا دورہ کرنے والے ہو تو زندہ رہنے کے لیے اسے منسوخ کر دو۔ اگر کبھی حالات سے مجبور ہو کر ریاست کو چھوڑنا پڑا تو ہم تمہیں کسی ملک میں سیاسی پناہ لینے نہیں دیں گے۔ تمہارا جینا مشکل کر کے موت کو آسان بنا دیں گے۔ ابھی یہ ابتدا ہے۔ دو چار ماہ کے بعد ہمارے جاسوس اور سیکڑوں شوٹرز تمہاری ریاست میں گھس آئیں گے۔ تمہاری آرمی سے گوریلا جنگ لڑیں گے اور تم دیکھو گے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور کرنسی کی کمی نہیں ہوگی۔ جب تک تم زندہ رہو گے۔ جب تک ہم سانس لیتے رہیں گے۔ وہ گوریلا جنگ جاری رہے گی۔ سمجھ لو کہ تمہاری ریاست کے عوام کا بھی امن و سکون غارت ہونے والا ہے۔“

مراد اور ہم زادن رہے تھے۔ وہ دس مجرم بے یار و مددگار نہیں تھے۔ ان کے پاس اسلحہ کرنسی اور خفیہ پناہ گاہیں تھیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والی کرمٹل تنظیمیں بھی ان دونوں کو چیلنج کر رہی تھیں۔ کسی بھی ملک کی پولیس ان کی جنس اور آرمی انڈر گراؤنڈ تنظیموں کو لگام دینے میں



دام

علی اختر

مفاد پرستی کی عادت نہ تو ذات پات دیکھتی ہے اور نہ ہی اونچ نیچ کا خیال کرتی ہے۔ نہ اپنا مقام دیکھتی ہے، نہ رشتوں کا احساس کرتی ہے۔ بس یہ ایک خوب صورت جال ہے جو اپنے مطلوب کے گرد گھیرا تنگ کرتا... اور مخالفین کی چھانٹی کرتا رہتا ہے... کچھ یہی انداز اس جوڑے کا تھا جو کچھ کی نظروں میں انتہائی بے جوڑ تھا لیکن وہ آپس میں اسی طرح جڑے رہے جیسے ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے... مگر... کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کس کے دام میں الجھا اور کس نے جال پھیلایا۔

مزید بننے والی ایک بے بس و شیزہ کی تنہائیوں کا عکس

پولیس کو دیے گئے ابتدائی بیان میں اس کی موت کی وجہ خود کشی لکھوائی گئی تھی۔ سیزہ میوں اور کمرے کے درمیان کوریڈور میں ابھی تک بار بار اگلاہی کی لاش اونڈھے منہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی دونوں بائیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے ایک بازو کے ہاتھ کے قریب پھل پڑا ہوا تھا اور اس کی کٹٹی سے نکلی ہوئی خون کی پتلی سی دھار بہہ کر زمین تک آگئی تھی۔ اس وقت اس چھوٹے سے گھر میں صرف دو افراد اس لاش کے نزدیک

پر ظاہر پریشان کھڑے تھے۔ ایک اٹھارہ بیس سال کی عمر کا لڑکا جان اشکرافٹ اور دوسری انتہائی خوب صورت اور متناسب جسمت کی حامل پینتیس چالیس سال کی اپریل گلابی جو خودکشی کرنے والی باربرا کی ماں تھی۔ اس کے خوب صورتی سے کئے بالوں کی پریشان لٹیں اس کے چہرے پر جمبول رہی تھیں۔ جان اشکرافٹ خود بڑا پریشان لیکن یہ ظاہر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں پڑے ٹیلی فون سے مقامی پولیس اسٹیشن فون کر کے ہٹا تھا اور دوبارہ لاش کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

اپریل گلابی نے اپنی موٹی اور غلافی آنکھوں سے جان اشکرافٹ کی طرف دیکھا تو جان اشکرافٹ نے اس کی آنکھوں میں آئے سوال کو پڑھ کر آنکھوں ہی سے سب اچھا کی رپورٹ دی۔ چند لمحوں کے بعد ان کے قلیٹ میں پولیس پہنچ چکی تھی۔ انسپکٹر نے اندر آتے ہی زمین پر اوندھی پڑی لاش کی طرف دیکھا۔ لاش کے لائے ہاتھوں کے خوب صورت اور مدور ناخنوں پر گہرے سرخ رنگ کی نیل پالش بہت سج رہی تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں ابھی تک حیرت جاگ رہی تھی۔ صحت کے لحاظ سے وہ خاصی کمزور اور بکھرے بالوں سے پریشان لگ رہی تھی۔ لاش کے ارد گرد چلنے کے بعد اس نے اپنے ماتحتوں کو کچھ حکم دیا اور خود گھروالوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں رہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کاغذ سنبھالا اور گھر میں موجود افراد کا بیان لینا شروع کر دیا۔ پہلا سوال اس نے اشکرافٹ سے کیا۔

”آپ مرنے والی کے کیا لگتے ہیں؟“

”جی، میں اس کا بوائے فرینڈ ہوں۔ میرا نام جان اشکرافٹ ہے۔“

”پولیس اسٹیشن فون آپ نے ہی کیا تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی سر.....!“

”اور آپ.....“ انسپکٹر کا اگلا سوال اپریل گلابی سے تھا۔

”میں اس کی بد نصیب ماں ہوں.....“ اپریل گلابی کی آنکھوں کی نمی جھلکنے لگی تھی۔

”یہ واقعہ کب ہوا.....؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”آج صبح..... میں رات ادھر ہی تھا۔ میں اور باربرا

کمرے میں تھے۔ میں صبح اٹھ کر واش روم گیا تو باربرا جاگ رہی تھی لیکن بے حد پریشان اور الجھی الجھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید رات وہ پوری طرح اپنی

خیند نہیں لے سکی ہے۔ رات اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ ہم تینوں قریبی ڈاکٹر کے پاس بھی گئے تھے جہاں سے باربرا کا علاج چل رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے کوئی بیماری لاحق ہے۔ یہ ظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھی لیکن اندر ہی اندر اسے کوئی ڈپریشن یا شدید نفسیاتی مرض لاحق تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بات بات پر اونچی آواز میں رونے لگتی تھی اور ہر وقت انتہائی غصے میں رہتی تھی۔ کھانا پینا بھی اس نے بہت کم کر رکھا تھا۔ آج صبح جب میں واش روم میں تھا تو میں نے گھر میں موجود سنگار میز کی دراز کھلنے کی آواز سنی اور پھر اس کے اٹھتے ہوئے تیز قدموں کی چاپ مجھے سنائی دی۔ اس کے بعد اچانک ہی مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً واش روم سے نکلا تو یہ بھی باہر کھڑی تھیں۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے کوریڈور میں آئے۔ تو اس وقت تک باربرا دم توڑ چکی تھی۔ اس نے خود کو کپڑی پر گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔“

انسپکٹر نے جان اشکرافٹ کا ابتدائی بیان لکھا۔ اتنی دیر تک اس کا ماتحت وقوعہ کا نقشہ بنا چکا تھا۔ تب انسپکٹر اپنی نشست سے اٹھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور باربرا کے اس پھیلے ہوئے بازو کے قریب دوزانو بیٹھ کر ہسپتال کے حلقے میں اس کی پھنسی انگلی کو آہستہ سے نکالا اور ہسپتال کو رومال ہی میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے اٹھالیا۔ اتنی دیر میں نیچے سڑک پر ایسبوتینس پہنچ چکی تھی اور رضا کار..... اسٹریچر لے آئے تھے۔

”پوسٹ مارٹم کے لیے لاش کو اسپتال لے چلو.....“

پولیس انسپکٹر نے انہیں کہا اور خود ایک بار پھر ان دونوں کے قریب آیا۔

”دیکھیں..... جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں آ جاتی، اس وقت تک آپ دونوں شہر سے باہر نہیں جائیں گے۔ ہمیں کسی لمحے بھی آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے تو انسپکٹر نے مزید ضروری کوائف لیے اور ان دونوں کو پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔ ”وہ مجھے بہت عزیز تھی۔ اب اس کا خلا کس طرح پورا ہوگا.....“ اپریل گلابی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو جان فوراً آگے بڑھا۔ اس نے اپریل کے گالوں پر اترنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے اسے دلا سادیا۔

”اسے خداوند کی رضا جان کر صبر کرو.....“ انسپکٹر نے جاتے جاتے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ناچار اسے بھی

مدے سے نڈھال اپریل گلابی کا کندھا تھپتھپانا پڑا۔

☆☆☆

کیش اینڈ کیری سے باربرا اگلی صبح کا ناشا سرشام ہی لے جایا کرتی تھی۔ اس روز بھی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ باربرا ناشا اور دیگر لوازمات لے کر کیش اینڈ کیری سے نکلی تھی۔ ابھی وہ تھوڑا دور ہی گئی تھی کہ ایک قریبی گلی سے وہ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لے کر اس پر پل پڑا۔ وہ قد کاٹھ میں خاصا لمبا اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط سیاہ قام تھا۔ اس نے آتے ہی اسے اپنے مضبوط اور کھلے ہاتھوں سے قابو میں کر لیا اور اسٹریٹ لائٹس سے ہٹ کر اندھیرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔

”مجھے امید ہے، ننھی گڑیا کہ تم چیخنے کی بے وقوفی نہیں کرو گی۔ ورنہ دیکھ رہی ہو میرے چاقو کا پھل بہت تیز ہے۔“ وہ غرایا۔ باربرا نے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”شاباش، جلدی سے جو کچھ تمہارے پاس ہے میرے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن میں چھوئی تو باربرا نے خوفزدہ ہو کر خریدی ہوئی اشیاء کے علاوہ اپنا پرس بھی اس کے حوالے کر دیا۔ ابھی اس سیاہ قام نے وہ پرس پکڑا ہی تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی کار کی بھرپور لائٹوں میں وہ دونوں نہا گئے۔ کار کے پیچھے ان کے نزدیک آ کر سختی سے چرچرائے اور دروازہ کھول کر اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا نوجوان نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ لگتا تھا کہ اسے دور ہی سے معاملے کی نوعیت کا پتا چل گیا تھا۔

”چھوڑو اسے ورنہ پستول کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“ آنے والے نے دھمکی دی تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر اسی اندھیری گلی میں چلا گیا۔ باربرا کا خریدا ہوا سامان زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ پرس بھی اس کے پاؤں کے قریب پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے، تم بچ گئی ہو۔“ وہ زمین سے سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ شکریہ تم وقت پر آ گئے۔“ باربرا نے کہا۔ ”میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ زبردستی کر رہا ہے۔ تبھی میں نے کار کو بڑی تیزی سے دوڑایا تھا۔“ باربرا نے لشکرانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا سامان سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔۔۔ اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ باربرا اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ماں ابھی تک اپنی جاب سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے سامان فریج میں رکھا۔ اس دوران

میں وہ اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہی اگر وہ مزاحمت کرتی۔ تو کیا وہ اسے چاقو سے قتل کر دیتا اور اگر وہ کار والا نوجوان وقت پر نہ پہنچتا تب بھی وہ اس کے ساتھ ہاتھ پائی ضرور کرتا۔ اس نے ان غنڈوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور زندگی میں شاید پہلی بار اسے اس واقعے کا حصہ بننا پڑا تھا، مگر وہ نوجوان کون تھا؟ اس کی نظروں میں دونوں کا حلیہ گھوم گیا۔ سیاہ قام غنڈا جس کی آنکھوں میں سفاکیت تھی اور وہ کسی بھی صورت میں اسے مار ڈالنے کی کوشش کرتا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی اس کی نسبت ننھی آنکھوں اور براؤن بالوں والے دراز قد نوجوان کی وجاہت اور مہذب رویہ اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔

اس نے سوچا کہ ماں کو بتا دینا چاہیے اگر اس نے بتایا بھی تو اس کی ماں اسے احتیاط برتنے کا کہہ کر خاموش ہو جائے گی مگر وہ نوجوان ابھی تک اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ کیا وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا ہے اگر ایسا ہے تو وہ کل شام کو اس کا وہیں انتظار کرے گی۔ اس کی ماں کب گھر آئی، اسے خبر نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ اسے اس کے آنے کی خبر اس وقت ہوئی جب اس نے آواز دے کر پوچھا۔

”باربرا۔۔۔۔۔ کچن کا سامان لے آئی ہو۔۔۔۔۔؟“

”جی ماما۔۔۔۔۔ کب کا۔۔۔۔۔ آپ کس وقت آئیں؟“

باربرا نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کچھ دیر پہلے۔۔۔۔۔ میں نے سمجھا تم سوچکی ہو۔ کھانا کھالیا کہ نہیں۔۔۔۔۔؟“ اس کی ماں نے دوبارہ استفسار کیا۔

”میں تو کھا چکی ہوں، آپ کے لیے رکھا ہے۔“

باربرا نے جواب دیا۔

”دیکھو باربی، میں صبح جلد کام پر چلی جاؤں گی۔ تمہارے اٹھنے سے پہلے ہی۔ تمہارا ناشا بنا کر رکھ جاؤں گی۔ اٹھ کر کھا لینا اور کالج چلی جانا اوکے۔۔۔۔۔“ اس کی ماں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے ماما۔۔۔۔۔“ باربرا نے جواب دیا۔

☆☆☆

باربرا گلابی کو اپنے خوب صورت نقوش کی وجہ سے دیکھنے والے یہ کہتے تھے کہ وہ اپنی ماں۔۔۔۔۔ اپریل گلابی کا دوسرا جنم ہے۔ بڑی بڑی ہرے کانچ کی سی آنکھیں ستواں ناک اور سرخ و سفید رنگت پر گلاب کی پتھریوں کے سے ہونٹ جن کی رنگت قدرتی سرخ تھی۔ لمبی انگلیوں کے بیضوی ناخنوں پر اسے شروع سے ہی سرخ رنگ کی نیل پالش لگانے کا شوق تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو کئی بار اسے اس بات

پر اپنی ماں سے جھڑکیاں بھی سننے کو ملی تھیں مگر اس کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب وہ کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔ کالج میں مخلوط تعلیم تھی اور باربرا اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی بن چکی تھی۔ کالج میں ہر دوسرا لڑکا اس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش میں تھا مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اپنی پختہ طبیعت اور عادت کے مطابق وہ اپنے دل کا ایک دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتی تھی۔ اس دروازے سے وہ ہر اس لڑکے کو اتنی چھوٹ دے دیتی کہ وہ اس کی چاہت کی ہلکی ڈور پکڑ کر اس کے ذریعے اس کے من میں داخل ہو جاتا اور جب وہ دیکھتی کہ آنے والا اس کے دل پر دستک دینے لگا ہے تو وہ فوراً اس سے کنارہ کشی کر لیتی اور اگر کوئی پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا اس کی شکایت پر سہل سے کر دیتی۔

جارج واکر اس کی کلاس کا سب سے سنجیدہ لڑکا تھا۔ مہنگے رالے سنہری بالوں اور براؤن آنکھوں والا۔ سب لڑکیاں اس کی قربت حاصل کرنے کی خواہاں تھیں مگر وہ کسی کو بھی سنجیدگی سے نہ لیتا تھا۔ یہی وہ لڑکیوں میں مغرور سمجھا جانے لگا تھا۔ باربرا گلاہی اور اس کی دوستوں نے باقاعدہ ایک پروگرام کے تحت اس کا غرور توڑنے اور اس کی انا کو شکست دینے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے باربرا کو آگے کر دیا گیا۔ باربرا نے بھی ہنس کر یہ ذمے داری قبول کر لی۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ باربرا کالج کی ٹیک شاپ پر بیٹھی تھی کہ ایک پلیٹ میں سمو سے اٹھائے لے کر آتا ہوا جارج اسے نظر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کافی تھی۔

باربرا کو شرارت سوچھی۔ وہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اس کے قریب پہنچی اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر جارج کے ہاتھ سے کافی کا مگ پکڑ کر کہنے لگی۔

”ارے جارج! تم نے بھلا یہ تکلیف کیوں کی۔ تم

بہت اچھے ہو۔“

جارج نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”سب کے سامنے اب میری سبکی کراؤ گے۔ چلو آؤ۔“

یہ کہہ کر باربرا نے اس کا بازو پکڑا اور اپنے سامنے کی کرسی پر بٹھالیا۔

جارج زندگی میں پہلی بار ایک عجیب و غریب صورت حال میں پھنسا اس کے سامنے بھیگی ملی کی طرح خاموش بیٹھا

تھا۔ اس نے سموں کی پلیٹ سامنے رکھی تو وہ بھی باربرا نے اپنے سامنے سرکالی اور نندیدوں کی طرح کھانے لگی۔

”مجھے بھی تو بھوک لگی ہے.....“ جارج منتنایا۔

”اوہ تو جارج..... تم بھوک برداشت کر سکتے ہو مگر

میں نہیں۔“ وہ بڑی تیزی سے کھاتے ہوئے بولی۔ اس سے

آگے اس کی سہیلیاں بیٹھی سب دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ پلیٹ

صاف کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے وہ کافی کا

گھونٹ لینے لگی تو جارج غصے کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔

جارج کے جاتے ہی سب لڑکیوں کا ایک بھرپور قہقہہ ابھرا۔

اس واقعے کے بعد جب بھی جارج اسے اکیلا ملتا تو

وہ اسے تنگ کر کے مزہ لیتی۔ پھر آہستہ آہستہ خود ہی جارج

اس کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ وہ

باربرا کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگا۔ وہ ہر وقت باربرا کے

ساتھ نظر آنے لگا۔ تب اس کی ایک دوست نے باربرا کے

ساتھ ایک روز شرط لگائی۔

”باربرا!..... تم نے جس طرح جارج کو قابو کر کے

اپنے ساتھ تھیں کیا ہے، کیا اسی طرح اسے اپنے سے جدا بھی

کر سکتی ہو؟“

”یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے لیزا.....“ باربرا نے

ہنس کر جواب دیا۔

”کتنی دیر میں.....“ لیزا نے پوچھا۔

”صرف ایک ہفتے کے اندر اندر.....“ باربرا نے

مضبوط لہجے میں کہا۔

”دیکھ لیتے ہیں.....“ لیزا نے ہنس کر اسے آسایا۔

اس روز سے باربرا نے جارج سے بے رخی اختیار کرنا

شروع کر دی۔ جارج اس کے یکسر بدلتے رویے کو دیکھ کر ایک

روز بولا۔ ”باربرا!..... میں کتنے دنوں سے تمہارا بدلتا ہوا رویہ

دیکھ رہا ہوں۔ کہیں تم مجھ سے اکٹا تو نہیں گئی ہو.....؟“

”ہوں..... بس کچھ ایسا ہی سمجھو.....“ باربرا نے

آگے سے تنگ کر جواب دیا۔

”وجہ جان سکتا ہوں.....؟“ جارج نے دوبارہ

پوچھا۔

”ضروری نہیں کہ ہر بات کی وجہ بتائی جائے.....

میں بس چاہتی ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو.....“ باربرا

مصنوعی غصے سے بولی۔

”آخر کوئی میری غلطی بھی تو ہو..... یاد کرو اس محبت

کی ابتدا بھی تم نے ہی کی تھی۔“ جارج آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

”یہ میری بے وقوفی تھی.....“ باربرا نے ترت جواب دیا۔

باربرا کی دوسری سہیلی مارٹنی بازو سے پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچ لے گئی۔

”تم نے بہت برا کیا باربرا..... اس بے چارے کو رسوا کر کے اچھا نہیں کیا۔ پتا نہیں تم کیوں نہیں سمجھتیں۔ لیزا نے تمہارے ساتھ ایک بڑی چال چلی تھی۔ وہ خود جارج کو چاہتی تھی مگر جارج اسے اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ تو ہر وقت تمہارے ساتھ چپکار ہوتا تھا۔ اس نے تمہاری اس بچکانا عادت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور تمہارے ہاتھوں جارج کو رسوا کروایا۔ اب دیکھ لیتا۔ وہ جارج کی محبت کو جیت لے گی اور تم اپنے بھولپن سے اس کے دام کا شکار ہو کر رہ گئی ہو.....“

”نہیں مارٹنی..... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ باربرا کی ہنسی سنجیدگی میں بدل گئی تھی اور پھر وہی ہوا جو مارٹنی نے بتایا تھا۔ اس واقعے کے کچھ ہی روز کے بعد لیزا اور جارج اکٹھے نظر آنے لگے۔ مارٹنی نے ایک روز پھر باربرا کو بتایا کہ اس نے لیزا کو اس واقعے پر بڑی لعن طعن کی تھی تو لیزا نے بڑی ڈھٹائی سے بتایا کہ اس نے جارج کو حاصل کرنے کے لیے یہ دام بچھایا تھا۔ باربرا کی بے وقوفی کہ وہ اس دام میں پھنس گئی اور وہ جارج کو کھو بیٹھی لیکن لیزا جیت گئی۔

☆☆☆

اس روز اپریل گلابی اپنے آفس سے جلدی واپس آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ گھر جاتے جاتے وہ کیش اینڈ کیری سے خود ہی صبح کے ناشتے کے لیے سامان لے آئے۔ وہ کیش اینڈ کیری میں داخل ہوئی تو وہاں کافی رش تھا۔ وہ لائن میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی تو معا اس کی نظر ایک دراز قد، نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والے نوجوان پر پڑی جو کیش اینڈ کیری میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ جتنی دیر تک اپریل گلابی کی باری آئی وہ ہال میں اسے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اپریل گلابی نے اپنے سامان کی ادائیگی کی اور سامان مختلف شاپر میں ڈال کر فارغ ہوئی۔ وہ نوجوان شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اپریل گلابی کیش اینڈ کیری سے باہر نکلنے والی تھی کہ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور آہستگی سے بولا۔

”معاف کرنا..... آپ وہی تو نہیں جسے کچھ روز پہلے میں نے ایک غنڈے سے بچایا تھا؟“

اپریل نے بڑی حیرانی سے اس کو دیکھا اور لٹی میں جواب دے کر آگے بڑھنے والی تھی کہ وہ پھر اس کے سامنے

”یہ تم نے درست کہا باربی..... ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، وہاں محبت واقعی بے وقوفی ہے پلٹنا اب میرے بس میں نہیں رہا۔“ جارج سنجیدگی سے بولا۔

”کلاس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں، پھر اس کے علاوہ پورا کالج مجھ ایسی بے وقوف لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں اور مقدر آزمائی کر لو اور پھر محبت کرنا ایسی کون سی مجبوری ہے۔ دیکھو جارج! اگر تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے تو میں دوسرا رستہ بھی اختیار کر سکتی ہوں۔“ باربرا نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میری بلا سے..... مگر سن لو، اگر تم میری نہ ہو میں تو کسی دوسرے کی بھی نہ ہو سکو گی.....“ جارج نے سختی سے کہا۔

”یہ تمہاری طرف سے دھمکی ہے، تو یہ بھی جان لو..... ہمارے معاشرے میں عورت سے ایسا رویہ اختیار کرنے پر قانوناً تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال میں تمہاری شکایت پر پھل سے کر رہی ہوں۔“ باربرا نے درشت لہجے میں کہا تو جارج بھی خاموش ہو گیا۔ انہیں اونچی آواز سے باتیں کرتے دیکھ کر لیزا اور ان کی دوسری دوست وہاں آگئیں۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر جارج بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف نکل گیا۔

”تمہیں تمہارا یہ رویہ بہت مہنگا پڑے گا۔“

”ہوں، دھمکی دیتے ہو.....“ باربرا نے اسی لہجے میں کہا اور پھر اس کے جاتے ہی ساری سہیلیاں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

”باربی..... تم نے تو کمال کر دیا.....“ وہ سب یک زبان ہو کر بولیں۔

”نہیں۔ کمال تو اب ہونے والا ہے۔“ باربرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر اس نے پرنسپل کو درخواست دے دی کہ جارج اسے ہراساں کر رہا ہے۔ پرنسپل نے دونوں کو اپنے آفس میں بلا لیا جہاں جارج کو جرمانے کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی گئی۔ جارج منہ لٹکائے جب پرنسپل کے آفس سے نکلا تو پوری کلاس پرنسپل آفس کے باہر کھڑی تھی۔ جارج احساسِ شرمندگی کی وجہ سے ان سے آنکھ نہیں ملا پارہا تھا۔ اسی دوپہر جارج نے جرمانہ ادا کر دیا۔ وہ ساری لڑکیاں لان میں کھڑی تھیں۔ جب لیزا ان سب کے سامنے شرط کی رقم باربرا کو پکڑ رہی تھی تو اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔

”باربرا! میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر کھنور بھی ہو سکتی ہو.....“ اس پر باربرا ہلکھلا کر ہنس دی۔ اسی دوران

آگیا۔

”مجھے یقین ہے تم ہی ہو..... مجھے پہچانو.....“

”تعارف کروانے کا یہ انتہائی بھونڈا انداز ہے.....“

اپریل نے اس پر آنکھیں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”معاف کرنا، شاید مجھے اندازہ لگانے میں غلطی ہوگئی

ہو۔ بہر حال وہ آپ ہی تھیں یا پھر شاید آپ کی چھوٹی بہن

ہو۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی برقرار تھی۔

اپریل نے یہ سنا تو اس کے لہجے میں بھی نرمی آگئی۔

”کہو.....“ اب وہ دونوں کیش اینڈ کیری سے باہر

نکل آئے تھے۔

”میرا نام جان اشکرافٹ ہے اور میں یہاں سے کچھ

دور ایک کاسٹیک بنانے والی فیکٹری کا لیبارٹری انچارج

ہوں۔ آپ مجھے صرف جان بھی کہہ سکتی ہیں۔ آج سے کچھ

روز پہلے میں شام کے وقت فیکٹری سے واپس آ رہا تھا۔ میں

نے دور سے دیکھا۔ ایک کیم کیم جشی ایک لڑکی کو گھیرے

ہوئے تھا۔ میں گاڑی تیزی سے ان کے قریب لے آیا۔

خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس پٹل بھی تھا۔ میں

نے کار روک کر پٹل کو اس کی طرف کرتے ہوئے اسے

لٹکارتا تو وہ جشی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا..... وہ لڑکی بالکل

آپ کے خدو خال کی تھی۔ ایسا ہی رنگ روپ! آپ جتنا

قد..... اور تو اور اس کے جسمانی خدو خال بھی آپ جیسے

تھے۔ آج میں ادھر سے دوبارہ گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا

اسی کیش اینڈ کیری سے وہ سامان لے کر نکلی ہوگی۔ ممکن ہے

آج بھی وہ سودا سلف خریدنے کے لیے ادھر آئی ہو..... اس

لیے میں کیش اینڈ کیری میں اس کی ایک جھلک دیکھنے آگیا۔

آپ کو دیکھ کر مجھے اسی کا شبہ ہوا کہ میں نے آہستہ آہستہ بتایا۔

”کیا تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟“ اپریل نے نرمی

سے پوچھا۔

”نہیں..... بالکل نہیں..... میں تو اس کا نام تک نہیں

جانتا۔“ جان نے جواب دیا۔

”وہ میری.....“ ابھی اپریل نے بات بھی پوری نہ کی

تھی کہ وہ جلدی سے بول اٹھا۔

”یقیناً وہ آپ کی چھوٹی بہن ہوگی۔ شکل و صورت

سے ہی لگتا ہے۔ دراصل گاڑی بعض انسانوں میں اس قدر

مشابہت پیدا کر دیتا ہے کہ پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہو جاتا

ہے۔“ جان نے اپنی بات پوری کی۔

”یہیں نزدیک ہی ہمارا فلیٹ ہے، اگر تمہیں برا نہ

لگے تو ایک کپ چائے یا کافی جو بھی پسند کرو ہمارے ساتھ

لی کر چلے جانا.....“ اپریل نے اسے آفر کی۔

”جی..... جی یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“ جان بولا۔

”اگر پارکنگ کا مسئلہ نہ ہو تو گاڑی ساتھ لے

لوں.....؟“ جان نے دریافت کیا۔

”یہیں نزدیک تو ہے، گاڑی ادھر ہی رہنے دو.....“

اپریل نے بتایا۔ ”ہم پیدل ہی گھر چلے جاتے ہیں۔ میں

نے اپنا تعارف تو تمہیں کرایا ہی نہیں۔ میرا نام اپریل گلاہسی

ہے، میں مائیکروسافٹ کمپنی میں پروجیکٹ مینجر ہوں اور

باربرا گلاہسی.....“ ابھی وہ بات پوری نہ کر پائی تھی کہ جان

دوبارہ بول اٹھا۔

”اچھا..... اچھا وہ باربرا گلاہسی ہیں، یقین کریں اگر

ہستے ہوئے آپ کے رخساروں میں ڈھل نہ پیدا ہوتے

ہوں، تو آپ بالکل اپنی چھوٹی بہن باربرا ہی لگیں۔“ جان

کا یہ بات سن کر اپریل کھلکھلا کر ہنس دی۔

”باربرا میری بیٹی ہے..... میری چھوٹی بہن

نہیں.....“ اپریل نے بتایا تو وہ حیران ہو کر اس کی طرف

دیکھنے لگا۔

”یہ مذاق تو نہیں.....؟“ جان نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں یہ سچ ہے.....“ اپریل نے بتایا۔

”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔ یقیناً آپ اچھا مذاق

کر لیتی ہیں۔“ جان دوبارہ بولا۔

استنے میں ان کا فلیٹ آگیا۔ اپریل نے دروازے کا

لاک کھولا اور دونوں فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ جان خاموشی

سے اس کے پیچھے چلتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا تو اپریل نے

باربرا کو آواز دی۔

”ماما..... میں اپنے کمرے میں ہوں.....“ باربرا

نے جواب دیا۔

تب اپریل نے دزدیدہ نظروں سے جان کی طرف

دیکھا تو جان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ویسے یقین مجھے اب بھی نہیں آ رہا۔ مجھے یہ آپ

دونوں کی سازش لگتی ہے۔“ جان نے ہستے ہوئے کہا باربرا

کی آواز آئی۔

”ماما..... کس سے باتیں کر رہی ہیں؟“

”یہ کوئی تمہارے واقف کار ہیں۔“ اپریل نے

جواب دیا۔ تو باربرا براہ راست آگئی۔

”ارے آپ.....“ باربرا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہوں..... کوئی شک ہے کیا.....“ جان نے جواب دیا۔

”ماما یہ آپ کو کہاں سے مل گئے.....؟“ باربرا نے

اگلا سوال کیا۔

”اسی جگہ سے جہاں کچھ روز پہلے سیاہ فام تمہیں لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ جان نے بتایا۔

”اوہ ماما..... میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کچھ روز پہلے جب شام کو میں کیش اینڈ کیری سے سامان لے کر آرہی تھی تو ایک سیاہ فام نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی اور انہوں نے میری جان بچائی تھی۔“ باربر نے آہستہ آہستہ بتایا۔

”ڈارلنگ! ذرا دھیان رکھا کرو.....“ اپریل نے کہا۔ ”لو تم اپنے مہمان کو سنبھالو..... بے چارہ کیش اینڈ کیری میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چلا تھا۔“ اپریل نے ہنس کر کہا تو باربر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

”باربی..... ایک بات تو بتاؤ..... یہ واقعی تمہاری سگی ماں ہیں۔“ جان نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی، یہی سچ ہے۔ یہ میری بہت پیاری ماما ہیں۔“ باربر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ویسے لگتا تو نہیں ہے۔ ان کی جسمانی ساخت سے تو لگتا ہے ابھی یہ خود غیر شادی شدہ ہیں۔“ جان نے دوبارہ کہا۔

”تمہیں ایک اور بات سن کر حیرانی ہوگی کہ میری ماما مس امریکا کا ٹائٹل جیت چکی ہیں۔“ باربر نے کافی کامک جان کو پکڑاتے ہوئے انکشاف کیا۔

”اوہ، کیا یہ بھی سچ ہے اور تم.....“ جان نے ورطہ حیرت سے پوچھا۔

”میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اپنی ماما کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرے نام سے تو واقف ہو ہی گئے ہو۔ میرا مکمل نام باربر اگلاہی ہے لیکن مجھے سب میرے پہلے نام باربر اسے ہی پکارتے ہیں۔“

”میں بھی اپنا تعارف کروانا بھول گیا۔ میرا نام جان اشکرافٹ ہے۔ میں ایک کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں لیبارٹری انچارج ہوں اور روز اسی راستے سے گزر کر اپنے گھر آتا جاتا ہوں۔ اس واقعے کے بعد تم مجھے نظر نہیں آئیں۔ آج بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کیش اینڈ کیری میں تمہیں ڈھونڈنے لگا۔ تو تمہاری ماما سے ملاقات ہو گئی۔ یقین کرو باربی..... اگر تمہاری ماما کے ساتھ اس قدر مشابہت نہ ہوتی تو میں تم تک نہ پہنچ پاتا۔“ جان نے بتایا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے نیل پالش مفت ملا کرے گی۔“ باربر نے اپنے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔

”نہ صرف نیل پالش بلکہ ہماری فیکٹری کی ہر

مصنوعات.....“ جان نے ہنس کر جواب دیا۔

”کاسمیٹک میں مجھے صرف نیل پالش ہی پسند ہے اور کچھ نہیں.....“ باربر نے کہا۔

”کیا تم مجھے اجازت دو گی کہ میں کبھی تمہارے سے ملنے آجایا کروں؟ مجھے تم اچھی لگی ہو۔“ جان نے بلا جھجک کہہ ڈالا۔

”جب چاہو..... مگر شام کو اگر آؤ تو زیادہ بہتر ہے کہ میں شام کو کالج سے گھر واپس آ جاتی ہوں اور ماما تو شام کے بعد ہی گھر لوٹتی ہیں۔ کبھی کبھی تو رات بھی باہر رہ جاتی ہیں۔

ان کی ملازمت ہی کچھ ایسی ہے۔“ باربر نے وضاحت کی۔

”ہاں..... ہاں تم مطمئن رہو۔ میں بھی شام ہی کو ادھر سے گزرتا ہوں۔“

☆☆☆

محبت اگر معاشرتی پابندیوں سے آزاد ہو تو بہت جلد انسانی احساسات کو فتح کر لیتی ہے۔ جان اشکرافٹ رفتہ رفتہ اس کے خاندان کا حصہ بن چکا تھا۔ اب اس کی اکثر راتیں ادھر ہی گزرتی تھیں۔ باربر کو ابھی تک اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے جارج کو بے جا تنگ کیا۔ حالانکہ جارج کو اب لیزا نے بڑے اچھے انداز سے سنبھال لیا تھا مگر پھر بھی کالج میں جب اس کا جارج سے سامنا ہوتا تو جارج کی آنکھوں میں ملتجیانہ پیاس بڑی واضح نظر آتی تھی جس کی وجہ سے باربر کا احساس جرم اور بھی بڑھ جاتا۔ اس روز باربر کا ہیریڈ خالی تھا اور وہ تنگ شاپ جاری تھی جب ہیری نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ہیری کو دیکھا تو وہ بڑے ندیدے پن سے بولا۔

”ہیلو گڑیا..... ہرے کالج کے سمندر میں ہمارا بھی ڈوبنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی ہمیں بھی لفٹ کرادو۔“

”تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔“ باربر نے درشتگی سے جواب دیا۔

”دیکھو گڑیا، یہ جارج تو ہے نہیں جسے تم ڈرا دھمکا لو گی۔ مجھے جو چیز پسند آجائے، میں اس کو زبردستی بھی اڑا لے جاتا ہوں۔“ ہیری نے ہنس کر کہا۔ ”کالج ٹائم کے بعد تم میرے ساتھ چلو گی۔ آرام سے یا زبردستی، فیصلہ اسی وقت ہوگا۔“ ہیری یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور باربر وہیں کھڑی سوچنے لگی۔

ہیری کا شمار کالج کے ان طالب علموں میں ہوتا تھا جو پڑھنے کے لیے کالج میں داخلہ نہیں لیتے۔ آوارگی اور بد معاشی کرنا ان کی عادت بن چکا ہوتا ہے۔ اس لیے باربر

بھی اس سے خائف تھی۔ باربرا ابھی وہیں کھڑی تھی کہ جارج اس کے قریب سے گزرا۔
”مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں لیکن پوچھ رہا ہوں کیوں پریشان کھڑی ہو؟“

”ویسے ہی.....“ باربرا نے شرمندگی سے کہا۔
”یہ ہیری تمہارے پاس کھڑا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟“
اس نے دوبارہ پوچھا۔

پہلے تو باربرا ہچکچاتی رہی پھر اس نے سب بتا دیا۔
”وہ بہت خطرناک غنڈا ہے..... اس سے بچ کر رہنا.....“ جارج یہ کہہ کر چلا گیا۔ جب باربرا کے ذہن میں آیا کہ وہ یہ تمام بات جان کو موبائل پر بتا دے مگر وہ کیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے اسے چھٹی نہ ملے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی جارج کی طرح خاموشی اور مصلحت سے کام لے۔ پرانی آگ میں کون کودتا ہے۔ گھبرا کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گویا کانچ کے ہرے سمندر میں سیلاب آ گیا تھا۔

اس روز جب وہ کالج سے باہر نکلی تو بس اسٹاپ پر ہیری کھڑا نظر آیا۔ وہ واپس کالج جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کی کرخت آواز آئی۔

”ہے گڑیا..... کہاں چلیں۔ تمہارے چاہنے والے تو ادھر کھڑے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک جست لگائی اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستل تھا۔ کچھ لڑکوں اور مردوں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی تو اس نے پستول کو آسمان کی طرف کر کے چار پانچ قائر کر دیے۔ باربرا کچھ اور سہم گئی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل چکی تھیں۔ اسی اثنا میں نہ جانے جارج کدھر سے وحشیانہ طریقے سے بھاگتا ہوا آیا اور ہیری سے بھڑ گیا۔ ہیری اس اچانک حملے سے سنبھل نہ پایا اور پیچھے گر گیا۔ اس کی جرات دیکھتے ہوئے کالج کے مزید طالب علم بھی اس پر پل پڑے اور اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ ان سب نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ باربرا پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑی تھی۔ جب کسی نے جا کر کالج کے پرنسپل کو اطلاع دے دی۔ وہ بھی باہر نکل آیا۔ اسے آتے دیکھ کر طالب علموں نے ہیری کو چھوڑ دیا جو زخمی حالت میں زمین پر پڑا ڈکرا رہا تھا۔ ہیری کو اٹھا کر کالج کی ڈسپنسری لایا گیا جہاں سے مرہم پٹی کر کے اسے قارغ کر دیا گیا۔

باربرا جب گھر پہنچی تو وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ اس

نے آتے ہی موبائل پر جان کے نمبر ملائے مگر دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا۔ تب اسے یاد آیا کہ فیکٹری میں موبائل جام کر دیے جاتے ہیں۔ پھر اس نے آفس کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب جان تھا۔

”ہیلو باربی.....“ آواز ابھری۔
”جان..... آج تمہاری باربی مر چکی تھی۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”مطلب.....“ دوسری طرف جان گھبرا گیا۔
توقف کے بعد پھر جان نے پوچھا۔ ”کیا آج وہی واقعہ پیش آ گیا؟ پھر کوئی غنڈا مل گیا تھا.....“ جان نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں..... آج کالج کا ایک غنڈا مجھے اغوا کرنے لگا تھا۔ وہ اسلحے کے زور پر مجھے گھسیٹ رہا تھا۔ جب قدرت کو میرے حال پر رحم آ گیا اور کوئی دوسرا اس سے بھڑ گیا۔“ اس نے بھیگی آواز میں بتایا۔

”میں آفس سے جلدی آ جاؤں گا۔ پھر ہم آؤٹنگ پر چلیں گے تاکہ تمہارے ذہن پر چھایا ہوا خوف دور ہو سکے۔ کوئی بات نہیں۔ زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔“ جان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ بھی اونڈھے منہ بستر پر گر پڑی۔ اس کی ماں ابھی تک آفس سے واپس نہیں آئی تھی۔ شام کو جب اپریل واپس آئی تو باربرا نے رو کر آج کا سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

”ماما..... آج کے بعد میں کالج نہیں جاؤں گی۔“
باربرا نے ہچکیوں کے درمیان کہا تو اپریل فوراً بول اٹھی۔

”ارے ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میرے تو پڑے خواب تم سے وابستہ ہیں۔ میں جان سے کہوں گی۔ وہ تمہیں کالج ڈراپ کر دیا کرے گا۔ اس طرح کالج کے طالب علموں کو بھی پتا چل جائے گا کہ تمہیں تحفظ دینے والا موجود ہے..... مگر دیکھو ایجوکیشن نہ چھوڑنا..... زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ انسانی قوت مدافعت چھین رہا ہے۔“ اپریل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہوں.....“ باربرا نے کہا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔
جان اپنے وقت سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا اور آتے ہوئے فیکٹری سے بہت سی نیل پالش اور کاسمیٹک کا دوسرا سامان لیتا آیا تھا۔

”ارے یہ کیا..... مجھے تو صرف نیل پالش پسند ہے۔
بقیہ اشیا کیوں اٹھالائے؟“ باربرا نے اس سے پوچھا۔
”ویسے ہی..... باقی آنٹی لے لیں گی۔“ اس نے کہا۔

”آنٹی بھی میک اپ پسند نہیں کرتیں۔ انہیں لب اسٹک اور نیل پالش ہی پسند ہے۔“

ان دونوں کی آوازیں سن کر اپریل بھی وہاں آگئی تھی۔ بستر پر رکھا ہوا کاسمیٹک کا سامان دیکھ کر اس نے جلدی سے لب اسٹک اٹھالی۔

”چلو آؤ..... باہر چلتے ہیں۔ رات کا کھانا وہیں کھالیں گے۔“ جان نے کہا۔

”ہمیں تیاری تو کر لینے دو.....“ باربرا نے کہا پھر دونوں جان کی گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”تمہارے ڈیڈ کا کیا ہوا۔ میرا کافی دنوں سے تم سے تعلق ہے مگر میں نے انہیں آج تک نہیں دیکھا۔“ جان نے ایک روز باربرا سے سوال کیا۔

”میں نے تو خود انہیں نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی ماما سے کئی بار پوچھا مگر وہ ہمیشہ ٹال مٹول کر گئیں۔ تم خود بھی پوچھ لو..... اگر انہوں نے بتا دیا تو مجھے بھی بتانا۔“ باربرا نے روہانے لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔“ جان نے باربرا کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ بس کبھی کبھی میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔“ باربرا نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ ایسی ہی کچھ کہانی میرے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لو۔ تمہاری پڑھائی مکمل ہوتے ہی میں تمہیں اپنا لوں گا.....“ جان نے دلار سے جواب دیا۔

”کیا انہی نہیں ہو سکتی یہ شادی.....؟“ باربرا نے جلدی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ میری اپنی بھی مجبوریاں ہیں لیکن یقین کرو میں تمہیں سب سے حد چاہتا ہوں..... ارے ہاں یاد آیا تمہارے اس دشمن کا کیا ہوا جس نے تمہارے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی؟“ جان نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”اے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ باہر آتے ہی اس نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر بینک ڈپیتی میں حصہ لیا اور بکڑا گیا۔ آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے..... اگر اس وقت ماما مجھے نہ سمجھاتیں اور تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو

میں کب کی اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ چکی ہوتی۔“ باربرا نے جواب دیا۔

”چلو بار! میری چھٹی سے فائدہ اٹھاؤ، آج کا دن باتوں میں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ساحل سمندر پر اچھل کود کے دن گزاریں۔ آج سورج نے بھی اپنا چہرہ دکھایا ہے۔ دھوپ میں ساحل سمندر کی نیم گرم ریت پر سن باتھ بھی لے سکیں گے۔“ جان نے تجویز پیش کی۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ماما کو بھی یہ تجویز بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر باربرا بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی۔

اپریل ابھی تک اپنے بستر پر ہی تھی۔

”ماما..... ہم ساحل سمندر پر جا رہے ہیں۔ آپ بھی ساتھ چلیں۔“ باربرا نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں..... میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں نہیں جاسکوں گی، تم کس کے ساتھ جا رہی ہو؟“ اپریل نے پوچھا۔

”جان میرے ساتھ ہے.....“ باربرا نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ..... میں گھر پر ہی آرام کروں گی۔“ اپریل نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے ماما۔ ہم شام کا کھانا لیتے آئیں گے۔ آپ نے انتظام نہیں کرنا اوکے.....“ باربرا نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ساحل سمندر پر چلے گئے۔

☆☆☆

ساحل سمندر ان جیسے منچلوں سے کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں رنگ برنگے نرم فٹ بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کرنے میں مصروف تھے اور بے شمار لوگ سورج کی نرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باربرا اور جان بھی ان لوگوں میں شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی تو جان کے کچھ دوست انہیں مل گئے۔ وہ بھی اپنے بچوں کو لے کر ساحل سمندر پر آئے ہوئے تھے۔ جان کے دوست کی بیوی نے فرط انبساط سے باربرا کا ہاتھ تھام لیا۔

”جان! آپ کی پسند بڑی عمدہ ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”میں ان کی نہیں بلکہ یہ میری پسند ہیں۔“ باربرا نے ہنس کر جواب دیا۔

”بہر حال کپل بہت اچھا ہے۔“ پھر اس نے باربرا کے پکڑے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو بے ساختہ بولی۔

”ارے یہ ریڈ نیل پالش تو نیلو پر اس طرح فٹ رہی ہے جیسے

کسی نے پکے ہوئے انار کے دانے تمہارے ناخنوں پر گاڑ دیے ہوں۔“

دوست کی بیوی نے اس کی دوبارہ تعریف کی اور فٹ بال لے کر بچوں کے ساتھ ریت پر کھیلنے لگی۔ باربرا بھی شکر یہ کہہ کر ان کے کھیل میں شامل ہوئی۔
کچھ دیر کھیلنے کے بعد وہ دونوں تھک کر گیلی کرم ریت پر چٹ لیٹ گئیں۔

”جان سے تم کب ملی ہو.....؟“ اس نے دریافت کیا۔
”اب تو ایک مدت ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر باربرا نے ملاقات کی ساری کہانی اسے سنا دی۔

”تم خوش قسمت ہو، جان طبیعت کا بہت اچھا اور دلیر انسان ہے۔ تم سے ملنے سے پہلے یہ اکثر ہمارے گھر میرے شوہر کے پاس آیا کرتا تھا۔“ اس نے بتایا۔

وہ چٹائی پر اپنے مختصر لباس میں کٹٹی باتیں کر رہی تھیں جب اس کا شوہر بچوں کو لے کر آگیا۔ اس کے ساتھ جان بھی تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا تو جان نے کٹٹی ہوئی باربرا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ باربرا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے سہارے اٹھ بیٹھی تو جان ہاتھ باربرا کی کمر میں ڈال کر اسے الگ جگہ لے گیا۔

”کیا باتیں ہو رہی تھیں دونوں کے درمیان۔“ جان نے شرکوشی میں پوچھا۔

”عورتوں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے۔“ باربرا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ویسے اتنے قریب آگئے مگر شادی کا کچھ پتا نہیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ محبت ایک خوشگوار احساس کا نام ہے۔ ایک خوشبو ہے جو دھیرے سے بدن میں سرایت کر جاتی ہے.....“ جان نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”جان! تم نے ماما سے بات کی تھی؟“ باربرا نے دوبارہ پوچھا۔

”ارے یار..... مجھے اس کا تو موقع ہی نہیں ملا اور سچ پوچھو تو میں ہر بات بھول جاتا ہوں تمہارے حسن کے آگے۔“ جان نے جواب دیا۔

”یہ تم مجھے بنا رہے ہو۔ باتوں کا جال پھینک کر لڑکیوں کو پھانسنے کا ہنرمیں خوب آتا ہے۔“ باربرا نے ہنس کر کہا۔

جان نے ہنستے ہوئے باربرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف

کھینچا۔ تو باربرا اس کے چوڑے چکے سینے سے آگئی.....
”سوٹ ہارٹ.....“ جان کے منہ سے جذباتی طور پر نکلا۔

”تم نام کے جان ہی نہیں۔ باربرا کی بھی جان ہو.....“ باربرا نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

موسموں کے تیز اور انسانی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جان کی آنکھوں میں اترا ہوا بیگانہ پن باربرا کتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

”جان..... میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ اب تمہاری نظروں میں میرے لیے وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی۔ کیا میں اس کا سبب جان سکتی ہوں؟“

”کچھ نہیں۔ بس ذرا میری فیکٹری میں مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے ادھر کم کم آتا ہوں۔“ جان نے جواب دیا۔

”وجہ یہی ہے یا چاہت کے سلسلے بدل گئے ہیں؟“ باربرا نے دوبارہ پوچھا۔

”مطلب.....“ جان نے وضاحت چاہی۔
”یہی کہ آج کل تم ماما کے ارد گرد زیادہ گھوم رہے ہو اور ماما کی نگاہیں بھی تمہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔“ باربرا نے برجستہ کہا۔

”باربرا! تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ وہ تمہارا ماں ہیں۔“ جان نے تیزی سے جواب دیا۔
”یہ حقیقت ہے اور سچائی بتانے میں کیا حرج ہے۔“ باربرا نے اسی لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں نہ آیا کروں۔“ جان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”پہلے جب تم میرے لیے آتے تھے، تو مجھے بہت اچھے لگتے تھے مگر اب مجھے یقین ہے کہ تم ماما کے لیے آتے ہو تو مجھے زہر لگتے ہو۔ میں جانتی ہوں، ماما کے جسمانی.....

خود خال مجھ سے بہتر ہی نہیں بہتر ہیں۔ یہ تم ہی نہیں میرے اور ماما کے کئی ملنے والے کہتے ہیں کہ اپریل باربرا سے کہیں چھوٹی لگتی ہے۔

”آج مجھے پتا چلا کہ میری ماں ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی اولاد کی خوشیوں کو بھی چھیننے سے نہیں چوکتیں۔“ باربرا نے سخت غصے میں جارحانہ انداز اپنا رکھا تھا۔

”تم بے وقوف ہو، تمہیں اپنی ماں پر یہ الزام لگاتے

ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“ جان نے بھی غصے سے کہا۔
”مجھے یہ سبق پڑ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات
تمہیں ماما سے کہنا چاہیے تھی۔“ باربرا کا پارہ تیز ہو رہا تھا۔

”میں ان کے ارد گرد رہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ اس
کا سبب کیا ہے، تمہاری ماما نے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں
دینے سے انکار کر دیا تھا۔“ جان نے بتایا۔

”ہاں..... اس نے ایسا کرنا ہی تھا کیونکہ وہ اپنا رشتہ
جو تم سے جوڑنا چاہتی تھی۔“ باربرا نے چیختے ہوئے کہا تو اتنی
دیر میں اپریل بھی آگئی۔

”بے وقوف لڑکی..... کیوں شور مچا رہی ہو۔“ اپریل
نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”پتا ہے، تمہاری آواز
دوسرے فلیٹوں تک جا رہی ہے اگر کسی نے پولیس میں
شکایت کر دی تو.....“ اپریل نے غصے میں کہا تو باربرا انھوت
سے بولی۔

”ہوں..... میرے جوتے کی نوک پر..... اچھا ہے
پولیس کو اطلاع کر دیں تو میں پولیس کو بتاؤں کہ اس گھر میں
کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔“ باربرا نے کہہ کر زور سے پاؤں
زمین پر مارتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”دیکھا تم نے..... یہ کیسی بدتمیزی دکھا رہی ہے۔ یہ
اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ایسے ملک کی رہائشی ہے جہاں
بچوں کو بے جاد باؤ میں رکھنے پر بھی سزائیں مل جاتی ہیں اگر
کسی مشرقی ملک میں ہوتی تو پتا چل جاتا۔“

”اکھوتی ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہے اور اسے اپنے
باپ کی کمی بھی بے حد محسوس ہو رہی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا
ہوں کہ اس کا باپ کہاں گیا.....“ جان نے پوچھا۔
”تمہیں پتا ہے کہ میں نے مس امریکا کا ٹائٹل جیت
رکھا ہے؟“ وہ بولی۔

”ہاں مجھے باربی نے بتایا تھا۔“ جان نے جواب دیا۔

”یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ مقابلہ حسن کے چناؤ کا
آخری سیشن چل رہا تھا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والی
تمام لڑکیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں ایزی چوٹی
کا زور لگا رہی تھیں اور وہ منتظمین کی ہر جائز و ناجائز
خواہشات کے سامنے ہچکچی جاتی تھیں۔ منتظمین اور جج
صاحبان بھی موقع سے فائدہ اٹھانے میں ہر طرح کے حربے
آزمار رہے تھے۔ آخری سیشن میں شریک لڑکیوں کو بند
کمروں میں لے جا کر ان کی جسمانی ساخت کی پیمائش اور
ان کے ہر عضو کو پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھا جا رہا تھا۔
میں بھی برہنہ ایسے ہی مراحل سے گزر رہی تھی۔ پھر ایسے میں

نہ صرف میں بلکہ میری طرح دیگر شرکاء بھی ان منتظمین اور
مناجج مرتب کرنے والوں کی ہوس کا شکار ہو گئیں۔ وہ کون تھا
اور اس کا تعلق کس ملک سے تھا میں نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف
یہ فکر تھی کہ کسی طور میں یہ مقابلہ جیت جاؤں..... پھر میں یہ
مقابلہ جیت گئی۔ میں مس امریکا بن چکی تھی اور میں بے حد
خوش تھی کہ میں نے اپنا ٹائٹل حاصل کر لیا ہے۔ مگر نہیں
جانتی تھی کہ نادانی یا انتہائی چالاکی سے میں اپنے جسم میں
ایک وجود بھی چھپالائی ہوں..... یہی باربرا ہے۔ جب میں
مس امریکا منتخب ہوئی تو مائیکروسافٹ کمپنی نے مجھے پروجیکٹ
منیجر کی ملازمت آفر کی۔ جو میں نے قبول کر لی۔ مقابلہ حسن سے
ملنے والی خطیر رقم سے میں نے اپنی انشورنس کروالی.....“
اپریل نے اپنی داستان سنائی تو جان فوراً بولا۔

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ آپ حسین ہونے کے
ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی ہیں۔ میں نے اپنی پہلی ملاقات میں
ایسے ہی آپ کی تعریف نہیں کی تھی.....“ جان نے پانسہ پھینکا۔
”اب بتاؤ میں باربرا کو کیسے بتاؤں کہ اس کا باپ
کون ہے جبکہ میں خود نہیں جانتی۔ میں نے تو اس وقت سے
اپنی زندگی کا محور صرف اور صرف باربرا کو بنالیا تھا۔ اس کے
لیے تو میں نے اپنی جان تک کی پروا نہیں کی۔“ جان اس کی
بات سن کر مسکرایا۔

”اگر آپ اپنی جان کی پروا کرتیں تو نہ جانے کس
قدر خوب صورت رہتیں جو یہ پروا نہ کرتے ہوئے بھی اس
قدر سڈول اور خوب صورت ہیں۔“

”ہوں..... مگر کہاں..... اب یہی دیکھ لو..... اسے یہ
اعتراض ہے کہ میں تم پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ تمہیں اس
سے بچین رہی ہوں، وہ مجھ سے اس بات پر کتنی بار جھگڑ چکی
ہے۔ اب مجھے بتاؤ اگر وہ جہان ہو گئی ہے تو کیا میں بوڑھی ہو گئی
ہوں۔ میری خواہشات مر گئی ہیں کیا۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”ویسے ایک بات کہوں آنتی.....“ جان بولا۔ ابھی
اس نے اپنی بات کی ابتدا ہی کی تھی کہ وہ پھری ہوئی شیرنی
کی طرح بولی۔

”خبردار! آنتی کہہ کر میری تو ہین نہ کرو..... میں
تمہیں آنتی دکھائی دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے
دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پکڑا اور اسے چوم لیا۔
باربرا کا شک سچ ثابت ہو گیا۔ اس روز سے جان
اپریل کے پورے قبضے میں آ گیا اور باربرا نے ایک دوبار
اپنی ماں اور جان کو انتہائی قریب دیکھا۔ اس لیے وہ اپنی ماما
کی مخالف ہو گئی تھی۔

”مل گیا..... اس کا حل بھی مل گیا۔ ہمیں اپنے کھیل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اصولوں کو توڑنا ہوگا۔“ جان نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرنے سے لاشی بھی بچ جائے گی اور سانپ بھی مر جائے گا۔“

”وہ کیا.....“ اپریل نے جلدی سے پوچھا۔
”لیکن اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“ اب جان کے لہجے میں تھوڑی مایوسی تھی۔

”پھر بھی کتنا انتظار.....؟“ اپریل نے دوبارہ پوچھا۔
”یہ مرنے والے کی قوت مدافعت پر ہے۔ دو ماہ، چھ ماہ یا پھر سال بھر کا انتظار..... مگر یہ طریقہ اس قدر شفاف ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی پکڑا نہیں جائے گا۔“ جان نے سمجھایا۔
”تم اگر ساتھ دو تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن اس کا کیا اعتبار ہے کہ تم بدل نہ جاؤ گے۔“ اپریل نے ملے جلے رد عمل میں جواب دیا۔

”ہم آج ہی کسی وقت چرچ میں جا کر شادی کر لیتے ہیں تاکہ تمہیں بھی خوف نہ رہے۔“ جان نے پیشکش کی۔
”لیکن مجھے طریقہ واردات تو بتاؤ۔“ اپریل نے پوچھا۔
”بہت آسان ہے۔ باربرا کو نیل پالش پسند ہے۔ ہم نیل پالش میں ایک عام سائیکلک ملاتے ہیں تاکہ نیل پالش جلدی سے سوکھ جائے۔ اس کیمیکل کو ٹرائی فینائل فاسفیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ کیمیکل عام طور پر پلاسٹک کی مصنوعات اور قوم بنانے والے فرنیچر میں آگ سے تحفظ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کیمیکل جب نیل پالش میں ایک مخصوص مقدار میں شامل کیا جاتا ہے تو یہ خواتین خاص کر لڑکیوں کے جسم میں بڑی تیزی سے جذب ہو جاتا ہے۔ یہ جہاں نیل پالش کو دیر پا بناتا ہے، وہاں یہ جسمانی ہارمونز کا توازن بھی دھیرے دھیرے بگاڑ دیتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ کیمیکل انسانی جسم میں ڈپریشن یا شدید قسم کے نفسیاتی امراض پیدا کر دیتا ہے۔ مریض کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ غصے میں کوئی خطرناک کام بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ میری سوچ کے مطابق ہم باربرا کے زیر استعمال نیل پالش میں اس کی مقدار زیادہ کر دیتے ہیں۔ اتنی زیادہ کہ یہ جلد جسم میں بگاڑ پیدا کر دے۔ جب یہ کیمیکل حاوی ہو جائے گا، اس کو خودکشی پر مجبور کر دیں گے۔“ جان نے واقعے کی تفصیل بتائی۔

”یہ بہت مشکل اور زیادہ وقت لینے والا عمل ہے۔ اس کے لیے کون اتنا انتظار کرے پھر اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ باربرا غصے میں ہمیں ہی قتل کر ڈالے۔ وہ تو اب بھی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جان..... مجھے زندگی

اپریل کی محبت کا فسوں جان کی رگ رگ میں سا چکا تھا۔ باربرا بدلتے ہوئے حالات اور دم توڑتی محبت کو دیکھ دیکھ کر ذہنی الجھاؤ کا شکار ہونے لگی تھی اور عجیب و غریب حرکات کرنے لگی تھی۔ ایک روز تو اس نے باقاعدہ ہنری کاٹنے والی چھری سے اپریل پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی لمحے جان فلیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے اپریل کی جان چھڑائی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ باربرا غراتے ہوئے بولی تو اپریل نے جان سے کہا۔
”تم دیکھ رہے ہو جان..... یہ عقل و شعور کی تمام حدیں عبور کر چکی ہے۔ اب ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ ہر حال میں..... تاکہ ہم آسانی سے اپنا مستقبل سنوار سکیں۔“
”ہوں..... میں بھی یہ سوچ رکھنے لگا ہوں.....“ جان نے کہا۔

جان نے باربرا کو ٹھیسٹ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا تھا اور وہ پریشان اپریل کو نہ صرف تسلیاں دے رہا تھا بلکہ جان چھڑوانے کے منصوبے میں اس کا معاون بننے کا بھی فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں کمرے میں بیٹھے بھی بات سوچ رہے تھے کہ باربرا سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ دونوں اپنی محبت کے اس مقام تک جا پہنچے تھے جہاں انہیں اپنے سوا سب دشمن نظر آنے لگے تھے۔ باربرا کی ذہنی حالت دیکھ کر اسے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ کسی اچانک ذہنی صدمے کے باعث یہ دماغی تناؤ کا شکار ہوئی ہے اور اس نے جو ادویات اسے دینے کا کہا تھا اس میں نیند کی ادویات زیادہ تھیں کیونکہ ان کے استعمال سے اس کی ذہنی حالت کو سکون ملتا۔

”اگر وہ تندرست ہو جاتی ہے تو یہ احتمال تو رہے گا ہی کہ وہ ہماری محبت کو کسی طور قبول نہیں کر سکے گی۔“ اپریل نے مایوسی سے کہا۔

”بہر حال ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے پہلے.....“ جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”ہوں..... لیکن جلد..... اس سے پہلے کہ وہ تندرست ہو کر دوبارہ ہماری جان کو آئے۔“ اپریل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر تک جان اور اپریل دونوں خاموش رہے پھر جیسے جان نے کوئی خزانہ پالیا ہو، وہ چیخنے کے انداز میں بولا۔

”تم کتنے اچھے ہو جان..... میری سوچوں سے بھی بڑھ کر اچھے.....“ باربر نے ایک بار پھر جتایا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم اپریل کے پاس اب تو نہیں جاؤ گے۔ وہ بہت بری عورت ہے، کسی کو پانے کے لیے وہ بدی کی آخری حد تک بھی جاسکتی ہے۔“ باربر نے سانس لیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم میڈیسن لو اور آرام سے سو جاؤ۔ میں نے ابھی جاب پر جانے کی تیاری بھی کرنی

بہت عزیز ہے، میں مرنا نہیں چاہتی.....“ اپریل کے لہجے میں اب خاصی تشویش پائی جانے لگی تھی۔

”دیکھ لو..... اس سے ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ ہم اس کی ٹرانسپیرنٹ نیل پالش اور نیل پالش ریمور میں اس کیمیکل کی مقدار کو جتنا چاہیں بڑھا سکتے ہیں تاکہ ہمیں اس کا جلد نتیجہ مل جائے۔ یہ طریقہ شفاف ہے.....“ جان نے دوبارہ زور دیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد اپریل بھی اس بات پر رضامند ہو گئی۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق دونوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی کو بتائے بغیر چرچ میں جا کر شادی کر لی۔ اس بات کی خبر باربر کو بھی نہیں دی گئی۔ شادی گویا جان کا اس فلیٹ میں رہنے کا کھلا اجازت نامہ تھی۔ دوسرا کام جان کے ذمے تھا۔ اس نے باربر کے کمرے سے اس کی پسندیدہ نیل پالش کی تمام بوتلیں (شیشیاں) اٹھالیں اور ان کی جگہ نئی انہی رنگوں کی شیشیاں رکھ دیں۔ وہ چونکہ کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں لیبارٹری انچارج تھا۔ اس لیے اسے یہ کیمیکل ملنے میں کوئی پریشانی بھی نہ تھی۔ باربر ان دنوں ویسے ہی ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ لہذا جان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ باربر کے ساتھ ساتھ رہے اور اس کو ذہنی طور پر اس بات کا یقین دلاتا رہے کہ وہ بے حد پیار ہے اور اس کی یہ بیماری بے حد جان لیوا ہے۔ ٹرائی فینائل فاسفیٹ کی حد سے زیادہ مقدار اس کی نیل پالش اور ریمور میں ملا دی گئی تھی۔ اب ہر روز صبح سویرے جان خود اپنے ہاتھوں سے باربر کے ناخنوں پر پہلے نیل پالش ریمور سے پرانی نیل پالش اتارتا اور پھر نئی نیل پالش لگا دیتا۔

”جان! تم کتنے اچھے ہو۔ میں ہی غلط تھی۔ تم بیماری میں میرا کتنا خیال رکھنے لگے ہو۔“ ایک روز باربر نے جان سے کہا تو جان نے فوراً اسے گلے لگا لیا اور بولا۔

”میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ کوئی بات نہیں زندگی میں ایسی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔“

اس پر باربر کے ہرے کالج کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ ”اپریل میری ماں نہیں ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی اپنی بیٹی کی محبت کو چھیننے کی کوشش نہ کرتی۔ کاش ایسے میں میرا باپ زندہ ہوتا تو میں اس کے پاس چلی جاتی۔ اب تو یہ بیماری ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

”گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں ہوں نا..... تمہارے ساتھ.....“ جان نے اس کی ڈبڈباتی آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

شمس عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلشر

سینس جاسوسی یا کیڑہ، سرگزشت

68-C فیہ الہ سٹیشن سٹیشن بلاک اسٹال ہیں مگر منسلک

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

انگلیوں کے نام

دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کریں

- 1۔ آئین
- 2۔ امانت
- 3۔ جنت
- 4۔ شہادت
- 5۔ فرض

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

ہے۔“ جان نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کے باہر اپریل آفس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے جان کی آنکھوں میں جھانکا تو جان نے سب اچھا کی رپورٹ دی۔

”کل رات پڑوسی باربرا کی صحت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“ اپریل نے کہا۔

”تو.....“ جان نے پوچھا۔

”تو میں نے انہیں بتایا کہ اس کی طبیعت سدھرنے کے بجائے دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ کئی ڈاکٹر بدل لیے، اب ہم اسے اسپتال میں داخل کروانے کا سوچ رہے ہیں۔“ اپریل نے بتایا۔

”گڈ..... تم بہت ذہین ہو.....“ جان نے کہا۔

”ذہین نہ ہوتی تو مس امریکا کیسے بنتی.....“ اپریل نے ہنستے ہوئے جان کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”ناشنا کر لیا ہے کیا.....“ جان نے پوچھا۔

”میں نے کر لیا ہے اور تمہارا ناشا پڑا ہے اگر مجھے میرے آفس پہنچانے کا وعدہ کرو تو میں کچھ دیر اور تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“ اپریل نے کہا تو جان بولا۔

”ہوں..... اب یہ بوجھ بھی مجھے اٹھانا ہوگا۔“

”بیوی ہوں تمہاری..... ایک دوسرے کو بوجھ جانیں گے تو کیسے گزر ہوگی۔“ اپریل نے کہا تو جان ہنس پڑا۔

”باربرا دن بھر کمزور ہو رہی ہے۔“ اپریل نے کہا۔

”وہ پہلے ہی بیمار تھی۔ اوپر سے کیمیکل بدن میں متواتر جانے سے وہ تیزی کے ساتھ اپنی قوت مدافعت کھو رہی ہے، مجھے لگتا ہے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

جان نے ناشا کرتے کرتے بتایا۔

اسی شام اپریل آفس سے واپس آئی تو ابھی جان نہیں آیا تھا۔ وہ آتے ہی باربرا کے کمرے میں گئی۔

باربرا بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر تکیہ بھگور ہا تھا۔ اپریل کو باربرا کی حالت پر کچھ ترس آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پيالے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے باربرا کے ماتھے کو چوم لیا اور بولی۔

”کس قدر کمزور ہو گئی ہے میری بیٹی..... اب تو میڈیسن بھی تم پر اثر نہیں کرتی۔ لگتا ہے، یہ موذی مرض میری بیٹی کی جان لے کر ہی رہے گا۔“

باربرا نے اپنی ویران اور بے بس آنکھوں سے اس کی

طرف دیکھا تو کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کاٹنے لگے۔

”ہاں..... ہاں..... یولو بیٹی..... میں سن رہی ہوں۔“ اپریل نے جھوٹ موٹ اپنی آنکھوں کے کولوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ماما..... میں جینا چاہتی ہوں..... مجھے بچالو.....“ وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

”ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر صحت دینا ہمارے بس میں تھوڑی ہے۔“ اپریل نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”میں سسک سسک کر جینے سے مرنے کو زیادہ ترجیح دوں گی۔“ وہ ہچکیوں میں بولی۔

”موت اور زندگی بڑے دھیرے دھیرے اپنا جال پھیلاتی ہیں، تم سو جاؤ..... میں تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے تمہیں جگادوں گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ افاقہ ہو جائے۔“ اپریل یہ کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ آئی۔

جب جان واپس آیا تو اپریل نے ساری گفتگو اسے سنا دی۔ وہ کہنے لگا۔

”کیمیکل کی زوداثری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مریض کو اس کی بیماری کی شدت کا اس قدر احساس دلایا جائے کہ وہ زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دینے لگے اور یہ کام تم جاری رکھو.....“

☆☆☆

ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مریضہ کے جسم میں موجود ہارمونز بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ اسے فوری طور پر اسپتال میں داخل کروادیا جائے۔

اپریل گلاہی بڑی عطا اور ہوشیار عورت تھی۔ اس نے فوراً آفس سے چھٹی لی اور جان کو فیکٹری ٹیلی فون کر کے بتایا۔

”ڈاکٹر باربرا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کو کہا ہے۔ میں

اسے اسپتال لے کر جا رہی ہوں، چھٹی پر تم بھی وہیں آ جانا۔
 میں اگر جلدی آگئی تو تمہیں دوبارہ اطلاع دے دوں گی۔“
 وہ اسے اسپتال لے آئی۔ وہ شدید ڈپریشن کی وجہ
 سے بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ جب ہوش میں آتی تو رونا
 شروع کر دیتی تھی۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر اسے چیک کیا
 اور مختلف انواع کے ٹیسٹ لکھ دیے۔ اسپتال ہی میں باربرا
 کے ٹیسٹ لیے گئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کسی میڈیسن کی
 وجہ سے اس کے جسم کے ہارمونز کا توازن بڑی تیزی سے بگڑ
 رہا ہے۔ اگر فوری طور پر اس عمل کو نہ روکا گیا تو مریضہ کسی
 وقت بھی نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کر سکتی ہے۔
 رپورٹ پڑھ کر اپریل نے سکون سا محسوس کیا۔ گویا
 اب وہ اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ باربرا کو اسپتال میں
 داخل کر لیا گیا تھا اور اس کا علاج شروع ہو چکا تھا۔ ایک روز
 باربرا نے سخت نقاہت میں جان کو مخاطب کرتے ہوئے
 پوچھا۔ ”کیا تم اب فیکٹری نہیں جاتے؟ میرے پاس نیل
 پالش نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو، میرے ناخن کس قدر
 اجڑے اجڑے لگ رہے ہیں۔“

”ہوں..... میں شام کو آتے ہوئے لے آؤں گا، گھر
 میں تو موجود ہے.....“ جان نے تسلی دی۔

مروجہ اصولوں کے مطابق اسپتال میں کسی بیمار کی
 ضرورت نہ تھی۔ اس لیے جان باربرا کو مطلوبہ اشیا فراہم
 کر کے چلا گیا تھا۔ اسپتال میں بھی بہترین میڈیسن کی
 فراہمی کے باوجود باربرا کو افاقہ نہیں ہو رہا تھا اور اس کی
 حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر خود اس کی حالت
 دیکھ کر پریشان تھے۔ پھر ایک روز ڈاکٹروں نے اسے
 اسپتال سے چھٹی دے دی تو اپریل اور جان اسے واپس گھر
 لے آئے۔ باربرا کا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا اور اس کے مزاج
 میں شدید غصہ شامل ہو چکا تھا۔ کوئی بھی بات اس کے مزاج
 کے خلاف ہوتی تو وہ شور مچا دیتی۔ اس روز تو حد ہی ہو گئی تھی۔
 جان اور اپریل کی چھٹی تھی۔ وہ دونوں گھر پر تھے کہ
 جان نے دوست کے گھر جانے کو کہا۔ اپریل نے ضد کی کہ
 وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی مگر جان نے منع کر دیا۔ اسی
 بات پر دونوں کے درمیان ایک ہلکی سی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔
 جان اکیلا ہی چلا گیا۔ اپریل اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ
 باربرا لڑکھڑاتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئی۔ نقاہت کی
 وجہ سے وہ بار بار گر رہی تھی۔ پھر بھی ہمت کر کے وہ اٹھی اور
 اپریل پر چبھتی۔

”ذلیل حرافہ..... تم کیا سمجھتی ہو..... میں مر گئی

ہوں..... تم اس طرح میرے جان کو مجھ سے چھین لو گی؟
 میں آج تمہاری وہ خوب صورتی ہی ختم کر دوں گی جس پر
 تمہیں اس قدر تازہ ہے۔“

ابھی اپریل سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے
 کچن سے چھری اٹھا لائی اور اسے موقع دیے بغیر اس پر حملہ
 کر دیا۔ اپریل نے اس کے ہاتھ سے چھری چھیننے کی کوشش
 کی۔ اس کوشش میں وہ زخمی بھی ہو گئی مگر اس نے چھری چھین
 لی اور اسے پیٹنے لگی۔

”تم مریکوں نہیں جانتی، میرے لیے مصیبت کھڑی
 کر رکھی ہے۔“ اپریل اسے مارتے ہوئے چیختی۔

”تمہیں مار کر مروں گی چڑیل، تم نے میری خوشیاں
 چھینی ہیں۔ میں تمہیں بھی خوش نہیں رہنے دوں گی.....“ یہ
 کہہ کر وہ ایک بار پھر اس پر چھٹی اور پھر اپنے جوش میں خود
 ہی زمین پر گر پڑی۔

”کاش میں ہی مر جاؤں.....“ وہ کرا رہی۔

”خدا کرے، تم مر جاؤ۔“ اپریل نے کہا۔ وہ آہستہ
 آہستہ زمین سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو
 جب جان واپس آیا تو اس نے اپریل کو زخمی دیکھ کر پوچھا۔
 اپریل نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ
 بھی غصے میں آ گیا اور جلدی سے باربرا کے کمرے میں گھس
 گیا۔ باربرا نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔ ”آگئے ہو اس
 حرافہ کا بدلہ لینے..... اسے دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا ہوگا..... وہ
 تمہاری محبوبہ جو ہوئی۔ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے، اس
 کا جسم بھی مجھ سے زیادہ اچھا ہے۔ تمہیں پسند بھی بہت ہے
 نا..... جاؤ دفع ہو جاؤ.....“ باربرا چیختی رہی۔

”یقیناً اب تمہیں مر ہی جانا چاہیے۔ ورنہ میں خود
 تمہیں موت کے منہ میں دھکیل دوں گا۔“ جان نے غصے
 سے کہا تو وہ بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی
 اور چیختی۔

”لو مار ڈالو مجھے..... میں خود اس زندگی سے اکتا گئی
 ہوں۔“ ممکن تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیتی۔
 جان نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”غصہ و جہم ایسے نہیں مرو گی۔“

پھر اس نے قریبی الماری سے پٹل نکال کر اس کے
 ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔

”لو کر لو خودکشی..... تاکہ ہم سب کی جان چھوٹ جائے۔“

کچھ ہی دیر بعد گولی کی آواز آئی..... اپریل اور جان
 بھاگ کر گئے تو سیزھیوں اور کمرے کے درمیان کوریڈور

میں باربرا کی لاش پڑی تھی، گولی کپٹی پر لگی تھی جہاں سے لہو کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے سے ہو کر زمین پر پھیل گئی جان نے آگے بڑھ کر اس کو چیک کیا۔

”مرچکی ہے.....“ وہ بولا۔

”تم فوراً پولیس کو اطلاع دو۔“ اپریل نے خوفزدہ

لہجے میں کہا۔

جان نے پولیس اسٹیشن اطلاع دی تو وہاں سے پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی فوراً ہی ان کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ ضروری کارروائی کے بعد وہ لاش لے کر چلے گئے۔

☆☆☆

لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامین رپورٹس موصول ہوتے ہی پولیس اسٹیشن سے جان کو ٹیلی فون آیا کہ دونوں پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔

”باربرا کی میڈیکل رپورٹس ساتھ ضرور لے لیتا۔“

جان نے چلتے ہوئے اپریل سے کہا۔

”ہوں..... میں پہلے ہی سوچ رہی تھی۔ جان کچھ

ہوگا تو نہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اپریل نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”ارے نہیں..... ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ڈاکٹرز اور اسپتال کی میڈیکل رپورٹس ہمارے لیے مضبوط گواہی ہیں۔“ جان نے کہا۔ پھر بولا۔ ”جلدی چلو..... ہمیں جلدی پولیس اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔“

☆☆☆

”تم دونوں کا پھیلا یا ہوا جال یقیناً بہت مضبوط تھا مگر نادانستگی میں اس کی کچھ گرہیں ذرا ڈھیلی رہ گئیں جس کی بنا پر میں تمہیں مجبوراً گفتیش میں شامل کر رہا ہوں۔“ پولیس انسپکٹر نے انہیں اپنے سامنے پا کر کہا۔

”دیکھو لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ، کیمیکل اور

دوسری رپورٹوں کے مطابق وقوعہ کے دن جس پسل سے

مقتولہ نے خودکشی کی ہے، اس پسل کے دستے پر مقتولہ کی

انگلیوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کچھ اور نشانات بھی

پائے گئے ہیں۔ لگتا ہے، جیسے مقتولہ کو آلہ قتل کسی نے خود

پکڑا یا ہے۔ ٹریگر پر بھی انہی انگلیوں کے نشانات ہیں جو

پسل کے دستے پر ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی انتہائی عیار

اور چالاک قاتل نے مقتولہ کو قریب سے گولی مار کر قتل کر دیا

اور پھر اس کے ہاتھ کی انگلی پسل کے ٹریگر میں پھنسا دی۔

تاکہ ایسا لگے کہ مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس پر کس کی

انگلیوں کے نشانات ہیں؟ میں نے اسی لیے آپ دونوں کو

پولیس اسٹیشن طلب کیا ہے کہ اگر تم جانتے ہو تو سیدھے

طرہ سے بتا دو۔“

”یقیناً کیجیے مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس کی ذہنی

کیفیت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ یہ اس

کی میڈیکل رپورٹس ہیں جو اس کی ذہنی کیفیات اور بیماری

کی ہیں۔“ جان نے اپریل سے باربرا کی میڈیکل رپورٹس

کی فائل لے کر انسپکٹر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، مگر جب تک تمہارے منکر پرنٹس کی

رپورٹ نہیں آ جاتی، تم دونوں پولیس کی حراست میں رہو

گے.....“ انسپکٹر نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہوگا؟“ اپریل نے پریشانی سے جان کے

کان میں کھسر پھسکی.....

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ جان نے آہستگی سے جواب دیا۔

”گولی تو تم نے ہی ماری تھی۔“ اپریل نے اسی لہجے

میں کہا۔

”خاموشی بہتر ہے۔“ جان بولا۔

اگلے ہی روز منکر پرنٹ ایگزامنر کی رپورٹ آ گئی۔

دوسرا منکر پرنٹ جان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتا تھا۔

انسپکٹر نے کہا۔

”اگر تم آسانی سے قتل کا اعتراف کر لو گے، تو بہتر

رہے گا۔ کیس میرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا

ہے۔ یہ میری میز پر پڑی نیل پالش کی شیشی بھی ایک پختہ

گواہی ہے تمہارے خلاف۔ کیمیکل ایگزامن رپورٹ کے

مطابق مارکیٹ میں ملنے والی اسی برانڈ کی نیل پالش میں

مضر صحت کیمیکل کی مقدار اتنی زیادہ نہیں جتنی اس میں شامل

ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق تم نے یا دونوں نے دانستہ طور پر

اس میں کیمیکل کی مقدار اس لیے بڑھا دی تاکہ اس کیمیکل

سے مقتولہ کے جسمانی ہارمونز کا توازن بگڑ جائے اور وہ

ڈپریشن یا کسی شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کر لے اور

جب مرنے والی نے خودکشی نہ کی تو تم نے اسے اشتعال دلا

کر اسے قتل کر ڈالا۔“

اقبال بیان میں جان نے اپنا جرم قبول کرتے ہوئے

اپریل کو بھی اپنا سنا بھی اور اعانت جرم کا شریک بتایا تو انسپکٹر

نے کہا۔ ”یقیناً تم نے انتہائی مضبوط جال بنا تھا مگر اس کی

کچھ گالٹیاں ڈھیلی رہ گئی تھیں۔“

”کاش مجھے اپریل کی خطیر انشورنس کی رقم کا لالچ نہ ہوتا۔“

جان مردہ آواز میں بولا۔ دونوں لاک اپ کی طرف بڑھ گئے۔

شیخ نظام الدین

ضیائیںم بگرا می

اللہ کی مصلحتوں کو اگر انسان سمجھنے بیٹھے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک ایک ایک پل کی تقدیر تحریر کرتا ہے کہ اس کا کون سا وقت اور کتنا وقت کس عمل میں صرف ہوگا۔۔۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور بعد از مرگ اس کی واپسی کے سفر میں تمام اعمال اس کا زاد سفر کس طرح ٹھہریں گے۔ اللہ کے نیک بندے اسی غور و فکر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کرتے اور لوگوں کو سکھاتے اور واپسی کا سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

رب کائنات کا قرب حاصل کرنے والے ایک

ولی کا قصہ



کہنؤ کے قریب کاکوری کے ایک گاؤں نگر اوں میں ایک ایسا خاندان اقامت گزیں تھا جس کا شجرہ نسب سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شہاب الدین سے تعلق رکھتا تھا اور اگر شہاب الدین سہروردی سے آگے نظر ڈالی جائے تو پھر یہ سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ تک پہنچتا تھا۔ اس خاندان کے صدق و ایمان پر سبھی متفق تھے۔ لوگ ان کی مثالیں دیتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا تھا جس نے اپنے علم، زہد اور غیر معمولی کارناموں سے۔۔۔ نسلوں پر گہرے اور یادگار اثرات چھوڑے ہوں۔

اس خاندان میں 1160ء میں ایک بچہ پیدا ہوا، والدین نے بچے کا نام نظام الدین رکھا۔ اس کی پرورش و پرداخت نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ کوری میں علمی خاندانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ اپنے وقت کے جید ترین علماء سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ گھر والے بہت خوش تھے کہ نظام الدین نے اپنے معاملات میں خود ہی دیکھی لینا شروع کر دی تھی۔ انہیں اپنی تعلیم کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ لوگوں سے یہ پوچھتے رہتے تھے کہ بڑے بڑے عالم کہاں ملیں گے اور انہیں علم حاصل کرنے کے لیے کن عالموں سے رجوع کرنا چاہیے۔

ایک دن ایک عالم کا کوری پہنچا۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے لوگ اس سے ملنے اور ہم کلام ہونے کو باعث عزت سمجھتے۔ نظام الدین کو علم کی طلب تو تھی ہی، یہ بھی اس عالم کے پاس جا پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت انہیں دے دیں، عالم نے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم مجھ سے کیا پڑھو گے؟ میں آج یہاں ہوں کل کہیں اور چلا جاؤں گا اور پڑھنے پڑھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد برابر کا وقت دیں۔ جو ظاہر ہے کہ میں نہیں دے سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کس طرح پڑھا سکتا ہوں۔“

نظام الدین نے مایوسی سے کہا۔ ”حضرت! اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ہمیشہ تشنہ ہی رہوں گا!“
عالم نے جواب دیا۔ ”اسی کوئی بات نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے تو تم لکھنؤ چلو، وہاں کہیں رہنے کا انتظام کر لو، پڑھا میں دیا کروں گا۔“

نظام الدین نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”افسوس کہ میں لکھنؤ نہیں جاسکوں گا حالانکہ جی بہت چاہتا ہے جانے اور پڑھنے کو۔“
عالم نے کہا۔ ”اگر تم لکھنؤ نہیں جاسکتے تو اور کہاں جاسکتے ہو۔ علم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ یہ سفر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے سیکڑوں اور ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے علم حاصل کیا تھا اور تم چند میل کا سفر بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں طلب صادق نہیں، ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔“

نظام الدین کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ وہ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے، آخر پوچھا۔ ”اس وقت علم کے گہوارے کون کون سے ہیں؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمائیں گے؟“

عالم نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ اور دہلی... مشہور یہی دونوں ہیں ورنہ ان دو کے علاوہ بھی کئی شہر ہیں۔“
نظام الدین اس وقت تو خاموش رہے، کچھ بھی نہیں بولے مگر کئی دن تک شش و پنج میں مبتلا رہے۔ وہ کوئی اہم اور بڑا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ گھر کے بزرگوں نے انہیں فکر میں ڈوبے دیکھا تو پوچھا۔ ”نظام الدین! آخر کس سوچ میں ہو؟ خیریت تو ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ سے آنے والے عالم نے مجھے یہ عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے تحصیل علم کے لیے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے طے کیے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میں کتابدہ نصیب ہوں۔ اس عظیم مقصد کے لیے چند میل کا فاصلہ بھی طے نہ کر سکا۔“

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات درست ہے کیونکہ ہزاروں میل کا سفر کرنے والے بزرگ اس نکتے سے واقف تھے کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے لیکن جب ہمارے ذہن سے یہ بات نکل گئی، ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ کسی ایک جگہ لوگ پیدا ہوئے اور وہیں مرکب گئے اور ان کے بارے میں دنیا یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”تب پھر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں علم کی خاطر سفر کروں گا۔ میں لکھنؤ نہیں دہلی جاؤں گا کیونکہ اس بڑے مقصد کے لیے اتنا مختصر سفر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

گھر والے سناٹے میں آگئے۔ وہ نظام الدین کو منع بھی نہیں کر سکتے تھے، پھر بھی ایک بزرگ نے کہا۔ ”لیکن اپنے اس سفر سے پہلے اس کی اونچ نیچ پر ضرور غور کر لینا۔ اس راہ میں دشواریاں بھی بہت پیش آتی ہیں۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ کسی بھی عظیم مقصد کی حصولیابی کی راہ میں مشکلات اور دشواریاں بھی عظیم ہی پیش آتی ہیں۔ میں ہر صعوبت اور ہر مشکل پر قابو پانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔“

نظام الدین کے جواب میں بڑی استقامت تھی۔ ان کے ایک، ایک لفظ میں قوت ارادی کا پرتو موجود تھا۔
اس گفتگو کے کئی دن بعد نظام الدین نے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ سیدھے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں دہلی جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے اس قافلے میں وہ لوگ بھی تھے جو اکثر و بیشتر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ دہلی میں وہ کون لوگ ہیں جن کی علمیست کا چرچا ہے اور جو درس و تدریس میں مرجع خلافت ہیں۔ ان کے اس سوال کا تقریباً ہر ایک کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”حضرت کلیم اللہ جہان آبادی۔ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ اور عالم بے بدل کلیم اللہ جہان آبادی۔“

نظام الدین نے دہلی پہنچتے پہنچتے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں سلسلہ چشتیہ کے اس آستانے پر دستک دینی ہے۔ وہ کلیم اللہ کے بارے میں

شیخ نظام الدین

معلوم نہیں کیا کچھ سوچتے رہے۔ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید یہ دوران کے لیے نہ کھلے کیونکہ کلیم اللہ کے آستانے پر ان جیسے معلوم نہیں کتنے لوگ حاضریاں دیتے ہوں گے اور ان میں ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا ہوگا کہ کلیم اللہ کا شرف و شاکر دی حاصل کر لے۔

نظام الدین دہلی پہنچ کر قافلے سے جدا ہو گئے اور کلیم اللہ کے آستانے کا پتا پوچھتے ہوئے پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا اور آستانے میں محفل سماع گرم تھی۔ یہ وہ پرستگ دینا چاہتے تھے کہ شیخ کے کسی مرید نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ نظام الدین نے پوچھا۔ ”میں شیخ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا شیخ نے ملاقاتیوں پر کوئی پابندی عائد کر رکھی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”اس وقت اندر محفل سماع گرم ہے اور شیخ کا یہ عام حکم ہے کہ وہ اپنی اس محفل میں کسی اجنبی یا عام شخص کو نہیں داخل ہونے دیتے۔ اس لیے اگر تم نے دستک بھی دی تو اندر سے یہی جواب ملے گا کہ شیخ حاضری دینا۔“

نظام الدین کا دل ٹوٹ گیا۔ مرید سے عالم یاس میں پوچھا۔ ”شیخ کو یہ کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اجنبی یا کوئی عالم شخص ہے؟“

مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم ہمارے شیخ کی بابت کیا کچھ جانتے ہو؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ سنا ہے کہ شیخ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔“

مرید نے پوچھا۔ ”بس یا اور کچھ بھی؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”بس، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

مرید نے کہا۔ ”تب پھر اے اجنبی..... تجھ کو رات کہیں اور بسر کرنا چاہیے۔ صبح آ جانا، ممکن ہے شیخ کی نظر کرم ہو جائے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے حلقہ درس میں نہیں بٹھائیں گے۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں ان کے حلقہ درس میں بیٹھنا چاہتا ہوں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”تم اپنی وضع قطع اور صورت شکل سے طالب علم نظر آتے ہو اور شیخ چونکہ روشن ضمیر ہیں اس لیے وہ آنے والے کے ارادے، نیت اور خصوصیت سے اسے دیکھے بغیر ہی واقف ہو جاتے ہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں تمہارے شیخ کا اس وقت امتحان کیوں نہ لے لوں۔ میں دروازے پر دستک ضرور دوں گا، خواہ یہ دروازہ کھلے یا نہ کھلے۔“

مرید نے مزاحمت کی۔ ”میں دروازے پر دستک نہیں دینے دوں گا۔“

لیکن نظام الدین نے مرید کی مزاحمت سے پہلے ہی دستک دے دی۔ مرید دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، بولا۔ ”اجنبی! تم نے یہ بہت برا کیا۔ بہر حال تم نے جو غلطی کی، اس کا اعادہ نہیں ہونے دوں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”بہتر ہے، میں دستک تو دے ہی چکا ہوں اور میں اپنی طلب صادق سے واقف ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے پیر و مرشد اپنی روشن ضمیری سے یہ سب جانتے ہیں یا نہیں۔“

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ مرید نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کہا۔ ”میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک نہ ہونے دوں لیکن یہ ضدی شخص دھوکا دے کر دستک دینے میں کامیاب ہو گیا۔“ پھر پوچھا۔ ”شیخ نے یہی کہا ہوگا کہ اس شخص کو رخصت کر دیا جائے؟“

آنے والے نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ شیخ نے پوچھا ہے کہ دستک دینے والے کا نام کیا ہے؟“

مرید حیران و پریشان نظام الدین کی صورت دیکھنے لگا۔

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”اپنے پیر و مرشد سے عرض کر دو کہ نظام الدین شرف باریابی چاہتا ہے۔“

وہ شخص واپس چلا گیا تو مرید نے نظام الدین کا مذاق اڑایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس وقت ذلت اور خواری تیرا مقدر بن چکی ہے ابھی تک میں نے تم اور تمہیں سے مخاطب کیا لیکن جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ تو ضدی اور خود مر انسان ہے تو میں تیرا اور تجھے پر اتر آیا۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”تم جن لفظوں میں بھی چاہو، مجھے مخاطب کرو۔ میں ہر حال میں نظام الدین ہی رہوں گا۔ تم نہ تو میرا مرتبہ بڑھا سکتے ہو اور نہ گھٹا سکتے ہو۔ میں جو ہوں وہی رہوں گا۔“

اس دوران وہ شخص واپس آ گیا۔ بولا۔ ”اے اجنبی! تجھے پیر و مرشد یا فرما رہے ہیں، وہ تجھ سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔“

نظام الدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہیں واقعی طلب کر لیا جائے گا، پوچھا۔ ”کیا واقعی؟ کیا مجھے اندر طلب کیا گیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، تجھ کو اسی وقت بلایا گیا ہے۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ جاؤ نظام الدین کو بلاؤ۔“

اب تو نظام الدین کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ وہ بوجھل قدموں سے اندر داخل ہو گئے اور اضطراب، بے چینی سے شیخ کی طرف بڑھتے

رہے۔ کچھ دیر بعد یہ شیخ کلیم اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے، انہیں حیرت تھی کہ یہ شیخ کو آج ہو کیا گیا ہے جو ایک اجنبی کو محفلِ سماع میں بلا لیا۔
ایک ارادت مند نے پوچھا۔ ”حضرت! داخل اجنبی در مجلس سماع دستور حضور نیست“ (حضرت! اجنبی کو مجلس سماع میں داخل کرنا حضور کا دستور نہیں ہے)

شیخ نے جواب دیا۔ ”اس مرد عزیز است اجنبی نیست“ (یہ شخص عزیز و آشنا ہے، اجنبی نہیں)
نظام الدین نے شیخ کو سلام کیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دے کر دریافت فرمایا۔ ”کہو، کیونکر آنا ہوا؟“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں تحصیل علم کی خاطر حاضر ہوا تھا، آپ کی نظر کرم کا طالب ہوں۔“
شیخ نے پوچھا۔ ”بس یا اس کے علاوہ بھی کچھ؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں آیا تو اسی غرض سے ہوں، اس کے علاوہ اور کیا یہاں سے مل سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔ حضور جو کچھ دیں گے، لے لوں گا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”تم رہتے کہاں ہو؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے شہر میں نو وارد ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ نے مجھ کو اپنے حلقہ درس میں شامل کر لیا تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی کر لوں گا۔“

شیخ نے کہا۔ ”میں نے تجھے اپنے حلقہ درس میں شامل کیا اور تجھے رہنے کا ٹھکانا بھی دیا، تو یہیں میرے آستانے میں رہے گا، میں تیری طلب صادق کی قدر کرتا ہوں۔“

حاضرین رشک سے اس نو وارد کو دیکھنے لگے۔ شیخ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ نظام الدین کو اس کے رہنے کی جگہ دکھا دی جائے۔ چنانچہ نظام الدین کو ایک چھوٹا سا حجرہ دے دیا گیا۔

اب تک جو کچھ اور جس انداز میں ہوا تھا، نظام الدین کو اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن جب اس حجرے میں ایک رات بھی بسر کر لی تو انہیں یقین آ گیا کہ وہ اپنا گوہر مقصود پا چکے ہیں لیکن انہیں شیخ کے مریدوں کی کیفیت دیکھ و کچھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ مریدین میں اکثر سکرو و جد میں مبتلا نظر آتے۔ نظام الدین سوچتے، ان لوگوں کی یہ حالت کیونکر ہو جاتی ہے۔ انہیں تو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ یہ کہ شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود ہیں، وہ سب ان کی طرح طالب علم ہیں پھر یہ وجد و جذب کی کیفیت کیوں ظاری ہو جاتی ہے اور اگر ان پر ظاری ہو جاتی ہے تو پھر خود نظام الدین پر یہ کیفیت کیوں نہیں ظاری ہوتی؟ سوچتے سوچتے سر میں درد ہونے لگا مگر ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔

دو پہر کا وقت تھا، نظام الدین اپنے استاد سے درس لے رہے تھے۔ یکا یک ایک ہلکا سا شور اٹھا اور لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے پھر یہ لوگ کھڑے ہو کر ایک طرف بھاگے۔ نظام الدین نے کسی سے پوچھا۔ ”بھائی! آخر بات کیا ہے؟ یہ لوگوں میں خاموشی کیوں چلی گئی ہے؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! شاید تم یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“
نظام الدین نے کہا۔ ”اگر میں یہاں کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”میاں سادہ لوح صاحب! یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی ہے اور باطنی تعلیم بھی۔ تم نے شیخ سے کہا کہ تم ان سے ظاہری اور دنیاوی علوم حاصل کرنا چاہتے ہو، اس لیے باطنی علوم کے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور تم جب جذب و کیف میں مبتلا لوگوں کو دیکھتے ہو تو حیران اور پریشان اُدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگتے ہو اور اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتے ہو۔“

نظام الدین نے آنے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بھائی! یہ کون صاحب ہیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ کیوں لیا جا رہا ہے؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”ہمارے پیر و مرشد۔ شیخ کلیم اللہ کے مرشد شیخ یحییٰ مدنی ان دنوں مدینہ میں اقامت گزیر ہیں۔ یہ آنے والا شخص شیخ مدنی کا مرید ہے اور اپنے پیر بھائی شیخ کلیم اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ یہاں والے اس کی زیارت اور ملاقات کی خاطر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”آنے والا اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ ہمارے شیخ کا پیر بھائی ہے؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”نظام الدین! افسوس کہ تم ہمارے شیخ کے مرتبے اور مقام سے واقف نہیں ہو۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”کیوں واقف نہیں، ہمارے شیخ اس عہد کے نامی گرامی بلکہ بے نظیر و بے عدیل عالم ہیں۔“
مرید نے کہا۔ ”افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔“ اس کے بعد مرید نے نظام الدین کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ بولا۔ ”تم

میرے ساتھ آؤ اور جو کچھ دیکھو اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“
نظام الدین اس کے ساتھ شیخ کے حجرے کی طرف بڑھے۔ مدینے سے آیا ہوا شخص اس وقت شیخ کے حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔
اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی حجرے میں داخل ہو گئے۔ ان داخل ہونے والوں میں نظام الدین بھی شامل تھے۔
مہمان نے اندر داخل ہوتے ہی السلام وعلیکم یا شیخ، کہہ کر شیخ کلیم اللہ کو مخاطب کیا۔
شیخ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کہہ کر جواب دیا اور اپنے پیر بھائی پر ہوش و خرد سوز نظر ڈالی۔ آنے والا مہمان ان نظروں کی تاب نہ لاسکا اور چیخ مار کر گر گیا۔ شیخ کے مریدوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ مہمان زمین پر گر چکا تھا۔

نظام الدین کی حیرت اور پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، اپنے مرید ساتھی سے پوچھا۔ ”کیا یہ شخص کچھ بیمار ہے... یہ بے ہوش کیوں ہو گیا؟“
مرید نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اپنے شیخ کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تو تمہیں یہاں سے چلا جانا چاہیے اور کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو محض عالم ہو اور کچھ نہیں۔“
نظام الدین نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”بھائی! میں جو نہیں جانتا اگر اس کی بابت کچھ جانتا چاہتا ہوں تو تم مجھے شرمندہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

مرید نے کہا۔ ”بھائی! تو بات ہی ایسی کر رہا ہے۔ اپنے شیخ کلیم اللہ عالم باعمل کے ساتھ ہی یگانہ روزگار صوفی بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی روشن ہے۔ ان کی باتوں میں اثر اور نظروں میں سحر ہے۔ مدینے سے آنے والے پیر بھائی کی نظریں شیخ کی پُرسوز نظروں کی متحمل نہ ہو سکیں اور یہ شخص بے ہوش ہو کر گر گیا۔“

اب نظام الدین کے اندر حرکت سی ہوئی اور کچھ مدد جزر سا پیدا ہو گیا پوچھا۔ ”شیخ میں یہ اثر کمال کیونکر پیدا ہو گیا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”ریاضت اور مجاہدے سے، تزکیہ نفس اور چلہ نشی سے۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”اگر میں بھی یہ بات حاصل کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

جواب ملا۔ ”نفس نشی، مجاہدہ، ریاضت!“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کتنے دنوں تک؟“

جواب ملا۔ ”اپنے پیر و مرشد استاد سے رجوع کرو اور پوچھو کہ ان جیسا مقام تم کتنے دنوں میں حاصل کر لو گے؟“

نظام الدین کو شرم سی آگئی، سر جھکا کر پوچھا۔ ”میں یہ باتیں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ انہیں اپنے استاد محترم سے نہیں پوچھ سکتا۔“

مرید نے کہا۔ ”بھائی! اپنے شیخ کی مردم شناسی اور عرفان کا یہ حال ہے کہ بات ابھی تمہارے ہونٹوں تک بھی نہیں آئی کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے، ان کے پاس پست ہمت اور.....“

نظام الدین نے بات کاٹ دی، بولے۔ ”ہاں۔۔۔ میں اپنے پیر و مرشد جیسا بننا چاہتا ہوں، کیونکہ مادی ترقیاں وقتی ہوتی ہیں اور میں پائیدار اور ناقابل شکست ترقی کرنا چاہتا ہوں۔“

مرید کو ان کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نظام الدین مریدوں کو چیرتے اور دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شیخ کے قریب پہنچ گئے اور انہیں جی بھر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شیخ کی نظروں کا ان کے دل پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

شیخ نے انہیں سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے نظام؟ خیریت تو ہے؟“

نظام الدین کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، بولے۔ ”کوئی خاص بات نہیں استاد محترم!“

شیخ نے کہا۔ ”نہیں، کوئی خاص بات ہے۔ مجھے تم پریشان نظر آ رہے ہو۔“

نظام الدین کا دل بھر آیا، بولے۔ ”استاد محترم! میں اپنی مجبوری اور بے بسی پر پریشان ہوں۔ آپ کی نظروں نے آپ کے پیر

بھائی کو بے ہوش کر دیا مگر یہی نظریں مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہیں۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ دنیا ہی دوسری ہے، اس کی بابت دور کے لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کیا میں اس دوری کو ختم کر سکتا ہوں؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، اگر تم چاہتے ہو کہ یہ دوری دور ہو جائے تو اس کے لیے تیاری کرو، اس طرح جس طرح ایک

طالب علم امتحان کی تیاری کرتا ہے۔“

کچھ لوگوں نے شیخ کو بتایا کہ بے ہوش ہونے والا پیر بھائی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، آپ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ ”یہ کیا بات ہے کہ تو کم ظرفوں کی طرح ایک چلو میں الو ہوا جا رہا ہے، طرف پیدا کر۔ محل اور صبر سے کام لے۔“

شیخ کا پیر بھائی آنسو بہا رہا تھا، بولا۔ ”شیخ! جب میں مدینے سے چلا تھا تو پیر و مرشد نے مجھ سے بطور خاص کہا تھا کہ شیخ کلیم اللہ سے نظریں نہ ملانا، ورنہ نقصان اٹھا جاؤ گے۔ چنانچہ آج جب غلطی سے میں نظریں ملا بیٹھا تو میں نے اپنے اندر ایک زلزلہ سا محسوس کیا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔“

شیخ نے کہا۔ ”بہر حال اتنی قوت پیدا کرو کہ آنکھیں ملا سکو۔“ پھر نظام الدین سے پوچھا۔ ”اور تم نے بھی کچھ محسوس کیا یا نہیں؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی جو دوسروں کو بتا کر حیرت زدہ کر دوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”یہ بات بھی نہیں ہونا چاہیے۔ تم بالکل کورے ہو، اس پر کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ کچھ نقش و نگار بنائے جاسکتے ہیں۔“ پھر کچھ توقف اختیار کیا، پوچھا۔ ”علوم دو قسم کے ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔ کیا تمہیں ان دونوں سے دلچسپی ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو میں ظاہری علوم حاصل کرتا رہا ہوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو باطنی علوم بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”محنت سے..... بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

شیخ نے سکوت اختیار کیا، ایسا سکوت جو مہینوں قائم رہا۔

نظام الدین کو شبہ ہوا کہ شیخ بے اتفاقی برت رہے ہیں، انہیں بڑا دکھ ہوا مگر شیخ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خود بھی خاموش ہو گئے اور کسی موقع کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب شیخ نے اٹھ کر اپنے جوتے تلاش کیے تو دیکھا نظام الدین انہیں ہاتھوں میں لیے مودب کھڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ جوتے شیخ کے قدموں میں رکھ دیے۔ شیخ نے نظام الدین کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”توجہ بکسب علوم باطنی اولیٰ و احسن است (علوم باطنی حاصل کرنے کی توجہ کرنا اول و احسن ہے)“

نظام الدین نے جواب میں شعر پڑھا۔

پہر دم خویشتن تو دایہ حساب کم و بیش را

اس شعر نے شیخ کی حالت غیر کر دی، وہ ٹپ گئے اور کہا ”نظام الدین! یہ تو نے کیا شعر پڑھ دیا؟“

نظام الدین گھبرا گئے، وہ سمجھے شاید اس شعر نے شیخ کو کسی وجہ سے آزر دے کر دیا ہے۔

شیخ نے کہا۔ ”تو پریشان نہ ہو جب میں مدینے سے چلا تھا تو میرے پیر و مرشد شیخ یعنی مدنی نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام نظام الدین ہوگا، تیرے پاس آئے گا۔ وہ کچھ عرصہ تجھ سے علوم ظاہری حاصل کرے گا پھر اچانک اس کی توجہ علوم باطنی کی طرف ہو جائے گی۔ جب وہ تجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے گا تو یہ شعر (مندرجہ بالا شعر) پڑھے گا۔ جب اور جو شخص یہ شعر پڑھے گا، اس کی طلب صادق ہوگی اور اس پر خصوصی توجہ دینا لازم ہو جائے گا۔“

نظام الدین بے حد خوش ہوئے مگر اس خوشی میں کوئی ایسی دلی بات نہیں شامل ہوئی۔

شیخ کی خدمت میں ایک اور مرید آ گیا۔ یہ شخص بھی مدینہ منورہ سے آیا تھا۔ شیخ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کسی کے آنے سے اتنا اداس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“

آنے والے نے شیخ کی طرف دیکھا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ نظام الدین نے دوسری بار یہ منظر دیکھا تھا۔ پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ہے؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ بھی ایک علم ہے جو تمہیں بھی تعلیم کیا جائے گا۔“

نظام الدین نے ایک سوال اور کیا۔ ”معلوم نہیں کیوں، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آنے والا بے ہوش شخص کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔ کون سی خاص خبر؟ مجھے پتا نہیں لیکن کیا شیخ کو بھی اس کا کوئی علم نہیں؟“

شیخ نے نظام الدین سے نظریں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ شخص مدینہ منورہ سے بڑی اندوہناک خبر لایا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس سے کہوں کہ تو جو خبر لایا ہے اسے سنا دے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے پیر و مرشد کی بابت کوئی اندوہناک خبر سنوں، اس لیے میں اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر سکا۔“

مریدوں نے بے ہوش شخص کو کوشش کر کے شیک کر لیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی شیخ نے اس سے پوچھا۔ ”میرے نوادارو مہمان! میرے پیر و مرشد کا کیا حال ہے، وہ خیریت سے تو ہیں؟“

آنے والا زار و قطار رونے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے ہوئے جواب دیا۔ ”شیخ! آپ کے پیر و مرشد کا وصال ہو چکا ہے۔“

شیخ نے ایک آہ بھری اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس دن شیخ ہمیشہ سے زیادہ طویل اور افسردہ رہے۔ انہیں کچھ اچھا ہی نہ لگتا تھا۔ آخر اسی عالم میں انہوں نے نظام الدین سے کہا۔ ”نظام! کئی دن کے غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں باطنی علوم بھی سکھائے جائیں چنانچہ کل سے یہ کام شروع ہو جائے گا۔“

نظام الدین پر خوشی کا ایسا دورہ پڑا کہ گر گئے اور دیر تک نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔

حسب وعدہ نظام الدین کو درس دیا جانے لگا۔ نظام الدین نے بھی اپنا سب کچھ بھلا دیا۔ انہیں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا چاہتے تھے کہ شیخ کا خلیفہ کون ہوگا؟ کیونکہ مریدوں نے نظام الدین کو بتا دیا تھا کہ درویش میں مراتب ہوتے ہیں اور یہ باقاعدہ ایک نظام ہے۔

نظام الدین کی محنت اور لگن نے شیخ کو بہت خوش کر دیا۔ ایک عرصے بعد جب نظام الدین کو ایک مقام مل گیا تو شیخ نے انہیں طلب کیا۔ نظام الدین پیر و مرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شیخ نے پھر سوال کیا۔ ”کچھ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد خود ہی ارشاد فرمائیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

شیخ نے پھر سوال کیا۔ ”یہاں تمہیں کیا لگتا ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا۔ میں نے یہاں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے جہان آباد سے بہتر کوئی اور سرزمین نہیں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اگر میں تجھ کو یہ حکم دوں کہ تو جہان آباد کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین پر چلا جا تو تجھے کیسا لگے گا؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد کا حکم سر آنکھوں پر..... آپ کے حکم کی تعمیل میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا، خوش و خرم رہوں گا۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”تب پھر تم دکن چلے جاؤ۔ میں نے دکن کی ولایت تمہارے حوالے کی۔ دکن کے شہر اور ننگ آباد میں تم قیام کرو گے۔“

نظام الدین دم بخود پیر و مرشد کو دیکھتے رہ گئے۔

شیخ نے پوچھا۔ ”میری صورت کیا دیکھتے ہو؟ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

نظام الدین نے اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا، کہا۔ ”میں اعتراض کروں گا، یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا؟ میں شیخ کے حکم کی تعمیل میں کل ہی اور ننگ آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ میں تو اس لیے پیر و مرشد کی شکل دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اور حکم دیا جائے۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نہیں، کوئی اور حکم نہیں ہے۔ تم فوراً ہی دکن چلے جاؤ۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کیا ابھی؟ کیا اسی وقت؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”ہاں ابھی..... اسی وقت!“

نظام الدین اسی وقت دکن روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اور ننگ آباد پہنچ کر نظام الدین نے رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ خواجہ گیسو دراز کی رشتے دار خاتون سے آپ نے شادی کر لی۔ خود کو ذکر و فکر میں مشغول کر دیا۔ آپ کا شہرہ ہوا تو آپ کے در پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپ ان میں شیر و شکر ہو گئے۔ آپ لوگوں کو ہدایتیں بھی فرماتے اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے۔

چشتیہ سلسلے میں چونکہ قوالی جائز ہے اس لیے نظام الدین کو بھی اس کا بہت شوق تھا، ملک کے دور دراز محلوں کے لوگ آپ کے پاس بیاس بجانے آتے اور شاداں و فرحاں واپس جاتے۔

محفل سماع برپا بھی اور لوگ مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ جایں کا کلام سنایا جا رہا تھا۔ آپ پر حالت وجد طاری تھی۔ اسی دوران ایک شخص محفل میں داخل ہوا اور آپ کے قریب بیٹھ گیا۔ محفل میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس شخص سے واقف ہوتا۔ وہ بے باکی سے محفل میں آیا تھا اور بدتمیزی سے آپ کے شانے سے اپنا شانہ بھڑا کر بیٹھ گیا۔

قوالی زور و شور سے جاری تھی۔ اس شخص نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کہا۔ ”جناب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ قوالی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا اس طرح ہمیں لہو و لعب میں نہیں مبتلا کر دیا گیا؟“

مخاطب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیر و مرشد نظام الدین پاس ہی بیٹھے ہیں اور وہ سماع کے دوران بات چیت پسند نہیں کرتے۔

اجنبی نے جواب نہ پا کر پھر پھیڑ چھاڑ کی، بولا۔ ”قوالی کے جواز میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھجن کی متبادل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے بعض صوفیاء اور خاص کر خواجہ معین الدین چشتی نے برصغیر کے ہندوؤں میں جب یہ دیکھا کہ وہ بھجن سے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل و دماغ پر بھجن اور بھجن گانے والے کی خوش الحانی کا خاص اثر ہوتا ہے تو اس کی جگہ قوالی کو رائج کیا گیا اور جب قوال حقائق یا معرفت کا کلام اپنے مخصوص انداز اور آواز میں سناتے ہیں تو سماع پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ غلط ہے کیونکہ قوالی کے رواج کا محض ہندوستان سے ہی تعلق نہیں، یہ ایران اور عراق عرب میں بھی رواج پا چکی ہے۔“

کسی نے اس اجنبی کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر وہ عاجز ہو گیا، بولا۔ ”کیا تم سب گونگے ہو گئے ہو، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے..... یا پھر تمہاری خاموشی کا یہ مطلب لوں کہ تم لوگ میری بات کی صداقت تسلیم کر چکے ہو۔“

نظام الدین کو اس شخص کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! یہ محفل سماع ہے۔ تو خاموش کیوں نہیں رہتا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب ہے تو مرحمت فرمادیں، میں خاموش ہو جاؤں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”میرے پاس تیرے ہر سوال اور ہر اعتراض کا جواب ہے لیکن یہ وقت سوالوں اور اعتراضوں کے جواب کا نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آ جانا، میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔“ پھر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”عبدالغنی!“

آپ نے فرمایا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ تیرا نام عبدالغنی نہیں ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر کیا ہے میرا نام؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نام تیرا ہے تو تو ہی بتائے گا بھی!“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جو تھا، بتا دیا، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کب یہ کہہ رہا ہوں کہ جھوٹ بول۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے باتیں کر کے تو اپنی ذمے داریوں کو پورا کر، ورنہ خواجہ خواہ کی لہن ترانیاں فضول ہیں۔“

وہ شخص جریز ہو کر چلا گیا، آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ ”اس اجنبی کو اس محفل میں کون لایا تھا؟“

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ”کوئی بھی نہیں، یہ شخص اپنے طور پر آیا تھا۔“

کافی دنوں بعد وہی شخص دوبارہ آ گیا لیکن اس دن قوالی نہیں ہو رہی تھی، آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو نے اس روز اپنا کیا نام بتایا تھا..... عبدالغنی؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں عبدالغنی بتایا تھا، کیوں کیا آپ کو میرے نام پر کسی قسم کا اعتراض ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ فقیروں سے جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں، تیرا نام عبدالغنی ہرگز نہیں ہو سکتا، کچھ اور ہے۔“

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ نے بجا فرمایا۔ واقعی میرا نام عبدالغنی نہیں، عبداللہ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں تیرا یہ نام بھی نہیں، تو مسلسل جھوٹ بولے جا رہا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، اب میں تو آپ سے بات کر نہیں سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، اس طرح نہیں سوچئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دن جو باتیں تو کر رہا تھا انہیں ایک دن میرے سامنے بھی بیان کر دے کہ میں اس کا مدلل جواب دے سکوں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کہہ جو دیا، اب میں یہاں ایک بات بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل و دماغ میرے اس خیال کو تکذیب میں ڈال رہے ہیں۔ اب میں کس منہ سے آپ سے بات کروں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرے سوالوں کے جواب میں دوں گا تا کہ تو مطمئن ہو جائے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں تو اسی دن مطمئن ہو گیا تھا، آج اس لیے آیا ہوں کہ اس دن کی گستاخی کی آپ سے معافی مانگ لوں۔“

شیخ نظام الدین

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو میرا چچا چھوڑ دے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! یوں کام نہیں چلے گا۔“

آپ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میری باتیں غور سے سن، تو نے پہلی بار اپنا نام عبدالغنی بتایا تھا مگر اس کے بعد تو عبداللہ ہو گیا۔ افسوس کہ تو نے جھوٹ سے توبہ نہیں کی۔ تیرا نام نہ تو عبدالغنی ہے اور نہ عبداللہ۔ تیرا نام تو عبدالغنی ہے، فقیروں سے کیا پردہ۔“
وہ شخص شرمندہ ہو کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنے جھوٹ کی معافی مانگنے لگا۔

آپ نے فرمایا۔ ”جا، میں نے تو تجھ کو معاف کر دیا مگر آئندہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ میری ایک بات یاد رکھنا، جس چیز کے بارے میں تجھے علم حاصل نہ ہو، اس پر زبان نہ کھولنا۔ جن لوگوں نے تصوف میں اپنی زندگیاں گزار دیں، اس بارے میں ان کا علم زیادہ ہوگا یا وہ جنہیں اس کی ابجد کا بھی علم نہیں۔“

وہ شخص شرمندگی اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلیاں دیں۔ تب کہیں عبدالحی کے ہوش و حواس قابو میں آئے۔

☆☆☆

ان دنوں دہلی میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء اور سردار آپس ہی میں جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ان حالات میں ایک تورانی امیر قمر الدین علی خان کو دکن کی تسخیر کا خیال آیا۔ یہ امیر دکن میں ایک طاقت ور حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں فقراء کی دعائیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نظام الدین کے پیر و مرشد کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں گیا اور مدعا بیان کیا، بولا۔ ”حضرت! دہلی اور اس کے مضافات میں جو انتشار اور بد امنی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالات ابھی اور زیادہ خراب ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ دیواروں کے مقابل دکن میں ایک مضبوط حصار کھڑا کر دیا جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو پناہ مل جائے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ وہاں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”پھر یہ حکومت کس طرح قائم کی جاسکتی ہے؟“
قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں نے انسانوں کی فوج تو تیار کر لی ہے، آپ کے پاس دعاؤں کا لشکر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ کی دعائیں اور میری فوج مل کر دکن پر حملہ آور ہوں گی تو میری فتح یقینی ہو جائے گی۔“
شیخ سوچ میں پڑ گئے، وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگے۔ قمر الدین علی خان کو شبہ ہوا کہ شاید انہیں ٹال دیا جائے گا۔ فوراً شیخ کے دونوں ہاتھ فرط عقیدت سے پکڑ لیے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں جو کچھ چاہتا ہوں، اس سے مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود متصور ہے۔ امید ہے آپ اس عاجز کو مایوس نہیں کریں گے۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”دکن کی ولایت تو نظام الدین کے حوالے کی جا چکی ہے، وہی کچھ کر سکتا ہے۔“
قمر الدین علی خان نے کہا۔ ”وہ بھی آپ ہی کے ایما اور سفارش پر کچھ کریں گے۔ میں تو آپ کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا، کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”میں نظام الدین سے تیری سفارش کروں گا، کام وہی کرے گا۔“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں نہیں جانتا۔“

شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”ایک ٹھیکری تو دینا۔“

شیخ کو ٹھیکری دے دی، آپ نے اس پر سیاہ روشنائی سے لکھ دیا۔ ”نظام الدین! کتنا آ رہا ہے ہڈی ڈال دو۔“
قمر الدین علی خان نے اپنی فوج اور سفارش کے ساتھ دکن پر چڑھائی کر دی۔ اس عالم میں اورنگ آباد پہنچے اور نظام الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ شیخ نظام الدین کے در پر ایک خادم نے قمر الدین علی خان کو روک لیا اور پوچھا۔ ”آپ کا ان سے کیا کام ہے؟“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں دہلی کے شیخ کلیم اللہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ میں تمہارے شیخ کے نام ایک سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہوں۔“

خادم نے کہا۔ ”اس وقت پیر و مرشد کھانا تناول فرما رہے ہیں، آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں انتظار کر لوں گا مگر تم یہ خبر اندر تو پہنچا دو۔“

خادم اندر چلا گیا۔ اس وقت تک آپ نے چند لقمے ہی کھائے تھے، خادم نے کہا۔ ”حضرت! ایک شخص حضرت کلیم اللہ کی سفارشی ٹھیکری لے کر آیا ہے اور باریابی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

آپ نے فوراً حکم دیا۔ ”اے فوراً اندر لاؤ۔ اس کو دروازے پر روکا ہی کیوں۔ فوراً اندر بلاؤ۔“

خادم نے اسی وقت قمر الدین علی خان کو نظام الدین کے روبرو پہنچا دیا۔ شیخ نظام نے پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“
قمر الدین علی خان نے ٹھیکری ان کی طرف بڑھادی۔ شیخ نظام نے ٹھیکری کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور خوشی سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم میرے بھروسہ کے پاس سے آ رہے ہو؟“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہیں سے آ رہا ہوں۔“
شیخ نظام نے دسترخوان پر سے سات روٹیاں لے کر اس پر ایک ہڈی رکھ دی اور قمر الدین علی خان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے کھانا کھا لو، اس کے بعد بات کروں گا۔“

قمر الدین علی خان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور چپ چاپ معذوب بیٹھ گئے۔
شیخ نظام نے پوچھا۔ ”اور کچھ یا بس؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بس۔ اب حاجت نہیں رہی۔“

شیخ نظام نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب اپنا مطلب بیان کرو۔“

انہوں نے کہا۔ ”حضرت! ہندوستان میں ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ مغلیہ سلطنت رو بہ زوال ہے۔ میں چاہتا ہوں دکن میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کروں۔ فوج میرے پاس ہے دعاؤں کی ضرورت ہے جو آپ سے ملے گی۔ بھروسہ شد شیخ کلیم اللہ نے یہ کام آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ نظرِ کرم کا امیدوار ہوں، بس اسی لیے حاضری دی ہے۔“
شیخ نظام نے اپنے زرد پیراہن کا ایک حصہ پھاڑ کر قمر الدین علی خان کے سر پر باندھ دیا اور کہا۔ ”آج سے تو نظام ہے، اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دے۔“

قمر الدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ کر اپنی فوج میں گئے اور دکن پر لشکر کشی شروع کر دی۔ گھمسان کارن پڑا اور قمر الدین نے فتح پائی اور انہوں نے نظام الملک آصف جاہ کا لقب اختیار کیا اور شاہی لباس میں زرد رنگ کی دستار کو اپنا طرۂ امتیاز بنالیا۔

کچھ عرصے بعد مبارز خان نے آصف جاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ آصف جاہ نے پریشانی میں ایک بار پھر شیخ نظام سے رجوع کیا اور پورا واقعہ بتا کے درخواست کی۔ ”حضرت! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، مسلمانوں کے لیے کر رہا ہوں لیکن افسوس کہ مسلمان ہی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“

آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”تم مبارز خان کا مقابلہ کرو۔ وہ ناکام رہے گا، کامیابی تمہاری قسمت میں لکھی گئی ہے۔“

آصف جاہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں چاہتا ہوں مجھے کوئی ایسی بین علامت فتح مل جائے جس سے میں مطمئن ہو جاؤں اور پریشان خاطری دور ہو جائے۔“

شیخ نظام کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”نظام! کل جمعرات ہے، تم اپنے ڈیرے پر غور کرنا۔ ایک صندلی پنجہ ظاہر ہوگا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فتح تمہاری ہے۔“

آصف جاہ اپنی فوج میں واپس چلا گیا، وہ کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ دوسرے دن جمعرات تھی۔ آصف جاہ اپنے خیمے میں جم کر بیٹھ گیا، اس کی نظریں خیمے کی دیواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دوپہر تک اسی صندلی پنجہ کی جستجو میں رہا۔ آخر ظہر کے وقت یہ پنجہ خیمے کی دیوار پر سائے کی طرح نمودار ہوا۔ آصف جاہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گیا۔ جو لوگ اس وقت خیمے میں تھے وہ آصف جاہ کی اس حرکت سے پریشان ہو رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ سجدہ کس خوشی میں ہو رہا ہے؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم لوگ خیمے کی اس دیوار پر کچھ دیکھ رہے ہو؟“

اب سبھی اس پنجہ کی طرف دیکھنے لگے اور سبھی نے متفقہ آواز میں کہا۔ ”ہاں، ہم سب دیوار پر ایک پنجہ کا سایہ ساد دیکھ رہے ہیں مگر یہ پنجہ ہے کس کا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میری فتح کا پنجہ ہے، میری کامیابی کی علامت ہے۔“

آصف جاہ کی باتیں کسی پاگل کی بڑلگ رہی تھیں مگر وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے بعد آصف جاہ اور مبارز خان کی فوجیں ٹکرائیں، لاشیں گرنے لگیں، خون برسنے لگا، زخمیوں کی چیخ و پکار نے میدان کارزار کو عرصہ حشر بنا دیا۔ شام تک مبارز خان کی فوجیں پسپا ہو کر راہ فرار اختیار کر رہی تھیں اور آصف جاہ کی سپاہ ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب فتح مکمل ہو گئی تو نظام الملک آصف جاہ نے شیخ کے دربار میں حاضری دی اور ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

پھر آصف جاہ دکن کے نظم و نسق میں مشغول ہو گیا۔ کافی عرصے بعد وہ اس حال میں شیخ کی خدمت میں پہنچا کہ گاڑیوں پر روپے لدے ہوئے تھے اور مویشیوں کی پشت پر کپڑے کے تھان رکھے تھے۔ آصف جاہ نے انہیں شیخ نظام کی بارگاہ کے باہر کھڑا کر دیا اور خود

شیخ نظام نے مسکرا کر اس دنیا دار کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے..... کوئی اور حاجت؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج میں آپ سے یہ اجازت لینے آیا ہوں کہ اس جگہ جہاں آپ سکونت پذیر ہیں، آپ

کے لیے ایک شان دار محل تعمیر کرا دوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اگر تم محل کی تعمیر کا کام آج ہی سے شروع کرا دو تو اس میں کتنا وقت صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”تقریباً دو سال مگر آپ کو اس کی کیا فکر؟“

شیخ نے پوچھا۔ ”اور اس میں کتنا روپیہ صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں مگر میں نے تو یہ تہیہ کر لیا ہے کہ جتنا بھی روپیہ صرف ہوگا میں خرچ کروں گا اور حضرت کی

شایان شان آستانہ تعمیر کرا دوں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”آصف جاہ! اگر تو چاہتا ہے کہ میں خوش ہو جاؤں تو وہ سارا روپیہ میری خانقاہ کے باہر اس کے چبوترے پر ڈھیر

کر دے، میں اس سے خوش ہو جاؤں گا۔“

نظام الملک نے باہر نکل کر گاڑیوں پر سے روپیہ اتار کر چبوترے پر ڈھیر کر دیا۔ سورج کی روشنی میں روپوں کی چمک سے آنکھیں

خیرہ ہونے لگیں۔ آصف جاہ اندر گیا اور شیخ کو مطلع کیا۔ ”حضرت! آپ کے حکم کے بموجب روپے کا ڈھیر چبوترے پر لگا دیا گیا ہے، ایک

نظر ملاحظہ بھی فرمائیں۔“

شیخ نظام اپنی جگہ سے اٹھے اور خانقاہ کے باہر تشریف لے گئے۔ وہاں چبوترے پر بہت سارا روپیہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور

مریدوں کو حکم دیا۔ ”جاؤ اور بازاروں اور مکی کوچوں میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ شیخ نظام فقرا اور مساکین کو کچھ دینا چاہتا ہے، وہ میری خانقاہ

کے در پر آ جائیں اور اپنا حصہ لے جائیں۔“

مریدوں نے شیخ کا یہ پیغام مکی مکی اور بازار بازار پہنچا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فقراء اور مساکین کا جم غفیر خانقاہ کے در پر اکٹھا ہو گیا۔

شیخ نے سارے روپے اسی وقت تقسیم کرنا شروع کر دیے، آصف جاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی اور عقیدت سے دیکھتا رہا۔ جب سارا روپیہ تقسیم

ہو گیا تو پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ جو کچھ کیا آپ کی نظروں کے سامنے کیا، پھر یہ سوال کیسا؟“

آصف جاہ نے کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ میں آپ کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کراؤں مگر آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پتا

نہیں کیوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو اتنی ساری رقم کو دو سال تک خرچ کرتا رہتا اور پھر کہیں ایک محل تعمیر کراتا لیکن تو نے دیکھا میں نے ذرا سی دیر

میں کئی شاندار محل تعمیر کرا ڈالے۔ بابا! ہم درویش لوگ اپنی کٹیوں ہی میں اچھے لگتے ہیں، محل تو فوایوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔“

آصف جاہ کا دل بھرا آیا، وہ رونے لگا۔ آہستہ سے کہا۔ ”قربان جائے اس سادگی اور سخاوت کے..... حرص اور طمع کو آپ نے زیر

کر کے پوری دنیا کو اپنا مطیع و منقاد کر لیا ہے، سبحان اللہ۔“

اس کے بعد آصف جاہی خاندان میں یہ دستور ہو گیا کہ جب خانقاہ میں عرس ہوتا تو خانقاہ کی طرف سے حکمران نواب کو جو تبرک بھیجی

جاتی، اس میں سات روٹیاں اور ان پر ایک ہڈی رکھی ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں ایک زرد رنگ کے کپڑے میں رکھ کر باندھ دی جاتیں۔ اس

کے بعد جو حکمران نواب آپ کی خانقاہ میں آتا تو اس کے سر پر زرد رنگ کا کپڑا باندھا ہوتا۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے سعید بیگ۔ آپ سعید بیگ پر بے حد مہربان تھے اور بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ صاحب

ہر روز بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ سعید بیگ غائب رہنے لگے۔

جب سعید بیگ کی غیر حاضری کو ایک ہفتہ گزر گیا تو شیخ نے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔ ”لوگو! کیا بات ہے؟ یہ سعید بیگ کہاں

غائب ہو گیا، کچھ اس کا بھی کسی کو پتا ہے؟“

کئی مریدوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”سعید بیگ معلوم نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اگر شیخ کا حکم ہو تو اس کے گھر جا کر اس

کی خیر خبر لے آئیں!“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، میرا خیال ہے تم میں اس وقت بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہے۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”ہیرو مرشد بجا فرماتے ہیں۔ میں سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہوں اگر حکم ہو تو بیان کر دوں۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”بیان کرنا کہ اس کا علاج کیا جائے۔“

شیخ نظام الدین

مرید نے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! سعید بیگ جس محلے میں رہتے ہیں، اس کے متصل ایک دوسرے محلے میں ایک جوگن رہتی ہے۔ یہ نہایت حسین مگر سنگ دل عورت ہے۔ سعید بیگ نے اس کو معلوم نہیں کہاں دیکھا تھا کہ دل دے بیٹھے۔ کئی بار اس کے در پر حاضری بھی دی اور جوگن سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی مگر وہ اتنی سخت دل اور بے نیاز ہے کہ سعید بیگ پر کوئی توجہ ہی نہیں دیتی۔ اس کی بے التفاتی اور بے نیازی سعید بیگ کے لیے جان لیوا ہو رہی ہے۔ شاید اسی لیے سعید بیگ یہاں بھی نہیں آ رہے۔“

شیخ نے اسی مرید کو حکم دیا۔ ”اچھا اب تو سعید بیگ کے گھر چلا جا اور اس کو بتا دے کہ میں نے اس کو طلب کیا ہے۔“

مرید نے پوچھا۔ ”اسی وقت یا کسی بھی وقت؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اسی وقت کیونکہ اس نازک وقت میں فوری دستگیری درکار ہے۔“

مرید بھاگا بھاگا سعید بیگ کے گھر پہنچا اور بہ آواز بلند اعلان کیا۔ ”سعید بیگ! تم اسی وقت میرے ساتھ شیخ کے پاس چلو، وہ تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔“

سعید بیگ نے پوچھا۔ ”مجھ سے شیخ کا کوئی خاص کام؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”شیخ کو تیرے معاشقے کا علم ہو چکا ہے، شاید وہ اس سلسلے میں تیری مدد کریں۔“

سعید بیگ اسی وقت مرید کے ساتھ ہولیا۔ شیخ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ جیسے ہی شیخ کے سامنے پہنچے، شیخ نے پوچھا۔ ”ارے سعید بیگ! تیرا کیا حال ہے؟ میں تیری بابت کیا سن رہا ہوں؟“

سعید بیگ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، جواب دیا۔ ”حضور! ہنگام دستگیری وقت عنایت است“ (حضور! یہ مدد کا وقت ہے، کچھ وقت عنایت ہوا ہے)

آپ نے پوچھا۔ ”اس جوگن میں تجھ کو کیا نظر آ گیا ہے؟“

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”ہاں نہیں کیا نظر آ گیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ میرے دل و دماغ پر اس کا قبضہ ہے۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال اور اسی کا تصور طاری رہتا ہے۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اور اس کا کیا حال ہے؟“

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”جو میرا حال ہے، وہ اس کا نہیں ہے۔ اگر میں اس کے پاس چلا جاؤں تو شاید وہ مجھ پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرے۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”تو گویا یہ ایک طرفہ عشق ہے؟“

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”جی ہر و مرشد! یہ ایک طرفہ عشق ہے۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اس کے عشق سے ہار آ جاؤ؟“

سعید بیگ نے رو، رو کر عرض کیا۔ ”جو اس کے عشق میں مڑ رہا ہوں اور دل کو جو لذت اور سرور حاصل ہو رہا ہے، میں اس سے دستبردار ہونے کے بجائے موت سے ہم آغوش ہو جانا بخوشی گوارا کر لوں گا۔“

شیخ نے کہا۔ ”بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے۔“

سعید بیگ کے زخم خوردہ دل پر اور چوٹ لگی، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”حضرت! میرے حق میں دعا کیجیے کہ مجھے موت آ جائے۔ میں اپنی زندگی سے ذرا بھی خوش نہیں۔ ناکام اور نامرادہ کر زندگی گزارنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”زندگی خدا کا عطیہ ہے، اس کو ختم کرنے کی خواہش کفرانِ نعمت ہے۔ اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

سعید بیگ نے مایوسی سے کہا۔ ”حضرت! میں تو آپ کے پاس استعانت کی آرزو لے کر حاضر ہوا تھا اور آپ ہی مجھے مایوس کر دینا چاہتے ہیں۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں، خدا سے مدد کی دعا کر، ضرور کامیاب ہو جائے گا۔“

سعید بیگ نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال یہ تھا کہ اگر آپ میرے حق میں دعا فرما دیں گے تو میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”مگر وہ جوگن کہتی کیا ہے؟“

سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”وہ کہتی تو کچھ بھی نہیں، وہ نہ تو میری طرف دیکھتی ہے اور نہ ہی مجھ سے بات کرتی ہے، حالانکہ دوسرے کئی جوگن کی چاہت میں آتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتی ہے اور ان کی طرف دیکھتی بھی ہے۔“

شیخ نے خلاف معمول حکم دیا۔ ”اچھا اب تو جاسکتا ہے، پھر کسی دن آ جانا۔“

اس کے بعد سعید بیگ چلا گیا۔ حاضرین پر سنانا طاری ہو چکا تھا۔ شیخ نے مریدوں سے کہا۔ ”میں تو لوگوں کو عشقِ حقیقی کی

طرف دعوت دیتا ہوں اور سعید بیگ یہ چاہتا ہے کہ میں عشق مجازی میں اس کی مدد کروں، بھلا یہ کیونکر..... زمانہ کیا کہے گا، دنیا کیا کہے گی۔“

جب چار مرید اکٹھا ہوئے اور شیخ نظام اپنے حجرے میں چلے گئے تو ایک نے دوسرے مریدوں سے سرگوشی میں کہا۔ ”پیر و مرشد نے سعید بیگ کو مایوس کر کے اس کا دل توڑ دیا، اس پر رحم آتا ہے۔ سوچو، اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔“

ایک دوسرے مرید نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد کو بھلا پھسلا کر اس جوگن کے گھر لے جایا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔“

تیسرا مرید بولا۔ ”لیکن پیر و مرشد کو وہاں تک کس طرح لے جایا جائے؟“

جس نے یہ مشورہ دیا تھا، بولا۔ ”میرا دماغ اپنا کام کر رہا ہے، شاید میں پیر و مرشد کو وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

کئی مریدوں نے فرط خوشی میں نعرہ لگایا۔ ”پیر و مرشد زندہ باد۔“

کئی دن بعد ایک مرید شیخ نظام کے تھکے میں گیا اور رو کر عرض کیا۔ ”حضرت! اب تو سعید بیگ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اس کے حق میں مستطاد دعا کرتا رہتا ہوں۔“

مرید نے درخواست کی۔ ”اگر مرشد جوگن کے گھر تک تشریف لے چلیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا اور میرا دل کہتا ہے کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا سعید بیگ نے یہ خواہش کی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”نہیں یہ ہماری خواہش ہے، ہم سب کی خواہش ہے۔“

آپ کچھ سوچنے لگے، پھر فرمایا۔ ”سعید بیگ بھی آخر کیا کرے، عشق تو آخر عشق ہے اور عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں بہت کچھ جل جاتا ہے۔ میں سعید بیگ کی ضرورت دیکھوں گا۔“

شیخ کے اس جواب نے مریدوں میں خوشی کی لہر دوڑادی، ان سب نے موقع غنیمت جانا اور اسی وقت شیخ کو تیار کر کر جوگن کے پاس چلے۔ راستے میں کہا۔ ”بھائی! میری سمجھ میں یہ بات تو آتی نہیں کہ ایک تیسرے درجے کی عورت نے آخر وہ کونسا جادو کر دیا ہے کہ سعید بیگ ہمیں کا بھی نہیں رہ گیا۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو اس کو اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس عشق کے طفیل اس میں جو جذب و کیف پیدا ہو گیا ہے، وہ بہت کام کی چیز ہے۔“

شیخ نے کہا۔ ”ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سعید بیگ نے اس تیسرے درجے کی عورت سے عشق کیوں کیا؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہ وقت میرے خیال میں کیوں اور کیا کا نہیں ہے۔“

شیخ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لوگ جوگن کے در پر پہنچ گئے۔ اندر جوگن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ دیوانہ وار باہر آئی اور شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا۔

شیخ نے اس حسین عورت کو بڑے غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کر لیا پھر جوگن سے پوچھا۔ ”اے عورت! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ میں یہ گھمنڈ کیوں ہے اور کیا تو غرور اور گھمنڈ کے انجام سے بھی واقف ہے؟“

جوگن نے جواب دیا۔ ”حضرت! بات یہ ہے کہ اس زمین پر جو بھی آیا، بالآخر زمین کے اندر چلا گیا۔ مجھے اپنی کسی چیز پر بھی کوئی غرور نہیں۔ میں اپنے اور اپنے حسن کے فانی ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”کیا تو میرے مرید سعید بیگ سے واقف ہے؟“

جوگن نے جواب دیا۔ ”ہاں نہیں واقف ہوں یا نہیں۔ اگر وہ صاحب میرے سامنے لائے جائیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکوں۔“

کسی مرید نے کہا۔ ”جوگن! تو نے پیر و مرشد کو بٹھایا نہیں، یہ کھڑے کھڑے باتیں کرنے کا سبب؟“

جوگن گھبرا گئی، بولی۔ ”معاف کیجیے گا، یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔“ اس کے بعد وہ شیخ کو اندر لے گئی اور بڑے احترام سے بٹھا کر خود سامنے کھڑی ہو گئی۔

مریدوں کا خیال تھا پیر و مرشد سعید بیگ کی بابت کچھ اور باتیں بھی کریں گے مگر آپ نے پھر کوئی بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد یوں ہی واپس چلے آئے۔ آپ کے اس طرز عمل سے دوسروں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن سعید بیگ نے شیخ کی خدمت میں حاضری دی، آپ نے سعید بیگ کو حکم دیا۔ ”سعید بیگ! اپنی جوگن سے آج ضرور

مل لیا، اس نے تمہیں بلایا ہے۔“
سعید بیگ نے شیخ سے تو کچھ بھی نہیں پوچھا، مریدوں سے ضرور سوال کیا۔ ”کیا پیر و مرشد نے جوگن سے کسی قسم کا وعدہ لے لیا ہے؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”میں تو جوگن کے پاس ہی موجود رہا۔ میرا خیال ہے وہاں تو ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ جوگن نے شیخ سے کب یہ کہہ دیا تھا کہ سعید بیگ کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔“
سعید بیگ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”اگر میں شیخ کے حکم کے بموجب وہاں چلا بھی جاؤں تو پتا نہیں وہ جوگن مجھ سے کیا سلوک کرے اور یہ کہ مجھ سے بات بھی کرے یا فوراً ہی نکال باہر کرے۔“

ایک دوسرے مرید نے کہا۔ ”جب پیر و مرشد نے وہاں جانے کا حکم دے ہی دیا ہے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“
سعید بیگ اسی وقت جوگن کے پاس روانہ ہو گئے۔ جب یہ جوگن کے گھر پہنچے تو وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سعید بیگ کو دیکھتے ہی بولی۔ ”میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی، دیر کہاں کر دی؟“
سعید بیگ نے ایسا محسوس کیا گویا جوگن سے ان کی بڑی بے تکلفی ہے اور وہ سالوں سے ملتے جلتے چلے آ رہے ہیں۔ سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”میں پیر و مرشد کے پاس گیا ہوا تھا اور وہیں سے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“
جوگن نے کہا۔ ”تب پھر مجھے بھی اپنے پیر و مرشد کے پاس لے چلو۔“

سعید بیگ نے پوچھا۔ ”کب؟“
جوگن نے جواب دیا۔ ”ابھی۔“
سعید بیگ جوگن کو لے کر پیر و مرشد کے پاس چلے گئے۔ شیخ نظام نے ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

جوگن نے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھ کو بیعت کر لیجیے اور یہ کہ میں اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری اس مشکل کو آسان کر دیں۔“
شیخ نے اسی وقت جوگن کو بیعت کر لیا اور سعید بیگ سے اس کا نکاح پڑھا دیا۔ یہ سب کچھ آنا فانا اور اچانک ہوا تھا، کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آپ نے سعید بیگ سے پوچھا۔ ”سعید بیگ! تمہ کو تیرا گوہر مقصود مل گیا لیکن اب میرے پاس آنا جانا نہ چھوڑ دینا۔“ پھر جوگن سے کہا۔ ”اور تو بھی اس نیک اور شریف مرد کی مطیع و فرمان بردار رہے گی۔ اس کا بڑا خیال رکھنا۔“
جوگن نے جواب دیا۔ ”میں تو انہیں نعمت سمجھ کر قبول کر رہی ہوں، پھر کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیوں کروں گی۔“
سعید بیگ جوگن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ شیخ کے مریدوں کو بڑی حیرت تھی لیکن اس ملاپ سے خوشی بھی بے حد ہوئی تھی۔
آپ نے ایک عرصے تک لوگوں کی خدمت کی، آپ نے جو انگوٹھی پہن رکھی تھی، اس کے ٹکس پر کندہ تھا۔
ذکرِ مولیٰ از ہمد اولیٰ

آپ مصنف بھی تھے اور آپ کی کتاب نظام القلوب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کی خوراک بہت معمولی تھی۔ جو لباس پہنتے تھے، وہ معمولی اور ہوند لگا ہوا ہوتا تھا۔ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا، آپ اسے دوسروں میں تقسیم فرما دیتے۔
آپ عشق کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بار بار فرمایا۔ ”اے عزیز! کمال عشق چاہیے تاکہ تو اس مقام تک پہنچ جائے جس سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ یہ عاشقوں کا مقام ہے اور کمال عشق کے بغیر یہ مقام نہیں حاصل ہوتا۔“
آپ یہ بھی فرماتے تھے۔ ”عبادت کے لیے خلوص ضروری ہے اور خاص کر وہ لوگ جو مبتدی ہوں، انہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔“

آپ کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بیاسی سال تک اس عالم رنگ بو کو اپنے فیوض سے نوازتے رہے۔ آخر 12 ذیقعد 1242ھ کو بعد نمازِ عشا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

انا لله وانا اليه راجعون



طبقات اکبری	تاریخ فیروز شاہی	عبداللطیف جلی	تاریخ خفرشتہ	آثار الشادید	تاریخ مبارک شاہی
فلاہاندین احمد	شجرہ مزاج عقیقہ	صلاح الدین لاسک	محمد قاسم قریشی	سرمید احمد خاں	سرمید احمد خاں



بہروپیا

ابراہیم جمالی

انسان لاکھ بھیس بدلے... رہتا تو انسان ہی ہے۔ یہ اور بات کہ اس کا ضمیر اسے کس کس سادھے میں ڈھلنے پر آمادہ کرتا ہے... رنگ بدلتی دنیا میں وہ بھول گیا تھا کہ فطرت کا یہی کمال ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے سے الگ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

کھیل تماشا کرنے والے ایک بہروپے کا اصل روپ

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب شیخ صاحب صرف ”مٹی ڈھونے والے“ تھے یعنی لمبا اٹھانے کا کام کرتے تھے۔ پچیس تیس گدھے، اتنی ہی بوریاں، کام کرنے والے ایک دو مزدور اور پانچ وچھ کدالیں اور بیچے..... شیخوں کی یہی کل مایا تھی۔ کسی کو لمبا اٹھوانا ہوتا تو وہ شیخوں کو بلوالیتا۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ انہوں نے کمیٹی کے داروغہ سے بھی بہتر تعلقات بنائے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ذرا سہولت سے لمبا اٹھانے دیتے تھے۔ پھر وہ سنگ و خشت کے ضرورت مند گا ہک کو تلاش کر کے اس کے ہاں ڈال آتے تھے۔ ایک جگہ سے لمبا اٹھا کر دوسری جگہ پہنچانے سے انہیں

فقیرے بہروپے کا بیٹا ملنے، بڑی حویلی والے شیخ صاحب کے بیٹے کا لنگوٹیا یا تھا۔ بچپن ہی سے ان کا یارا نہ چلا آ رہا تھا۔ بچپن میں وہ دونوں کچھ عرصے تک مسجد میں بھی ساتھ پڑھتے رہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شیخوں میں بھی مسجد اور تکیوں کی تکریم پائی جاتی تھی۔ ان کی نظر میں مولوی اور درویشوں کی عزت ہوتی تھی۔ اس وقت وہ خود چنگیری میں روٹی رکھ کر اور اسے اپنی پکڑی کے شملے سے ڈھانپ کر مسجد کے مولوی کے لیے کھانا لے جاتے تھے۔ جب انہیں بخاریا سر میں دروہوتا تو تکیے کے سائیں سے دم کرانے جاتے.....

اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ قدرے بہتر انداز سے گزر بسر ہو سکے، لیکن وہ دن بھر مٹی میں مٹی بن کر رہتے تھے۔ منہ، سر، ڈاڑھی، کپڑے اور جوتے خاک سے اٹ جاتے تھے۔ ان دنوں میں انہیں اپنی عقل بھی مٹی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ انہیں ”شیخ ملبا“ اور ”شیخ مٹی والے“ کہہ کر پکارتے۔ انہی دنوں میں انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے مسجد میں بٹھایا تھا اور مولوی صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گزارش کی تھی۔ ”بزرگو! میں تو اس لڑکے کی دنیا سنوارنے کے قابل نہیں۔ آپ مہربانی فرما کر اسے رب کے راستے پر لا کر اس کا دین ہی سنواریں۔“

فقیرے بہرہ پیسے نے بھی انہی دنوں میں اپنے بیٹے کو مسجد میں بٹھایا تھا۔ اس طرح بہرہ پیسے کا بیٹا شیخ کے بیٹے کا دوست بن گیا۔ مولوی صاحب پڑھانے کے دوران بھی کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر مسجد سے باہر جاتے تو بہرہ پیسے کا بیٹا ملنگی فوراً اٹھ کر ان کی گدی پر بیٹھ جاتا۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک طرف چبوترہ بنا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اس چبوترے پر گدی بچھا کر بیٹھتے تھے۔ جوتوں والی جگہ پر ایک حقہ رکھا رہتا، جس کی لمبی ناڑ مولوی صاحب کے زانوؤں پر دھری رہتی۔ وہ وقفے وقفے سے اسے اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیتے۔

مولوی صاحب کے مسجد سے باہر جاتے ہی حقے کی ناڑ ملنگی کی بغل میں چلی جاتی۔ وہ دائیں ہاتھ میں کتاب تھام کر اور بائیں ہاتھ سے مولوی صاحب کی چھتری لہرا کر بھاری آواز میں کہتا۔

”سنو اوئے شیطانو! اگر تم لوگوں نے اپنا سبق یاد کر کے نہیں سنایا تو میں تمہیں مرغابنا دوں گا..... اور تو سن اوئے شیخ کے سپوت! اگر تو نے سبق نہیں سنایا تو میں نے تیرے باپ کا نکاح توڑ کے تیری ماں سے خود ہی نکاح پڑھا لیتا ہے۔ ساتھ حکم شرع شریف کے۔“

اس کی اس نفالی پر بچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شیخ ملبا کا بیٹا اس سے چھتری چھین کر اس کے پیچھے لپکتا اور پھر خود بھی ہنستے ہنستے گر جاتا۔ پھر اچانک ملبا شیخ کے دن پھر گئے۔

کہتے ہیں کہ ایک جگہ سے ملبا اٹھاتے ہوئے کھدائی کے دوران انہیں خاصے قیمتی زیور ہاتھ لگ گئے تھے۔ کوئی کہتا کہ انہیں زیر زمین طلائی اشرفیوں سے بھری ہوئی دیک مل گئی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ان کی لاٹری محل گئی تھی..... بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ یہ حقیقت اپنی

جگہ تھی کہ ان کے دن پھر گئے تھے۔ دولت ہاتھ آتے ہی انہوں نے بڑی حوصلی خرید لی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کا کارخانہ بھی لگا لیا۔ پھر انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کو مسجد سے اٹھوا کر انگریزی اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن بچپن کی محبت اور دوستی اتنی گہری تھی کہ شیخ صاحب کے بیٹے کو جب بھی فرصت ملتی، وہ سپردِ حلقہ فقیرے بہرہ پیسے کے گھر جا پہنچتا۔ بہرہ پیسے کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا۔ دونوں دوست اس کی بھیس بدلنے والی چیزوں سے کھیلتے رہتے۔

بہرہ پیسے کی کوٹھری کسی عجائب خانے سے کم نہ تھی۔ دیواروں پر مختلف قسم کے بے شمار لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں سادھو سنتوں کے گیروے رنگ کے لباس سے عالم فاضل کے چونے اور پگڑیاں تک تھیں۔ ریلوے گارڈ کی وردی سے لے کر پولیس افسروں تک کے ڈریس موجود تھے۔ یعنی بھیس بدلنے کے تمام لوازمات وہاں دیکھے جاسکتے تھے۔

شیخ صاحب کا بیٹا اس کوٹھری میں کھینچتے ہی گویا بے خود سا ہو جاتا۔ کبھی وہ سفید ڈاڑھی لگا کر بوڑھا بن جاتا اور کبھی لمبے پراندے والی دگ لگا کر کسی عورت کی طرح مکھن لگتا۔ کبھی وہ اور ملنگی چور سپاہی بن کر کھیلتے رہتے۔

”اگر تمہیں بھیس بدلنے کا فن سیکھنا ہے تو پہلے کسی ماہر فن کو استاد بناؤ۔“ ملنگی ہنستے ہوئے اس سے کہتا۔ ”کسی اور کو استاد نہیں بناتے تو ہمارے ہی گھٹنے چھولو۔ پھر تمہارا باپ بھی تمہیں پہچان جائے تو استاد نہ کہنا۔“

”چل اوئے بڑیو لے۔“ شیخ کا بیٹا بھی ہنستے ہوئے جواب دیتا۔ ”پہلے تم اپنے باپ سے تو کچھ سیکھ لو پھر دوسروں کا گرو بننے کا سوچنا۔“

☆☆☆

جب ملنگی کا بہرہ پیسا باپ کئی دنوں کے بعد گھر لوٹا تو اس نے بیٹے کا قد کاٹھ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اب اسے باپ دادا کا ہنر سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وہ جاتے ہوئے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گیا۔

باپ بیٹا کئی دنوں تک گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتے رہے۔ اس دوران میں ملنگی اپنے باپ دادا کا کسب حاصل کرتا رہا۔ ساتھ ہی باپ اسے موقع بھی دیتا رہا کہ وہ لوگوں کو اپنے ہنر کے جوہر دکھاتا رہے۔ طویل عرصے تک جہاں ٹوری کرنے کے بعد وہ واپس لوٹے تو باپ نے بیٹے کی پیٹھ چمکتے ہوئے کہا۔

”چل بیٹا، تیار ہو جا۔ اب تیری زندگی کا سب سے

اہم وقت آگیا ہے۔ جو کسب تم نے محنت سے سیکھا ہے، وہ اپنے شہر کے لوگوں کو بھی دکھانا کہ لوگ تمہارے باپ دادا کو یاد رکھیں۔ یاد رکھنا بیٹے! یہ روپ بہروپ سب مالک کی لیلیا ہے لیکن جس نے اپنے ہنر اور کسب کی داد اپنے شہر، اپنی جنم بھومی سے حاصل نہیں کی، اس کا فن اور کسب۔۔۔ بیکار ہے۔ جس کلاکار کے فن کا لطف اس کے اپنے لوگوں نے اٹھایا ہے، اس کے کمال فن کو دنیا نے بھی سراہا ہے اور اس کے سر پر عزت اور شہرت کا تاج رکھا ہے۔ جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا۔۔۔۔۔ چل بیٹا! اپنے شہر والوں کو اپنا فن دکھا دے۔ تم پردیسوں کو تو خوش کرتے آئے ہو۔ اب ذرا انہوں کو بھی راضی کر لو۔“

ملنگی اپنا کسب دکھانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں شیخ کے بیٹے سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ پرانا یار ملا تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

”یار، دیس دیس گھوم کر آئے ہو۔“ شیخ کے بیٹے نے کہا۔ ”ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟“

”شیخ جی افکار کے پاس اس کے فن سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ سچ میں آج کی رات ہے۔ کل چاند چڑھے گا اور پورا جگ دیکھے گا۔“ پھر وہ اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے بولا۔ ”اور ہاں، شیخ جی! اگر آپ کو میرا شاگرد بننا ہے تو لٹو کا تھال اور پگڑی دو پٹا تیار رکھنا۔“

”بس اوئے، بڑا آیا استاد!“ شیخ کے بیٹے نے کہا۔ ”تم تین چار سال میں ایسا کیا سیکھ آئے ہو جو تمہیں استاد بننے کا شوق چھڑا رہا ہے۔ ارے بے وقوف! ہم انگریزی اسکول سے پڑھے ہوئے ہیں اور والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ارے ہم نے اپنے جیسا اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔ اونہ۔۔۔۔۔ بڑا آیا ہمارا استاد بننے۔ بھلا دکھاؤ تو سہی، کیا کارگیری ہے تمہارے اندر، کون سے گن ہیں تیری کلا میں، کیسے موتی ہیں تمہارے پلے پے؟“

☆☆☆

اگلے دن شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک خوب رو جووان بے خودی کے عالم میں گلی گلی بھٹک رہا ہے۔ بہترین لباس میں ملبوس وراز قد اور وجیہہ نو جوان عشق کی چوٹ کھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی وہ بے خیالی کے عالم میں بڑبڑانے لگتا اور کبھی دیوانوں کی طرح ہنسنے لگتا۔

”ماں باپ کا لاڈلا معلوم ہوتا ہے۔“ لوگ اس نو جوان کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔

”انہوں نے اسے بہترین پوشاک اور قیمتی جوتے

پہنائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن افسوس کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ عشق کا مارا لگتا ہے۔“

کسی نے اس نو جوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری واسکٹ بہت سوہنی ہے۔ یہ ہمیں دے دو۔“

”سوہنی“ لفظ سنتے ہی نو جوان نہال ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ بے خودی کے عالم میں بولا۔ ”سوہنی کے نام پر میری جان بھی قربان۔۔۔۔۔ یہ لو۔“

پھر اس نے بلیڈ سے زری والی واسکٹ کا کلڑا کاٹ کر اچھال دیا۔

”تمہاری جوتی بہت سوہنی ہے۔“ کسی نے ہانک لگائی۔ اس نے دونوں پیروں سے جوتیاں اتار کر اپنی آنکھوں سے لگالیں اور بولا۔ ”اگر یہ سوہنی ہیں تو انہیں پیروں میں نہیں پہن سکتا۔۔۔۔۔ میں سوہنی کی ایسی جگ نہیں کر سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ پھر وہ جوتی کو اٹھا کر سوہنی کہنے والے کی طرف لپکا اور اسے جوتیاں تمہا کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھٹکتا رہا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں لیکن اسے گویا کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ نہیں بیٹھ جاتا تو بیٹھا ہی رہتا۔ رونے لگتا تو روتا ہی چلا جاتا۔ اس کی صورت، اس کی جوانی اور اس کے حال کو دیکھ کر لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

”یارو، جس کا ایسا گبرو جوان پٹا سودا کی ہو جائے، اس ماں کا کیا حال ہوگا؟“

کسی نے کہا۔ ”اگر اس کی سوہنی اسے اس حال میں دیکھ لے تو شاید ہیر کی طرح کچھ کھا کر جان دے دے گی۔“

وہ دیوانہ مستانہ سب باتوں سے بے نیاز ایک ہفتے تک شہر کی گلیوں میں خاک اڑاتا رہا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی لیکن کوئی یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ عشق گزیدہ نو جوان آیا کہاں سے ہے۔

☆☆☆

وہ دیوانہ اچانک کہیں غائب ہو گیا اور شہر میں ایک نیا چاند چڑھ آیا۔

سفید وودھیا لباس میں ملبوس ایک خوب صورت نرس گھر گھر جا کر عورتوں سے ملنے لگی۔ اگر وہ گندی رنگت کی نہ ہوتی تو اسے خاص ولایتی سمجھا جاتا۔ اس کے ناک نقش بھی اسے ایسی ثابت کرتے تھے۔ البتہ اس کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ کسی ولایتی اسپتال میں ٹریننگ لیتی

رہی ہے۔ وہ چمکتی شگفتگی جس طرف سے بھی نکلتی، لوگوں کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتیں۔ اس کے بیگ میں بخار کی گولیاں، کھانسی کا شربت، مرہم اور پٹیاں موجود تھیں۔ آدمی بیماری تو اسے دیکھتے ہی دور ہو جاتی تھی، جب وہ پیار سے کہتی۔

”دیکھو دیری ناہیں لگتا۔ تم ابھی اچھا ہوتا۔“

ایسے میں روگیوں کو اپنا روگ دور ہوتا محسوس ہوتا۔ کوئی بزرگ خاتون اسے دعا دیتی۔ ”اللہ تمہیں خوش رکھے۔ سر کا سائیں سلامت رہے۔“

یہ سن کر وہ ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی اور پوچھتی۔ ”اماں! سر کا سائیں کیا ہوتا ہے؟“

جب اسے اس بات کا مطلب بتایا جاتا تو وہ شرماتے ہوئے بتاتی کہ ابھی اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ عورتیں کھی کھی کر کے ہنسنے لگتیں۔

دو چار دنوں میں وہ ”مس صاحبہ“ ہر گھر کی سہیلی بن گئی اور اس کا انتظار کیا جانے لگا۔

☆☆☆

شہر میں خوب صورت اور منسار نرس کا چہ چہ ہونے لگا۔ ایسے میں شہر کے نئے کو تو ال آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی شہر کی تمام چھاڑیاں اٹھوا دیں۔ ٹھیلے اور تھڑے ہٹوا دیے اور جگہ جگہ موجود گندگی کے ڈھیر صاف کر دیے۔ شہر بھر کی ایسی صفائی ستھرائی ہو گئی کہ لوگ حیران رہ گئے۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب بھی بیٹھ گیا تھا۔ اونچے لمبے قد پروردی انہیں بارعب بناتی تھی۔ ایک دن وہ بازار سے گزرتے ہوئے رک گئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ”یہ رکاوٹ سے پاک کھلی سڑکیں آپ ہی کے فائدے کے لیے ہیں۔ ناجائز تجاوزات سے آپ کی آمدورفت میں خلل پڑتا ہے۔ گندگی سے آپ کی صحت خراب ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ بھی اس بات کا خیال رکھیں اور جگہ جگہ کچرا نہ پھینکیں۔ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، مکھیوں اور چھروں کا عذاب بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ اس کے علاوہ چوراچکوں، نوسر بازوں اور جیب کتروں سے بھی شہر کو پاک کر دیا۔ مطلب یہ کہ جب سے یہ نئے افسر شہر میں آئے تھے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے با تصویر ہفت روزہ نے ”عشق گزیدہ نوجوان، مہربان نرس“ اور ”فرض شناس کو تو ال“ کی

تصویریں صفحہ اول پر چھاپیں۔ درمیان میں فقیرے بہروپے کے بیٹے ملنگی کی پورے قد سے ایک تصویر چھاپی گئی تھی۔ کمپنیشن میں لکھا تھا۔

”ملنگی..... فن بہروپ کا فنکار!“

”ایسے فنکار ہمارے اپنے دیس میں تو کیا دوسرے ملکوں میں بھی کم ہی پائے جاتے ہیں۔“

دوسرے اخباروں نے بھی بہروپ کے فن پر مضامین شائع کیے۔ انہوں نے نامور بہروپوں کے فن سے ملنگی کی صلاحیت کا موازنہ کیا تھا اور ملنگی کو سب سے بڑا کلاکار قرار دیا تھا۔

پورے شہر میں ملنگی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جہاں دیکھیے، لوگ اس کی باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ اس کے باپ کو مبارکبادیاں وصول کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ پھولوں کے ہار ایک طرف، لوگوں نے باپ بیٹے کو نوٹوں کے ہاروں سے لاد دیا تھا۔

ملنگی اپنے گھر میں نوٹوں کے ہار ڈالے اور اخبارات کے پرچے ہاتھ میں اٹھائے اپنے یار، شیخ صاحب کے بیٹے سے ملنے چل دیا۔ دونوں دوست ملے تو ملنگی نے کہا۔

”اب لے آؤ پگڑی اور دوپٹا..... لڈوؤں کے تھال کے ساتھ۔ آج ہم تمہیں اپنا شاگرد بنائیں گے۔“

”اتنا تیز مت چلو دوست!“ شیخ صاحب کے بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میدان میں اڑنے والی دھول کو بیٹھ جانے دو۔ ممکن ہے دھول کے بیٹھتے ہی میدان کی دوسری طرف سے کوئی تم سے بھی بڑا پہلوان اور فنکار نمودار ہو جائے۔“

”پہلوان تو بے شک کئی سامنے آ سکتے ہیں شیخ جی! لیکن بہروپ کا فنکار ہم سے بڑھ کر نہ ہوگا۔ یہ ہم دعوے سے کہتے ہیں۔“ ملنگی نے یقین سے کہا۔

شیخ جی پھر ہنس دیا۔ ”بڑی باتیں مت کرو پیارے! یہاں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار پڑا ہوا ہے۔“

ملنگی نے کہا۔ ”جب تک مجھ سے بھی بڑا فنکار سامنے نہیں آئے گا، میں کیسے مان سکتا ہوں۔“

بہر حال اس شہر میں ہمیشہ باصلاحیت انسان سامنے آتے رہے ہیں۔ مداری کی پٹاری کی طرح اس میں سے نت نئی اور حیران کن ”چیزیں“ نکلتی رہی ہیں۔

ملنگی کے بہروپ کے قصے شہر میں گردش کر رہے تھے کہ ایکشن کا غلغلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف گہما گہما اور رونق پیدا ہو گئی۔ قد آدم پوسٹروں سے دیواریں سج گئیں۔ جگہ جگہ

جلے ہوئے گئے، جلوس نکلنے لگے اور کچھ لوگوں کی مصروفیات نکل آئیں۔ وہ بھی کچھ عرصے کے لیے برسرِ روزگار ہو گئے۔ انہیں رقوم فراہم کی گئیں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو ان کے پوسٹر اور بینرز اتارنے کی کوشش کرے اسے سبق سکھائیں تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے۔ ان کا دوسرا کام یہ تھا کہ وہ اپنے امیدوار کے جلسوں میں نعرے لگائیں اور خوب شور مچائیں۔

دراصل اس شہر میں الیکشن کے پوسٹر وغیرہ لگانے کے ساتھ ہی یہ انتظام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے کہ مخالفین انہیں پھاڑ اور اتار نہ دیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ ایک پارٹی کے کارکن دیواروں پر اپنے امیدوار کے پوسٹر لگاتے جاتے اور ان کے پیچھے مخالف پارٹی کے لفٹے انہیں پھاڑ کر لیر لیر کر دیتے۔ شہر میں ہر امیدوار کے کارکن گویا چوکیداری کرتے پھرتے تھے۔

اس شہر کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ جہاں الیکشن کے دوران خوب شور شرابا اور رونق ہوتی تھی وہیں کوئی نہ کوئی مثبت مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا پھر اس مسئلے پر لوگ بڑھ چڑھ کر بولتے تھے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر پڑی حویلی کے شیخ صاحب کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ جب سے شیخ صاحب کے ہاتھ دولت لگی تھی، اسی وقت سے عام آدمی اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ نہ تو عام لوگ انہیں اپنا سمجھتے تھے اور نہ ہی شیخ صاحب انہیں انسان گردانتے تھے۔

جب سے شیخ صاحب شہر کے درمیان میں سے نکلنے والے گندے پانی کے نالے کے حق میں اڑ کر کھڑے ہو گئے تھے؟ اسی وقت سے شہر کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ گندے نالے کو شہر کے درمیان میں سے ہٹایا جائے۔ اس کا رخ بدلا جائے، زیر زمین کوئی انتظام کیا جائے اور اسے ہر صورت میں پاٹ دیا جائے۔ جبکہ شیخ صاحب اس کے سخت مخالف تھے۔

دراصل اسی گندے نالے کے پانی سے شیخ صاحب کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ وہ گندانا لا طویل عرصے سے اسی جگہ موجود تھا۔ شہر سے باہر، نالے کے قریب واقع زمین شیخ صاحب نے منہ مانگے دام ادا کر کے خریدی تھی۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ نالے کے پانی سے سبزیاں کثرت سے اور بہترین پیدا ہوتی تھیں۔ اس سے شیخ صاحب کو خاصی آمدنی ہوتی تھی۔

لوگوں کا مطالبہ شدت اختیار کرنا چلا گیا۔ وہ چاہتے

تھے کہ گندانا لا شہر کے حسن کو برباد کر رہا ہے۔ لہذا اسے پاٹ کر اس کی جگہ گرین بیلٹ تیار کی جائے۔ شہر کا گندانا پانی کسی دوسری طرف نکالا جائے۔

ظاہر ہے اس طرح شہر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے اور لوگوں کو کھیلوں اور چھڑوں کے علاوہ لطفن سے بھی نجات مل جاتی۔ لیکن شیخ صاحب اپنا یومیہ ہزاروں روپے کا نقصان کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ کسی کی بات نہیں سنتے تھے اور سب کو ان کی بات سنی پڑتی تھی کیونکہ وہ شہر کی کمیٹی کے پردھان تھے اور ان کی مرضی کے خلاف گندانا لا تو ایک طرف، کمیٹی کا کوڑا اٹھانے والے گدھے کا رخ بھی نہیں موڑا جاسکتا تھا۔

ان انتخابات میں شیخ صاحب بھی کمیٹی ممبر کے امیدوار تھے۔ اگر وہ ممبر منتخب ہو جاتے تو ان کا پردھان بننا مشکل نہ تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ”ملبا شیخ“ کو ممبر بنانا گندے نالے کی عمر کو طول دینے کے مترادف ہے۔ بولنے اور لکھنے والے ملبا شیخ اور گندے نالے کے حوالے سے طرح طرح کی کہانیاں سامنے لے آئے۔ جلسے اور جلسوں میں وہ کہانیاں بیان کر کے لوگوں کو ہنسیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر اس بات پر متفق ہو گیا کہ گندانا لا اور ملبا شیخ دو مختلف چیزیں ہیں بلکہ ان دونوں سے ایک ساتھ ہی جان چھڑانی پڑے گی۔

اس قسم کی باتیں تو کی جا رہی تھیں اور محض باتیں کرنا خاصا آسان بھی ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ شیخ صاحب کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس شہر کی کسی ماں نے ایسا سورما پیدا ہی نہیں کیا جو آگے بڑھ کر ممبری کے لیے شیخ صاحب سے ٹکر لے اور ان کی جگہ خود شہر کا پردھان بن جائے۔

آخر کار اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے شہر کے لوگوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس میں شہر کے تمام لوگوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ طے شدہ وقت پر شہر کے خاصے لوگ وہاں پہنچ گئے تو ایک شخص ڈانس پر آ کر ان سے مخاطب ہوا۔

”بھائیو اور دوستو! اس گندے نالے کی سیاہ کچڑ اور بدبودار پانی ہمارے شہر کے لیے کلنک کا ٹیکا ہے۔ جب تک بیماری کی یہ نہر ہمارے شہر کے درمیان بہتی رہے گی۔ جب تک طیریا، بدبو، پھوڑے جیسے روگ پر بھگتی کھیلوں اور چھڑوں سے ہماری جان نہیں چھوٹے گی اور جب تک بڑی حویلی والے شیخ صاحب میونسپل کمیٹی کے چیئرمین رہیں گے،

جگہ ان کا بیٹا پہلی مرتبہ ممبر اور پھر میونسپلٹی کا چیئرمین بن گیا۔

☆☆☆

اب لوگ اس بات کے متحیر تھے کہ کب کمپنی کے مزدور کدالیں، بیلچے اور ٹوکریاں لے کر آتے ہیں اور نالے کو پانے کا کام شروع ہوتا ہے۔

شیخ صاحب کا بیٹا الیکشن کے دوران باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے سسرال میں رہنے لگا تھا۔ لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ گندانا لا باپ بیٹے کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل ہو گیا ہے۔ جو خلیج بنگال کی طرح بھی پانا نہیں جاسکے گا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ لاکھ اختلافات بھی، قریبی اور سگے رشتوں میں ہمیشہ کے لیے دوریاں قائم نہیں رہ سکتیں اور یہ بات مناسب بھی نہیں ہے۔

کچھ ہی عرصے کے بعد لوگوں نے سنا کہ شیخ صاحب کا بیٹا میونسپلٹی کا چیئرمین بنتے ہی دوبارہ بیوی کو لے کر باپ کی حویلی میں آ گیا تھا لیکن لوگ اس بات کا انتظار ہی کرتے رہے کہ کمپنی کی جانب سے نالا پانے کا کام کب شروع کیا جاتا ہے۔

سب سے زیادہ فکر اس کے یار ملنگی کو تھی۔ وہ سینہ ٹھونک کر لوگوں سے کہتا رہا تھا۔ ”میرا یار بڑے شیخ صاحب کے تمام گناہ دھو دے گا۔ باپ نے شہر سے جو دغا بازی کی ہے، ان کا بیٹا اس کی تلافی کر دے گا۔ وہ نالے کو بند کرا کے شہر کو شیشے کی طرح صاف کر دے گا۔ میرا یار بڑا جی دار اور وعدے کا پکا آدمی ہے۔ دیکھنا، اس نے جو کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔“

لیکن لوگوں کا انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ گندانا لا اپنی تمام غلاظت اور بدبو کے ساتھ موجود رہا۔ ملنگی کا جوش اور جذبہ بھی ماند پڑنے لگا۔ آخر کار وہ ایک دن شیخ صاحب کے بیٹے سے ملنے گیا۔ چڑا سی نے چک اٹھا کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ شیخ صاحب کا بیٹا بڑی شان سے پردھان کی کرسی پر براجمان تھا۔ لیکن آج ملنگی نے ہنستے ہوئے اپنی بات شروع نہیں کی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہی سنجیدگی سے بولا۔ ”شیخ جی! آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نالا پانے کا وعدہ اب تک کیوں پورا نہیں ہوا؟“

شیخ صاحب کا بیٹا اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ کان سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اس کی ٹھوڑی کو انگوٹھے سے ٹھوکا دے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”اوئے فقیرے بھانڈ کی اولاد! دیکھا اصل بہرہ دیا؟“

اس نالے کو پانے کا ہر جن ناکام رہے گا۔ بس یوں سمجھیے کہ شیخ صاحب اور گندانا لا ساتھ ہی رہیں گے اور ساتھ ہی جائیں گے۔ ہے کوئی ایسا شخص جو شیخ صاحب سے ٹکر لے؟ پھر وہ کامیاب ہو یا ناکامیاب..... لیکن ایک بار شیخ صاحب کو یہ معلوم ضرور ہو جانا چاہیے کہ شہر کی پیشانی پر اس کا لک کے دسے کو دھونے والے بہادر لوگ بھی اس شہر میں بستے ہیں۔“

مقررہ بیٹھ گیا تو ہر طرف قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی میں بولنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ اچانک ساکت لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک نوجوان کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہونے لگے۔ شیخ صاحب کا بیٹا آگے بڑھا اور اسے پر آ کر بولنے لگا۔

”میرے بزرگو اور بھائیو! میں کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا، نہ ہی مجھے تقریر کرنا آتی ہے۔ میں سیدھا سادہ اور کام کرنے والا بندہ ہوں، میں خود ایک عرصے سے اس گندے نالے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ لیکن اس سے نجات کی مجھے کوئی راہ نہیں سوچھی۔ آج آپ لوگوں کی باتوں نے مجھے بھی راہ بھانکی ہے۔ میں زیادہ باتیں کرنے کے بجائے صرف اتنا کہوں گا کہ شیخ صاحب میرے والد ہیں۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلوائی ہے۔ ایک اچھے گھرانے میں میری شادی کرائی ہے..... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شہر بھی میرا کچھ لگتا ہے۔ میرا اس سے بھی ایک تعلق ہے۔ جس طرح میرے والدین کی خدمت مجھ پر فرض ہے اسی طرح یہ شہر بھی مجھ پر کچھ حق رکھتا ہے۔ میں اس کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوں۔ اس کا اناج کھا کر اور پانی پی کر پلا بڑھا ہوں۔ اسی شہر کی گلیوں اور میدانوں میں کھیل کود کر بڑا ہوا ہوں..... اس کا بھی مجھ پر حق ہے۔ میں اپنے خوب صورت شہر، اپنی جنم بھومی کی پیشانی سے کالک کا یہ داغ دھودوں گا اور اس کے سینے سے گندگی کے اس ناسور کو ختم کر کے ہی دم لوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنے سگے باپ سے بھی کیوں نہ ٹکر لینا پڑ جائے۔ میں ایک اصولی موقف اور اپنے شہر کی بھلائی کے لیے یہ کرگزروں گا۔“

شیخ صاحب کے بیٹے کی باتیں سن کر شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ اسے کندھے پر اٹھا کر شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر نعرے لگانے لگے۔

”مبارک..... مردہ باد۔ ان کا بیٹا زندہ باد۔“

یہ نعرے اس وقت تک گونجتے رہے جب تک مبارک شیخ کی

انجانا آشنا

ناہید سلطان اختر

جذبہ عشق... کہیں گل و گلزار کی صورت پھلتا پھولتا ہے اور کہیں چنگاری بن کر دھیرے دھیرے دلوں کو گرماتا ہے مگر جب... مخالف ہوا چل جائے تو سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور اس راکھ میں حسرتیں، ناکامیاں اور... ادھورے خواب تمام عمر کی بے چینی، اپنے مطلوب کی خوشیوں سے بھرپور زندگی کو بھی دکھوں سے بھر دیتی ہے۔ ہاں ایسا تب ہی ہوتا ہے جب کوئی وعدہ کرے اور بھول جائے... کسی کے دل میں زبردستی اترے اور پھر رستہ بدل جائے... خوشیوں کا سودا کرے اور غموں کے تحفے دے جائے... ساتھ ساتھ چلنے کا عہد کرے اور قدم قدم پر مکرو فریب سے سمت بدل جائے۔ ایسے میں بھلا کس طرح یہ ادراک ہو سکتا ہے کہ یہ انجام کیوں ہوا اور یہ آشنائی... بے اعتنائی میں کیونکر بدل گئی... شاید مقدر کی بساط پر ایسی ہی چالیں چلی جاتی ہیں جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ کسی کے دامن میں کامیابی کے پھول کھلتے ہیں اور کوئی شکستگی کی دھول میں کہیں گم ہو جاتا ہے... اس کے باوجود... قدرت کا تعاقب موت تک جاری رہتا ہے اور مکافات کا جال کہیں نہ کہیں خطا کار کو قید کر لیتا ہے۔

تلی سمجھ کر محبت سے کھیلنے والے ایک عاقبت نااندیش

عاشق کی داستان لہو

”اس وقت ا“
”تم نے کہا تھا نا..... آؤ۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔
ہاں..... کہا تو تھا اس نے مگر اب جب وہ آگئی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔
”تمہارے گھر والے؟“ اس نے دہلی دہلی آواز میں پوچھا۔
”سور ہے ہیں۔“
”تم آئیں کیسے؟“
”دیوار کو دوکر۔“ اس نے بتایا پھر بولی۔ ”تم نے کہا تھا نا عاقب..... آؤ..... میں آگئی۔“ اس کے لہجے میں اتراہٹ تھی۔
وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی..... اتنی کہ وہ اس کی گرم سانسیں اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔
”عاقب!“ اس کی آواز میں ڈر تھا، تشویش تھی، اندیشے تھے..... مگر فیصلہ کن کیفیت بھی تھی۔ ”میں صرف تم سے شادی کروں گی عاقب۔“

سر سے پاؤں تک لحاف تانے وہ جسم میں اترتی سردی کو ماہ نور کے تصور سے گرمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے دروازے کا دستہ آہستگی سے گھمانے اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا خیال تھا شاید بھابی ہوں۔ گھر میں اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کو وہ اکثر یونہی چھاپا مارا کرتی تھیں۔
”آج سردی بہت ہے بھابی۔“ وہ لحاف کے اندر ہی سے بولا۔
دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا مگر قدموں کی چاپ کمرے سے باہر جانے کے بجائے نزدیک ہوئی سنائی دی اور پھر دہلی دہلی سی آواز آئی۔ ”میں ہوں۔“
لحاف منہ پر سے ہٹا تا وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھیلی تارکی کے باوجود وہ اسے اس کی آواز سے پہچان سکتا تھا۔
”تم!“ وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔
”ہاں!“ وہ آہستہ سے بولی۔

Downloaded From

Paksociety.com



کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تاریکی اور.....
صبح کو پھٹنے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پر راحہ
کے دروازے پر کھڑا دروازے کو اپنی انگشت شہادت کی انگلی
پورے آہستہ سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ راحہ کی نیند بڑی چوکنی تھی۔
”کون؟“ راحہ نے پوچھا۔

”میں ہوں بھابی۔“
راحہ نے دروازہ کھول دیا۔ ”خیریت تو ہے؟“
”وہ..... بھابی..... وہ.....“ زبان اس کا ساتھ دے
رہی تھی نہ الفاظ ”بھابی..... وہ.....“
”بول بھی چکو عاقب..... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“
”وہ..... ماہ نور..... رات وہ..... ہماری طرف آگئی تھی۔“
”ہا! راحہ کا منہ کھلا اور اس کا ہاتھ میکا ٹکلی طور پر
منہ تک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاقب کو دیکھتے ہوئے
اس نے پوچھا۔ ”پھر گئی کیسے؟“
”گئی نہیں..... اوپر کمرے میں ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ راحہ کو جیسے چکر ہی تو آنے لگا
تھا۔ ”رات بھر تمہارے کمرے میں رہی؟“ اس نے دہی
دہی آواز میں پوچھا۔
عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی
نظریں فرش سے جا لگیں وہ مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا
تھا..... جرم تو سرزد ہو چکا تھا..... بلکہ گناہ!
ایک راحہ کا نپٹنے لگی اور اس کے دانت بچنے لگے۔
”صبح..... ہونے..... والی ہے..... اسے..... جلدی.....
واپس..... بھیجو۔“ راحہ نے مسلسل بچتے دانتوں کی
کھٹکھٹاہٹ میں کہا۔

”وہ واپس جانے کو تیار نہیں۔“ عاقب نے کہا۔
اپنے لرزتے وجود کے ساتھ راحہ نے گھر کے لاؤنج
سے اوپر جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں
سے خود بھی ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس متحیرنے
حقیقی زندگی میں اس کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اس کے گمان
میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

دونوں گھر حقیقی طرف سے تقریباً چھ فٹ بلند ایک
مشترکہ دیوار سے ملے ہوئے تھے۔ یہ دیوار عاقب کے
والد محمد عارف نے جنہیں اب مرحوم و مغفور ہوئے بھی سات
آٹھ برس بیت چکے تھے اپنی عملی زندگی کے ابتدائی برسوں

میں سرکاری نرخ پر خریدے جانے والے پانچ سو مربع گز
کے پلاٹ کی احاطہ دیوار تعمیر کراتے ہوئے کھڑی کرائی
تھی۔ اچھا وقت تھا جو انہیں یہ پلاٹ مل گیا تھا ورنہ چند
برسوں بعد تو وہ اس علاقے میں پانچ سو مربع گز تو کجا اتنی گز کا
پلاٹ خریدنے کی بھی نہ سوچ پاتے۔ زمین کی قیمتیں نہایت
تیزی سے بڑھی تھیں۔ بھلا ہو بینک کی نوکری کا جس نے
انہیں قرضہ لے کر اس پلاٹ پر مکان تعمیر کروانے کا حوصلہ
بھی دیا۔

محمد عارف اپنے دور طالب علمی میں رہے تو تھے
محاشیات کے طالب علم اور حصول تعلیم کے بعد بنے پیشہ ور
بینکار مگر طبعاً وہ نہایت آرٹسٹک آدمی تھے۔ سو مکان تعمیر
کرواتے ہوئے انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ
ان کا تعمیر کرایا ہوا مکان فقط درود دیوار کا ڈھانچا نہ دکھائی
دے بلکہ اس میں زندگی بھی متحرک ہو۔ یہی خواہوں کا مشورہ
تھا کہ وہ اپنے مکان کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ مکانیت کا
عنصر مد نظر رکھیں مگر محمد عارف نے سنی سب کی کیا وہ جوان کا
جی چاہا۔ انہوں نے گھر کی تعمیر میں وسعت مکانیت سے
زیادہ دلکشی کو مقدم رکھا۔ کمرے بڑے نہ بنائے لیکن
عمارت کے تین اطراف کشادہ لان اور کیماریوں کا اہتمام
کیا۔ گھر میں کارپورج ضروری نہ ہوتا تو وہ چوٹھی جانب بھی
پھول اور سبزہ بچھوا دیتے۔ گھر کے ہر کمرے میں انہوں نے
بڑی بڑی کھڑکیاں رکھوائیں جن سے سبزہ دکھائی دیتا اور
رنگ برنگ موکی پھول اپنی چھب دکھاتے۔ عارف صاحب
کے گھر جو آتا ان کے مکان کی تعمیر و بناوٹ اور گھر کے ہر
حصے سے سبزہ دکھائی دینے کی تعریف کیے بناتے رہتا۔

محمد عارف نہ تو جدی پشتی امیر آدمی تھے نہ ہی کوئی
اعلیٰ منصب دار۔ اچھی شہرت کے حامل ایک مالیاتی ادارے
میں گریڈون افسر تھے۔ کچھ اپنی جمع پونجی اور کچھ ادارے
سے قرض لے کر انہوں نے بچوں کے لیے اپنی حیثیت سے
بڑھ کر ٹھکانا بنوا لیا تھا۔ کوئی اچھا وقت تھا کہ انہوں نے
پلاٹ خرید کر ڈال دیا تھا ورنہ بعد میں تو وہ اتنا بڑا پلاٹ
خریدنے اور اس پر اپنے بچوں کے لیے اتنا عمدہ مکان تعمیر
کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتے۔ ان کے تین بیٹے تھے
عاقب، عاطف اور عاقب۔ تینوں کے لیے ان کی آنکھوں
میں سنہری خواب سجے تھے۔

محمد عارف کا اپنا بچپن، نوجوانی اور پھر عملی زندگی کے
دو عشرے بہت معمولی مکانوں میں گزرے تھے۔ بچپن اور

بچے ہمارے عہد کے

یہ کہانی کسی انسان کے بچے کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک بھیڑ کے بچے کی ہے اور بھیڑ کا یہ بچہ آج کے عہد کا ہے۔ جنگل میں بھیڑ کا ایک بچہ نالے سے پانی پی رہا تھا کہ ایک شیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ بھیڑ کے بچے کو دیکھ کر شیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ وہ کئی دن سے بھوکا تھا وہ آہستہ آہستہ بھیڑ کے بچے کی طرف بڑھنے لگا۔ بچے نے شیر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے شیر سے کہا۔ ”آپ بے شک مجھے کھا جائیں۔ کیونکہ میں اپنی زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔“

”زندگی سے تنگ کیوں آگئے ہو.....؟“

شیر نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”جناب میری ماں اتنی ہی ظالم ہے۔ جتنی موٹی تازی ہے۔ وہ ہر وقت مجھے مارتی رہتی ہے اور وقت بے وقت مجھے حکم دیتی رہتی ہے، اب یہی دیکھ لیں کہ یہ وقت میرے ناشتے کا ہے اور اس نے مجھے یہ حکم دے کر بھیجا ہے کہ جاؤ دیکھ کر آؤ۔ نالے میں پانی ہے یا نہیں۔“ بھیڑ کے بچے نے کن انکھوں سے شیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا تم فوراً جا کر اسے بھیج سکتے ہو۔ لیکن میرا نہ بتانا اور یہ بھی کہنا کہ نالے میں پانی بہت ہے۔“ شیر نے کہا۔

”کیوں نہیں؟ ابھی بھیجتا ہوں۔ اس طرح

اس ظالم سے میرا چھٹکارا ہو جائے گا۔“

بھیڑ کا بچہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ شام تک نہ تو اس کی ماں آئی اور نہ وہ خود۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ثاقب کا اپنے ایک دوست کی بیٹی راحمہ سے بچھلے عاطف کا اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی رخشندہ سے اور عاقب کا اپنی بہن کی بیٹی نسرین سے۔ یہ بھی خدا کا بندوبست ہی تھا۔ ایک ثاقب تو ضرور اپنے پیروں پر کھڑا تھا باقی دونوں تو ابھی پڑھ ہی رہے تھے۔

ثاقب نے لی کام کیا تھا۔ اس کا نتیجہ نکلتے ہی محمد عارف نے اسے بھاگ دوڑ کر کے ایک بینک میں بھرتی کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے ملازمتیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لہذا موقع ملتے ہی بچوں کو ان کے پیروں پر کھڑا

لو جوانی ساٹھ مربع گز پر دو کمروں کے ایک مکان میں جہاں آٹھ نفوس کا بڑی مشکل سے گزارہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کو وہ کبھی گھر کے اندر بلا کو نہیں بٹھا سکے۔ گھر کے باہر کھڑے کھڑے ہی بات چیت ہوتی اور وہیں سے رخصت کر دیتے۔ بہت ہوا تو کالج کے گلاس میں پانی۔ شادی کے بعد وہ دو ڈھائی برس تو گھر والوں کے ساتھ اسی مکان میں رہے لیکن جب گزارہ بہت مشکل ہو گیا تو پھر وہ بیوی اور بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ کرائے کے مکان میں کوئی اٹھارہ برس رہے، اسی دوران پلاٹ کی خریداری عمل میں آئی اور پلاٹ کا قبضہ ملتے ہی انہوں نے محکمے سے قرض لینے کی درخواست دے دی اور اپنی جمع پونجی سے مکان کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ ایک آرام وہ اور باعزت گھرانہ کی دیرینہ خواہش تھی۔ خود انہیں تو اپنے باپ کی طرف سے اچھا گھر نہیں مل سکا تھا لیکن اپنی آرزوئے دیرینہ کی تسکینی دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بچوں کے لیے ایک عمدہ مکان بنوا دیا تھا۔ جو دیکھنے میں بھلا اور رہنے میں آرام دہ اور مہر سکون تھا۔ مکان کی زیریں منزل پر ڈرائنگ، ڈائننگ تھا۔ ٹی وی لاونج تھا۔ کچن اور تین بیڈرومز مع اٹیچڈ باتھ۔ مکان کی بالائی منزل پر انہوں نے ایک کمر مع اٹیچڈ باتھ تعمیر کرایا تھا، بطور خاص اپنے لیے۔ اس کمرے میں انہوں نے چار اطراف کھڑکیاں کھلوائی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے وہ دور تک نظارہ کر سکتے تھے۔ ان کی اہلیہ کو زیریں منزل پر رہنا زیادہ پسند تھا۔ سب کچھ نیچے ہی تو تھا۔ لاونج، کچن، بچوں کے کمرے، کارپورج، لان مگر مشکل یہ تھی کہ نیچے تینوں بیڈرومز پر تینوں بیٹوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ انہیں مجبوراً اوپر ہی آنا پڑتا کہ میاں جو اوپر رہتے تھے، اس مکان میں شفٹ ہونے کے بعد وہ برس بھر ہی جی پاکیں۔ ایک روز تیز بخار چڑھا جو سینل کے ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہی نہ ہو کر دیا۔ پانچویں چھٹے دن اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اسپتال جا کر دو دن اور زندہ رہیں۔ تاک، منہ سے خون جاری ہو گیا۔ تشخیص جاری تھی کہ چل بسیں۔ گھرویران ہو گیا۔ اہلیہ کی موت محمد عارف کے لیے صدمہ تو تھی ہی وہ تنہا بھی رہ گئے۔ بیٹوں سے ہر بات تو نہیں کہی سنی جاسکتی تھی۔ دل کا روگ محمد عارف کا خاندانی روگ تھا۔ ایک روز دورہ قلب سے دو چار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ گھر اور بھی ویران ہو گیا لیکن جانے سے پہلے وہ بیٹوں کے رشتے طے کر گئے تھے، بڑے بیٹے

کر دینا چاہیے۔ ثاقب ذہین تھا۔ اسکول سے کالج تک اس نے ہمیشہ اچھی تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بی کام میں فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ عمر تقریباً بیس برس کے لگ بھگ۔ محمد عارف کے ایک کولیگ کے قریبی رشتے دار ایک معروف بینک میں اے وی بی لگے ہوئے تھے، ان سے کہہ سن کر محمد عارف نے ثاقب کو نوکری پر لگوا دیا۔ ارادہ تھا کہ جلد ہی اس کی شادی بھی کر دیں گے۔ گھر میں ویسے بھی ایک خاتون کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر ان کی زندگی نے وفانہ کی۔

باپ کی موت کے وقت عاطف انجینئرنگ یونیورسٹی میں سال اول کا طالب علم تھا اور عاقب اسکول میں نویں جماعت میں زیر تعلیم..... چھوٹا ہونے کی وجہ سے عاقب دونوں بھائیوں کا لاڈلا تھا۔ البتہ ثاقب اور عاطف میں وہ ذہنی ہم آہنگی اور پیار نہیں تھا جو بھائی ہونے کے ناتے ان میں آپس میں ہونا چاہیے تھا۔ ثاقب مزاجاً قدرے خود غرض جبکہ عاطف جیسے کوتیسرا۔ مزاج کا بھی اختلاف ان کی دوری کا سبب تھا۔ دونوں کی بالکل نہ بنتی۔ باپ کی موت بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہ کر سکی تاہم عاقب سے دونوں ہی محبت کرتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد عاقب سے دونوں ہی پوری شفقت کا رویہ رکھتے۔ اس کی کوئی خواہش کوئی فرمائش رد نہ کی جاتی۔ عاطف کو ثاقب پانچ روپے دینے کا بھی روادار نہ تھا جبکہ عاقب کے لیے اس کے پاس اس کی کسی ضرورت کے معاملے میں انکار کی گنجائش نہ تھی۔ باپ کی موت کے بعد عاطف کو خود کفیل ہونے کے لیے ٹیوشن کا سہارا لینا پڑا۔ یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد وہ تین چار گھروں میں بچوں کو ٹیوشن دینے جاتا اور یوں اسے اپنی ضرورتوں کے لیے ثاقب کا دست نگر نہیں بنتا پڑا تھا بلکہ بچوں کو پڑھانے سے اسے اتنی آمدن ہو جاتی کہ وہ عاقب کو بھی کچھ دینے دلانے کے لائق ہو گیا تھا۔

گھر میں ایک خاتون کی کمی کا احساس تو عارف صاحب کی زندگی کے آخری برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ وہ گئے تو یہ احساس دو چند ہو گیا۔ اس پر طرہ ثاقب اور عاطف کے درمیان اختلاف مزاج... کوئی ناگزیر بات ہوتی تو عاقب ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتا۔ کبھی وہ ثاقب کو پیغام رسانی کرتا بھی عاطف کو ثاقب کا سندیہ پہنچاتا۔ عاقب کو اپنی اس اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

ثاقب اپنے پیروں پر تو کھڑا ہی تھا۔ گھر میں عورت کی کمی کا غلا پڑ کرنے کے لیے اس نے شادی کا ارادہ کر لیا، لڑکی ڈھونڈنی نہیں تھی۔ رشتہ مرحوم و مغفور والد اپنی زندگی میں طے

کر گئے تھے۔ لڑکی والوں کو معلوم تھا لڑکا خود مختار ہے، باصلاحیت ہے۔ آگے بڑھنے کی دھن رکھتا ہے۔ گھر میں ساس بھی نہ نند گھر جانے والی کا اپنا ہی راج ہوتا تھا۔ سو جیسے ہی ثاقب نے شادی کا ارادہ کیا لڑکی والوں نے تیاری پکڑ لی۔ ثاقب سے کہہ دیا تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں جو ہماری بیٹی کے مقدر میں ہوگا وہ اسے تمہارے گھر جانے کے بعد مل جائے گا۔ لڑکی والوں کی تو واہ واہ ہو گئی۔ ثاقب نے طلائی زیورات کا ایک سیٹ خریدا۔ بارہ تیرہ ریشمی لباس۔ دلہن کے لیے دو جوڑے جوتے اور ایک ہینڈ بیگ۔ اور ساتھ ہی ایک دینی بکس۔ معمولی خرچے پر دلہن گھر آ گئی۔ دلیمہ کی دعوت البتہ کافی خرچہ کرائی۔ بہر حال گھر میں عورت کی آواز اور اس کی ہنسی کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ ثاقب کے کمرے میں بہار سی آ گئی۔ گھر میں زندگی کا احساس ہوتا۔ ثاقب کی دلہن عاطف کا بھی اتنا ہی خیال رکھتی جتنا عاقب کا۔ عاطف کو ٹیوشن سے جو آمدن ہوتی اس کا ایک حصہ وہ بھابی کو بھی دے دیتا۔ شروع میں تو وہ بہت حیران ہوئی لیکن پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ پیسے وہ اسے گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے دیا کرتا تھا۔ ثاقب کی دلہن راحمہ کے آجانے سے گھر، گھر لگنے لگا تھا۔ گھر میں کام کاج میں راحمہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ثاقب نے ایک ملازمہ رکھ دی تھی جو صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آتی اور سہ پہر کو تین چار بجے کے لگ بھگ واپس چلی جاتی۔ راحمہ کے آنے سے ثاقب ہی نہیں عاطف اور عاقب بھی گھر میں ایک خوشگوار تہذیبی محسوس کر رہے تھے۔ گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرہ بند کر دیا گیا تھا۔ گھر میں چار افراد تھے۔ سب کی اپنی اپنی خواب گاہ تھی۔ بالائی منزل پر واقع کمرہ اب جھاڑیوں کے لیے ہی کھولا جاتا۔

راحمہ بھی بہت خوش تھی۔ تین مردوں والے گھر میں اسے اپنا وجود انتہائی اہم محسوس ہوتا۔ ثاقب کی تو وہ خیر شریک زندگی ہی تھی۔ عاطف اور عاقب بھی گھر میں ہوتے تو اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے۔ نصیبوں والی تو وہ واقعی تھی۔

☆☆☆

شادی کے دوسرے برس بیٹے کی پیدائش نے نہ صرف ثاقب اور راحمہ کے رشتے کو نئے معنی دیے بلکہ گھر میں بھی نئے رنگ بکھیر دیے۔ عاطف اور عاقب ننھے عاشر کو گود میں اٹھائے پھرتے۔ راحمہ بچے کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دن بھر مصروف رہتی۔ ثاقب دفتر سے گھر آنے کے بعد

سے کرنی چاہیے اور یہ تو ڈیڈی کا فیصلہ ہے۔۔۔۔۔ میں اس فیصلے کا احترام کروں گا۔۔۔۔۔ آخر بھائی نے بھی تو آپ سے اسی لیے شادی کی کہ ڈیڈی کا فیصلہ تھا۔ ورنہ بھائی کی پرستاشی تو آپ جانتی ہی ہیں کتنی ڈشنگ تھی بلکہ ہے۔“

راحہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا وہ اسے یہ جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے جوڑ کی نہ تھی اور اگر اس کے مرحوم باپ کا انتخاب نہ ہوتی تو اس کے بھائی کو اس سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔

عاطف کی شادی کے لیے ثاقب کو بڑا بھائی ہونے کے ناتے چچا سے صرف یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ وہ عاطف کے لیے باپ کے طے کردہ رشتے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے عاطف کے مشورے سے شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور اگلی بار جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو رخشندہ اس کی شریک حیات بن کر اس گھر میں آ گئی۔

گھر میں اب ایک نہیں دو عورتیں تھیں۔ گھر کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا۔ راحہ کو اس کی شادی پر ملنے والے جہیز کا سامان ہی بہت تھا اب جو رخشندہ کا جہیز آیا تو چیزیں رکھنے کے لیے جگہ کم پڑنے لگی۔ عاقب نے اپنا کمر خالی کیا اور گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرے میں شفٹ ہو گیا۔

عاطف شادی کے بعد ایک دو مرتبہ چھٹی پر گھر آیا پھر اس نے ابو ظہبی میں ہی ایک اسٹوڈیو قلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اسے چھٹی ملتی تو وہ خود پاکستان آنے کے بجائے رخشندہ کو ابو ظہبی بلا لیتا۔ دونوں مکمل پرائیویسی کے ساتھ گھر میں رہتے۔ نہ رخشندہ کو گھر میں اور لوگوں کی موجودگی کے خیال سے حجاب ہوتا نہ عاطف کو محتاط رہنا پڑتا۔ جب جی چاہتا دونوں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل جاتے۔ جتنی دیر چاہتے لمبی تان کر سوئے رہتے۔ نہ کسی کے کچھ کہنے سننے کی فکر نہ کسی کے اعتراض کا خدشہ۔ روز و شب ان کے اپنے ہوتے زندگی اپنی ہوتی۔ رخشندہ تو راحہ سے بھی بڑھ کر قسمت کی دھنی تھی۔ اس کا ایک پاؤں پاکستان میں تو دوسرا ابو ظہبی میں ہوتا بھی جب عاطف کو وطن اور عزیز واقارب کی یاد ستانے لگتی تو وہ خود بھی چند دنوں کو پاکستان آ جاتا اور رخشندہ کو ساتھ لے کر یا اسے واپس چھوڑ کر ابو ظہبی چلا جاتا۔ آمدن اور مراعات ملازمت کے اعتبار سے وہ بڑے بھائی سے کہیں زیادہ خوش حال تھا۔ راحہ جو اپنے مقدر پر نازاں رہا کرتی تھی اب رخشندہ کی خوش قسمتی پر رشک کرتی۔ دیکھی چیزوں کو تو وہ اب کم ہی لائق اعتنا سمجھتی

عاشر سے کھیننے کے لیے اپنی باری کا منتظر رہتا۔ عاطف اسے گود سے اتارتا تو عاقب اٹھالیتا۔ عاقب اتارتا تو عاطف۔ عاشر کے دم سے ثاقب اور عاطف کے درمیان رابطے کا فقدان بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ عاشر کے بھانے وہ ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے لگے تھے۔ گھر کا ماحول خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

انجینئرنگ یونیورسٹی میں اپنے آخری سیمسٹر کے دوران ہی عاطف نے ملازمت کے لیے کوشش شروع کر دی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ایک آئل ریفائنری میں ملازمت مل گئی۔ برس بھر وہاں کام کیا پھر ابو ظہبی میں زیادہ بہتر ملازمت مل جانے پر بیرون ملک چلا گیا۔ بیرون ملک ملازمت دلکش مراعات کا پیکیج تھی۔ عمدہ مشاہرہ، مفت رہائش اور طبی سہولیات، جتنے دن کام اتنے دن چھٹی مع تنخواہ اور چھٹی وطن میں گزارنے کے لیے مفت فضائی آمد و رفت ٹکٹ۔ ثاقب اور عاطف کے درمیان فاصلہ مزید سمٹ گیا۔ ان کے باہمی تعلقات میں سرد مہری کی جگہ گرمجوش آ گئی تھی۔ عاطف چھٹی پر ابو ظہبی سے پاکستان آتا تو بھائیوں، بھانجے اور بھینجے کے لیے بہت سے تحائف اور سوغاتیں لے کر آتا۔ گھر میں عاطف کی اہمیت خاصی بڑھ گئی تھی۔ راحہ کا جی چاہتا عاطف کی شادی اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی سے کروا دے مگر مشکل یہ تھی کہ مرحوم سسر جن کی وجہ سے وہ اس گھر میں راج کر رہی تھی، عاطف کا رشتہ اپنی زندگی ہی میں طے کر گئے تھے اور خود عاطف ہی نہیں ثاقب کو بھی مرحوم باپ کے فیصلوں کا پورا احترام تھا۔ عاقب تو ابھی زیر تعلیم تھا اس کی شادی کا معاملہ ہنوز ولی دور است والا معاملہ تھا تاہم عاطف اب خود کفیل تھا اس کی شادی میں کوئی قباحت نہ تھی۔ عاطف کو ٹٹولنے کے لیے راحہ نے اپنے ہی خاندان کی ایک دولڑکیوں کا دبی زبان سے تذکرہ کیا مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اس سلسلے میں مصلحت بھی گول مول بات کرنے کے بجائے اس پر واضح کر دیا کہ شادی کے لیے وہ اپنی چچا زاد رخشندہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے نہیں کہ اسے رخشندہ پسند تھی یا وہ اس سے محبت کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے مرحوم باپ کا انتخاب تھی۔

”تمہیں رخشندہ سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے عاطف۔“ راحہ نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

”ارے بھائی۔۔۔۔۔ اچھی کا کیا ہے۔۔۔۔۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے مگر شادی بندے کو بڑوں کی مرضی

تھی۔ اس کے کپڑے، جوتے، ونڈ بیگ، کاسٹیکس سب غیر ملکی ہوتا۔ جو پر فیومز وہ استعمال کرتی ان سے گھر مہلکا رہتا اور گھر میں رخشندہ کی موجودگی کا احساس حاوی رہتا۔ رخشندہ ابو ظہبی جاتی تو راحمہ کے لیے بھی تحائف لے کر آتی جنہیں راحمہ بہت دیکھ دیکھ کر استعمال کرتی۔ اس کا جی چاہتا تھا قب بھی کہیں باہر چلا جائے۔ اسے اور عاشق کو اپنے پاس بلائے اور وہ بھی رخشندہ کی طرح غیر ملکی چیزیں استعمال کرے اور اترائے۔ وہ اکثر مٹا قب کو بھی باہر جانے کی ترغیب دینے کی کوشش کرتی مگر مٹا قب اندھا دھند چھلانگ لگانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دیس میں بھی بہت سوں سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ قسمت میں اگر پردیس کی روزی نکلی تھی تو وہ بھی مل جانی تھی۔ کوشش کر لینے میں حرج نہیں تھا مگر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔

مستقبل کے لیے عاطف نے شہر کے ایک پوش رہائشی علاقے میں ایک لکڑی اپارٹمنٹ یک کرایا۔ باپ کا گھر ان تینوں بھائیوں ہی کے لیے تھا مگر آج نہیں تو کل ان سب کو اپنے بال بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ گھر کی ضرورت لازم تھی۔ نئی زمانہ شادی کے بعد اولاد اپنے والدین کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی وہ تو پھر بھائی تھے۔ فطندی اسی میں تھی کہ علیحدہ گھر بنانے کی داغ بیل ڈال دی جاتی سو اسی خیال کے تحت عاطف نے اپارٹمنٹ یک کرایا تھا۔ آج وہ اور رخشندہ دو تھے کل دو سے تین پھر چار بھی ہونے والے تھے انشا اللہ۔ راحمہ کی دعا میں رنگ لائیں۔ مٹا قب کو سعودی عرب کی ایک معروف کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی جاب مل گئی۔ پرکشش مشاہرہ کے ساتھ کچھ اور مراعات بھی پیکج کا حصہ تھیں۔ راحمہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ خوش تھی کہ رخشندہ کی طرح اب وہ بھی اپنے شوہر کے پاس سعودی عرب آ، جاسکے گی بلکہ خدا نے چاہا تو عمرہ اور حج کی سعادت بھی حاصل کرے گی۔ کیا عجب کہ مٹا قب جو ابھی تو کمپنی کی فراہم کردہ شیئرڈ اکاموڈیشن میں رہائش اختیار کرنے جا رہا تھا آنے والے دنوں میں فیملی کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکتا۔

مٹا قب کے سعودی عرب جانے کے بعد گھر میں عاقب واحد مرد رہ گیا۔ راحمہ کی اس سے گاڑھی چھنتے لگی۔ رخشندہ تو کبھی پاکستان میں ہوتی کبھی ابو ظہبی میں ہوتی۔ عاقب سے بطور دیور اس کی وہ نہیں بن سکی تھی جو عاقب کی اسی رشتہ میں راحمہ سے تھی۔

☆☆☆

ابو ظہبی میں عاطف کے سینئرز میں انصار حسین نے

اہل و عیال کو مستحلاً ابو ظہبی میں رکھا ہوا تھا۔ جس گھر میں انصار حسین کی فیملی کرایہ دار تھی اس کا ایک حصہ خالی ہوا تو عاطف نے اسٹوڈیو کلیٹ چھوڑ کر انصار حسین کے گھر میں خالی ہونے والا حصہ کرائے پر لے لیا اور رخشندہ کو مستقل طور پر ابو ظہبی بلا لیا۔ انصار حسین اور عاطف ایک ساتھ چھٹی پر آتے، اپنی اپنی چیمبل کے ساتھ چھٹی گزارتے اور چھٹی گزار کر ایک ساتھ فیلڈ پرواپس چلے جاتے۔ عاطف کے جانے کے بعد رخشندہ اطمینان سے انصار حسین کی بیوی بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس نئے بندوبست سے اسے بار بار پاکستان سے ابو ظہبی آنے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ رخشندہ کے ابو ظہبی چلے جانے کے بعد عاقب اور راحمہ کی اور زیادہ بے تکلفی ہو گئی تھی۔

سعودی عرب جانے کے دس ماہ بعد مٹا قب نے راحمہ اور عاشق کو عمرہ کرنے کے لیے دو ہفتوں کو سعودی عرب بلایا اور اس دوران میں ان کا قیام ہوٹل میں رکھا۔ انہیں اپنے ساتھ ٹھہرانے کی سہولت نہ تھی اسے۔

راحمہ اور عاشق کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کو گھر میں اکیلا ہی رہنا پڑا۔ وہ بی کام کر چکا تھا اور مٹا قب نے وطن سے دور ہونے کے باوجود اسے اپنے جاننے والوں سے کہہ سن کر اسی بینک میں ملازم کرا دیا تھا جہاں وہ خود بھی سعودی عرب جانے سے قبل ملازم رہا تھا۔

راحمہ اور عاشق کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کے لیے تنہا گھر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ والدین کی آخری اولاد اور نو عمری ہی میں ماں کی محبت سے محرومی کے بعد باپ اور بڑے بھائیوں کا لاڈلا ہونے کے ناتے اس کا زندگی کی سختیوں اور تنگی سے سابقہ نہ ہونے کے برابر رہا تھا۔ مٹا قب اور عاطف تو اس کی اوائل عمر میں اسے پیار سے اپنی ”بہنا“ کہا کرتے تھے۔ وہ شرمیلا اور ڈرپوک قسم کا تھا۔ گھر سے بلا ضرورت کم ہی باہر نکلتا۔ عاطف کی شادی کے بعد گھر میں سامان کے لیے جگہ تنگ ہو جانے پر وہ گھر کی بالائی منزل پر واقع اکلوتے کمرے میں شفٹ ہو گیا تھا مگر شام ہوتے ہی وہ اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے بند کر لیتا۔ رات کو سونے سے قبل بالحقہ غسل خانہ میں اور بیڈ کے نیچے جھانک کر کمرے میں کسی اور کے نہ ہونے کا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی بستر پر جاتا۔ اسے چور، ڈاکو، جن، بھوت، کتا، مٹی سب سے خوف آتا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ماں کے انتقال کے بعد باپ اور بھائیوں نے اسے ”پپرڈ“ بنا کر رکھا تھا۔ راحمہ تو اسے بھی بھی لاڈ سے

”مناپٹا“ کہا کرتی تھی۔ دورانِ تعلیم اور ملازمت کے بعد بھی عاقب کا معمول رہا تھا، گھر سے سیدھا وہاں جاتا جہاں جانا ہوتا اور وہاں سے سیدھا گھر واپس آتا۔ اپنی عمر کے عام نوجوانوں کی طرح اسے بلا ضرورت باہر گھومنے پھرنے کی ذرا عادت نہیں تھی۔ مزاجاً وہ بڑے بھائیوں کا آمیزہ تھا۔ عاقب کی طرح خود بین اور خود غرض اور عطف کی طرح ذہین اور متکبر۔

راحہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کے دفتر سے سیدھا گھر واپس آنے کے معمول میں تو تبدیلی نہ آئی تاہم اکیلے گھر میں اسے وحشت سی ہوتی، راحہ جانے سے قبل اس کے لیے بہت سا کھانا پکا کر فریج میں رکھ گئی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ حسبِ خواہش چائے یا کھانے سے فارغ ہو کر اوپر اپنے کمرے میں آ جاتا۔ کھڑکیاں، دروازے بند کرتا اور بستر پر پڑ جاتا۔ اس کی نیند نو دس گھنٹے سے کسی صورت کم نہ ہوتی۔ صبح اٹھتا تو نہایت تازہ دم ہوتا۔

سعودی عرب جانے کے بعد راحہ اس سے روزانہ فون پر بات کرتی۔ عاشر سے بھی اس کی بات کراتی۔ عاقب بھی اس کا حال چال پوچھتا اور اسے اطمینان دلاتا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ راحہ اور عاشر جلد ہی پھر اس کے ساتھ ہوں گے۔

”بھائی! مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔“ راحہ کو سعودی عرب گئے دوسرا یا تیسرا دن تھا جب عاقب نے عاقب سے یہ بات کہی۔

عاقب ہنس دیا پھر بولا۔ ”یار! چھ فٹ کے جوان آدمی ہو کر ڈرتے ہو۔“

”گھر جو اکیلا ہے۔“ عاقب نے جھینپ کر کہا۔

”گھر اکیلا نہیں..... گھر میں تو تم ہو..... اصل میں تم اکیلے ہو۔“ عاقب بولا۔

”ہاں..... یہی سمجھ لیں۔“

”فکر مت کرو..... کچھ عرصے کی بات اور ہے..... ہم تمہیں دو کیلا بھی کر دیں گے۔“ عاقب کے لہجے میں شوخی آمیز معنی خیزی تھی۔ ”بھائی کی جان بہادر بنو..... شادی کے بعد بھی اگر تم یونہی ڈرتے رہے تو نسرین کیا سوچے گی..... مرد بنو یا مرد۔“

عاقب کو شرم سی آگئی۔ واقعی وہ بہت ڈر پوک تھا، اسے مرد کی طرح نڈر بننے کی ضرورت تھی۔

ہوٹل کے کمرے میں عاقب کے پہلو میں بیٹھی اور اسپیکر آن ہونے کے باعث دونوں بھائیوں کی گفتگو براہ

راست سنی راحہ نے نسرین کے ذکر پر آہستگی سے پہلو بدلا۔ عطف کے مزاج کی وجہ سے وہ رخشندہ کا اپنی دیورانی بنتا تو جبراً قہراً برداشت کر گئی تھی، نسرین کو وہ کسی قیمت پر اس گھر میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھی جہاں اس کی حکمرانی تھی۔ عاقب سے شادی کے بعد وہ اپنے تمام سرسالی گھرانوں میں آ، جا کر دیکھ چکی تھی کہ سب کے سب نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ ایک اس کے سر اور ان کے تینوں بیٹے ہی تھے جو پڑھ لکھ کر اتنے خوشحال اور مستحکم ہو گئے تھے ورنہ باقی سب تو معمولی پڑھے لکھے اور چھوٹی چھوٹی ملازمتوں یا کاروبار سے وابستہ تھے۔ رخشندہ ایف اے تھی اور اسی پر اتراتی تھی۔ نسرین میٹرک آرٹس گروپ میں کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ ہانڈی روٹی کر کے دوپہر کو سلائی کڑھائی کے اسکول چلی جاتی اور اسی پر اس کی چائلہ اماں جان یوں فاجر ہوتیں جیسے صاحبزادی سلائی کڑھائی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ عاقب کو نسرین اور اس کے گھر والوں سے متنفر کرنے کے لیے راحہ گلہ بیگا ہے اس کے سامنے ان کی برائیاں کرتی رہتی یا بھانے بھانے سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتی۔ ابھی اسے نسرین کی شین قاف پر اعتراض ہوتا بھی اس کی ڈریسنگ میں کیڑے نکالتی۔

”مناپٹا سچ پوچھو تو نسرین اور اس کے گھر والے کہیں سے بھی تمہارے جوڑے نہیں۔“ وہ عاقب سے کہتی۔

”کیا بتاؤ گے تم اپنے بینک کے ساتھیوں کو کہ تمہارے سر ویلڈنگ کا کام کرتے ہیں۔“ وہ اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتی۔

”اور وہ تمہارا ہونے والا ہم زلف..... گوالا لگتا ہے شکل اور جسم کے بھدے پن سے۔“

عاقب کا چہرہ شرم سے تھمتانے لگتا۔

”انکل کو چاہیے تھا جوڑ دیکھ کر فیصلہ کرتے۔“ راحہ

کن انکھیوں سے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہتی۔

”بس بھابی ڈیڈی نے یہ سوچا ہوگا کہ اپنے ہیں۔“

عاقب کہتا۔

”ارے بھئی اپنے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ محفل

میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے۔“ راحہ بڑکالگاتی۔

عاقب شرمندہ سا ہو جاتا۔

”بس ایک تمہارے بڑے بھائی کے لیے انکل اچھا

فیصلہ کر گئے۔ ورنہ رخشندہ کون سی کوئی دودھ کی دھلی آگئی

تھی..... سب کچھ ہمارے گھر آ کر ہی سیکھا۔ ہائی ہیل پر لنگڑا

لنگڑا کر چلتی تھی۔ اسے میک اپ کرنا میں نے سکھایا۔ اب

بیگم صاحبہم ہی کو سبق پڑھاتی ہیں..... برانڈ سے کم بات ہی نہیں کرتی... ہماری فیملی میں دیکھو کیسے سلجھے ہوئے نفیس لوگ ہیں... ایک سے بڑھ کر ایک... اسی لیے لڑکیوں کے پڑھتے پڑھتے ہی ان کے رشتے طے ہو جاتے ہیں... بڑی آپا کی بیٹی ماہم کے لیے انجینئر کا رشتہ آیا ہوا تھا مگر وہ کہتی ہیں جانے بوجھے لوگوں میں رشتہ دیں گی... بھائی کی چھوٹی بیٹی فائزہ تو اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا عاشر اگر بڑا ہوتا تو میں اسے کسی اور گھر نہ جانے دیتی۔“

عاقب نہایت سعادت مندی سے سنے جاتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا تھا کہ راحمہ کا خاندان نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور معاشی و معاشرتی ہر اعتبار سے ایک مستحکم خاندان تھا۔ راحمہ کے خاندان کی لڑکیاں خوب رو، تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور روشن خیال تھیں اور اچھے اچھے گھرانوں میں بیاہی جا رہی تھیں۔ عاقب اس کے خاندان والوں سے مل کر ہمیشہ متاثر و مرعوب ہوتا۔ راحمہ کی خواہش تھی کہ عاقب کی شادی نسرین سے نہیں اس کے اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے ہوتا کہ ایک گھر میں اسی کے خاندان کی دو بہویں ہونے کی وجہ سے رخشندہ کے مقابلے میں اس کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

☆☆☆

تہائی بہت بڑا دکھ ہے۔ راحمہ کو سعودی عرب گئے دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر اس کی وطن واپسی تھی۔ عاقب اس روز بھی دفتر سے گھر واپس آنے کے بعد حسب معمول پیٹ پوجا کر کے اوپر آ گیا تھا۔ موبائل فون سے لگا ایئر فون کانوں میں اڑ سے وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نظر غیر شعوری طور پر گھر کے پچھواڑے مکان کی چھت کی جانب اٹھی جہاں ایک نوجوان لڑکی کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ لڑکی مسکرا دی۔ اس کا چونکنا یقینی تھا۔

گھر کے پچھواڑے اس مکان میں جاوید اختر زمان رہا کرتے تھے۔ مانسہرہ سے تعلق تھا۔ کاروباری آدمی تھے۔ نہایت چھوٹی سی فیملی تھی جاوید اختر زمان، ان کی اہلیہ اور جاوید صاحب کے معمر والد۔ جاوید صاحب کا برقی آلات کا کاروبار تھا۔ شہر کے وسط میں مصروف کاروباری مرکز میں ان کا شوروم تھا۔ خوشحال آدمی تھے۔ ان کے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بعض کئی کئی دن ان کے ہاں قیام بھی کرتے۔ عاقب اور دونوں بڑے بھائیوں کی جاوید اختر، ان کی اہلیہ اور والد سے رسمی سلام دعا رہا کرتی

تھی۔ راحمہ اور رخشندہ سے بھی ان کی اہلیہ کی عینک ملیک تھی۔ جاوید صاحب کا گھرانہ مذہبی گھرانہ تھا۔ جاوید صاحب اور ان کے بوڑھے والد اپنی ضعیفی کے باوجود باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے باقاعدگی سے محلہ کی مسجد آتے جاتے دکھائی دیتے۔ جاوید صاحب لا ولد تھے۔ ان کے دو بھائی اور ایک بہن مانسہرہ ہی میں مقیم تھے۔ تاہم جاوید صاحب کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ عارف صاحب مرحوم جاوید اختر زمان کے گھرانے کو اچھا پڑوسی کہا کرتے تھے۔ دونوں گھر پچھواڑے پر ایک مشترکہ دیوار سے ملے ہونے کے باوجود جاوید اختر کے گھر سے کبھی اونچی آواز نہ سنائی دیتی۔ آس پاس کے دیگر گھروں کی چھتوں پر تو بعض پر اکثر و بیشتر اور بغض پر گرمیوں کی شاموں میں خواتین اور لڑکیاں ہوا خوری کے لیے شہلٹی دکھائی دیتی تھیں لیکن جاوید اختر کے مکان کی چھت پر کبھی کوئی خاتون دکھائی نہ دیتی۔ مہمان بھی آتے تو گھر کے اندر ہی رہتے یا گھر کے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ان کی چھت پر ایک نوجوان لڑکی کا دکھائی دینا اور وہ بھی محویت سے اسی کو دیکھتے ہوئے عاقب کے لیے اچنبھے والی بات تھی اور اس پر مستزاد اس کے ہڑبڑانے پر لڑکی کا مسکرا دینا۔ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہونا بھول کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ شام سے رات تک اور رات کو سونے سے پہلے تک اسے اسی لڑکی کے خیال نے گھیرے رکھا۔ رات میں جتنی دفعہ آنکھ کھلی، کروٹ بدلی اسی کا خیال آیا۔ صبح جاگا تو پھر دھیان اسی طرف گیا۔ ”لڑکی“ عاقب کے لیے کوئی ان دیکھی، انجانی جنس نہ تھی۔ ہر جگہ لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ راحمہ کے ساتھ اس کے خاندان کی تقریبات میں جاتا تو ایک سے بڑھ کر ایک فیشن ایبل لڑکی دکھائی دیتی۔ مگر پڑوس کی چھت پر دکھائی دینے والی اس لڑکی سے پہلے کبھی کوئی لڑکی اسے دیکھ کر اس طرح نہ مسکرائی تھی۔

دفتر میں فرقان علی سے عاقب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ فرقان عمر میں اس سے بڑا اور عہدے میں سینئر تھا مگر عاقب سے دوستی رکھنے کے باعث عاقب کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ بلکہ برادرانہ تھا۔ عاقب نے پڑوس کی چھت پر لڑکی کے مسکرانے کا تذکرہ اس سے کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”خوش قسمت ہو بیٹے کہ لڑکی تمہیں دیکھ کر مسکرائی۔ ہمیں دیکھ کر تو آج تک کوئی لڑکی روئی بھی نہیں۔“

”آپ کو مذاق سو جہر رہا ہے فرقان بھائی۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔“ عاقب بولا۔

مہم ہمارے ملک مائیں کے رنگ
ہمارے دل فریب و خوشنارگوں سے جا اپریل 2016 کا سالگرہ بھر



نگہت سیما کا خوب صورت ناول اختتامی پڑاؤ کے ساتھ

انجم انصار، ڈارٹمن بلال و نایاب جیلانی کے قسط وار مسحور کن سلسلے

کھونے کھونے لمحے..... تابندہ نعیم کی بھرپور کاوش کا خوب صورت اختتام

رضوانہ پرنس، ثمینہ عظمت علی کی خوب صورت کہانیاں خاص آپ کی نذر

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور محترمہ اختر شجاعت کی ایمان افروز حکایتیں

وہ آئے بزم میں

شیریں حیدر کی شیریں بیاباں

عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب کی رونمائی کی پُر لطف تقریب کا احوال

اس کی عطا

نگہت اعظمی، شیریں حیدر، میمونہ صدف، ہاجرہ ریحان،

عقیلہ حق، ریحانہ زیدی و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین تحریریں.....

اس کے ہمراہ جدید تفریحی معلومات و دیگر خوش بیاباں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

”ایسا ہی ہوتا ہے بیٹے..... ایسی وارداتوں میں نیند اڑتی جاتی ہے۔“
 ”پلیز! مجھے مشورہ دیں۔“
 ”کیسا مشورہ؟“

”گھر میں اکیلا ہوں میں..... کیا بھابی کے آنے تک نیچے شفٹ کر جاؤں؟“
 ”نیچے شفٹ کرنے سے کیا ہوگا؟“
 ”وہ چھت پر آئی بھی تو میں اسے دکھائی نہیں دوں گا۔“
 ”بہادر بنو یا رکیا لڑکیوں کی طرح منہ بسور رہے ہو..... اب نظر آئے چھت پر تو اس سے فون نمبر مانگ لیتا..... بھابی کے آنے تک فون پر گپ شپ کرتے رہتا وقت اچھا گزر جائے گا۔“
 ”جوتے بھی پڑیں گے۔“
 ”کس سے؟“

”بھابی سے، ثاقب بھائی سے، عاطف بھائی سے اور اگر پھپھو کے گھر میں خبر ہو گئی تو ان سے بھی..... نسرین جس سے میری بات طے ہے انہی کی تو بیٹی ہے۔“
 ”چھوڑو یا رلوگ شادی کے بعد دوسری لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں تم بات طے ہونے کے خیال سے گھبرا رہے ہو۔“

”آپ بڑے تیز ہیں یا فرقان بھائی۔“
 ”اگر تم لڑکیوں کو تو لڑکی پھنسا کر دکھاؤ۔“ فرقان مسکرایا۔
 ”چیلنج کر رہے ہیں؟“
 ”یہی سمجھ لو۔“
 ”اوکے۔“

☆☆☆

راحہ اور عاشق کی وطن واپسی کا وقت نزدیک آرہا تھا۔ راحہ اداس تھی، ثاقب کو چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہ رہا تھا اس کا۔
 ”میں آپ کو پہلے سے بھی زیادہ مس کروں گی۔“
 راحہ نے ثاقب سے کہا۔
 ”مجھ سے پوچھو..... تمہارے ساتھ تو وہاں عاشق ہوگا عاقب ہوگا..... میں یہاں اکیلا ہوں گا۔“
 ”ہمیں اپنے ساتھ ہی رہنے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟“
 راحہ نے کہا۔

”دل تو بہت چاہتا ہے مگر..... وہاں بھی تو گھر ہے۔ اسے بھی اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا..... جس کا قبضہ وہی مالک..... میں تو سوچتا ہوں اتنی رقم اکٹھی کر لوں کسی طرح

کہ عاطف اور عاقب کو ان کا حصہ دے کر مکان صرف ہمارا ہو جائے..... پھر بے شک دونوں ہمارے ساتھ بھی رہیں یہ کھٹکا نہیں ہوگا کہ مکان میں حصے دار ہیں۔“

”بات تو بہت اچھی ہے۔“ راحہ نے گرجوٹی سے تائید کی۔ ”مگر کیا وہ دونوں راضی ہو جائیں گے؟“
 ”پیسے ملے گا تو کیوں راضی نہ ہوں گے..... اپنا حصہ لیں اور الگ گھر بنائیں..... سوچ رہا ہوں چھٹی پر پاکستان آؤں تو عاقب کی شادی بھی کر دی جائے..... سر پر بیوی بچوں کی ذمہ داری پڑے تو پھر انسان اپنا گھر بنانے کی بھی سوچتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ مگر.....“ راحہ بولتے بولتے رک گئی۔

”مگر؟“ ثاقب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”عاقب سے نسرین کا کوئی جوڑ نہیں۔“ راحہ نے دلی زبان سے کہا۔

”جوڑ ہو یا نہ ہو اپنے گھر کی لڑکی تو ہے..... باہر والیاں تو آکر تنگی کا تاج نچاتی ہیں۔“
 ”میں نے آپ کو کتنا نچایا بھلا!“ راحہ نے ثاقب کو ٹیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ثاقب لا جواب ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا پھر جھینپ کر بولا۔ ”تمہاری بات اور ہے۔“

”جی نہیں..... یہ کہیے اچھی بری لڑکیاں اپنے خاندان میں بھی ہو سکتی ہیں، غیر خاندان میں بھی..... ساری بات ماؤں کی تربیت کی ہوتی ہے..... ہمارے خاندان میں مائیں اپنی بیٹیوں کی تربیت اور گردننگ کا پورا خیال رکھتی ہیں۔“ راحہ کے لہجے میں فخر و عنوت کا احساس تھا۔

”پچھو بھی اچھی ماں ہیں۔“ ثاقب بولا۔
 ”مگر تعلیم یافتہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے.....“

ایک تعلیم یافتہ ماں کی بیٹی کی اپروچ ہی اور ہوتی ہے..... برا مت مانے گا..... نسرین کو آپ کی پچھو نے گھر داری ضرور سکھائی ہے مگر اس کے پہننے اوڑھنے اور بات چیت کرنے سے گنوار پن جھلکتا ہے۔“

ثاقب کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے خاندان کی عورتیں کیا مرد بھی اکثر تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ قریبی خاندانی رشتوں میں بس ایک اس کے والد ہی تھے جو تعلیم سے اپنی رغبت کے باعث خود بھی لکھ پڑھ گئے تھے اور تینوں بیٹیوں کو بھی حصول تعلیم کی جانب راغب رکھا تھا۔ ثاقب کے اپنے خاندان کے برعکس راحہ کا خاندان

”یہ فیصلہ ہے؟“

پڑھے لکھے لوگوں کا خاندان تھا۔ اس خاندان کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور روشن خیال تھیں۔

”نسرین تمہاری صحبت میں رہے گی تو بدل جائے گی۔“ ثاقب مسکرایا۔

”کیوں میرا کام یہی رہ گیا ہے کہ آپ کے خاندان کی جاہل لڑکیوں کو بدلتی رہوں۔ ایک وہ رخشندہ بیگم ہیں۔ شادی ہو کر ہمارے گھر آئیں تو ہائی ہیل سینڈلز پہنتیں تو لنگڑا کر چلتی تھیں۔ میک اپ انہیں کرنا نہ آتا تھا۔ بلش آن لگانے کی تمیز نہیں تھی۔ پورا چہرہ سرخ کر کے بیربھونی بن جاتی۔ پرفیوم کو پفیوم کہتی تھی آج بیگم صاحبہ کے خزانے ہی نہیں ملتے..... مجھے دیکھ دیکھ کر سب کچھ سیکھا اور اب جب کبھی آتی ہے تو مجھ ہی کو ٹپس بتاتی ہے..... ہماری لمبی ہم سے میاؤں..... آپ کے ڈیڑی کورشتے طے کرتے ہوئے دیکھ تو لینا چاہیے تھا کہ کہاں رشتے کر رہے ہیں۔“

”وہ رشتے طے نہ کرتے تو تم مجھے کہاں سے ملتیں۔“

ثاقب نے راحمہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”قسمت میں ہوتا تو مل ہی جاتی۔“ راحمہ نے توقف کیا پھر بولی۔ ”عاطف اور رخشندہ کا بھی جوڑ تو نہیں تھا مگر پھر کچھ گوارا لیکن..... عاقب اور نسرین کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں..... ابھی اتنی موٹی اور بے ٹکی ہے شادی کے بعد تو اور پھیل جائے گی۔“

”بھئی اب جو بھی ہو..... ڈیڑی کا فیصلہ تھا اور ان کے فیصلے کا احترام ضروری ہے۔“

”چاہے لڑکے کی زندگی برباد ہو جائے؟“ راحمہ نے دائیں ابرو چڑھا کر ثاقب کو دیکھا۔

”انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا..... نسرین جس ماحول میں رہے گی آہستہ آہستہ اس میں ڈھل جائے گی۔“

”میں تو کہتی ہوں اب بھی موقع ہے..... سوچ لیں..... نسرین کو آپ کے خاندان میں اسی کی طرح کا کوئی رشتہ مل جائے گا..... عاقب کے لیے اس کے جوڑ کی لڑکی دیکھیں..... عاقب منڈسم ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ بینک میں ملازم ہے۔ اس کا ایک اسٹینٹس ہے خود اپنی وجہ سے بھی اور آپ دونوں بڑے بھائیوں کی وجہ سے بھی..... اس کی شادی کسی اچھے خاندان کی خوش شکل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی سے ہونی چاہیے۔“

”نہیں راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے۔“ ثاقب نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میرا نہیں..... ڈیڑی کا..... اور ڈیڑی کا ہر فیصلہ ان کی زندگی میں بھی پتھر کی لکیر ہوا کرتا تھا..... ان کی موت کے بعد بھی پتھر کی لکیر ہی رہے گا..... اور ہاں دیکھو مجھ سے تو تم نے یہ بات کہہ دی..... عاطف، رخشندہ اور خاندان کے کسی اور فرد خاص طور پر عاقب کے سامنے یہ بات اپنے منہ سے نہ نکالنا ورنہ ہماری نیت پر بھی شک کیا جائے گا اور ہمیں مرے ہوئے باپ کے فیصلے سے روگردانی کا مجرم بھی ٹھہرایا جائے گا..... انسان کی زندگی میں ساری اہمیت زبان ہی کی ہوتی ہے..... پچھو بے چاری کب سے انتظار میں بیٹھی ہیں..... بس اب دیر نہیں کرنی..... چھٹی پر گھر آیا تو یہ کام نمٹا کر ہی واپس آؤں گا..... تم بھی پچھو کے کان میں یہ بات ڈال دینا..... میں بھی یہاں سے فون کر کے کہہ دوں گا..... ہماری امانت ہمیں سونپنے کی تیاری کریں۔“

راحمہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ ثاقب سے اتنی مغز ماری بے کار ثابت ہوئی تھی۔ عاقب کے لیے اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی کو بیاہ کر لانے کی خواہش ثاقب سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد حسرت کا روپ دھار گئی۔

☆☆☆

برسوں کا فاصلہ گویا دنوں میں طے ہو گیا تھا۔ پڑوس کے مکان کی چھت پر نظر آنے والی اس لڑکی سے عاقب کی لائن مل چکی تھی۔ دونوں کوررات کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ رات ہوتے ہی وہ موبائل فون پر راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے اور رات بھر یہ آنکھ مچولی چلتی رہتی۔

اس کا نام باہ نور تھا۔ جاوید اختر زمان کی بیوی کی سگی چھوٹی بہن کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ایک ٹریفک حادثے میں مر گیا تھا۔ اس وقت وہ صرف ڈھائی سال کی تھی اور والدین کی اکلوتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بھائی کے گھر میں رہتے ہوئے بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کی اور بیٹی ماہ نور کو پالا پوسا۔ ماہ نور اسکول کے آخری سال میں تھی کہ ماں بیمار پڑ گئی۔ کینسر تشخیص ہوا۔ بھائی علاج کے لیے لاہور بھی لے گیا مگر پتا چلا کینسر بہت پھیل چکا تھا۔ چند ہی ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ماں کے انتقال کے بعد ماہ نور کو اس کی خالہ اور خالو اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ دونوں لاولد تھے۔ ماہ نور کو انہوں نے اپنی بیٹی بنالیا اس کی خالہ اس کے آجانے سے بہت خوش تھی۔ ماہ نور میٹرک پاس کر چکی تھی۔ کراچی لے آنے کے بعد خالہ اور خالو اسے اپنے ہی علاقے کے ایک کالج میں

داخل کروانے کے لیے کاجوں میں داخلے کھلنے کے منتظر تھے لیکن اس بات سے بے خبر کہ جس جیم ویسیر بھانجی کو وہ بیٹی بنا کر اپنے گھر لائے تھے وہ تو پڑوس کے رہائشی نوجوان سے چند ہی دن میں بہت ٹھنکس بڑھا کر ان کی سوچ سے بھی آگے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”مجھے نہ کالج میں داخلے سے دلچسپی ہے نہ کہیں اور..... مجھے بس تم سے شادی کرنی ہے عاقب۔“ اس نے عاقب سے کہہ دیا تھا۔

ابھی تک دونوں میں فون پر ہی راز و نیاز چل رہے تھے۔ چھت پر دور دور سے ایک دوسرے کا دیدار بھی کر لیتے۔ ادھر ادھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس انہیں کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا بھی کبھار ہلکی سی اشارہ بازی بھی ہو جاتی۔ رہیں باتیں تو وہ رات بھر دونوں ہی دل کھول کر کرتے تھے۔ فون پر پیکیج کی سہولت نے دونوں ہی کا کام آسان کر رکھا تھا۔ سچی ویسے بھی دونوں میں سے کسی کو نہیں تھی۔ عاقب خود کفیل تھا۔ ماہ نور کو خالہ اور خالو کے گھر میں ہر قسم کی فراغت میسر تھی۔ جنک فوڈ خریدنے کے بہانے قریبی مارکیٹ جاتی اور وہاں سے موبائل فون کارڈ بھی خرید لاتی۔ ویسے تو عاقب نے بھی کہہ رکھا تھا بیلنس ختم ہو جائے تو وہ اس کے فون پر لوڈ کر اسکا ہے مگر کیا ضرورت تھی اسے۔

خوشحال خالہ اور خالو کی زیر سرپرستی آکر عاقب کا احسان لینے کی..... جتنے عیش و عشرت میں وہ آج کل تھی اس کا تو اس نے اپنی ماں کی زندگی میں ماموں کے گھر میں بھی خواب میں نہیں سوچا تھا۔ خالہ اور خالو نے اسے ماں کی پہلی جمعرات کے بعد ماموں کے گھر سے اپنے ساتھ کراچی لاتے ہوئے انہیں زبان دی تھی کہ وہ ماہ نور کو اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ وہ واقعی ایسا ہی کر رہے تھے۔ بیوی کی خوشنودی کی خاطر جاوید صاحب ماہ نور کو اپنے گھر میں بہت اہمیت دیتے اور جب باہر سے گھر آتے تو ماہ نور کو نہ دیکھنے پر ان کا اپنی اہلیہ سے پہلا سوال یہی ہوتا۔ ”ماہ نور بیٹی کہاں ہے؟“

ماہ نور کو خالہ کے گھر میں علیحدہ کمرہ، علیحدہ ٹی وی، کیبل اور موبائل فون کی سہولت میسر تھی۔ خالہ نے اسے بہت سے نئے کپڑے بھی بنا دیے تھے۔ وہ جب بازار جاتیں اس کا ساتھ جانا لازم ہوتا اور وہ اسے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور خرید دیتیں۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ فریج ہر وقت بھرا رہتا۔ خالو جو پھل اور میٹھا کھانے کے انتہائی شوقین تھے اتنے پھل اور میٹھی اشیاء خرید لاتے کہ گھر میں مہمانوں کی آمد پر ان کی خاطر تواضع کے لیے باہر سے کچھ

منگوانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ گھر کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں گاؤں سے آئی ہوئی ایک کل وقتی ملازمہ تھی اور دوسرا کراچی ہی کا ایک آدمی جو بوقت ضرورت ڈرائیوری بھی کرتا۔ خالہ نے ماہ نور کو گھر میں ہر وقت پہننے کے لیے سونے کے دو کنگن، لاکٹ، بالیاں اور دو انگلیٹھیاں بھی بنوا دی تھیں۔ ماہ نور کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماں کے بعد اسے اتنی چاہنے والی خالہ کی سرپرستی میسر آ جائے گی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے آجانے سے خالہ اور خالو کو بھی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے برسوں بعد ہی سہی وہ اچانک صاحب اولاد ہو گئے تھے۔

☆☆☆

راحہ کو وطن واپسی پر عاقب کی چوری پکڑنے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ ایک روز نیچے سے چھت پر آتے ہوئے اس نے ماہ نور کو اپنی چھت پر کھڑے اور اسے اور عاقب کو اشارے بازی کرتے رہنے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ماہ نور گھبرا کر منظر سے ہٹ گئی عاقب جھینپ کر کان کھجانے لگا۔

”یہ کیا ہو رہا تھا؟“ راحہ نے عاقب کو گھورا۔

”کچھ نہیں بھابی..... کچھ بھی تو نہیں۔“ عاقب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

راحہ نے اس کا کان اپنے ہاتھ میں دبوج لیا اور بولی۔ ”میں نے دیکھ لیا ہے بچو۔“

”وہ..... بھابی..... پلیز..... کسی اور کو مت بتائیے گا۔“ عاقب نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

”چلو نہیں بتاؤں گی کسی اور کو..... مگر یہ بتاؤ کب سے ہے یہ چکر اور یہ لڑکی ہے کون؟“

”تھوڑے دنوں سے..... جاوید صاحب کی بیگم کی بھانجی ہے۔“ عاقب نے اس کے دونوں سوالوں کا جواب دیا۔

”آئی ہوئی ہے؟“

”اب یہیں رہتی ہے..... ان لوگوں کے پاس..... آپ کے سعودی عرب جانے سے کچھ دن پہلے آئی تھی اپنی امی کے انتقال کے بعد۔“

”اچھا اچھا..... سعودیہ جانے سے پہلے میں نے برابر والی سے سنا تو تھا کہ جاوید صاحب کی بیگم کی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ تعزیت کے لیے جانے کا ارادہ تھا مگر کوئی ساتھ جانے والا نہیں ملا۔ جابھی نہ سکی پھر تمہارے بھائی کے پاس جانا ہو گیا۔“

”اب ہو آئیے گا۔“

”دیکھوں گی..... ویسے بھی ان کا گھر دوسرے رخ

پر ہونے کی وجہ سے ہمارے اتنے تو تعلقات نہیں ہیں ان لوگوں سے..... کسی روز چھت سے نظر آئیں جاوید صاحب کی بیگم اپنے لان میں بیٹھے تو تعزیت کر لوں گی..... اچھا تو یہ جاوید صاحب کی مرحومہ سالی کی بیٹی ہے۔“ راحمہ اصل موضوع پر آگئی۔

عاقب نے نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔
”ہے تو خوب صورت!“

”سمجھدار بھی ہے۔“ عاقب نے تر ت کہا۔
”سمجھدار ہے بھی تو دیکھ کر پھنسا یا ہے اس نے تمہیں۔“
”نہیں نہیں وہ تو بس ایک بار دیکھ کر مسکرائی تھی۔ فون نمبر میں نے ہی مانگا تھا اس سے۔“
”اچھا جی!“ راحمہ نے عاقب کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ”تو بات فون تک پہنچی ہوئی ہے۔“
”بھائی کو مت بتائیے گا۔“

راحمہ جو عاقب اور نسرین کے طے کردہ رشتے میں دراڑ ڈالوانے کی کوشش میں ناکام رہی تھی ایک عجیب سے احساس سے دو چار ہوئی۔ وہ کام جو وہ نہیں کر پائی تھی۔ پڑوس کی اس لڑکی سے وہ کام لیا جاسکتا تھا۔ عاقب کے لیے اگر اس کے حسبِ منشا اس کے اپنے خاندان کی کوئی لڑکی نہیں تو پھر نسرین بھی نہیں۔ بے شک کوئی اور ہی سہی..... غیر سہی..... ایک ہی خاندان کی دو لڑکیاں آجانے سے وہ تو اقلیت نہیں بنے گی نا..... دو فرسٹ کزنز مل کر تو اس کے خلاف نہ جانے کیا سازشیں کریں گی..... جذبہ رقابت اور حسد انسان کی سوچ اور فکر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔
”ثاقب کو نہیں بتاؤں گی مگر ایک شرط پر۔“ راحمہ نے کہا۔

”وہ کیا؟“ عاقب چونکا۔

”جو ہوا ہے اب تک وہ بھی مجھے بتا دو..... اور آئندہ بھی بتاتے رہنا۔“

عاقب نے کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے راحمہ کو دیکھا۔
”رازداری کا وعدہ کرتی ہوں۔“ راحمہ نے اپنا ہاتھ عاقب کی جانب بڑھایا۔ عاقب نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
نسرین ان دونوں ہاتھوں کے بیچ کہیں گم ہو گئی۔

☆☆☆

ایک طرف راحمہ نے ثاقب کی خواہش کے مطابق اس کا یہ پیغام بھد کے گھر پہنچا دیا کہ ثاقب چھٹی پر گھر آئے گا تو عاقب کی شادی کر کے جائے گا۔ دوسری جانب وہ

عاقب اور ماہ نور کے درمیان کھیلے جانے والے کھیل کی نہ صرف تماشائی بلکہ عاقب کی رازداریاں بھی بن گئی۔ وہ عاقب سے ماہ نور کی بابت چھیڑ چھاڑ رکھتی، اس کے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں کرید کرید کر پوچھتی۔ عاقب شروع شروع اس کی چھیڑ چھاڑ اور کرید پر جھینپتا، شر ماتا اور گھبرا بھی جاتا مگر راحمہ کی مسلسل چھیڑ چھاڑ نے بالآخر اسے بھی بے حجاب کر دیا اور وہ اسے فون پر ماہ نور سے ہونے والی باتیں نہ صرف زبانی کلامی بتانے لگا بلکہ اپنے اور ماہ نور کے میسر بھی اسے بے تکلفی سے دکھانے اور پڑھانے لگا۔ ماہ نور کے معاملے میں اس کے اور راحمہ کے درمیان کوئی حجاب رہا نہ راز۔ تاہم راحمہ نے اس معاملے میں ماہ نور سے فاصلہ رکھا ہوا تھا اور عاقب کو بھی یہ ہدایت کر کھی تھی کہ وہ ماہ نور کو یہ نہ بتائے کہ وہ اس کے اور عاقب سے بیکر سے آگاہ تھی۔

”کیوں نہ بتاؤں بھابی؟“ عاقب نے پوچھا۔
”اس لیے مٹائیے کہ اسے اگر یہ پتا چل گیا کہ بھابی کو بھی اس کی اور تمہاری دوستی کا علم ہے تو وہ اس ڈر سے کہ بھابی کسی سے کچھ کہہ نہ دیں تم سے اپنا فیئر ختم بھی کر سکتی ہے۔“
یہ دلیل عاقب کے دل کو لگ گئی۔

☆☆☆

نسرین نے گھر والوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ثاقب کی پھوپھی کا راحمہ کو فون آجاتا اور وہ اسے نسرین کے جہیز کی تیاری سے متعلق تازہ ترین معلومات اسے بتا کر اس سے رائے مشورہ بھی چاہتیں۔

”اس لیے تم سے مشورہ کرتی ہوں راحمہ کہ تم گھر کی بڑی ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ گھر میں کس چیز کی ضرورت ہے کس کی نہیں..... ایسی چیزیں جن کی ضرورت نہ ہو خواہ مخواہ جہیز میں دینے سے فائدہ۔“ پھوپھی نے ایک دن کہا۔

”جی پھوپھی آپ ٹھیک کہتی ہیں..... اور بہت شکریہ کہ آپ مجھے اتنی اہمیت دیتی ہیں۔“ راحمہ نے اوپری دل سے کہا۔
”اہمیت دینے کی کیا بات بیٹا تمہیں اللہ نے رشتے میں، مقام میں بڑائی دی ہوئی ہے اس گھر میں۔“
”آپ کی محبت ہے پھوپھی۔“

”میں تو نسرین کو بھی سمجھاتی رہتی ہوں کہ اس گھر جا کر اپنی بڑی جیٹھانی کو بڑی بہن اور ماں کا سا مقام دینا..... ہر اچھی بری اسی سے پوچھنا..... اسی سے صلاح مشورہ رکھنا..... بھئی ماں کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بیٹیوں کو صحیح سیکھ دے۔“

بھر کاموں میں لگی رہتی ہیں، نوکر ہیں مگر ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔“

”تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔“
 ”امی کے ساتھ رہ کر سیکھا ہے..... امی نے بڑی مشکل زندگی گزاری، امی کہا کرتی تھیں جب بندے کی زندگی مشکل سے گزرے تو اسے دوسرے کی بات کا جواب دینا آ جاتا ہے۔“

”امی کی زندگی مشکل سے گزری؟“
 ”بہت..... اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے..... مجھے تو اب یوں لگتا ہے جیسے خالہ کے گھر میں، میں جنت میں رہ رہی ہوں۔“

”تم میری بات گول کر گئیں۔“

”کون سی بات؟“

”کسی روز آؤ نا۔“

”کہاں؟“

”ہماری طرف۔“

”خالہ کے بغیر میں کیسے آ سکتی ہوں؟“

”خالہ کے بغیر تم مجھ سے عشق بھی تو کر رہی ہو۔“

”مگر ان کے بغیر آ نہیں سکتی تمہاری طرف۔“

”مجھ سے شادی کرنے کو کہتی ہو اور آ نہیں سکتیں.....“

”اگر تمہاری خالہ اور خالو مجھ سے تمہاری شادی کرنے پر راضی نہ ہوئے تو کیا تب بھی تم ایسی ہی بزدلی دکھاؤ گی؟“

”نہیں نہیں عاقب..... شادی تو میں تمہی سے کروں گی۔“

”نکا؟“

”بالکل۔“

”لیکن یا ایک مسئلہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ڈیڈی میری بات اپنی بہن یعنی میری پھوپھی کی بیٹی سے طے کر گئے تھے اور بڑے بھائی کہتے ہیں چھٹی پر پاکستان آئے تو میری شادی کر کے جائیں گے۔“

”تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی مجھے؟“ وہ یک لخت رو ہانسی ہو گئی۔

”بتانے کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔“

”اب کیسے آ گیا؟“

”کیونکہ تم کالج میں داخلہ لینے والی ہو۔ پھوپھی شادی کی تیاری کر رہی ہیں اور بڑے بھائی دو مہینے بعد چھٹی پر آنے والے ہیں..... تمہارا کالج میں داخلہ ہو گیا اور بھائی نے میری شادی پھوپھی کے ہاں کر دی تو پھر تم مجھ سے کیسے

”بالکل پھوپھی..... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

”بیٹا! نسرین اس گھر سے تمہارے گھر آ کر تمہاری

ہی ہوگی..... ہمارے گھر میں تو بس اب تھوڑے سے دنوں

کی مہمان ہے یہ۔“ پھوپھی کی آواز بھرا گئی۔

راحمد دل ہی دل میں ہنسی۔ پھوپھی کو کیا معلوم عاقب کو ان

کی بیٹی میں شاید پہلے کبھی دلچسپی رہی ہو مگر اب تو رتی بھر بھی

نہیں تھی، اس کی ٹانگیں تو ماہ نور کے ساتھ روز افزوں تھیں۔

کالجوں میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ ماہ نور نے

بھی خالہ کے ساتھ جا کر گھر کے قریب ہی واقع ایک کالج

میں داخلے کی درخواست جمع کروا رکھی تھی۔ میرٹھ لسٹ میں

اس کا نام نہیں آ سکا تھا۔ کالج انتظامیہ نے دوسری اور تیسری

لسٹ کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔

”اگر دوسری اور تیسری لسٹ میں بھی نام نہ آیا تو؟“

عاقب نے اس سے پوچھا۔

”تو خالو جی کہتے ہیں کسی پرائیویٹ کالج میں داخل

کر ادیں گے۔“

”یار! ہمارے کالج میں داخلہ لے لو نا۔“

”تمہارا کالج! تمہارا کون سا کالج ہے؟“

”تمہاری خالہ کے گھر کے پیچھے..... بس ایک دیوار

ہی تو ہے درمیان میں..... آ جاؤ کسی روز داخلہ لینے۔“

عاقب جو شروع میں بہت گھبرایا گھبرایا رہتا تھا اب اس سے

ایسی ہی باتیں کرنے لگا تھا۔

”خالہ میرا حلوا بنا دیں گی۔“

”بہت لذیذ بہت میٹھا ہوگا۔“

”بدمیز!“

”کسی روز آؤ نا۔“

”کہاں؟“

”ہمارے گھر۔“

”تمہاری بھابی میری خالہ سے دعا سلام ہی نہیں

رکھتیں۔ ان کا آنا جانا ہوتا خالہ کے ہاں تو شاید میں بھی خالہ

کے ساتھ کسی دن آئی جاتی تمہارے ہاں۔“ اس نے شاکی

لہجے میں کہا۔

”بھابی دراصل مصروف بہت رہتی ہیں۔“

”مصروف تو خالہ بھی بہت رہتی ہیں۔“

”بھابی کے ساتھ بچہ بھی تو ہوتا ہے نا..... اسے

اسکول بھیجتا، ہوم ورک کراتا..... بھابی سارا دن کاموں میں

لگی رہتی ہیں۔“

”خالہ کے ساتھ میں ہوتی ہوں..... خالہ بھی دن

شادی کر سکو گی؟“

”تم میرے علاوہ کسی اور سے کر لو گے شادی؟“

عاقب سے جواب نہ بنا تو اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ ”تم کر لو گی؟“

”نہیں۔“ اس نے بلا توقف فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ماہ نور عمر کے اس حصے میں تھی جہاں شعور و دانش سے زیادہ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسے عاقب دنیا کے ہر دوسرے انسان سے بڑھ کر اچھا اور اپنا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر عاقب نے اپنے چہرے سے لحاف ہٹائے بغیر قدموں کی چاپ کو بھابی کی آمد پر محمول کرتے ہوئے کہا۔ ”آج سردی بہت ہے بھابی۔“ دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک ہوتی گئی پھر مہین سی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چھلانگ لگا کر گرم بستر سے نکل آیا۔ ”تم!“ زیر و پا اور بلب کی نیلگوں روشنی میں ماہ نور اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اس وقت!“

”تم نے کہا تھا نا..... آؤ۔“

وہ اپنی بات سے مکر نہ سکتا تھا مگر..... اب جب وہ آگئی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”تمہارے گھر والے؟“

”سور ہے ہلہ۔“

”تم آئیں کیسے؟“

”دیوار کو دوکر۔“

وہ اس کی جرأت رندانہ پرحیران رہ گیا۔ اتنی سردی اور اندھیرے میں وہ دو گھروں کی مشترکہ دیوار پھلانگ کر اس تک پہنچی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آگئی..... اتنی کہ وہ اس کی گرم سانسیں اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

”عاقب! میں صرف تم سے شادی کروں گی۔“

کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تاریکی اور.....

صبح تو پوچھنے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پر راحمہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا دروازے کو آہستگی سے کھٹکھٹا رہا تھا۔

”کون؟“ راحمہ نے پوچھا۔

”میں ہوں بھابی۔“

”خیریت!“ راحمہ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

”وہ..... بھابی..... وہ.....“ زبان اس کا ساتھ دے

رہی تھی نہ الفاظ۔ ”بھابی..... وہ.....“

”بول بھی چکو عاقب..... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“

”وہ..... ماہ نور..... رات وہ..... ہماری طرف آگئی تھی۔“

”ہاہ!“ راحمہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا

پھر پوچھا۔ ”پھر گئی کیسے؟“

”گئی نہیں..... اوپر کمرے میں ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ راحمہ چکراسی گئی۔ ”رات بھر تمہارے

کمرے میں رہی؟“ اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی نظریں فرش سے جا لگیں۔ وہ مجرم بنا کھڑا تھا..... مجرم تو تھا وہ..... بلکہ گناہ گار!

پکا یک راحمہ کی تھر تھری چھوٹ گئی اور دانت بجتے لگے۔ ”صبح ہونے والی ہے اسے جلدی واپس بھیجو۔“ اس نے مسلسل بجتے دانتوں کی کٹکٹاہٹ میں کہا۔

”وہ واپس جانے کو تیار نہیں۔“ عاقب نے کہا۔

”کیا!“ راحمہ نے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا

اور اپنے لرزتے وجود کے ساتھ گھر کے لاؤنج سے اوپر جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں سے خود بھی ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس منظر نے اس کے چھکے چہرہ اذیت تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

کمرے کا منظر اور ماہ نور کی جھکی جھکی نظریں زبان حال سے گزشتہ شب کی داستان سنار ہی تھیں۔ راحمہ نے عاقب کی طرف دیکھا اس نے نظریں چرائیں۔ راحمہ نے کمرے کی جاوید اختر کے مکان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا پردہ چٹکی سے پکڑ کر نہایت احتیاط سے ذرا سا ہٹایا اور باہر جھانکا۔ جاوید صاحب کے گھر میں کھل سناٹا تھا اور کسی کمرے میں روشنی نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا اہل خانہ ابھی سو رہے تھے۔ راحمہ پردہ چھوڑ کر پلٹی اور اس نے ماہ نور کو ڈانٹا۔ ”کتنی بڑی غلطی کی تم نے..... اٹھو..... اپنے گھر جاؤ.....“ اس نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا اور عاقب کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”یہ نالائق تمہیں دیوار چڑھا دے گا۔“

ماہ نور ٹھس بیٹھی رہی۔

”سنا نہیں تم نے میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ راحمہ نے

تیور مزید بگاڑے۔

ماہ نور بدستور سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

”اٹھو بھئی۔“ راحمہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کا بازو جھنجھوڑا۔

ماہ نور منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا مطلب!“ راحمہ غرائی۔

”مجھے نہیں جانا۔“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”پاگل ہوئی ہوا مردانہ ہمیں اور..... خود بھی

مروگی۔“ راحمہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔ ”اٹھو..... ابھی روشنی نہیں ہوئی..... تمہارے گھر والے جاگ گئے تو انہیں پتا چل جائے گا کہ تم گھر میں نہیں ہو۔“

”پتا چلنے دیں۔“ وہ بولی۔

”دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا..... قیامت کروں گے

تمہارے گھر والے۔“

”کرنے دیں۔“ اس کا انداز سرفروشانہ ہو گیا۔

راحمہ نے عاقب کو دیکھا اور غرائی۔ ”کھڑے دیکھ

کیا رہے ہو..... اسے بھیجو اس کے گھر۔“

عاقب دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

”میں کیا بکو اس کر رہی ہوں عاقب۔“ راحمہ نے

اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”بھابی..... وہ جا نہیں رہی تو میں کیا کروں۔“

عاقب بے بسی سے بولا۔

”پھر انجام بخشتے کو تیار ہو جاؤ..... نہ اس کے گھر

والے بخشیں گے تمہیں نہ تمہارے اپنے بھائی۔“

”آپ بتائیں میں کیا کروں؟“

”کرو یہ کہ.....“ راحمہ نے بیڈ پر بیٹھی ماہ نور کی

طرف انگلی اٹھا کر۔ ”گناہ کی اس پوٹلی کو اس کے گھر میں

پھینک دو۔“ راحمہ بھول رہی تھی کہ گناہ کے اس کھیل کو ہوا

دکھانے میں اس نے بھی حصہ ڈال رکھا تھا۔

”چلو بھئی اٹھو۔“ عاقب نے ماہ نور سے کہا۔

”نہیں جاؤں گی۔“

راحمہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر جھپانی کیفیت میں چھت

کی طرف دیکھنے لگی۔

”دیکھو..... پلیز..... ابھی وقت ہے..... تم خاموشی

سے اپنے گھر والوں جاسکتی ہو..... چلی جاؤ.....“ راحمہ نے

اپنا لہجہ بدل لیا۔

ماہ نور کس سے مس نہ ہوئی۔

”اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں جیسا تم نے کیا.....

گھر جاؤ.....“ راحمہ نے اسے پککارا۔

”نہیں جانا..... نہیں جانا۔“

”تمہیں پتا ہے تم نہیں گئیں تو ہم لوگ کتنی مشکل میں

آجائیں گے۔“ راحمہ گڑ گڑائی۔

”میں بھی تو مشکل میں آ جاؤں گی۔“

”ہاں تو اسی لیے تو کہہ رہی ہوں چلی جاؤ اپنے گھر۔“

”نہیں جانا۔“

”آخر کیوں!“

”بس۔“

”بس کا مطلب۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ راحمہ کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

راحمہ پھر کھڑکی تک پہنچی اور اس نے اسی احتیاط سے

پھر باہر جھانکا اور یکتخت گھبرا کر پلٹی۔ ”تمہارے گھر میں

ایک کمرے کی جی جلی گئی ہے..... کوئی جاگ گیا ہے شاید۔“

اس نے ایک نظر راحمہ کو دیکھا۔ تھوڑی سی گھبرائی مگر

اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

”اب خود ہی نمٹنا اس مصیبت سے۔“ راحمہ نے

عاقب پر آنکھیں نکالیں۔

عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

”تھانہ کچھری ہو جاتا ہے ایسے قصوں میں۔“ راحمہ بھکی۔

”میرا کیا قصور بھابی..... وہ خود آئی ہے۔“

”ہاں ہاں..... تم تو جیسے بہت معصوم..... دودھ پیتے بچے

ہو..... سب کچھ کر کے بیٹھ گئے اور کہتے ہو میرا کیا قصور۔“

”عاقب تم نے خود ہی تو بلایا تھا مجھے۔“ ماہ نور دھیمی

آواز میں بولی۔

راحمہ نے چونک کر عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کو

گھورتے ہوئے ترش لہجے میں بولی۔ ”اور تم اتنی بھولی تھیں

کہ اس کے بلانے پر آ گئیں..... وہ بھی رات کو..... شرم نہیں

آئی تمہیں؟“

ماہ نور نے پھر کر عاقب کو دیکھا۔ ”عاقب! بتاؤ نا

انہیں تم نے مجھ سے کیا کہا ہے۔“

راحمہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے عاقب کو یوں

دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اس نے ایسا کیا کہا تھا، ماہ نور

سے۔ وہ خاموش گھڑا رہا۔ ”کیا کہا ہے؟“ اس کی خاموشی نہ

ٹوٹنے پر راحمہ کو پوچھنا پڑا۔

”کچھ نہیں۔“ عاقب بولا۔

”جھوٹ مت بولو..... بتاؤ نا تم نے مجھ سے کیا ہے

کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔“

صورت حال یہ نہ ہوتی جو کہ اس وقت تھی تو راحمہ

خوشی سے بے اوسان ہو گئی ہوتی۔ یہی تو چاہتی تھی وہ کہ عاقب اپنی پھوپھی زاد نسرین کے بجائے کسی اور سے شادی کر لے تاکہ اس گھر میں نسرین کے بہانے اس کی پھوپھی کے جائل اور کمتر گھرانے کا عمل دخل نہ ہونے پائے۔ مگر اس وقت صورت حال کچھ اور تھی۔

”شادی ایسے ہوتی ہے۔“ راحمہ نے ماہ نور کو گھورا۔

اس نے سر جھکا لیا۔

”کھڑے کیا ہواب اس مصیبت کا کوئی حل نکالو۔“

راحمہ عاقب کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔

عاقب اسے شرمساری سے دیکھنے لگا۔

”میرا منہ کیا تک رہے ہو..... کچھ کرو..... صبح ہو گئی ہے۔“

”فر..... فرقان..... بھائی کو..... بتاؤں۔“ عاقب

اٹکتے ہوئے بولا۔

”وہ کیا کر لے گا۔“

”یہ جانیں رہی تو..... شاید وہی کچھ مشورہ دے دیں۔“

”صبح صبح اس کا فون کھڑکاؤ گے؟“

”مجبوری ہے نا بھابی۔“

”کرلو۔“ راحمہ نے ماہ نور پر ناگواری سے نظر ڈالی

اور پھر اسی کھڑکی کی طرف پیش قدمی کی۔ کھڑکی پر پڑا پردہ

پھر اسی احتیاط سے ذرا سا ہٹا کر جاوید اختر کے گھر کی طرف

دیکھا پھر گھبرا کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے سب

جاگ گئے ہیں۔“

”آٹھ نو بجے سے پہلے کسی کو پتا نہیں چلے گا.....

میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے..... میں کھڑکی

سے کود کر آئی ہوں۔“ ماہ نور نے کہا۔

راحمہ کے جڑے آپ ہی آپ بھینچ گئے۔ کیسی فتنہ

لڑکی تھی۔

فرقان سے بات کرنے کو عاقب نیچے چلا گیا۔

”فرقان بھائی آپ ہماری طرف آسکتے ہو؟“

عاقب فون پر فرقان علی سے کہہ رہا تھا۔

”اتنی صبح! خیریت؟“ فرقان علی اپنے بستر میں تھا۔

”ایمر جنسی ہے فرقان بھائی۔“

”کیا ہوا؟“ فرقان اٹھ بیٹھا۔

”آپ آؤ گے تو بتاؤں گا..... فون پر بتانے والی

بات نہیں۔“

”میں تو ابھی جاگا ہوں..... شاور لوں گا..... تیار

ہوں گا..... پھر نکلوں گا تمہاری طرف آنے کے لیے..... اتنی

دیر میں تم کیوں نہیں آجاتے میری طرف۔“ فرقان علی کے

وہم وگمان میں بھی وہ نہ تھا جو ہو چکا تھا۔ ”بائی دی وے ایمر جنسی کی نوعیت کیا ہے؟“ عاقب اور عاطف تو خیریت سے ہیں نا؟“

”جی..... جی..... ادھر تو سب خیریت ہے..... رات وہ

آگئی تھی ہماری طرف۔“ عاقب نے ہلکے پکچھاتے ہوئے بتایا۔

”وہ! وہ کون؟“

”یارو بی نا..... ماہ نور..... جس سے میری ڈانٹ

چل رہی تھی۔“

”اچھا! اچھا! کیا کہا تمہاری طرف آگئی تھی؟“

”جی..... اور اب اپنے گھر واپس جانے کو تیار نہیں۔“

”یعنی رات کو وہ تمہاری طرف ہی رہی؟“

”جی۔“

”ادھائی گاڈ!“ فرقان علی کے لہجے میں تشویش تھی۔

”اس کے گھر والوں کو پتا نہیں چلا؟“

”پتا چلتا تو کھینچ کر نہ لے جاتے..... اب جاگیں گے

تو پتا چلے گا۔“

”آئی کیسے؟“

”دیوار پھلانگ کر۔“

”یار بھیجو اسے اس کے گھر ورنہ ایسے پھنسو گے کہ

جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔“

”وہ جانے کو تیار ہی نہیں۔“

”بس تو اب کچھ بھی بھگتے کو تیار رہو۔“

”فرقان بھائی! پلیز بتائیں نا کیا کروں؟“

”میں کیا بتاؤں۔“

”آپ ہی نے تو کہا تھا فون نمبر مانگتے کو۔“

”یہ تم کافی دن پہلے کی بات یاد دلار ہے ہو مجھے۔“

فرقان کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس نے عاقب کی بات کا برا

منایا تھا۔ ”یار! یہ کب کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے گھر

آجائے تو رات بھر مزے کرنا۔“ فرقان یلختی ہو گیا۔

”پلیز فرقان بھائی میری مدد کریں۔“ وہ گڑگڑایا۔

”بھابی بھی بہت پریشان ہیں۔“

”ہونا چاہیے..... جانتے ہو کیا ہوتا ہے ایسی باتوں کا

انجام..... پولیس، تھانہ، کچہری..... اور دشمنیاں الگ.....

لڑکی والوں کے لیے عزت کا مسئلہ ہوتا ہے۔“

”غلطی ہو گئی فرقان بھائی۔“

”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بھائی دونوں باہر

ہیں..... گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بچہ..... تم لاکھ

چھپاؤ گے بچہ کہیں نہ کہیں اگل دے گا۔“

”اسے کچھ پتا نہیں..... وہ تو ابھی سو رہا ہے۔“
 ”سب سے پہلے تو کوشش کرو کہ وہ چپ چاپ اپنے گھر چلی جائے.....“
 ”بہت سمجھایا..... نہیں جا رہی۔“
 ”تو اسے لے کر نکل دو ہاں سے ورنہ برے پھنسو گے۔“
 ”کہاں لے کر جاؤں؟“ عاقب نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”یہ بات تمہارے سوچنے کی ہے یار۔“
 ”ٹھیک ہے فرقان بھائی۔“ عاقب کو فرقان کی سرد مہری سے افسوس ہوا۔
 ”راحمہ بھی نیچے آگئی تھی۔“ کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”وہ تو لفٹ ہی نہیں کر رہی ہے..... بس یہ کہا یا تو اسے واپس بھیجو ورنہ وہاں سے لے کر نکلو۔“
 ”ہاں عاقب اسے لے ہی جاؤ۔“
 ”کہاں لے جاؤں بھائی؟“

راحمہ جو انتہائی پریشان دکھائی دے رہی تھی سوچ میں پڑ گئی۔ ”خاندان میں کہیں لے جاؤ گے تو عزت بچانی مشکل ہو جائے گی..... وہ وہ باتیں نہیں کی کہ خدا کی پناہ۔“
 راحمہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”جامل بھرے پڑے ہیں نا خاندان میں اس لیے۔“
 ”ٹھیک کہتے ہو۔“ عاقب نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔
 ”آپ اپنی امی کے ہاں بات کریں۔“
 ”پاگل ہوئے ہو..... تمہارے ساتھ میری بھی ذلت ہوگی۔“
 ”پھر؟“

”فرقان کے پاس ہی جاؤ..... وہ سمجھدار آدمی ہے کوئی راستہ نکال دے گا۔“
 ”اور اگر نہ نکالا کوئی راستہ؟“
 ”جاؤ تو سہی۔“ راحمہ زچ ہو کر یولی۔

☆☆☆

فرقان علی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ دو بہنیں شادی شدہ تھیں، دو کنواری، والدہ حیات تھیں۔ والد کا انتقال ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ فرقان خود بھی شادی شدہ تھا۔ عمر کوئی پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ دو بچوں کا باپ تھا۔ اکلوتی اولاد زینہ ہونے کے باعث قدرے من موچی مگر تھامرد آدمی۔ جو کہہ دیتا اسے نبھانا فرض جانتا۔ تھا تو وہ عاقب کے دوستوں میں اور اس کا ہم پیشہ بھی مگر مراسم اس

کے تینوں بھائیوں سے تھے۔ عاقب کو تو وہ بچے کی طرح فریٹ کرتا تھا۔ ہنسی مذاق میں اس نے عاقب کو پڑوس کی چھت والی لڑکی سے شغفیں بڑھانے کا مشورہ تو دے دیا تھا اور عاقب اپنے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں کبھی کبھار اس سے شیئر بھی کر لیا کرتا تھا مگر فرقان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اونٹ اس کروٹ بیٹھے گا۔

چادر میں لپیٹی ماہ نور کو اپنے ہمراہ لیے عاقب..... علی الصباح فرقان کے گھر پہنچا تو فرقان بھبک اٹھا۔ ”یار! کچھ عقل ہے تمہیں..... ماں بہنوں والا آدمی ہوں، نیگم بھی ہے گھر میں..... کیا سوچیں گی سب کی سب۔“

عاقب شرمندہ ہو گیا۔
 ”کچھ شرم کرو یار۔“ فرقان علی نے اسے ڈانٹا۔
 ”پلیز فرقان بھائی۔“ عاقب دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑایا۔ ”کچھ کریں۔“
 ”کیا کروں۔“ فرقان نے آنکھیں نکالیں۔
 ”اسے اندر بلا لوں؟“

”اندر بلا کر کیا کرو گے..... اندر گھر میں خواتین مجھ سے پوچھیں گی نہیں یہ کون ہے۔ یار کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی ذلیل کرانا چاہتے ہو۔“

عاقب نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں کھل خاموشی چھا گئی۔ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ عاقب کے قتل بچانے پر فرقان کی والدہ نے دروازہ کھولا تھا اور عاقب کو صبح سویرے پریشان حال دروازے پر کھڑے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔ عاقب ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ تینوں بھائیوں کا ان کے ہاں آنا جانا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتیں عاقب نے کہا۔ ”آئی فرقان بھائی سے ملتا تھا۔“

فرقان کی والدہ نے ایک اچھتی نظر گاڑی میں بیٹھی ماہ نور پر ڈالی جس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چادر سے چھپا رکھا تھا۔ فرقان کی والدہ اسے دروازے پر ہی کھڑا چھوڑ کر فرقان کو باہر بھیجنے کے لیے گھر کے اندر جانے کو مڑیں۔

فرقان اسے گھر کے اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر کے رخ کھٹنے والے دوسرے دروازے کی چھتی چڑھا لی۔ اس نے گھر کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھی چادر پوش لڑکی کو دیکھ کر بھی اسے اندر بلانے سے گریز کیا تھا مگر اب عاقب اس سے لڑکی کو اندر بلانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ عاقب سے اس کے پرانے تعلقات تھے۔ عاقب کی غلطی

عاقب کو غیرت آگئی۔

”تو پھر اس بے چاری کو تحفظ دو۔“

”بھابی گھبرا رہی تھیں کہ اس کے گھر والے آجائیں

گے، پولیس آجائے گی..... یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔“

”ان کی پریشانی بھی جائز ہے..... ایسے معاملات

میں یہی ہوتا ہے..... لڑکی والے خاموش تھوڑی بیٹھتے ہیں۔“

”مشورہ دیں نا کیا کروں؟“

”عاقب کو فون کرو..... عاطف کو خبر کرو۔“

”نہیں، نہیں۔“ عاقب نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

”وہ دونوں تو میرے کلڑے کر دیں گے۔“

”غلط نہیں کریں گے..... لڑکے والوں کی بھی عزت

جاتی ہے یار۔“ فرقان غصے سے بولا۔

ڈرائنگ روم کے اندر کی طرف کھلتے والے بند

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور فرقان کی والدہ جو در

سے بند دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی تھیں بولیں۔

”فرقان کیا بات ہے بیٹے؟“

”کچھ نہیں امی۔“

”دروازہ کھولو۔“

”کھولتا ہوں امی۔“

”میں اتنی صبح اس لڑکے کے آنے پر پہلے ہی کھٹک گئی

تھی..... میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔“ دروازے کے پیچھے

سے فرقان کی والدہ کی آواز سن کر ماہ نور بھی چوکنی سی ہو گئی تھی۔

فرقان نے دروازہ کھول دیا۔ والدہ اندر آ گئیں اور

انہوں نے خشونت سے پہلے عاقب کو ایک نظر دیکھا پھر ماہ

نور پر اپنی لگا ہیں مرکوز کر دیں۔

”بیٹیہی امی۔“ فرقان نے دلی زبان سے کہا۔

”کیا بیٹیہوں..... یہ.....“ انہوں نے پھر عاقب کو

دیکھا مگر اس بار حقارت اور نفرت سے۔ ”اس لڑکی کو بھگا کر

لایا ہے نا۔“

عاقب نے شرمندہ ہو کر پہلو بدلا اور نظریں چراتے

ہوئے بولا۔ ”آنتی یہ خود آگئی تھی۔“

”خود کیسے آگئی تھی۔“ والدہ تڑخ کر بولیں۔

”پڑوس کے گھر میں رہتی ہے۔“ فرقان نے ماں کو بتایا۔

”چکر چل گیا ہوگا۔“ والدہ نے ناگواری سے کہا پھر

اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ”اللہ بچائے آج

کل کی لڑکیوں سے اور لڑکوں سے بھی۔“ پھر ماہ نور کو غصے

سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”شرم نہ آئی ماں باپ کی

عزت کو داغدار کرتے ہوئے۔“

پر وہ اس کے بڑے بھائی سے اپنے دیرینہ تعلق سے یکلفت
آنکھیں نہیں پھیر سکتا تھا پہلے تو اس نے منع کیا پھر کچھ سوچ کر
اس نے قدرے تامل سے کہا۔ ”بلا لو۔“

عاقب گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ درمیانہ
قامت کی حامل تھی۔ محتاط روی سے کمرے میں داخل ہوئی۔
”بیٹھو۔“ فرقان نے اس سے کہا۔

وہ سسٹی سسٹی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم بھی بیٹھو۔“ فرقان نے عاقب سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے اس سے پوچھا۔
”گھر کیوں نہیں گئیں تم اپنے؟“

وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں جھان کے
عالم میں باہم مروڑنے لگی۔

”اس نے تو حماقت کی ہے۔“ فرقان نے ایک نظر
عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کی جانب نگاہ کی۔ ”تم کیوں بے
دقتی کرنا چاہتی ہو۔“ فرقان اپنے گھر والوں کے خیال سے
دلی دبی آواز میں بول رہا تھا۔

وہ چادر کے کنارے سے اپنی آنکھیں مسلنے لگی۔

”گھر سے نکل لڑکی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔“ وہ اسی

طرح اپنی آنکھیں مسلتی رہی۔

”چلی جاؤ اپنے گھر۔“ فرقان نے سمجھایا۔ وہ رونے لگی۔

”اب رونے سے کیا فائدہ۔“

”خالو مجھے قتل کر دیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز

میں بولی۔ ”چادر اس کے چہرے سے ڈھلک گئی تھی۔

فرقان نے اندازہ کیا وہ بہ مشکل سولہ سترہ سال کی رہی

ہوگی۔ ”خالہ تو مجھے زبردستی ساتھ لائی تھیں..... خالو کی مرضی

نہیں تھی۔“ اس نے مزید کہا۔

”اور تم نے خالہ کی محبت اور مہربانی کا انہیں یہ انعام دیا؟“

اس نے سر جھکا لیا۔

”اپنے ساتھ خالہ کو بھی مشکل میں ڈال دیا..... اب

کیا کرو گی..... کہاں جاؤ گی؟“

وہ اضطراب سے دو چار نظر آنے لگی۔

”بولو۔“ فرقان نے تقاضا کیا۔

اس نے اپنی جھکی جھکی نظریں عاقب کی طرف

اٹھائیں۔ ”انہی کے ساتھ رہوں گی اور کہاں جاؤں گی۔“

”سن لیا!“ فرقان نے عاقب کو دیکھا۔ ”اب

عورتوں کی طرح مست چھو مرد بنو اور مردوں کی طرح بہادری

دکھاؤ..... سمجھے۔“

”میں..... میں پیچھے تو نہیں ہٹ رہا فرقان بھائی۔“

”امی اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں.....
عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالور رہتے ہیں۔ ان
کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ
اپنے ہاں لے آئے تھے۔“

”لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں..... خالہ
اور خالوتو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگائیں گے۔“
”منہ کیا نہیں لگائیں گے..... یہ کہتی ہے خالوتو اسے
مار دے گا۔“ فرقان نے ماں سے کہا۔
”ہونا تو یہی چاہیے۔“ وہ بولیں۔
ماہ نور رونے لگی۔

”اب مگر مجھ کے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“
فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ ”تمہیں پرائے پھڑے میں الجھنے کی ضرورت
نہیں..... انہیں یہاں سے چلتا کرو۔“

”پلیز آئی۔“ عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں
ہاتھ جوڑ دیے پھر متوحش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ”پلیز! پلیز!
میری مدد کریں..... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔“
”جہاں مرضی آئے جاؤ..... فرقان کو اس قصبے میں
تھینے کی ضرورت بالکل نہیں۔“

”فرقان بھائی!“ عاقب نے اسے ہتھی لگا ہوں سے دیکھا۔
صوفے پر بیٹھی ماہ نور دفعتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ
تینوں بے ساختہ چوٹے۔ ڈرائنگ روم میں بچے قالین پر
اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش سا طاری
تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند
تھیں جبرے بچنے ہوئے تھے۔

”بے ہوش ہو گئی ہے بے ہوش..... اس کے منہ پر پانی
کے چھینٹے دو جو تانگھاؤ اسے۔“ فرقان کی والدہ نے کہا۔
عاقب ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔
”میں پانی لاتی ہوں۔“ فرقان کی والدہ دروازے
کی طرف لپکیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ”یار تمہیں
یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ فرقان کے لہجے میں ناگواری
تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ
پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی
تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج.....

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے
فرقان کی والدہ نے خود کلامی کی۔ ”چھوٹی عمر کی ہے۔“ پھر
عاقب کو دیکھ کر بولیں۔ ”یتیم بچی ہے..... تو نے ہی کچھ عقل

سے کام لیا ہوتا۔“
ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت
رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں
دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں
دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔
”ڈرا سوچو تو۔“ فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔
”اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی
اور لڑکا..... تو تم اس وقت کیا کرتے ہو؟“
عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

لیکا یک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل
جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ”بھابی!“
کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی
نظریں اسی پر تھیں۔

”اچھا..... پھر..... اوہو..... ہوں..... ہوں.....“
راحمہ کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت
متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع
کر دی۔ ”میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔“
”کیا ہوا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر..... جس کرسی پر
چڑھ کر یہ دیوار پھلانگی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور
دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔“ عاقب نے بتایا۔
”شہادتیں بھی مل گئیں..... اب تم تیار ہو جاؤ۔“
فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سرا سیمہ دکھائی دینے لگا۔
”شاباش۔“ عاقب نے کہا۔ ”فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو
ٹیز می نظر سے دیکھا۔“ ”ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں
کا..... دیوار پھلانگتے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جا، بے جا
چوٹ لگ جاتی تو؟“

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔
”تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟“
فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔“
”بیٹا! پھنس گئے ہو بری طرح..... اسے گھر سے
لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ
ان کے سپرد کر دیتے..... ان کی بھی عزت سچ جاتی، تمہاری
بھی..... اب بھی وقت ہے..... اس سے پہلے کہ بات زیادہ
بڑھے..... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے
گھر۔“ فرقان نے کہا۔

”نہیں..... میں گھر نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور رونے لگی۔

”پھر کہاں جائے گی تو؟“ فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔

اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتی۔

”خالد سے بات کروں؟“ فرقان نے والدہ کو

دیکھتے ہوئے دلی زبان سے کہا۔

”کس لیے؟“ وہ چونکی۔

”جو ہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے..... فی الحال

وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔“

”بغیر کسی رشتے کے!“ والدہ نے تیوری چڑھا کر

فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”دیکھو بھی۔“ فرقان کی

والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ ”میں

بیٹیوں والی ہوں..... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال

سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس

کے دل پر کیا گزرتی، بیٹی کی آب تو ہیرے موتیوں سے بھی

زیادہ قیمتی ہوتی ہے..... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو

گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو..... شکاری کتے پھر رہے

ہیں گھر سے لگی لڑکیوں کی یوسونگتے..... گند کو مزید گند بنانے

کے بجائے اسے یہیں چھوڑ دھارے پاس..... محفوظ تو رہے

گی اور..... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔“

”مگر میں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور نے

بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”چپ کر۔“ فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ سہم سی گئی۔

”جاؤ بھی تم جاؤ۔“ والدہ عاقب سے یولیں۔

ماہ نور کو کن انکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی

طرف بڑھا۔

”ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ..... تمہیں

اپنے بھائیوں کو ضرور بتا دینا چاہیے..... تم اکیلے نہیں نمٹ سکو

گے اس مسئلے سے..... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ

گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے..... کیونکہ یہ وقت تو کام پر

جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا

نہیں..... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق

چینک جاؤ..... ویسے بھی دولٹر کے چھٹی پر ہیں..... اور ہاں

اپنی بھابی سے احتیاط کے ساتھ رابطے میں رہو۔“

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو شک گیا تھا اس کی

بات سے متفق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جربز ہوئیں

مگر چپ رہیں۔

”ناشا کرو گے؟“ فرقان نے رسوا پوچھا۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا..... کرلوں گا۔“ عاقب

دروازے سے نکل گیا۔

”چلو بھی اندر چلو۔“ فرقان کی والدہ ماہ نور سے

یولیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں

دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم

میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

”تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی

پینگیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی..... تم ہی اس کے راز دار

اور صلاح کار رہے..... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپھی

زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے

دل لگی پر حوصلہ افزائی کی..... مزے لے لے کر سنتے

رہے۔ وہ تو نوجوان تھا..... تم تو شادی شدہ اور دو بچوں کے

باپ تھے..... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی..... تم تو

بہنوں والے تھے..... دو اب بھی بیٹھی ہیں گھر میں..... ذرا

سوچو..... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو..... تمہاری ان دو

غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی..... خدا نخواستہ اس طرح

کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو..... رو رہی ہو.....

کانپے، لرزے اور بے ہوش ہو جائے تو.....!“

فرقان کٹھنرے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر

وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش

کر رہا تھا۔

”ہاں..... میں بھی شریک جرم ہوں۔“ لڑکی کی کم

عمری، اس کی خوب صورتی، اس کے چہرے سے ہویا

نا تجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، سسکتا

اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈباتے آنسو فرقان کو ناقابل بیان

دکھ اور احساس شرمندگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ

وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحمہ کو تازہ

ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی

ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکر مند

رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحمہ کا پھر فون آ گیا۔

وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحمہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس

نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی خالہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان

کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے اور ان کے گھر کی اس

مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے

نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے

نشانات دکھائی دیے تھے۔

”عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

”امی اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں.....
عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالور رہتے ہیں۔ ان
کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ
اپنے ہاں لے آئے تھے۔“

”لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں..... خالہ
اور خالوتو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگا سکیں گے۔“
”منہ کیا نہیں لگا سکیں گے..... یہ کہتی ہے خالوتو اسے
مار دے گا۔“ فرقان نے ماں سے کہا۔
”ہونا تو یہی چاہیے۔“ وہ بولیں۔
ماہ نور رونے لگی۔

”اب مگر مجھ کے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“
فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ ”تمہیں پرانے پھلے میں الجھنے کی ضرورت
نہیں..... انہیں یہاں سے چلتا کرو۔“

”پلیز آئی۔“ عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں
ہاتھ جوڑ دیے پھر متوحش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ”پلیز! پلیز!
میری مدد کریں..... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔“
”جہاں مرضی آئے جاؤ..... فرقان کو اس قصبے میں
تھمسنے کی ضرورت بالکل نہیں۔“

”فرقان بھائی!“ عاقب نے اسے بلتی لگا ہوں سے دیکھا۔
صوفے پر بیٹھی ماہ نور دفعتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ
تینوں بے ساختہ چوٹے۔ ڈرائنگ روم میں بچے قالین پر
اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش سا طاری
تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند
تھیں جبرے بچنے ہوئے تھے۔

”بے ہوش ہو گئی ہے بے ہوش..... اس کے منہ پر پانی
کے چھینٹے دو جو تاسکھاؤ اسے۔“ فرقان کی والدہ نے کہا۔
عاقب ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

”میں پانی لاتی ہوں۔“ فرقان کی والدہ دروازے
کی طرف لپکیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ”یار تمہیں
یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ فرقان کے لہجے میں ناگواری
تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ
پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی
تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج.....

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے
فرقان کی والدہ نے خود کلامی کی۔ ”چھوٹی عمر کی ہے۔“ پھر
عاقب کو دیکھ کر بولیں۔ ”یتیم بچی ہے..... تو نے ہی کچھ عقل

سے کام لیا ہوتا۔“
ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت
رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں
دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں
دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔
”ذرا سوچو تو۔“ فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔
”اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی
اور لڑکا..... تو تم اس وقت کیا کرتے ہو؟“
عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

یکا یک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل
جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ”بچی بھابی!“
کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی
نظریں اسی پر تھیں۔

”اچھا..... پھر..... اوہو..... ہوں..... ہوں.....“
راحہ کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت
متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع
کر دی۔ ”میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔“
”کیا ہوا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر..... جس کرسی پر
چڑھ کر یہ دیوار پھلا گئی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور
دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔“ عاقب نے بتایا۔
”شہادتیں بھی مل گئیں..... اب تم تیار ہو جاؤ۔“
فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سرا سیمہ دکھائی دینے لگا۔
”شابش۔ ہے بھئی!“ فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو
ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ”ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں
کا..... دیوار پھلا گئے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جا، بے جا
چوٹ لگ جاتی تو؟“

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔
”تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟“
فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔“
”بیٹا! پھنس گئے ہو بری طرح..... اسے گھر سے
لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ
ان کے سپرد کر دیتے..... ان کی بھی عزت بچ جاتی، تمہاری
بھی..... اب بھی وقت ہے..... اس سے پہلے کہ بات زیادہ
بڑھے..... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے
گھر۔“ فرقان نے کہا۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا..... کرلوں گا۔“ عاقب دروازے سے نکل گیا۔

”چلو بھی اندر چلو۔“ فرقان کی والدہ ماہ نور سے بولیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

”تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی پٹلیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی..... تم ہی اس کے راز دار اور صلاح کار رہے..... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپھی زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے دل لگی پر حوصلہ افزائی کی..... مزے لے لے کر سنتے رہے۔ وہ تو نو جوان تھا..... تم تو شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے..... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی..... تم تو بہنوں والے تھے..... دو اب بھی بیٹھی ہیں گھر میں..... ذرا سوچو..... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو..... تمہاری ان دو غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی..... خدا نخواستہ اس طرح کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو..... رو رہی ہو..... کانپے، لرزے اور بے ہوش ہو جائے تو.....!“

فرقان کٹھنرے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں..... میں بھی شریک جرم ہوں۔“ لڑکی کی کم عمری، اس کی خوب صورتی، اس کے چہرے سے ہویدا نا تجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، سسکنا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈباتے آنسو فرقان کو ناقابل بیان دکھ اور احساسِ شرمندگی سے دو چار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحہ کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکر مند رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی خالہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے اور ان کے گھر کی اس مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

”عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

”نہیں..... میں گھر نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور رونے لگی۔

”پھر کہاں جائے گی تو!“ فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتی۔

”خالہ سے بات کروں؟“ فرقان نے والدہ کو

دیکھتے ہوئے دنی زبان سے کہا۔

”کس لیے؟“ وہ چونکیں۔

”جوہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے..... فی الحال

وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔“

”بغیر کسی رشتے کے!“ والدہ نے تیوری چڑھا کر

فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”دیکھو بھی۔“ فرقان کی

والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ ”میں

بیٹیوں والی ہوں..... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال

سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس

کے دل پر کیا گزرتی، بیٹی کی آب تو ہیرے موتیوں سے بھی

زیادہ قیمتی ہوتی ہے..... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو

گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو..... شکاری کتے پھر رہے

ہیں گھر سے نکلی لڑکیوں کی بوسہ نکلتے..... گند کو مزید گند بنانے

کے بجائے اسے یہیں چھوڑ دھارے پاس..... محفوظ تو رہے

گی اور..... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔“

”مگر میں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور نے

بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”چپ کر۔“ فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ سہمی گئی۔

”جاؤ بھی تم جاؤ۔“ والدہ عاقب سے بولیں۔

ماہ نور کو کن انکھیں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی

طرف بڑھا۔

”ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ..... تمہیں

اپنے بھائیوں کو ضرور بتا دینا چاہیے..... تم اکیلے نہیں نمٹ سکو

گے اس مسئلے سے..... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ

گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے..... کیونکہ یہ وقت تو کام پر

جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا

نہیں..... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق

بینک جاؤ..... ویسے بھی دو لڑکے چھٹی پر ہیں..... اور ہاں

اپنی بھابی سے احتیاط کے ساتھ رابطے میں رہو۔“

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو ٹھنک گیا تھا اس کی

بات سے متفق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جریز ہوئیں

مگر چپ رہیں۔

”ناشٹا کرو گے؟“ فرقان نے رسماً پوچھا۔

رہے تھے..... خالہ کہنے لگیں۔ آپ کو دیوار پر سے کسی کے کودنے کی آواز نہیں آئی..... میں نے کہا مجھے کیا پتا..... میں تو سوئی ہوئی تھی نیند میں کس کو ہوش رہتا ہے۔“

”پھر؟“

”پھر انہوں نے تمہارا پوچھا..... میں نے کہا وہ تو اپنے پینک چلا گیا..... عاقب انہوں نے لان سے گیٹ تک چپا چپا دیکھا..... پوچھ رہے تھے گیٹ آپ کو صبح بند ملایا کھلا۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”نہیں میں نے کہا میں نے نوٹ نہیں کیا۔“

”اوہو بھائی کہہ دینا تھا کھلا ملا..... وہ سمجھتے ماہ نور نے فرار کے لیے ہمارا گیٹ استعمال کیا ہے۔“

”خیر میں نے تو وہی کہا جو تمہیں بتایا ہے..... ویسے ایک بات ہے۔“

”کیا؟“ عاقب کے لہجے میں پیتابی تھی۔

”مجھے لگتا ہے انہیں یہ علم نہیں کہ تمہاری اور ان کی لڑکی کی فون پر بات چیت رہتی تھی۔“

”بھائی! تھوڑے دن ہی تو رہی اور..... وہ اپنے کمرے میں چھپ کر بات کرتی تھی..... پھر نمبر بھی ڈیلیٹ کر دیتی تھی۔“

”ہے حرفوں کی بنی۔“ راحمہ نے کڑوے کیلے لہجے میں کہا۔ عاقب کو حیرت ہوئی۔ راحمہ تو اس کی تعریفوں کے پل باندھے رہتی تھی اس کے سامنے۔ ”اللہ! عاقب اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا بس چلے تو اسے اپنے گھر لے آؤں“ اور اب وہی کہہ رہی تھی کہ حرفوں کی بنی ہے۔

”بھابی..... مجھے بتاتی رہے گا کیا ہو رہا ہے۔“ عاقب نے کہا۔

”ہاں ہاں..... خالہ کہہ رہی تھیں..... کچھ دیر دیکھتے ہیں..... پتا نہ چلا تو خاندان والوں کو بھی بتانا پڑے گا اور ہو سکتا ہے پولیس کو بھی رپورٹ کرائیں گے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ عاقب نے راحمہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”پریشان کیسے نہ ہوں..... پولیس تو جب تفتیش کرنے پر آتی ہے تو عورت دیکھتی ہے نہ مرد..... یہ تم نے کیا کر دیا عاقب..... سوچ تولیتے۔“

عاقب کو اپنا دل ڈوبتا اور ٹانگیں بے جان ہوتی لگ رہی تھیں۔

☆☆☆

لنچ بریک کے دوران عاقب نے بینک سے باہر نکل کر راحمہ کو خود فون کیا۔ فرقان جو کام کے دوران ایک دو مرتبہ ضرور اس کی طرف آکر اس سے بات چیت کر لیا کرتا تھا اس روز ایک مرتبہ بھی اس کی سیٹ کی طرف نہیں آیا تھا۔

راحمہ نے اسے بتایا ماہ نور کی خالہ کے گھر میں پراسراری خاموشی تھی۔ گھر کا رخ دوسری طرف ہونے کے باعث کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

”چھٹی کے بعد گھر ہی آؤ گے نا؟“ راحمہ نے اس سے پوچھا۔

”کہہ نہیں سکتا۔“

”کیا مطلب کہہ نہیں سکتے۔“ راحمہ چونکی۔ ”میں اکیلی رہوں گی کیا!“

”آپ اپنی امی کے ہاں چلی جائیں۔“

”بہت اچھے! ادھر تم گھر سے غائب ادھر میں امی کے ہاں..... انہیں تو پھر پکا شک ہو جائے گا۔“

”آجاؤں گا..... فکر نہ کریں۔“

سہ پہر کو ماہ نور کے خالو اور ماموں کے ساتھ پولیس کے تفتیشی اہلکار دیوار کے دوسری طرف گھر کا اسی طرح جائزہ لینے آگئے جیسے صبح ماہ نور کے خالو اور خالہ لے کر گئے تھے۔ تفتیشی اہلکاروں نے راحمہ سے بھی پوچھ گچھ کی اور گھر میں رہنے والے دیگر افراد کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان کے جاتے ہی راحمہ نے عاقب کو فون کیا۔ ”انہوں نے تمہارے پینک کا نام پتا بھی پوچھا مجھ سے۔“ راحمہ نے بتایا۔

”بھابی! اب تو میرا گھر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا..... رات کو پولیس آگئی اور مجھے اٹھا کر لے گئی تو.....“ عاقب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”تمہارے بھائی کو بتانا ضروری ہو گیا ہے۔“ راحمہ نے کہا۔

”نہیں بھابی ابھی نہ بتائیں۔“

”تو پھر کب بتاؤں؟“ راحمہ تنک کر بولی۔

”ہو سکتا ہے معاملہ سیٹل ہو جائے۔“

”پھر بھی..... عاقب کو پتا تو چلے گا نا کبھی کبھی..... وہ جگڑیں گے مجھ پر کہ اتنی بڑی بات تم مجھ سے چھپا لگیں..... لڑکی اپنے گھر سے رات کو ہمارے گھر آگئی۔ رات اس نے تمہارے کمرے میں گزار دی..... اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ وہ درمیان کی دیوار سے ہمارے گھر میں کووی ہے..... پولیس نے آکر پوچھ گچھ کر لی ہے..... اب کیا میں

اس بات کا انتظار کروں کہ تمہارے بجائے پولیس مجھے تھانے لے جا کر بٹھا دے اور تب تمہارے بھائی کو اطلاع ہو اور وہ مجھے چھڑانے آئیں..... نہ بابا نہ تمہاری وجہ سے میں اپنی عزت اور اپنے گھر کو داؤ پر نہیں لگا سکتی..... جانتے ہوتا کتنے غصے والے ہیں تمہارے بھائی۔“

”جانتا ہوں بھابی۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔
بینک سے چھٹی کے بعد وہ پریشانی کے عالم میں بہت دیر بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا پھرا۔ فرقان کے ہاں جانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ راحمہ نے اس دوران دو تین مرتبہ فون کیا۔ اس نے ثاقب کو خبر دے دی تھی۔ وہ نہایت پریشان ہوا تھا۔

”بھائی نے کیا کہا آپ سے؟“

”کہہ رہے تھے ایمر جنسی کی بنیاد پر چھٹی لینے کی کوشش کرتا ہوں اور پاکستان آتا ہوں..... عاطف اور رخشندہ تو کل پہنچ رہے ہیں۔“

”اچانک!“ عاقب چونکا۔

”اچانک نہیں..... عاطف کو ثاقب نے فون کیا تھا۔ وہ چھٹیوں پر ہے۔ اسے چھٹی لینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لہذا وہ اور رخشندہ تو کل آرہے ہیں۔“

عاقب کو اس خبر سے حوصلہ بھی ملا مگر اس خیال سے پریشانی بھی ہوئی کہ بھائی آکر اس کا نہ جانے کیا حشر کریں گے۔
رات ہونے پر وہ فرقان کے گھر پہنچا اور اسے عاطف کی یقینی اور ثاقب کی ممکنہ آمد کی اطلاع دی۔

”چلو اچھا ہوا..... انہیں بتانا ضروری بھی تھا..... وہ آئیں گے تو معاملہ کچھ نہ کچھ سنبھال ہی لیں گے۔“

”ماہ لور ٹھیک ہے؟“ عاقب نے دہلی زبان سے پوچھا۔

”ہاں..... امی اور بہنوں کے کمرے میں ہی ہے..... امی بتا رہی تھیں بہت سادہ لڑکی ہے..... خالو اور ماموں کے ڈر سے اس کا دم نکلا ہوا ہے..... کہتی ہے میں گھر گئی تو وہ مجھے مار دیں گے..... خاندان میں اس سے پہلے بھی ایک لڑکی کو پسند کی شادی پر مارا جا چکا ہے۔“

”مجھے نہیں بتایا اس نے۔“

”تم نے اسے دوسری ہی باتوں میں جوا لہجائے رکھا ہوگا۔“

”غلطی ہوگئی فرقان بھائی۔“

”مگر دیکھو اب پیچھے مت ہٹنا..... اس غلطی کو اب

نبھانا ہے۔“

عاقب نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“

”نہیں..... شکریہ..... بس چلتا ہوں۔“

”کیا گھر جاؤ گے؟“

”نہیں..... آج تو نہیں..... گاڑی کسی پبلک پلیس پر کھڑی کروں گا اور اسی میں سو جاؤں گا..... اول تو نیند کے آتی ہے۔“

”بھابی؟“

”وہ پہنچ کر لیں گی۔“

”والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم سے کہتا یہیں سو جاؤ۔“

”نہیں نہیں ٹھیک ہے..... فرقان بھائی مردوں کا کیا..... کہیں بھی پڑ سکتے ہیں..... ماہ لور کا مسئلہ تھا..... آپ نے اسے اپنے گھر میں رکھ کر بڑی مہربانی کی۔“

”والدہ کو دعائیں دو۔“

”بہت دعائیں فرقان بھائی۔“

”احتیاطاً کل تم بینک نہ آؤ تو بہتر ہے۔“

”ہاں یہی میں بھی سوچ رہا تھا..... پولیس نے بھابی سے مجھ سمیت گھر کے تمام لوگوں کے بارے میں تو انفارمیشن لے لی ہے..... پولیس بینک آگئی اور مجھے لے گئی تو بدنامی ہوگی۔“

”بیٹے مجھے تو تمہاری نوکری بھی اب خطرے میں لگ رہی ہے۔“

”یہاں زندگی خطرے میں لگ رہی ہے فرقان بھائی۔“

”مخاطر ہو۔“

”چلتا ہوں۔“

”اوکے۔“

☆☆☆

رات گیارہ بجے تک وہ راحمہ سے فون پر رابطے میں رہا۔ پھر ایک کاروباری مرکز کی پارکنگ لائٹ میں جگہ تاک کر گاڑی کھڑی کی اور پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی مگر..... سولی پر بھی آجاتی ہے کے مصداق بالآخر وہ سو ہی گیا..... رات کو دو سو او بچے کا وقت تھا جب اس کے موبائل کی آواز نے اسے نیند سے جگایا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ راحمہ کا نمبر تھا۔

”جی بھابی۔“

”عاقب! پولیس آئی تھی۔“ راحمہ نے دہلی دہلی آواز میں بتایا۔

”اچھا!“ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا..... میں نے ای کو بلا لیا تھا..... انہیں مجبوراً سب کچھ بتانا پڑا تھا..... انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا..... اب تو ماہ نور کے گھر والوں کا بھی اور پولیس کا بھی تم پر شک پکا ہے..... محلے والوں کو بھی پتا چل گیا..... بدنامی ہے عاقب..... تم نے کسی کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا ہمیں۔“

”یہ باتیں بعد میں کر لیجیے گا..... یہ بتائیں پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا..... پولیس کی موبائل وین آئی تھی..... چلے گئے پولیس والے لیکن مجھے یقین ہے پھر آئیں گے..... ہو سکتا ہے کل تمہارے بینک بھی جائیں۔“

”عاشر کو گھر کے اندر ہی رکھیے گا بھائی۔“

”مجھے اسی کا ڈر تھا..... آپا امی کو میرے پاس چھوڑنے آئیں تو میں نے عاشر کو ان کے ساتھ ہی بھیج دیا..... ایک تو اس خیال سے کہ بچہ ہے کچھ الٹی سیدھی نہ بول دے کسی سے..... دوسرے ماہ نور کے گھر والوں کا کیا اعتبار میرے بچے ہی کو کوئی نقصان پہنچا دیں..... تم نے اچھا نہیں کیا عاقب۔“

”بھائی اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔“

”آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

☆ ☆ ☆

خالہ کے گھر میں ماہ نور کے کمرے سے عاقب کے خلاف ثبوت بھی مل گیا۔ ویلنٹائن ڈے پر عاقب نے اسے گھر کی اسی دیوار پر سے جسے پھلانگ کر وہ اس کے پاس آئی تھی ایک ٹیڈی بیئر اور اس کے ساتھ گلاب کے پھول کی ایک مصنوعی ٹہنی دی تھی۔ دونوں چیزوں کو اس نے اپنی الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تو یہ دونوں چیزیں ہاتھ لگیں۔ ٹیڈی بیئر کے گلے میں جھولتے چھوٹے سے کارڈ پر لکھا تھا۔ ”ٹو مائی ٹو ماہ نور..... فرام عاقب۔“

پولیس کو عاقب کی تلاش میں اس کے بینک پر چھاپا مارنے کے لیے یہ ثبوت کافی تھا مگر عاقب بینک سے غیر حاضر تھا۔ نمبر نے پولیس کے استفسار پر فرقان سے پوچھا۔ ”عاقب کے بارے میں کوئی خبر ہے فرقان صاحب؟“

”جی نہیں۔“ فرقان نے سپاٹ چہرے کے ساتھ

لا علمی کا اظہار کیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن عاطف اور رخشندہ کراچی پہنچ گئے۔ جاوید اختر کے گھر کی چھت جہاں شاڈ ہی کوئی فرد نظر آیا کرتا تھا چہل پہل کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ایک آتا ایک جاتا اور ہر آتے جاتے کی نظر ادھر ہی ہوتی۔ ماہ نور کی الماری سے ملنے والے ویلنٹائن کارڈ اور عاقب کے گھر سے غائب ہونے اور بینک سے غیر حاضری نے ماہ نور کے گھر والوں کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ انہوں نے ماہ نور کی گمشدگی کیس میں عاقب کو ملزم نامزد کر دیا تھا۔

جاوید اختر زمان کی شہر کے کاروباری حلقے میں اچھی ساکھ تھی۔ اپنے علاقے کے حوالے سے سیاسی اثر و رسوخ بھی تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران تک بھی رسائی تھی۔ لڑکی کی بازیابی عزت و وقار کا معاملہ تھا۔ داسے، درے، ستنے ہر طرح سے وہ ماہ نور کی جلد از جلد بازیابی کی کوشش کر رہے تھے۔ جاوید اختر کے اثر و رسوخ کی بنا پر تفتیشی اہلکاروں کی کارروائی گھنٹوں میں کر رہے تھے۔ جہاں عام آدمی اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کی پولیس کو فریاد کرنے جائے اور خود ہی مجرم بنا کر بٹھالیا جائے وہاں ماہ نور کی بازیابی کے لیے پولیس کا دوسرے ہی دن عاقب کے بینک پہنچ جانا جاوید اختر کے اثر و رسوخ کی ہی دلیل تھی۔

جاوید اختر کے گھر سے زبانی کلامی دھمکیاں بھی ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ راحہ گھر میں اکیلی ہوتی تو شاید گھر چھوڑ کر ہی چلی گئی ہوتی مگر عاطف اور رخشندہ کے آجانے سے اس کو حوصلہ مل گیا تھا۔ عاقب بھی ایمر جنسی میں چھٹی لے کر پہلی دستیاب پرواز سے وطن آنے کے لیے بے چین بیٹھا تھا۔

عاطف نے آتے ہی راحہ سے واقعے کی تفصیلات حاصل کیں۔ سم ٹریکنگ کے خوف سے عاقب نے پرانی سم کی جگہ نئی سم لگالی تھی۔ راحہ سے نیا نمبر لے کر عاطف نے عاقب کو فون کیا تو اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ راحہ نے اپنے نمبر سے اس کی بات کرائی۔

”کہاں ہو؟“ عاطف کے لہجے سے ناراضگی عیاں تھی۔

”یہیں ہوں بھائی۔“ عاقب مردہ سی آواز میں بولا۔

”یہیں کے بچے! یہ کیا کیا ہے تو نے۔“ ہمیشہ نہایت

میٹھے لہجے میں بات کرنے والا بھائی انتہائی حقارت سے بات کر رہا تھا۔ وہ چپ رہا۔ کہنے کو تھا ہی کیا۔ ”فرقان بھائی کا نمبر دو مجھے۔“

”اوکے۔“

مصیبت کی اس گھڑی میں عاطف کو فرقان ہی سے رجوع کرنا تھا۔ اپنے خاندان والوں کا تو اسے پتا تھا نہ کسی میں اتنی سمجھ تھی کہ اس سرپڑی سے نکلنے کی کوئی راہ بچا سکتا۔ ثاقب نے بھی فون پر اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ فرقان سے رابطہ کرے۔

فرقان پیسے کے اعتبار سے تو بیچارہ تھا مگر سیاست اس کا شوق، دلچسپی اور شاید حالات کا تقاضا بھی تھا۔ ملکی سیاست پڑھے لکھے، دہنگ اور مضبوط کردار کے حامل افراد کی طلب گار تھی۔ فرقان اپنی خاندانی ذمہ داریوں اور پہلے تعلیم پھر روزی، روٹی کے چکر میں سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا تو نہ بناسکا تاہم ایک سیاسی جماعت سے اس کی ذہنی وابستگی ضرور ہوگئی تھی۔ اسے بارہا اس جماعت میں سیاسی عہدوں کی پیشکش ہوئی مگر اس نے عہدہ لینے کے بجائے بلا عہدہ کام کرنا زیادہ پسند کیا۔ وہ خود کو جماعت کا ”ادنیٰ کارکن“ کہا کرتا تھا مگر جماعت کے بڑے بھی اس کی سیاسی بالغ نظری کے معترف تھے۔ تھا تو وہ جوان مگر اس کی ”اپروچ“ جماعت کے بزرگوں کو بھی حیران کر دیتی تھی۔ جماعت میں جب کوئی بحران پیدا ہوتا وہ اس بحران کا حل نکالنے والوں کے اجلاس میں ضرور بلایا جاتا۔ اپنا کام کر کے وہ خاموشی سے منظر سے نکل جاتا۔ والدہ کی خواہش و ہدایت اور اپنی خاندانی ذمہ داریوں کے باعث فرقان علی کو اپنا ”ایکسپوڈر“ یا ٹکا ہوں میں آنا پسند نہیں تھا۔ گھر میں ایک نہیں کئی عورتیں اسی کو اپنا کھیون ہار سمجھتی تھیں۔ نہ وہ انہیں مایوس کرنا چاہتا تھا نہ کسی آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ پھر بھی وہ لوگوں کی نگاہوں میں تھا۔ اپنے ہی نہیں مخالفین بھی اسے جانتے تھے اور یہ پہچان اسے لوگوں سے تعلقات اور گھر سے باہر آمد و رفت میں محتاط رہنے کا پابند کرتی تھی مگر ثاقب کے گھرانے سے اس کے تعلقات ہر احتیاط سے ماورا تھے۔ ثاقب اس کا دوست تھا۔ عاطف اور عاقب کو وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا بلکہ عاقب تو اس کی نظر میں بچہ تھا۔ بینک میں اسے ملازم رکھوانے میں اس کی کوشش بھی شامل تھی۔ ہر انسان کی طرح فرقان بھی اپنی ذات میں متضاد صفات سے ماورا نہ تھا۔ عاقب کو بچہ سمجھتا مگر کبھی کبھی اس سے ہم عمروں کی طرح راز و نیاز کرنے لگتا۔ عاقب کو ماہ نور سے چٹائیں بڑھانے کی صلاح اس کی انہی متضاد صفات کا شاخسانہ تھا اور اپنی اس غلطی کے ازالے کے لیے وہ اس مسئلے کے حل میں اپنا حصہ بنانے کا خواہاں تھا۔

عاطف کا فون آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ عاقب کا فون آگیا۔ ”فرقان بھائی عاطف بھائی نے آپ کا نمبر لیا تھا مجھ سے، آپ کی بات ہوئی؟“

”ہاں..... وہ ادھر ہی آرہا ہے۔“
”فرقان بھائی انہیں ذرا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کیجیے گا..... بہت غصے میں لگ رہے تھے وہ۔“
”تمہیں تو الٹا لٹکا دینا چاہیے..... سارے گھر کو پریشان کر کے رکھا ہوا ہے تم نے۔“
”بس اس دفعہ معافی دلوا دیں..... آئندہ میرے باپ کی بھی توبہ۔“

”معافی ملنا آسان نہیں بیٹے..... تمہارے گھر والے تو شاید معاف کر دیں مگر لڑکی کے گھر والے اور پولیس نہیں بخشے گی تمہیں۔“

عاطف آیا تو دونوں بہت دیر بیٹھے اس معاملے کی ہر اونچ نیچ پر غور کرتے رہے۔ اس دوران عاطف کے ایما پر فرقان نے فون کر کے عاقب کو بھی بلالیا۔ وہ آیا تو سر جھکا ہوا تھا نظریں نیچی تھیں۔ عاطف نے اسے زہر خند لگا ہوں سے دیکھا اور ترشی سے یولا۔ ”جی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دیا جائے۔“

اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔
”سر جھکانے سے کام نہیں چلے گا..... پرسوں ثاقب بھائی بھی پہنچ رہے ہیں۔ وہ دیکھنا کیا حشر کریں گے تمہارا۔“
”وہ تو جو حشر کرے سو کرے۔ خدا نخواستہ یہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ جو حشر کریں گے اس کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا..... لڑکی کا معاملہ ہے مذاق بات نہیں..... اور ابھی تو وہ اپنے گھر واپس جانے سے انکار کر رہی ہے۔ اگر کہیں اس نے گھر واپس جانے کا ارادہ کر لیا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں..... لڑکی کے اغوا کا مقدمہ بنے گا اور یہ سیدھا اندر۔“
فرقان نے کہا۔

”سن لیا!“ عاطف نے اسے گھورا۔ وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔ ”یہ رہ کہاں رہا ہے؟“ عاطف نے فرقان کو دیکھا۔

”پوچھ لو۔“ فرقان نے کہا۔
”ہاں سمجھی کہاں.....؟“
وہ حنہ بذب دکھائی دینے لگا۔
”جو گھر کا نہیں رہتا وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا عاطف۔“
فرقان نے کہا۔

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... اور گھر کا وہی نہیں

رہتا جسے گھر کی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔“ عاطف کے لیے
میں جی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن تفتیشی افسر پھر آیا اور اس نے عاطف سے
دھمکی آمیز لہجے میں بات کی۔ ”شام تک اگر تمہارا بھائی
تھانے نہ پہنچا تو تمہیں اور تمہارے گھر کی عورتوں اور بچوں کو
اٹھا کر لے جاؤں گا..... بند کروں گا تھانے میں۔“
”جرم بھائی نے کیا ہے اور پتا نہیں کیا بھی ہے کہ نہیں
اور دھمکی آپ مجھے اور میرے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اٹھا
کر لے جانے کی دے رہے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے انسپکٹر
صاحب۔“ عاطف بگڑ کر بولا۔

”اتنی عجیب بھی نہیں..... جب تم اور تمہارے گھر کی
عورتیں تھانے میں ہوں گی تو وہ کیا اس کا باپ بھی آئے گا۔“
”پلیز!“ عاطف نے بدزبانی پر ٹوکا۔ ”بھائی کی
کشدگی سے ہم لوگ خود پریشان ہیں۔“

”آجائے گا..... پریشان ہونے کی ضرورت
نہیں..... جب اسے پتا چلے گا کہ گھر والے لاک اپ میں
ہیں تو وہ سامنے آجائے گا..... مگر ہمیں لڑکی بھی چاہیے.....
شرم نہیں آتی دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالتے۔“ تفتیشی
افسر نے اہانت سے کہا پھر تیوری چڑھائی۔ ”لڑکی کی بازیابی
ضروری ہے۔“

”آپ پورا گھر دیکھ سکتے ہیں۔“ عاطف نے کہا۔
”اوائے اہتوق سمجھتے ہو نہیں..... لڑکی کوئی تم نے
اس گھر میں رکھی ہوگی۔“

”تم سے آپ کا مطلب؟“ اب عاطف نے تیور بدلا۔
”تمہارا بھائی۔“ انسپکٹر نے اپنی بھوئی اچکا لیں۔
”مطلوب آپ کو میرا بھائی ہے اور غصہ آپ مجھے دکھا
رہے ہیں۔“

”اس سے کہو شام تک تھانے پہنچ جائے ورنہ..... خیر
نہیں۔“ تفتیشی افسر نے آنکھیں دکھائیں۔ عاطف نے
خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

شام ہو گئی۔ رات بھی خیریت سے گزری۔ اگلے روز
تفتیشی افسر پھر آدھمکا۔ ”آپ سے تو وہ ضرور ہوگا رابطے
میں۔“ اس نے عاطف کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”جی نہیں..... میں تو خود اس کے غائب ہونے کی خبر
سن کر باہر سے آیا ہوں..... آپ مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے
ہیں۔ میں کے الزام دوں..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرا
بھائی ہی کسی واردات کا شکار ہوا ہو۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے رپورٹ کیوں نہیں
کرائی ابھی تک؟“

”تلاش کر رہے ہیں ہم..... خدا خواستہ نہ ملا تو
رپورٹ ہی کرائیں گے۔“

”اسے حاضر کرو تھانے میں۔“

”کہاں سے حاضر کریں؟“

”کہیں سے بھی۔“

ثاقب آیا تو عاطف اسے ساتھ لے کر بڑی
رازداری سے فرقان کے پاس پہنچا اور تینوں میں خاصی دیر
گفتگو رہی۔ فرقان نے کہا۔ ”اب بچاؤ کا صرف ایک ہی
راستہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ان دونوں کا نکاح کر دیا جائے اور لڑکی یہ بیان
دے دے کہ وہ بالغ ہے اپنی مرضی سے آئی ہے اور اس نے
اپنی پسند سے عاقب سے شادی کی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے فرقان..... عاقب کی مانگ پھپھو
کے گھر میں ہے وہ لوگ شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔“
ثاقب بولا۔

”سوچ لو..... میں نے تو وہ صلاح دی ہے جس سے
عاقب کی بچت ہو سکتی ہے..... اور تم سب بھی کسی بڑی
پریشانی سے بچ سکتے ہو۔“

”گھر والوں سے مشورہ کر لیا جائے۔“ ثاقب نے کہا۔
”مجھے جیسے معلوم نہیں کہ گھر میں کون ہے..... دو
خواتین بے چاری جنہیں قانونی موٹکائیوں سے دور کا بھی
واسطہ نہیں۔ جو تم کہو گے اسے آئنا صدقہ کہیں گی۔“

”اس کہنے سے تو پوچھنا پڑے گا کہ وہ راضی ہے یا
نہیں۔“ ثاقب نے غصے سے کہا۔

”اسے راضی ہونا پڑے گا میرے بھائی اور یہ کام
فورا کرنے والا ہے۔“

”لڑکی راضی نہ ہوئی تو؟“

”یہی بات تو عاقب کے حق میں جا رہی ہے کہ لڑکی
کہتی ہے وہ شادی کرے گی تو صرف عاقب سے۔“

”تم سے کس نے کہا؟“

”گھر کی خواتین سے وہ خاصی بے تکلف ہو گئی ہے۔“

”بلاؤ اس خبیث کو۔“ ثاقب نے عاطف سے کہا۔

عاطف نے فرقان کو دیکھا۔ ”فرقان بھائی آپ فون کریں۔“

”میں کیسے لیتا ہوں۔“

عاقب آیا تو اسی طرح سر جھکائے اور شرمندہ شرمندہ

سا۔ ثاقب نے اسے جی بھر کر صلواتیں سنائیں۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا۔

”الو کے پٹھے اجیل کی ہوائیں کھانا چاہتا تو تیرا اس سے نکاح کرنا پڑے گا ہمیں۔“ ثاقب نے کہا۔

عاقب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس سے تمہارا سو فیصد تو نہیں لیکن بڑی حد تک بچاؤ ہو جائے گا۔“ فرقان بولا۔

”بتا کیا مرضی ہے تیری؟“ ثاقب نے اس سے

جواب کے لیے تقاضا کیا۔ وہ چپ رہا۔ ایک ذرا سی بھول

نے اسے تعزیرات میں دھکیل دیا تھا۔ پٹھے بول بولنے والی زبانیں اس سے تو مذاق کر رہی تھیں۔

ثاقب نے عاطف کو اشارہ دیا کہ وہ اس سے

پوچھے۔ ”بول بھی کیا مرضی ہے تیری؟“

”بتاؤ عاقب۔“ فرقان نے کہا۔

”آپ لوگوں کی مرضی۔“ وہ دبی زبان سے بولا۔

”ہماری مرضی کا تو نے اس وقت تو نہیں سوچا ہوگا

جب لڑکی تیرے پاس آئی تھی۔“ ثاقب نے غصے سے کہا۔

”آگے کی سوچو۔“ فرقان نے ثاقب کو ٹھنڈا کرنے

کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے فرقان..... تم نے جو سوچا ٹھیک ہی سوچا

ہے۔ لڑکی سے بھی پوچھ لو۔“

فرقان اٹھا اور اس نے اندر جا کر والدہ سے بات کی۔

نکاح خواں کا بندوبست فرقان ہی نے کیا۔ ”نکاح

نامے کی خانہ پری کی جانے لگی تو مہر کی رقم کے بارے میں

ثاقب، عاطف، عاقب اور فرقان نے ایک طرف ہو کر

آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ عاقب نے بھائیوں پر چھوڑا

اور دونوں بھائیوں نے اتفاق رائے سے کہا۔ ”شرعی مہر۔“

”یعنی؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ساڑھے تیس روپے۔“

فرقان نے اختلاف کیا۔ ”مہر شرعی سے مراد ہے وہ

مہر جو شرع محمدی کے مطابق مرد کی حیثیت دیکھ کر مقرر کیا

جائے..... میرا خیال ہے مہر دولاکھ سے کم نہ رکھا جائے۔“

”دولاکھ!“ ثاقب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”اس

بھگوڑی کی اوقات ہے اتنی۔“

”وہ تمہارے گھر کی عزت بننے جا رہی ہے ثاقب۔“

فرقان کو ثاقب کی بات بری لگی تھی۔

”فرقان بھائی کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو یہ کہاں سے

دے گا دولاکھ۔“ عاطف نے دبی زبان سے کہا۔

”اونچ نیچ کی نیت کیوں رکھی جائے۔“ فرقان بولا۔

عاطف اس کی بات پر جھینپ گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں

تھا۔“ اس نے کہا۔

”میرا بھی وہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو..... لڑکی کا

وکیل بنا ہوں..... اس کے حق کا تحفظ میری ذمہ داری

ہے..... ختم ہو چکی ہے..... اس وقت اس کا اپنا کوئی نہیں.....

نہ ختم لوگوں نے اسے عروسی جوڑا دیا ہے نہ کوئی زیور.....

مہر دولاکھ سے کم نہیں ہوگا۔“

ثاقب اور عاطف نے ایک دوسرے کو دیکھا اور عاقب

نے ان دونوں کا کنکھوں سے جائزہ لیا۔ گھر کے اندر فرقان

کے گھر کی خواتین ماہ نور کو اوڑھانے کے لیے سرخ رنگ کا کوئی

دوپٹا تلاش کر رہی تھیں۔ مہر دولاکھ روپیہ ہی لکھا گیا۔

عاقب اور ماہ نور کا نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد ثاقب اور عاطف یوں گھر واپس

ہوئے جیسے میت کی تدفین کر کے آنے والے قبرستان سے

لوٹا کرتے ہیں۔ گاڑی عاقب کے پاس تھی۔ ثاقب اور

عاطف نے گاڑی اسی کے پاس رہنے دینا مناسب سمجھا۔

فرقان ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر پہنچانے آیا۔ ثاقب

نے اسے اصرار کر کے کھانے کے لیے روک لیا۔ عاقب اور

ماہ نور کے نکاح کی خبر نے راحمہ اور رخشندہ دونوں کو ششدر

کر دیا۔

”پچھو کو کیا جواب دیں گے؟“ رخشندہ نے عاطف

سے کہا۔

”کیا کرتے مجبوری تھی۔“ عاطف کے لہجے میں دل

مرفتگی تھی۔

راحمہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ اس کے جذبہ حسد کو

تسکین ملی تھی۔ ماہ نور سے عاقب کے نکاح کے بعد نسرین

کے اس گھر میں بیاہ کر آنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی

اس گھر میں آ کر رخشندہ ہی کی طرح اپنی اوقات بھول جاتی۔

کھانے کے بعد ثاقب نے راحمہ سے قہوہ بنانے کو کہا

اور تینوں مردلان میں آ بیٹھے۔ عاطف کو یکا یک خیال آیا۔

اس کا موبائل فون بیلنس ختم ہونے کو تھا۔ فرقان کی گاڑی کا

قائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نزدیکی مارکیٹ سے فون کارڈ لینے

چلا گیا۔ ابھی واپس نہ لوٹا تھا کہ ماہ نور کے گھر والوں کی مخبری

پر پولیس کا چھاپا پڑا اور ثاقب کے ساتھ پولیس فرقان کو بھی

لے گئی۔ عاطف گھر لوٹا تو راحمہ اور رخشندہ سراپیمہ گیٹ کے

باہر کھڑی ملیں۔ آئندہ خطرے کے پیش نظر عاطف نے ان

دونوں اور عاشر کو لے کر فوراً وہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ

☆☆☆

خاندان بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقب نے کسی لڑکی کو بھگا کر اس سے نکاح کر لیا تھا۔ نسرین کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہوا تھا۔ عاقب کی پھوپھی ہاتھ مل مل کر عاقب اور اس لڑکی کو کلپ کلپ کر بددعا میں دے رہی تھیں۔

گو فرقان کا بہ ظاہر کوئی بچ نہ تھا مگر شومی قسمت کہ علاقہ تھانے کا ایس ایچ او جو مخالف جماعت کا بھروسہ سمجھا جاتا تھا اس کا چہرہ آشنا تھا۔

”تو آپ ہیں لڑکی کے اغوا کے پیچھے۔“ ایس ایچ او جانباز علی نے اپنا ڈنڈا ہاتھ کی پھٹلی پر دھیرے دھیرے مارتے ہوئے کہا۔

”جناب! یہ میرے دوست ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔“ عاقب نے صفائی پیش کی۔

”چور کا پارگرہ کٹ.....“ ایس ایچ او نے تحقیر سے کہا۔

”آپ تو ہین کر رہے ہیں ایس ایچ او صاحب۔“

فرقان نے احتجاج کیا۔

”تو ہین!“ ایس ایچ او نے اسے گھورا پھر عاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والوں کا ساتھ دیتے ہو..... شرم نہیں آتی پھر اپنے جلسوں جلوسوں میں نعرے لگاتے ہو کہ ہم بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں کے رکھوالے ہیں۔“

فرقان نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر عاقب نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح دی کہ اس وقت چپ رہنے میں عافیت تھی۔

ایس ایچ او نے اپنے معاون اہلکاروں کو طلب کیا اور دونوں کو حوالات میں بند کر دینے کا حکم دیا۔ عاقب نے گھبرا کر فرقان کو دیکھا۔

”جب تک لڑکی اور لڑکا تھانے میں پیش نہیں ہو جاتے تم دونوں حوالات میں رہو گے۔“ ایس ایچ او نے عاقب اور فرقان کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میں..... میں ایک کال کر سکتا ہوں؟“ فرقان نے کہا۔

”کے کرو گے؟ پارٹی کو؟“

”جی نہیں..... اپنے دوست کو۔“

”کرلو!“ ایس ایچ او کا انداز کچھ اس طرح تھا جیسے کہتا ہو کہ لو فون دیکھتا ہوں تمہارا فون کرنا کیا کام دکھاتا ہے۔

شہر کے ایک دوسرے تھانے کے انچارج اشفاق احمد سے فرقان کے بہت پرانے مراسم تھے۔ دونوں ایک ہی

کالج سے فارغ التحصیل تھے۔ گریجویشن کے بعد اشفاق نے پولیس کے محکمے میں نوکری کر لی تھی۔ فرقان نے بینکاری کا شعبہ اپنایا تھا۔ اشفاق اور جانباز علی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہم پیشہ تھے۔ ہم عہدہ تھے۔ ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کو ممنون احسان بھی کرتے رہتے تھے۔

فرقان نے اشفاق کے موبائل یا آفس کے نمبر پر فون کرنے کے بجائے اس کی بیوی کے نمبر پر فون کیا اور اسے محتاط الفاظ میں بتایا کہ وہ اس وقت فلاں تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ وہ یہ بات اپنے شوہر کو ضرور بتا دے۔

”آپ فکر نہ کریں بھائی میں ابھی ان کے موبائل پر بات کرتی ہوں۔“ اشفاق کی بیوی نے کہا۔

”اور ہاں اسے کہیں والدہ کو ذرا تسلی دے دے۔ انہیں پتا چلے گا تو وہ بہت پریشان ہوں گی۔“

”او کے او کے۔“

فرقان کو یقین تھا اشفاق اس کی خیر خبر ضرور لے گا۔ وہ اگر اس وقت مشکل میں تھا تو کیا بارہا فرقان کے کام آیا تھا۔ جماعت کے اثر و رسوخ پر اسے اس کی مرضی کے تھانوں میں تعیناتیاں دلوائی تھیں۔ مجرموں تک رسائی میں جماعت کے ایکٹوسٹوں سے اسے مدد دلوائی تھی۔ اسے آنا چاہیے تھا آخر آئندہ بھی تو اسے اسی شہر میں نوکری کرنی تھی۔ آئندہ بھی کام پڑنے تھے۔ فطرتاً بھی اشفاق بے فیض اور طوطا چشم نہیں تھا۔ اسے دوستی اور تعلق کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ اس کی بیوی کے بھی فرقان کی والدہ، بہنوں اور بیگم سے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں گھرانوں میں ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔

عاقب اور فرقان کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ حفظہً ماتقدم کے طور پر راحہ، رخشندہ اور عاشر کے ساتھ خود بھی اپنی سسرال منتقل ہو جانے کے بعد عاطف اپنے زیر استعمال فرقان کی گاڑی اس کے گھر پہنچانے گیا تو اس کی والدہ ہول لگیں۔ ”فرقان کہاں ہے؟“

”آجائیں گے..... آپ پریشان نہ ہوں۔“ عاطف نے انہیں تسلی دی۔

”ہے کہاں وہ؟“

”آجائیں گے..... آجائیں گے۔“

”مجھے بتاؤ تو..... تم اس کی گاڑی کیوں لے کر آئے ہو۔“ والدہ روہانی ہو گئیں۔

عاطف کو انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیے بنا چارہ نہ

رہا۔ ان کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ عاقب اور ماہ نور جنہیں گھر کی خواتین نے ان کے نکاح کی خوشی میں اچھا کھانا کھلانے کی تیاری کر رکھی تھی چور بنے بیٹھے تھے انہی کی وجہ سے اس گھر کا واحد مرد حوالا ت چلا گیا تھا۔

”میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے کہوں!“

فرقان کی والدہ سینہ پیٹ رہی تھیں۔

”آہستہ امی..... مجھے والوں کو آواز گئی تو اور مشکل ہو جائے گی۔“ فرقان کی بہن نے ماں کو سمجھایا۔ فرقان کی والدہ کو اپنے گھر میں عاقب اور ماہ نور کی موجودگی سخت کھٹک رہی تھی۔ سمجھدار اور محمل مزاج نہ ہوتیں تو شاید دونوں پر برس ہی پڑتیں۔ بعید نہ تھا کہ اپنے گھر سے نکال باہر کرتیں۔

”آئی! آپ فکر نہ کریں..... فرقان بھائی آجائیں گے..... انہوں نے ہماری پریشانی میں ہمارا ساتھ دیا ہے..... ہم ان کے لیے اپنا خون بھی بہانے سے دریغ نہیں کریں گے۔“ عاتق نے کہا۔

”جیہی تم یہاں بیٹھے ہو آرام سے اور میرا بچہ.....“

والدہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور سب چوٹے۔ فون کال اشفاق کی تھی۔ وہ

فرقان کی والدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں بیٹے..... میں بات کر رہی ہوں۔“

”السلام علیکم آئی۔“

”وعلیکم السلام۔“

”آئی میں اس وقت فرقان کے پاس ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”کیسے بے فکر ہو جاؤں بیٹے..... مجھ بیوہ کی وہ ایک ہی آنکھ ہے۔“

”میں جانتا ہوں..... جانتا ہوں آپ اس سے کتنا پیار کرتی ہیں..... میرا بھی وہ دوست نہیں بھائی ہے.....

انشاء اللہ اس کا بال بھی پیکا نہیں ہوگا۔ میں اسے خود اپنے ساتھ گھر لے کر آؤں گا۔“

”میری اس سے بات تو کرواؤ۔“ والدہ کے لہجے میں ایک گونہ بے قراری تھی۔

”ہاں..... کر لیں۔“

”السلام علیکم!“ فرقان نے اشفاق سے فون لے کر کہا۔ والدہ اس کی آواز سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”پلیز امی۔“

”دیکھائیے ہوتا ہے پرانے پھلے میں پڑنے کا انجام۔“

”امی! احتیاط سے..... اس وقت تو خیر میں اشفاق

کے فون سے بات کر رہا ہوں اور میں نے اسے ساری بات بتا بھی دی ہے مگر جب تک میں یہاں ہوں احتیاط سے بات کریں..... جیسے اس قصے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے سمجھ گئی۔“

فرقان نے فون اشفاق کو تھما دیا۔

”ٹھیک ہے آئی..... میں خود آؤں گا آپ کی طرف۔“

”میرا بچہ کب گھر آئے گا؟“

”آجائے گا..... آجائے گا..... آپ تسلی رکھیں۔“

ایس ایچ او جانباز علی سے اپنے مراسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اشفاق اپنی فتنہ داری پر فرقان کو لاک اپ سے باہر نکال لایا تھا اور دونوں تھانے کے ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے تحلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ اشفاق نے اس کے لیے چائے بھی منگوا لی تھی۔ ”رات میں نے تیرے ساتھ ہی گزارنی ہے۔“ اشفاق نے فرقان سے کہا۔

”کیوں؟“ فرقان چونکا۔

”کیونکہ میں اگر تیرے ساتھ نہ بیٹھا تو جانباز علی کی نیت اچھی نہیں لگتی مجھے تیرے بارے میں۔“

فرقان کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”کچھ کہا اس نے؟“

”ہاں..... کہہ رہا تھا لڑکی والے سورس فل لوگ ہیں..... آئی جی تک جا پہنچے ہیں..... آئی جی کہتا ہے چوبیس گھنٹے میں لڑکی بازیاب ہو جانی چاہیے..... لڑکی کی بازیابی کے لیے تم دونوں کی چھتر دل چھنی ہے۔ میں رات بھر تمہارے ساتھ بیٹھا رہوں گا۔ جانباز کچھ تو مروت کرے گا میری۔“

”ثاقب کا کیا ہوگا..... وہ بے چارہ تو کمزور سا آدمی ہے میری طرح سخت جان نہیں..... دو منٹ کی چھتر دل بھی برداشت نہیں کر سکے گا..... اگلے دے گا سب کچھ۔“

”ایسے کمزور لوگوں کے لیے تم کیوں خود کو خطرے میں ڈالتے ہو..... معلوم ہے نا جانباز علی تمہاری جماعت سے کتنی خار رکھتا ہے۔“

”معلوم ہے۔“

”دو دن پہلے تمہاری مخالف جماعت کا جولیڈ مارا گیا ہے وہ جانباز علی کا قریبی تھا۔ اس کی پر خاش میں وہ تمہیں کوئی زک پہنچا سکتا ہے۔“

”تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی؟“

”ہاں..... جب میں آیا تو تھوڑی دیر اس کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ یہ جو بندے تم نے اٹھائے ہیں ان میں فرقان میرا جگری ہے۔ اسے کچھ نہیں

سب سہہ سکتا ہوں..... نوکری کی بھی پروا نہیں..... رزق دینے والا اوپر بیٹھا ہے..... مگر..... تم شاید پولیس کی سختی نہ سہہ سکو کیونکہ میری طرح سخت جان نہیں ہو..... جب کل بھی مسئلے کا حل یہی ہے، آج بھی یہی تو..... سوچ لو۔“ فرقان نے کہا۔

”میں نے کیا سوچتا ہے یار..... سوچتا تو اس خبیث عاقب کو چاہیے تھا لاک اپ کا بس نام ہی سنا تھا اس نے اندر بٹھا دیا۔“ ثاقب کے لہجے میں ملال تھا۔

”بہتر ہے یہاں سے جلدی نکلو..... میں خود بھی پولیس والا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو پولیس کے شکنجے میں نہ آئے وہی اچھا..... خواہ مخواہ تمہارا پیسا بھی خرچ ہوگا وقت بھی ضائع ہوگا اور جان پر بھی سختی۔“ اشفاق بولا۔

”ٹھیک ہے اشفاق صاحب جیسے آپ بہتر سمجھیں۔“
”گڈا تو میں کہہ دوں ان لوگوں سے کہ لڑکی کو پیش کر رہے ہیں؟“

”جی۔“
”صرف لڑکی کو نہیں لڑکے کو بھی پیش ہونا پڑے گا۔“
فرقان بولا۔

”ظاہر ہے..... نکاح کا قانونی ثبوت بھی پیش کرنا پڑے گا.....“ اشفاق نے کہا۔ ”تو پھر کب پیش کرو گے دونوں کو؟“

”جب آپ کہیں۔“ ثاقب نے گویا پتوار اشفاق کے ہاتھ میں دے دی۔

”میرا خیال ہے صبح۔“ فرقان نے کہا پھر تو جیہہ بھی پیش کی۔ ”اس وقت تو بے چاری لڑکی بھی پریشان ہوگی۔“
”ٹھیک ہے..... میں کہہ دیتا ہوں جاننا زعلی سے کہ صبح لڑکی اور لڑکا دونوں پیش ہو رہے ہیں۔“

رات بھر اشفاق تھانے میں فرقان کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ گو اس نے جاننا زعلی کو اس امر کی یقین دہانی کرا دی تھی کہ صبح لڑکی پیش کر دی جائے گی لہذا احراست میں لیے گئے افراد پر کوئی سختی نہ کی جائے لیکن پھر بھی اس نے فرقان کے پاس سے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ فرقان سے تو جاننا زعلی کی سیاسی محتاصت بھی تھی۔ اس پر اندھا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تھانوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا بھلا!

☆☆☆

عاقب جو فطرتاً ایک بزدل نوجوان تھا، تھانے میں پیش ہونے کو تیار نہ تھا مگر عاطف نے اسے غیرت دلائی۔
”کینے انسان تیری وجہ سے بڑا بھائی حوالات میں بند ہے

ہونا چاہیے۔“

”پھر؟“ فرقان کے لہجے میں پیتابی تھی۔

”اس نے مجھے آئی جی والی بات بتائی اور کہا تمہاری خاطر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اگر یہ کل تک لڑکی اور اسے بھگا کر لے جانے والے کو حاضر کر دیں تو کسی کو ان دونوں بندوں کو ہاتھ نہ لگانے دوں..... وہ بھی صرف تمہاری خاطر..... ورنہ تمہیں معلوم ہے ہم بندہ بھی بازیاں کروالیتے ہیں اور چھترول بھی خوب لگاتے ہیں۔“

”لڑکی کسی نے نہیں بھگائی وہ خود آگئی تھی ان لوگوں کے گھر۔“ فرقان نے اسے آہستگی سے بتایا۔
”اب کہاں ہے؟“

”اسی کے ساتھ ہے..... وہ اپنے گھر واپس ہی نہیں جانا چاہتی..... دونوں نے نکاح بھی کر لیا ہے۔“

”ارے تو پھر لمبے چکر میں کیوں پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ اور تمہیں بھی پریشانی میں ڈال دیا..... ان سے کہو دونوں کو تھانے میں پیش کریں اور لڑکی بیان دے دے کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں، عاقل و بالغ ہوں اور میں نے اس لڑکے سے نکاح کر لیا ہے..... اس کے بیان کے بعد تمہاری اور تمہارے یار ثاقب کی جان بھی چھوٹ جائے گی۔“

”ثاقب سے بات کر سکتے ہیں ہم لوگ؟“
”ہاں ہاں کیوں نہیں..... تم بیٹھو میں اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔“

اشفاق گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ثاقب کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ ثاقب کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اشفاق نے پہلے تو اس کے لیے چائے منگوائی پھر صلاح کاری شروع کی۔

”دیکھو بھئی لڑکی تو پولیس نے تم لوگوں سے بہر حال بازیاں کرنی ہے۔ بات اوپر تک پہنچ گئی ہے اور جب اوپر سے ڈنڈا پڑے تو پولیس مردے کو بھی قبر سے نکال لاتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ لڑکی پیش کر دی جائے۔ دونوں نکاح تو کر ہی چکے ہیں۔ لڑکی شوہر کے حق میں بیان دے دے بس کافی ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ تمہاری بھی سختی اور میرے یار فرقان کے گھر والے بھی مفت میں پریشان اور بدنام الگ..... اس کی نوکری کا معاملہ بھی ہے..... اپنے بچے بھی تو پالنے ہیں اس نے۔“

ثاقب نے فرقان کو دیکھا جیسے اس کی صلاح جاننا چاہتا ہو۔

”میرا کوئی مسئلہ نہیں ثاقب..... پریشانی، بدنامی

کیا وہ بند ہی بیٹھا رہے گا۔“
 ”انہیں لڑکی چاہیے نا اسے پیش کر دیں..... وہ کہہ
 دے گی میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“
 ”تھانہ اور پچھری تجھ جیسے ذلیل آدمی کا چہرہ بھی دیکھنا
 چاہیں گے۔“

”اور اگر تھانے والوں نے مجھے اندر کر دیا؟“
 ”تو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ تجھ جیسے ننگ
 خاندان سے ہمیں چھٹکارا ملا..... تیری وجہ سے بڑا بھائی اندر
 ہے۔ سارا گھر پریشان ہے..... راحمہ بھابی کی طبیعت خراب
 ہو گئی ہے..... بے چارے فرقان بھائی کی بلا وجہ میں سختی.....
 والدہ اس کی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں..... بیوی کو بار بار
 دورے پڑ رہے ہیں اور تو بزدلی دکھا رہا ہے..... تجھ سے اچھی تو
 وہ لڑکی ہے جو تھانے جا کر بیان دینے کو تیار ہے۔“
 ”دیکھ لیں بھائی۔“

”ابے مجھے تو جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا..... دیکھ لیا
 کہ تو کتنا خود غرض ہے..... کوئی اور ہوتا تیری جگہ تو کہتا میرا
 باپ جیسا بھائی میری وجہ سے اندر ہے اسے باہر نکالنے کے
 لیے تو میں اپنی جان پر بھی کھیل جاؤں گا۔“
 عاطف نے عاقب کو اتنی غیرت دلائی کہ وہ بالآخر
 پولیس کے سامنے پیش ہونے کو تیار ہو ہی گیا۔ ماہ نور کو پولیس
 اسٹیشن لے جانے سے قبل اسے اچھی طرح سمجھایا بچھایا گیا۔
 نو بیاتاہن کا روپ دینے کے لیے اسے فرقان کی ایک بہن
 نے اپنا زرق برق جوڑا جو اس نے اپنے ایک کزن کی شادی
 پر سلوایا تھا اور صرف ایک مرتبہ ہی پہنا تھا پہننے کو دیا۔ عاطف
 اس کے لیے رخشندہ کا ایک ایگنیٹیشن جیولری سیٹ لے آیا۔
 فرقان کی بیوی نے کندنی ننگن جو اس کی والدہ اس کے لیے
 انڈیا سے بطور سوغات لائی تھیں، ماہ نور کی کلائیوں میں پہنا
 دیے۔ یہ ننگن اسے واپس ملتے نہ ملتے اس کا شوہر گھر تو واپس
 آ جاتا بس..... ماہ نور کا میک اپ بھی کر دیا گیا تاکہ بنی
 سنوری ہونے کی بنا پر وہ نو بیاتاہن ہی دکھائی دے۔

ماہ نور اور عاقب تھانے میں پیش ہو گئے۔ ماہ نور کے
 گھر والوں کو اس کی بازیابی کی اطلاع دے دی گئی۔ اس کی
 خالہ، خالو، ماموں اور دوسرے بہت سے رستے دار تھانے پہنچ
 گئے۔ اسے اپنے حق میں کرنے اور اپنے ساتھ لے جانے
 کے لیے انہوں نے اسے سمجھانے بچھانے کی کوشش کی۔
 منت سماجت کی، واسطے دیے۔ اسے کچھ نہ کہنے سننے کی یقین
 دہانی کرائی۔ پورے تحفظ کی ضمانت دی۔ خالہ اس کے
 پیروں میں پڑ گئی۔ مردوں نے اپنی ٹوپیاں سر سے اتار کر

اس کے قدموں میں ڈال دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ
 پولیس کو اپنا بیان دے چکی تھی کہ وہ عاقل و بالغ ہے اپنی
 مرضی سے خالہ کا گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔ عاقب سے اس کا نکاح
 ہو چکا ہے۔ وہ اس کا شوہر ہے، اب وہ اسی کے ساتھ رہنا
 اور بسنا چاہتی ہے۔

ماہ نور اور عاقب کے پیش ہو جانے کے بعد عاقب
 اور فرقان کو پولیس حراست سے نجات مل گئی۔ فرقان کو ہمراہ
 لے کر اشفاق حسب وعدہ اس کی والدہ کے پاس پہنچا۔
 ”آئی! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا..... پوچھ
 لیں اس سے کسی نے اسے انگلی بھی نہیں لگائی ہے۔“
 ”جیتے رہو بیٹا..... جیسے تم نے میرا دل ٹھنڈا کیا
 تمہاری ماں کا دل بھی تمہاری طرف سے سدا ٹھنڈا رہے.....
 بہت بہت شکریہ۔“
 ”لیکن ایک بات کہوں برا نہ مانیے گا۔“

”ہاں ہاں..... کہو۔“
 ”دوستی اپنی جگہ لیکن دوستی کی خاطر بدنامی کو گلے لگانا
 عقلمندی نہیں..... اس لڑکے کے بھائی سے فرقان کی دوستی
 ہے، ٹھیک ہے لیکن اس دوستی کی خاطر گھر سے بھاگی ہوئی
 لڑکی کو اپنے گھر میں رکھ لینا عقلمندی نہیں تھی..... بہنوں والا
 گھر ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے..... جس کی لڑکی جاتی ہے وہ تو
 سانپ کی طرح بل کھا رہا ہوتا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو بیٹا..... غلطی مجھ سے بھی ہوئی.....
 میں نے سوچا جوان لڑکی ہے وہ کبخت تو نہ جانے کہاں کہاں
 لیے چھپاتا پھرے گا اسے، یہیں بیٹھی رہے تو بہتر۔“
 ”آپ کی ہمدردی کو سو سلام آئی مگر یہ خطرناک
 معاملے ہوتے ہیں۔ دشمنی بندھتی ہے تو نسلوں چلتی ہے.....
 جس گھر کی بزرگ عورت اپنی عزت کی خاطر گھر سے بھاگی
 لڑکی کے پیروں میں پڑ جائے اور مردوروں سے ٹوپیاں اتار
 کر اس کے قدموں میں ڈال دیں اور وہ پھر بھی ان کے
 بجائے اس لڑکے کا ساتھ دے جس کی خاطر اس نے گھر
 چھوڑا ہو؟ وہ پھر ایسی لڑکی کا جو حشر نہ کریں کم ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ اس سے انتقام لیں گے۔“
 فرقان کی والدہ سینے پر ہاتھ دھر کر بولیں۔
 ”کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”اللہ رحم کرے..... اس بچی پر بھی اور ہم پر بھی.....
 ویسے لڑکی ہے اچھی..... ساری گھرداری آتی ہے اسے.....
 سخت وقت دیکھ رکھا ہے..... ہر حال میں گزارہ کرنے والی
 لڑکی ہے..... میری بچیوں اور بہو سے تو وہ ایسے مکمل مل گئی تھی

دے رہی ہوں..... نہ بھاگ جائے تمہارے گھر سے بھی تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔“

”پھوپا!“ ثاقب نے ہچکچاتے ہوئے دہی زبان سے کہا۔ ”آپ تھوڑے دن انتظار کر لیں۔“

”کس بات کا!“ پھوپا چونکیں۔

”وہ جائے گی تو ہم لوگوں کو عاقب کے لیے پھر آپ کے دروازے پر ہی آنا ہے۔“

پھوپا نے ثاقب کو گھورا پھر تلخ لہجے میں بولیں۔

”میری بچی کو تم نے ایسی گری پڑی سمجھ رکھا ہے..... ارے اس

ارادے سے تو میں تم لوگوں کو اپنی چوکھٹ بھی نہ چڑھنے دوں

گی کبھی..... اور عاقب! اس لفٹکے سے تو کہنا مجھے اپنی صورت

بھی نہ دکھائے کبھی ورنہ ماروں گی ہزار گنوں کی ایک!“

ثاقب شرمندہ ہو کر اٹھا۔

ماہ نور کے خالو نے دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار

اونچی کر والی۔ محلے داروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنی ہی

لڑکی کو مورد الزام ٹھہراتے تھے اور اب اس کی صورت تک

دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ چند محلے داروں سے یہ بھی پتا چلا

کہ اپنے طور پر بھائی چارگی میں جب انہوں نے ماہ نور کے

خالو کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا اب وہ اپنی

لڑکی یا اس کے سسرال والوں میں سے کسی کو کوئی زک

پہنچانے کی نیت نہ رکھیں تو اس نے کہا۔ ”عزت کا معاملہ تھا

وہ تو گئی اب سات خون بھی کر دیے جائیں تو عزت واپس

نہیں آسکتی۔ میں تو جوان لڑکی کی ذمہ داری لینے کے حق میں

ہی نہیں تھا، میری بیوی بیوقوف تھی جو مرنے والی بہن کی محبت

میں اس کی بیٹی کو گھر لے آئی..... ہمارا اب اس سے کوئی لینا

دینا نہیں..... زندگی بھر اس سے تعلق ختم..... اس کے ماموں

اور مائی کا بھی یہی خیال ہے۔“

☆☆☆

ثاقب اور عاطف دونوں ہی کو اپنے گھر کی عزت

خاک میں مل جانے کا نہایت ملال تھا۔ یہ وہ گھیرانا تھا جس

کی ان کے باپ کی وجہ سے محلے میں عزت رہی تھی۔ ثاقب

اور عاطف نے بھی اپنے طرز عمل سے باپ کی زندگی میں

بھی اور ان کی موت کے بعد بھی اس عزت کو برقرار رکھا

تھا۔ مجال بھی جو دونوں میں سے کسی نے محلہ کی کسی لڑکی کو نظر

بھر کر دیکھنے کی بھی کوشش کی ہو۔ عاقب سے بھی انہیں ایسا

کوئی اندیشہ نہ تھا مگر ہونی کو کون روک سکا ہے۔ حالات و

واقعات سے انہیں اب بھی یہ یقین تھا کہ زیادہ غلطی لڑکی کی

تھی۔ کیوں آئی وہ رات کو گھر کی دیوار پھلانگ کر ان کے

جیسے انہی کے ساتھ رہتی آئی ہو۔“

”نی الحال دور دور رہے گا..... اسی میں بہتری

ہے..... یہ میرا مشورہ ہے آگے آپ کی مرضی۔“

☆☆☆

ماہ نور نے عدالت میں بھی اپنا وہی بیان دہرایا جو

اس نے تھانے میں پولیس کو دیا تھا۔ عدالت نے اسے

عاقب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی، خالہ اور

ماموں نے عدالت سے بے نسل و مرام جاتے ہوئے اس

سے کہا۔ ”تو آج سے ہمارے لیے مرچکی..... اپنے باپ کی

اولاد ہے تو آج کے بعد ہمیں اپنا منہ نہ دکھانا۔“

ماہ نور اور عاقب گھر آ گئے۔ راحمہ اور رخشیدہ بھی

ڈرتی ڈرتی واپس آ گئیں۔ ثاقب کو پھوپا اور ان کے گھر

والوں سے معذرت کرنا پڑی کہ عاقب کی ناخلفی نے انہیں

باپ کا طے کردہ رشتہ نباہنے لائق نہ چھوڑا تھا۔

”نہ میں تمہاری پھوپا نہ تم میرے بھتیجے..... ارے تم

نے اس لڑکی سے عاقب کا نکاح کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ

میری بچی پر کیا گزرے گی۔“ پھوپا نے غی سے کہا۔

”مجھے آپ لوگوں کے دکھ کا پورا احساس ہے پھوپا لیکن

حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ.....“ ثاقب اس سے آگے

کچھ نہ کہہ سکا۔

”روز حشر بھائی سے بھی گلہ کروں گی اور تم لوگوں کے

گریبان بھی پکڑوں گی جو تم نے میری معصوم بچی کے ساتھ

کیا ہے۔“ پھوپا جذباتی ہو کر رونے لگیں۔

”پھوپا ہمارا کیا قصور..... غلطی تو عاقب کی ہے بلکہ سچ

پوچھیں تو عاقب کی بھی اتنی نہیں جتنی اس لڑکی کی ہے..... وہ

خود ہی آگئی تھی ہمارے گھر۔“ ثاقب نے صفائی پیش کی۔

”ارے تو ایسی کیا گھر بسائے گی..... جسے اپنے

خاندان کی عزت کا خیال نہیں وہ تمہاری کیا عزت رکھے

گی..... رہ جائے تو میرا نام بدل دینا۔“ پھوپا نے بڑے

یقین سے پیشگوئی کی۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جسے اپنے خاندان، اپنے

خالہ خالو کی عزت کا پاس نہیں جنہوں نے اسے اپنے گھر میں

پناہ دی، عزت سے رکھا..... وہ عاقب کی کب بن کر رہے

گی..... اس وقت تو اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

خالہ، ماموں کے پاس واپس جاتی تو وہ اسے قتل کر دیتے اس

لیے اس نے عاقب کے حق میں بیان دے دیا۔“

ثاقب کو بھی اپنا ہمنوا پا کر پھوپا نے بڑے یقین سے

اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”صرف چھ ماہ کا ٹائم

گھر میں؟ کیوں رہی وہ رات بھر عاقب کے کمرے میں؟ اور کیوں آمادہ نہ ہوئی اپنی خالہ کے گھر واپس جانے کو؟ گنتی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر لوگ کیا کچھ نہیں کر گزرتے؟ آہی گئی تھی تو صبح ہونے سے پہلے اگر اپنے گھر چلی گئی ہوتی تو اتنی ذلت اور رسوائی تو نہ ہوتی۔ ایک چچا کے گھر کے سوا کہ ان کی بھی مجبوری تھی کہ ان کی بیٹی رخشندہ عاطف سے پیاری ہوئی تھی باقی سارا خاندان ان کے گھرانے سے قطع تعلقی کر بیٹھا تھا۔

عاقب اور ماہ نور کے گھر آ جانے کے بعد عاقب اور عاطف نے دونوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار اپنی خاموشی سے کیا۔ ماہ نور نے شروع شروع میں ان سے بے تکلف ہونے اور ان کے آگے بچھ بچھ جانے کی پوری کوشش کی مگر دونوں میں سے ایک کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ چائے بنا کر ان کے آگے رکھتی تو وہ پیالیاں پرے سرکا دیتے۔ کھانا پکاتی تو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا نہ کھاتے۔ اس سے سامنا ہوتا تو تیوری چڑھا لیتے۔ اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے۔ کھانے کی میز پر آتی تو دونوں اٹھ کر چلے جاتے۔ دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کو بھی اسے زیادہ رخ دے کر بات نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ رخشندہ تو خیر اسے لفٹ ہی نہ کراتی راحمہ البتہ بات کر لیتی تھی۔ ماہ نور نے اس سے اور عاقب سے کئی مرتبہ عاقب، عاطف اور رخشندہ کی بے رخی کا گلہ کیا۔

”خود مجھ سے بھی بات نہیں کرتے ہیں دونوں بھائی۔“ عاقب نے کہا۔ اس کی یہ بات تو ٹھیک تھی۔ وہ دونوں اس سے بھی ہنسکا م نہ ہوتے تھے۔

”ٹھیک ہو جائے گا سب۔“ راحمہ ماہ نور کو دھیرے سے تسلی دیتی۔

ماہ نور کا دل برا ہوتا۔ سوائے عاقب اور راحمہ کے اس گھر کے باقی لوگ اس سے کس قدر حقارت اور اہانت کا رویہ رکھتے تھے جیسے وہ کوئی پرلے درجے کی گری پڑی مخلوق تھی۔ عاقب بھی دونوں بھائیوں کے سامنے بی بی سے ڈرے چوہے کی طرح سہا سہا رہتا۔ ان کی موجودگی میں اس سے بات کرنے سے گریز کرتا۔ اس کے جائز جذباتی تقاضوں کے ساتھ وہ اس کی مادی ضرورتوں سے بھی بے نیازی اختیار کیے ہوئے تھا۔ عجیب شوہر تھا۔ خالہ کے گھر سے جن تین کپڑوں میں وہ اس کے گھر آئی تھی، ان کے علاوہ فرقان کی ایک بہن نے اسے اپنا ایک عام سا جوڑا پہننے کے لیے دیا تھا اور نکاح کے موقع پر ایک فینسی سوٹ جو اس کے اصرار کے باوجود فرقان کی والدہ نے بیٹی کو اس سے واپس نہیں لینے دیا

تھا۔ شوہر اور سسرال کی طرف سے اسے ایک دمگی تک تولی نہیں تھی اور نہ کسی کو اس کا احساس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے بھی ابھی تک وہی تھے جو وہ خالہ کے گھر سے پہن کر نکلی تھی۔ زیور تو دور کی بات شوہر کے گھر میں اسے عزت بھی نہ مل رہی تھی۔ وہ دن بھر کسی ملازمہ کی طرح گھر کے کاموں میں لگی رہتی، کسی کا سراہنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ سمجھا جاتا۔ عاقب بھی عجیب دیوسا آدمی تھا گھر والوں کے اس رویے پر احتجاج کرنا تو درکنار اس کا دل رکھنے کو بھی کچھ نہ کہتا۔

واپسی کے لیے پہلے عاقب نے رخت سفر باندھا۔ سفر پر جاتے ہوئے آدمی کا دل ویسے بھی رقیق ہو رہا ہوتا ہے۔ عاقب سے اس کی کیسی ہی ناراضگی سہی خون کا رشتہ تھا۔ جانے سے قبل اس نے عاقب سے بات چیت شروع کر دی۔ عاقب کی دیکھا دیکھی عاطف کی بھی اس سے بات چیت شروع ہو گئی جانے سے پہلے عاقب نے عاقب کو سمجھایا۔ ”ذرا احتیاط سے رہنا..... دشمن کو کبھی بے خبر نہ سمجھے آدمی..... دشمن تاک کر حملہ کرتا ہے..... سمجھ رہے ہوتا؟“

”جی بھائی۔“

”اور اس لڑکی کو کبھی قابل اعتبار نہ سمجھنا..... جسے اپنے خاندان کی عزت کی پروا نہیں ہوئی وہ تمہاری عزت کی پروا کب کرے گی..... کسی بھی وقت تمہاری عزت مٹی میں ملا سکتی ہے۔“

”صحیح!“ عاطف نے جوتیوں بھائیوں کے اس خفیہ اجلاس میں شریک تھا عاقب کی بات کی پر جوش تائید کی اور اپنی طرف سے گرہ لگائی۔ ”یہ زیادہ عرصہ رہے گی نہیں..... ایسی عورتیں ایک کی ہو کر نہیں رہیں۔“

راحمہ کو عاقب پر اپنے اور بیٹے کو سعودی عرب بلائے جانے کے لیے دباؤ ڈالنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ”مجھے تو اب یہاں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ماہ نور کے گھر والے کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں..... میں تو عاشر کے لیے بہت فکر مند رہنے لگی ہوں جب تک اسکول سے گھر واپس نہیں آ جاتا میرا تو دل سولی پر لٹکا رہتا ہے۔“ اس نے عاقب سے کہا۔

”فکر مت کرو راحمہ۔“ عاقب نے اسے تسلی دی۔ ”کوشش میں تو میں پہلے بھی لگا ہوا تھا اب زیادہ کوشش کروں گا تمہیں اور عاشر کو جلد از جلد وہیں بلانے کی..... اور ہاں تم اس کو زیادہ منہ نہ لگایا کرو۔“

”کسے؟“ راحمہ نے تجاہل عار قانہ کا مظاہرہ کیا۔

”ارے وہی جس کی وجہ سے مجھے حوالات کا منہ دیکھنا

پڑا..... اب کیسی نیک پروین بنی پھرتی ہے اس گھر میں۔“
”شکر ہے وہ موٹی بھدو نسرین نہیں آئی اس گھر میں۔“ راحمہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

”خاندان میں منہ دکھانے کا نہیں رکھا اس نے ہمیں۔“ ثاقب کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”میں تو سوچ رہا ہوں جب تک سعودیہ میں دانہ پانی لکھا ہے لکھا ہے جب وہاں سے دانہ پانی اٹھ جائے تو یہاں واپس آنے کے بجائے کہیں اور نکلا جائے۔“

”کہاں؟“ راحمہ چونکی۔

”دہلی، انگلینڈ، امریکا، کینیڈا..... کہیں بھی۔“

راحمہ کو یک گونہ خوشی ہوئی۔ انگلینڈ، امریکا اور کینیڈا

جانا تو اس کا خواب تھا۔

ثاقب کے جانے کے بعد عاطف اور رخشندہ نے بھی واپسی کی تیاری کی۔ جانے سے قبل عاطف نے بھی عاقب کو ماہ نور پر بھروسہ نہ کرنے اور اس کے خاندان والوں سے ہوشیار خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں راحمہ، عاشر، عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب کی بینک سے بنا اطلاع کئی روز غیر حاضری کا سبب بینک والوں سے چھپا نہ رہ سکا مگر فرقان نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ عمل میں لا کر معاملہ بحال کر دیا تھا۔

راحمہ کو ماہ نور کی صورت گویا ایک فل ٹائم کیئر فیکر میسر آ گئی تھی۔ دونوں بھائیوں کے جانے کے بعد راحمہ اور ماہ نور میں گاڑھی چھیننے لگی تھی۔ راحمہ آرام کرتی اور ماہ نور سارا گھر سنبھالتی۔ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں گھر کے کام کرواتی۔ صبح ناشتا اور دونوں وقت کھانا پکانا اب ماہ نور ہی کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ عاقب بالائی منزل سے نیچے شفٹ ہو گیا تھا۔ اوپر والا کمر اب سختے میں ایک آدھ بار صفائی کے لیے ہی کھولا جاتا۔ ماہ نور بھی کبھی دزدیدہ نظروں سے خالہ کے گھر کی طرف دیکھتی تو اسے وہاں کوئی دکھائی نہ دیتا۔ دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار اونچی ہو کر فصیل شہر کی طرح درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ خالہ کے گھر سے ماہ نور کو کبھی کوئی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ ماہ نور اپنا دھیان اور دل دونوں نئے گھر میں لگائے رکھنے کی کوشش کرتی مگر کبھی کبھی دونوں ہی بھٹک کر خالہ اور اس کے گھر کی طرف نکل جاتے۔

☆☆☆

عاقب نہایت بے پروا شوہر ثابت ہوا۔ اسے بس اپنی ذات، اپنے آرام، اپنی تسکین کا خیال رہتا۔ ماہ نور کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔ فون پر دونوں بھائیوں سے ملنے والی

ہدایتیں اور نصیحتیں اس پر مستزاد ثابت ہوتیں۔ وہ اسے ماہ نور کو سختی میں رکھنے، اس کا بھی اعتبار نہ کرنے اور اس پر پیسا خرچ نہ کرنے کی صلاح دیتے۔۔۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیویاں تو خاندانی تھیں۔ عزت سے رخصت ہو کر آئی تھیں اس کی بیوی کی طرح غیر خاندانی اور اپنے گھر سے بھاگ کر نہیں۔ ماہ نور کی تفحیک اور اس کی طرف سے عاقب کا دل برا کرنے کو وہ دونوں بہت کچھ کہہ جاتے۔ کبھی کبھی رخشندہ بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ڈال دیتی اور اپنی گفتگو میں ہر پھر کر نسرین کا ذکر لے آتی۔ ”نسرین کی ہائے لی ہے تمہاری بیوی نے۔ خوش نہیں رہ سکتی۔“ وہ عاقب سے کہتی۔

گو خاندان والوں سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا لیکن راحمہ کسی نہ کسی سے رابطے میں رہتی۔ اس کے ذریعے عاقب کو پھوپھی اور ان کے گھر والوں کی شدید ناراضگی کا پتا چلتا رہتا۔ صدمے کی ماری پھوپھی نے نسرین کی شادی اپنے چیمٹھ کے بیٹے سے کر دی تھی جس کی پہلی شادی ناکام ہو چکی تھی۔ جوڑیا ہازار میں باپ کی دکان پر بیٹھتا تھا اور نرا انگوٹھا چھاپ تھا۔ عاقب کو نسرین کی شادی کی نہ خوشی ہوئی نہ رنج..... وہ اس کے مرحوم باپ کا فیصلہ تھا اور بس..... اگر ماہ نور اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو بڑے دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی باپ کے فیصلے کے مطابق نسرین سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لے آیا ہوتا اور وہ بھی اس گھر میں اسی طرح ہنسی خوشی بس رہی ہوتی جیسے اس کے بھائیوں کی بیویاں بسی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

راحمہ سے کیے وعدے کے مطابق ثاقب نے جلد ہی راحمہ اور عاشر کو اپنے پاس بلا لیا۔ راحمہ کے میکے والوں نے چین کا سانس لیا۔ ماہ نور والے واقعے کے بعد سے اس کے گھر والوں کو اس کی اور عاشر کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔ دشمن اور رقیب کو آدمی بھی سویا ہوا نہ سمجھے۔ وار کرتا ہے اور پھر کرتا ہے۔

راحمہ کے جانے کے بعد گھر میں عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب صبح دفتر چلا جاتا۔ بینک کی نوکری تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے جانے کا وقت تو معلوم ہوتا ہے واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ عاقب شام کو گھر واپس لوٹتا۔ کبھی رات بھی ہو جاتی۔ ماہ نور دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ راحمہ اور عاشر کے جانے کے بعد عاقب نے ثاقب کی صلاح پر ملازمہ کی بھی چھٹی کر دی تھی۔ ”تم اکیلی تو ہوئی ہو..... کرنے کو کچھ ہوتا نہیں تمہارے پاس..... گھر کے کام خود کر دی تو مصروف بھی رہو گی، دل بھی بہلا رہے گا۔“ اس نے ماہ نور

سے کہا۔
”کام کا مسئلہ نہیں عاقب..... آپ چلے جاتے ہو تو
گھر میں کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہوتا..... میں یور
ہو جاتی ہوں۔“

”ٹی وی کس مرض کی دوا ہے۔“ عاقب نے کہا۔
”ٹی وی بھی آدمی کتنی دیر دیکھ سکتا ہے..... دل بھر
جاتا ہے۔“

”پھر تو تم ایک دن یہ بھی کہو گی کہ مجھ سے بھی تمہارا دل
بھر گیا ہے۔“
”کیسی بات کرتے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں..... خالہ کا گھر چھوڑ آئیں تو یہ
گھر بھی چھوڑ کر جاسکتی ہو۔“ دونوں بھائیوں کی باتیں اپنا اثر
دکھا رہی تھیں۔

”عاقب!“ ماہ نور نے اسے صدمے کی کیفیت میں دیکھا۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“
”مجھے آپ کی بات سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔“

”میں غلط تو نہیں کہہ رہا..... جسے اپنے خاندان کی
عزت کا پاس نہیں اسے شوہر کی عزت کا کب احساس ہوگا۔“
ماہ نور کی آنکھیں بھر آئیں۔

”مگر مجھ کے آنسو مت بہاؤ..... مجھے ٹسوے بہانے
والی عورت سے شدید نفرت ہے۔“
”ایسی کتنی عورتیں دیکھ رکھی ہیں آپ نے؟“

عاقب نے ہاتھ اٹھایا اور اس کا زوردار طمانچہ ماہ نور
کے گال پر پڑا۔
”آپ نے مجھے مارا۔“

”جواب دو گی تو اس سے بھی بری پٹو گی۔“
ایک دفعہ اس کا ہاتھ اٹھا تو وہ ذرا ذرا سی بات پر اسے
مارنے پینے لگا۔ خالہ کا گھر پڑوس میں ہونے کے خیال سے

وہ اونچی آواز میں بات کر پاتی نہ اس کے مارنے پر آہ و بکا
کرتی۔ گھٹ گھٹ کر روتی اور روپیٹ کر چپ ہو جاتی، کوئی
اس کی فریاد سننے والا بھی نہ تھا۔ کپڑے لٹے، جوتا، زیور،

سیر و تفریح کی تو اسے عاقب سے کوئی امید ہی نہ نظر آتی تھی۔
آہستہ آہستہ اس نے کھانے پینے کی تنگی بھی دینا شروع
کردی۔ وہ اس سے گھر کی ضرورت کا کوئی سامان لانے کو

کہتی تو وہ کالم گلوچ پر اتر آتا۔ ”تمہارے باپ نے کھانا
نہیں کھلوا رکھا ہے تمہارے نام کا میرے بینک میں۔“
”وہ بے چارے تو بھی اپنے نام کا کھانا بھی نہیں

کھلوا سکے کسی بینک میں۔“ ماہ نور حسرت سے کہتی۔

تراخ! اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے لیے
عاقب کو بس کوئی بہانہ چاہیے ہوتا۔

رات کو وہ اس پر بدترین جسمانی تشدد کرتا جسے سہنے
میں ماہ نور ضبط کرتی۔
”میں تمہیں کسی اور کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ
وحشی پن سے کہتا۔

”میں صرف آپ کی ہوں..... آپ ہی کی رہنا چاہتی
ہوں ساری زندگی۔“ وہ روہا نسی ہو جاتی۔
”اور مجھ سے پہلے کتنوں کی رہ چکی ہو۔“ وہ اس کے

بازو اتنی شدت اور دیوانگی سے دبوچتا کہ اس کی سسکیاں
نکل جاتیں۔
وہ منہ الال کر قہقہہ لگاتا۔ اس کے بازو چھوڑ کر جا بجا
چٹکیاں بھرنے لگتا۔ وہ تکلیف سے بلبلائی تو حنظل اٹھاتا۔

ماہ نور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ عاقب اسے جسمانی
تشدد اور ذہنی اذیت سے کیوں دوچار رکھتا تھا۔ اپنی کسی
جائز ضرورت سے اسے آگاہ کرتی تو وہ نہایت حقارت سے

کہتا۔ ”شکل دیکھی ہے تم نے اپنی..... ہو تم اس لائق کہ میں
تمہیں کچھ لا کر دوں۔“
وہ بے چارگی سے اس کا منہ دیکھنے لگتی۔

”آپ کے بھائی اپنی بیویوں کی ضرورتیں پوری نہیں
کرتے ہیں کیا۔“ ایک بار اس نے کہہ دیا تو وہ بھیک پڑا۔
”ان کی بیویاں اپنے گھروں سے بھاگ کر نہیں آئی تھیں۔“

وہ دم بخود رہ گئی تھی۔
اسے گھر سے بھاگنے کا طعنہ وہ دے رہا تھا جس کی
خاطر وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اس نے خود ہی تو بلایا تھا اسے

اپنے گھر۔ ماہ نور کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔
”تم جیسی لڑکیاں پتا نہیں کتنوں سے یاریاں لگاتی
ہیں۔“ عاقب نہایت بے ہودگی سے کہتا۔

ماہ نور کو دکھ ہوتا کہ وہ اس سے اتنی بدگمانی رکھتا تھا۔
اس کی خاطر تو اس نے اپنے سارے خاندان سے دشمنی مول
لی تھی۔ ماں کا سا بچا روینے والی خالہ کو دھتکار دیا تھا۔ تھانہ

اور عدالت میں وہ کس بے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ
جوڑے اس کی منت سماجت کرتی رہی تھیں کہ وہ گھر واپس
آجائے مگر اس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ اپنے پیروں میں

پڑی خاندان کے مردوں کی ٹوپوں کی پروا نہیں کی تھی۔
صرف اس لیے کہ وہ عاقب کی بن کر رہنا چاہتی تھی اور اب
وہی اسے کچھ کتا تھا..... بات بات پر..... بہانے بہانے۔

کبھی بھی ماہ نور کو یوں لگتا جیسے عاقب ایک نارمل

وہ دم بخود اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اختلاف کی جرأت ہی نہ دی تھی شوہر کے سخت رو نے اسے۔ وہ تو نفس میں گرفتار ایک پرندے کی طرح بے بس اور لاچار تھی۔

عاقب نے کہا۔ ”اس کام کے لیے تمہیں کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں..... نیٹ پر دنیا کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے..... سرچ کرو۔“

عاقب نے نیٹ پر سرچ کیا تو کسی ڈاکٹر یا حکیم کی مدد کے بغیر گھر میں ہی حمل ضائع کرنے کے ایک دو نہیں بیسیوں طریقے اس کے علم میں آگئے اور اس نے ماہ نور کو تختہ مشق بنا ڈالا۔ وٹامن سی کے حامل رس دار پھلوں کی کثرت سے پنساہ کی جڑی بوٹیوں، ڈاکٹری ادویات اور سخت جسمانی مشقت تک اس نے حمل ضائع کرنے کا ہر طریقہ ہی تو دھان پان سی ماہ نور پر آزمایا ڈالا۔ وہ گڑ گڑاتی، منت سماجت کرتی کہ وہ اسے اس خوشی سے محروم کرنے کے لیے اسے یوں تختہ مشق نہ بنائے مگر وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی دھر کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کرتا اور آنکھیں دکھاتا۔ دفتر جاتا تو باہر گیٹ پر تالا ڈال جاتا۔

حمل تو ضائع ہو گیا مگر ماہ نور موت کے دہانے پر جا پہنچی۔ اسے ایک نئی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ وہ مرتے مرتے بچی اور جب اس نے اپنی معالج کے استفسار پر اسے وہ سب کچھ بتایا جو عاقب نے اسے حمل ضائع کرانے کے لیے استعمال کرایا تھا تو ڈاکٹر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”تمہارا ہسپتال پاگل تو نہیں ہے۔ اس نے تو تمہاری موت کی تیاری کر رکھی تھی۔“ ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئی ہو..... مگر نقصان بہت ہوا ہے۔“

عاقب نے اسپتال ہی میں اس پر اپنا حصہ نکالا۔ ”ڈاکٹر سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میرے شوہر کو ابھی بچہ نہیں چاہیے..... یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے ابھی بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی اچھا دوسرا کوئی مل جائے۔“

ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

”پھر وہی مگر مجھ کے آنسو..... نفرت ہے مجھے ان ٹسوؤں سے۔“ عاقب نے یہ سوچ کر بھی اس پر رحم نہ کھایا کہ وہ موت کی وادی میں جا کر پٹی لگی۔ خدا جانے کس جہنم کی دشمنی نکال رہا تھا وہ اس سے۔

تین دن اسپتال میں رہ کر وہ گھر واپس آئی تو عاقب کا منہ پھولا ہوا تھا اور اس کے منہ میں دونوں بھائیوں کی

آدمی نہیں تھا بلکہ نفسیاتی مریض تھا جو اسے اذیت دینے میں تسکین پاتا تھا یا شاید اسے اذیت دے کر وہ خاندان میں اپنی کھوئی عزت کا رنج نکالتا تھا۔ بے عزتی تو اس کی بھی ہوئی تھی۔ بہر حال وجہ جو بھی تھی۔ اس کا رویہ ماہ نور کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

ماہ نور امید سے ہو گئی۔ اسے امید بندھی کہ اب عاقب کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہو جائے گا۔ وہ یہ سوچ کر کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کے ساتھ اپنا غیر انسانی رویہ ترک کر دے گا۔ اس پر مہربان ہو جائے گا۔ اس کا خیال رکھے گا۔ اسے قابل اعتبار جانے گا مگر اس کی یہ امید خوش فہمی ثابت ہوئی۔ دونوں بھائیوں نے ماہ نور کے امید سے ہونے کی خبر سن کر عاقب کو خوب لٹا ڈالا۔

”بہت جلدی تھی تمہیں۔“ عاقب نے ڈانٹا۔

”فیملی بڑھانے کی منصوبہ بندی دیکھ بھال کر کی جاتی ہے یار..... تمہارے پاس ابھی ہے کیا..... ابھی اتنا تو پتا نہیں ہے تمہیں کہ یہ عورت کب تک تمہارے پاس نکلتی ہے۔“ عاقب نے اپنی فراست بکھاری۔

”یہ جو چالاک عورتیں ہوتی ہیں یہ مرد کے پیروں میں اولاد کی بیڑی ڈال کر اسے چپاتی ہیں..... ابھی اس چکر میں مت پڑو..... جس لڑکی نے اپنے خاندان کی عزت کی پروا نہیں کی۔ وہ تم سے کب وفا کرے گی۔“ عاقب نے تڑکا لگایا۔

دونوں بھائیوں نے اسے ماہ نور سے بدظن کرنے اور بچہ پیدا کرنے کے خلاف کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

”اس جھنجٹ سے فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔“ عاقب نے صلاح دی۔

”ابارشن کرادو یار۔“ عاقب نے مشورہ دیا۔

”ابارشن؟“

”ہاں یار..... لیکن احتیاط سے..... کسی ڈاکٹر کا پتا کرو جو یہ کام کرتی ہو، شہر میں بہت سی ایسی کلینکس اور اسپتال ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے..... اسے لے جاؤ وہاں..... تھوڑا خرچہ ضرور ہوگا مگر تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور آئندہ ذرا احتیاط کرنا۔“ عاقب نے صلاح دی۔

عاقب نے ماہ نور سے کہا۔ ”مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔“ وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”اسے ضائع کرادیتے ہیں۔“

زبانیں دھری تھیں۔ ”اگر تمہیں شوہر کی عزت کا خیال ہوتا تو ڈاکٹر کے سامنے اسے نکال کرنے کے بجائے کہتیں میں خود پینٹنسی ضائع کرنا چاہتی تھی..... اب میں تمہارا کیسے اعتبار کر سکتا ہوں کسی معاملے میں۔“

وہ چپ رہی..... کہتی تو کیا کہتی..... اس سے غلطی ہوئی تھی اور اسے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا واجب تھا۔

☆☆☆

”خوش قسمت تھے تم جو تمہاری جان چھوٹ گئی۔“

عاقب نے کہا۔

”مر کے ہنگی ہے وہ۔“ عاقب نے بتایا۔

”مر جاتی تو اچھا تھا..... خس کم جہاں پاک۔“

عاطف نہایت بے رحمی سے بولا۔

”چھٹی کرو اس کی اور اپنی جان چھڑاؤ۔“ دونوں

بھائیوں کی طرف سے اسے مشورہ دیا گیا۔ مگر اس کے گلے میں تو دو لاکھ روپے مہر کی پھپھوندرا لگی ہوئی تھی۔

”یار! دو لاکھ کی خاطر ساری زندگی گند کو تو اپنے سر پر نہیں رکھا جاسکتا..... لاکھ تم دینا پچاس پچاس ہزار ہم دونوں دے دیں گے۔“

اس نے سوچنے میں دیر نہ لگائی۔ البتہ یہ کہہ کر اپنی اوقات ضرور دکھا دی کہ دو لاکھ مہر فرقان کی ماہ نور سے خواجواہ کی ہمدردی کا شاخسانہ تھا۔

بھائیوں کی طرف سے رقم وصول ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے پچھری جا کر طلاق نامہ تیار کروایا اور نہایت سفاکی سے اس بے آسرا لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا جس کے قدموں کی ایک لغزش نے اس کے قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔

”میرا تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں میں کہاں جاؤں گی؟“

اس نے زار و قطار روتے ہوئے بے بسی سے کہا اور اس کے قدموں میں لوٹ گئی۔

”یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ محبت تو خیر اس نے اس سے شاید کبھی بھی نہیں کی تھی۔ بس اپنے نفس کی تسکین کا آلہ کار بنائے رکھا تھا مگر ماہ نور کو اس سے اتنی سفاکی اور غیر انسانی رویہ کی توقع نہ تھی۔ وہ شدید رنج اور صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اجنبیت کا پر تو اپنے چہرے پر لیے یہ وہ شخص تھا جسے اس نے سوچے سمجھے پناہ کی تاریکی میں اپنی سب سے قیمتی متاع سونپ دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اس کے سامنے کھڑا وہ شخص بے حس تھا یا بے رحم..... نفسیاتی

مریض تھا یا بھائیوں کے اشاریوں پر ناچنے والا ایک بودا اور کمزور انسان۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ اس کی خانماں بربادی میں وہ اکیلا نہیں اس کے دونوں بھائی بھی شریک رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا وہ اس گھر سے نکل کر کہاں جائے۔ بدن کے تین کپڑوں میں وہ اپنی خالہ کے گھر سے اس گھر آئی تھی۔ اس گھر سے بھی اسے تین کپڑوں میں ہی نکلتا پڑا۔ نیچے زمین تھی اوپر آسمان اور ان دونوں کے بیچ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرتی بے آسرا، بے ٹھکانا ماہ نور!

☆☆☆

دونوں بھائی بہت خوش ہوئے۔

”فرقان کو ضرور بتا دینا تاکہ کوئی اونچ نیچ ہو تو وہ

سنجال سکے۔“ عاقب نے عاقب کو ہدایت کی۔

فرقان نے سنا تو اس نے عاقب کو بے نقط سنا لیا۔

”بے شرم آدمی تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ بے چاری جائے گی کہاں۔“

”یہ تو اسے اپنی خالہ کے گھر سے نکلتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا فرقان بھائی۔“ عاقب کو اپنے کیسے پر ذرا ملال نہ تھا۔

”اب تو وہ تمہاری عزت تھی۔“ فرقان بھیک کر بولا۔

”رہنے دیں فرقان بھائی ایسی عورتیں نہ آج آپ کی

ہوتی ہیں نہ کل۔“ عاقب کے منہ میں بھائیوں کی زبان بول رہی تھی۔

”کیا نہیں کیا اس نے تمہارے لیے..... خاندان کی

عورتوں نے اپنے دوپٹے اور مردوں نے اپنی ٹوپیاں ڈال دی تھیں اس کے قدموں میں..... وہ اگر اس وقت تمہارے خلاف بیان دے دیتی تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔“

”وہ خود آئی تھی..... کیسے دے سکتی تھی میرے خلاف

بیان۔“ عاقب نے خود کو بے قصور ثابت کرنا چاہا۔

”تمہارے بلانے پر آئی تھی۔“ فرقان جو ہمراز تھا

خص سے عاقب کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے کہہ سکتے ہو تم کہ یہ جھوٹ ہے۔“

وہ شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

”کیا قصور تھا اس کا جو تم نے اسے طلاق دی۔“

فرقان نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”اس نے گزارہ نہیں کرنا تھا فرقان بھائی وہ آوارہ تھی۔“

”بکو اس مت کرو۔“ فرقان گرجا۔

”عاقب بھائی اور عاطف بھائی کی مرضی بھی یہی

”یار فرقان بھائی.....“ جڑ بزد کھائی دیتے ہوئے وہ

فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”بیٹا! بھگتو گے ضرور..... تم سب بھگتو گے۔“ فرقان

کے لہجے میں یقین تھا مگر یہ اس کے اپنے گمان میں بھی نہیں تھا اس کے کہے پر مشیت ایزدی کی مہر اتنی جلد ثبت ہو جائے گی۔

☆☆☆

عارف صاحب کی طرف سے ان کے تینوں بیٹوں کو

مکان کے ساتھ مرض دل بھی وراثت میں ملا تھا۔ اس مرض

کے باعث عارف صاحب خود بھی محض چھیالیس سال کی عمر

میں جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ثاقب کو ان سے بھی

کم عمر میں ہارٹ ایک ہوا۔ وہ راحمہ اور اکلوتے بیٹے عاشر

کے ساتھ سعودی عرب ہی میں تھا۔ وہیں میڈیکل ٹیسٹ

ہوئے۔ رپورٹ آئی کہ دل کی تین شریانیں بند تھیں اور بائی

پاس سرجری لازم۔ راحمہ کے میکے والوں کی رائے ٹھہری کہ

سرجری پاکستان میں کروائی جائے تاکہ مشکل وقت میں وہ

بھی بیٹی داماد کے ساتھ کھڑے ہوں۔

سرجری کامیاب رہی مگر ثاقب کو سعودی عرب میں

اپنی ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔ ماہ نور کو اس گھر سے گئے کچھ

زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہی راحمہ جو کبھی عاقب کی شادی

اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے کروانے کی خاطر عاقب کی

پھوپھی زاد منگیتر نسreen کی جڑیں کاٹنے کے درپے رہا کرتی

تھی ماہ نور کے ساتھ عاقب کے ہیسا نہ سلوک کے بعد اب

اپنے خاندان کی کسی لڑکی کا تو کجا باہر کی کسی غیر لڑکی کا خیال

بھی عاقب کے لیے اپنے دل میں لانے کو تیار نہ تھی۔ سعودی

عرب جانے کے بعد بھی ثاقب اور عاقب سے چوری چھپے

اس کی اور ماہ نور کی فون پر بات چیت رہا کرتی تھی۔ ماہ نور

پر کیے جانے والے عاقب کے ہر ظلم و ستم بلکہ بربریت سے

آگاہ تھی وہ! بالخصوص ماہ نور کی پریمنسی ضائع کرانا اور اس

ہیسا نہ اقدام کے لیے اسے جسمانی اور نفسیاتی ہر دو قسم کے

تشدد سے دوچار کرنا، عاقب کا ایسا غیر انسانی سلوک تھا جس

نے راحمہ کو عاقب سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انسان کو درندہ بننے کے لیے برسوں کا سفر طے کرنے کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ عاقب کی طرح نوجوانی میں

بھی درندے بن جاتے ہیں۔

اپنے اور اپنی فیملی کے محفوظ مستقبل اور پرسکون

زندگی گزارنے کی خاطر ثاقب نے برطانیہ میں جا بسنے کی

منصوبہ بندی کی اور برطانیہ چلا گیا۔ زیادہ نہیں چند ہی ماہ

گزرے ہوں گے کہ ایک رات ایسا سویا دوبارہ زندگی سے

تھی۔“ اس نے دہی زبان سے کہا۔

”اس لیے کہ ان کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی..... بھگتو

گے تم سب بھگتو گے..... اور جلدی بھگتو گے..... آسمان والا

اوپر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے..... وہ گئی کہاں؟“

”پتا نہیں۔“

فرقان نے جڑے بھیج لیے۔ کچھ دیر ناقابل بیان

ذہنی بھونچال سے دوچار کھڑا رہا پھر اس نے عاقب کے سینے

پر ہلکے سے گھونسا رسید کرتے ہوئے نہایت تحقیق سے کہا۔ ”تم

سے اور تمہارے بھائیوں سے اچھی تو میری ماں رہی جس

نے عورت ہونے کے باوجود اس لڑکی کو اس وقت اپنے گھر

میں پناہ دی جب شاید کوئی بھی اس کے سر پر ہاتھ دھرنا

مناسب نہ سمجھتا..... جانتے ہو کیوں..... کیونکہ اس کے اپنے

گھر میں بیٹیاں تھیں اور دل میں خدا ترسی..... تم بد قسمت ہو

کہ نہ تمہارے گھر میں بہنیں تھیں اور نہ دل میں خدا ترسی۔“

”ماسٹرنہ کیجیے گا فرقان بھائی..... اس راستے پر مجھے

لگا پاتا تو آپ ہی نے تھا۔“ عاقب نے اوچھا وار کرنے کی

کوشش کی۔

”مجھے معلوم تھا ایک دن یہی کہو گے..... مجھ سے

واقعی غلطی ہوئی۔ اس غلطی کی کچھ سزا تو میں بھگت چکا

ہوں..... میری تم سے کیا رشتہ داری تھی جو ثاقب کے ساتھ

پولیس مجھے بھی بھیج لے گئی..... حساب کتاب کیا تو سمجھ میں

آ گیا کہ میرا حوالہ جانا میری اسی غلطی کی سزا تھی..... مجھے

اب بھی جب اپنی غلطی کا خیال آتا ہے تو بہ کرتا ہوں اپنے

اللہ کے حضور اور آگے کے لیے معافی مانگتا رہتا ہوں خدا

سے..... یار تمہاری غلطی تو میری غلطی سے کہیں بڑی تھی.....

اس لڑکی کو طلاق دے کر بے گھر اور بے آسرا کرتے ہوئے

تمہیں اللہ سے ذرا خوف نہیں آیا۔“

وہ چپ رہا پھر کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں بولا۔ ”میرا

خیال تھا وہ آپ کے گھر ہی جائے گی۔“

فرقان نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا پھر کہا۔

”نہیں..... وہ میری طرف نہیں آئی..... اور ہاں ذرا یہ سوچ

لیتا کہ اگر وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں بھی نہیں گئی ہے

تو..... آج تو وہ اس سے ناراض ہیں کل کلاں کو اگر انہوں

نے پلٹ کر اس کی خیر خبر لینے کی کوشش کی تو تم انہیں کیا

جواب دو گے۔“

عاقب نے شپٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بتاؤ گے انہیں؟ کہاں گئی وہ؟“ فرقان نے

مزید کہا۔

نظر نہیں ملا سکا۔

عاطف جو دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑے بھائی کی موت کے بعد اس کا غم اپنے چچا اور ان کی فیملی کے ساتھ مل بیٹھ کر بٹانے کو رخشندہ اور بچوں کے ساتھ پاکستان آیا اور اسے بھی دل کی تکلیف ہوئی۔ فوری سرجری لازم ٹھہری۔ آپریشن کامیاب رہا لیکن بعد میں کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ گوما میں چلا گیا۔ تقریباً دو ماہ زندگی سے بے نیاز بستر پر پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

شوہر کے انتقال کے بعد رخشندہ نے اپنے سسرالی گھر میں رہنے کے بجائے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہنے کو ترجیح دی۔ تناسب کچھ ہو جانے کے بعد سسرالی گھر میں رہ کر وہ اپنے اور بچوں کے لیے کوئی خطرہ مول نہ لیتا چاہتی تھی۔ عاطف نے جو اپارٹمنٹ خرید رکھا تھا۔ وہاں وہ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہ نہ سکتی تھی۔ میکے والوں نے چاہا کہ اس کے بچوں کا دادا کے گھر میں حصہ مل جائے تو وہ اپارٹمنٹ کو بھی فروخت کر کے اپنے میکے کے نزدیک کوئی گھر خرید لے مگر عاقب ان کا حصہ دینے پر تیار نہ ہوا۔ بلکہ جب اس پر مکان میں بھائیوں کے یتیم بچوں کو ان کا جائز حق دینے کے لیے دباؤ بڑھا تو وہ حق داروں کا حق ہڑپ کرنے کے لیے سینہ ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ ”کسی میں ہمت ہے تو مکان بیچ کر دکھائے۔“ خود غرضی اور حرص وہوس نے اسے باؤلا کر دیا تھا۔

شوہر کی زندگی میں پر آسائش زندگی گزارنے والی رخشندہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ والدین کے آسیرے پر پڑی رہنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کا ناز و تکبر خاک میں مل گیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس نے کہ آنا قانا زندگی اتنی بدل جائے گی سوچا تو اس کے شوہر نے بھی نہیں ہوگا اپنی زندگی میں کہ ماہ نور کو طلاق دلو اور گھر سے بے گھر کر کے وہ اپنے بال بچوں کے لیے کیسی تکلیف دہ زندگی کا بیج بوجائے گا۔

راحہ کے مسائل دوسری نوعیت کے تھے۔ غریب الوطنی، انہوں سے دوری، اکیلا پن اور اکلوتے بیٹے کو مغربی معاشرے کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے کی فکر۔ سات سمندر پار وہ بھی اور اس کا بیٹا حاشر۔ ان کے دکھ سکھ میں کوئی تیسرا ان کا سا بھی نہ تھا۔

باپ کے نہایت چاہ سے تعمیر کردہ مکان میں فقط عاقب رہ گیا۔ اپنے گھر کے سنانے سے اس کا دل گھبراتا مگر اس سے زیادہ خوف اسے اپنے گھر کی عکسی طرف واقع ماہ نور

کی خالہ اور خالو کے گھر پر چھائی خاموشی سے محسوس ہوتا۔ وضع دار اور انا پسند لوگ تھے۔ انہوں نے کبھی یہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ماہ نور کس حال میں تھی..... اور بھی بھی کہ نہیں۔ معاشرے کے بدلے اطوار نے ہمسایوں کو عاقب کے گھر میں خاتون خانہ کی خبر لینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہونے دی۔ ویسے بھی جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد محلے دار اس گھرانے سے دور دور ہی رہتے تھے۔

☆☆☆

گھر کے سنانے اور اپنی تنہائی سے تنگ آ کر عاقب نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا اور نہایت سادگی اور خاموشی سے دوسری شادی کر کے آفریدہ کو گھر لے آیا۔ اس پاس آباد گھرانے اس کے ساتھ ایک نئی عورت کو گھر سے باہر آتے جاتے دیکھ کر چونکے ضرور مگر کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ بہر حال چھپنے والی بات تھی نہیں سو بالآخر لوگوں کو پتا چل ہی گیا کہ عاقب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلی چلی گئی تھی..... کہاں؟ کیوں؟ کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی حتیٰ کہ ماہ نور کی خالہ اور خالو نے بھی نہیں..... آخر لوگ اپنے بہت پیارے لوگوں کو دفنا کر، ردھو کر بھی تو صبر کر ہی لیتے ہیں۔ ان عزت دار لوگوں نے بھی عدالت سے آخری فیصلہ سننے کے بعد ماہ نور سے کہا تھا۔ ”آج کے بعد تو ہمارے لیے مر گئی۔“

عاقب کا لوگوں سے میل جول بہت محدود ہو چکا تھا۔ فرقان سے بھی بس اس وقت تک تعلق رہا جب تک دونوں ایک برائچ میں تھے۔ ماہ نور کو طلاق دینے کے بعد فرقان نے عاقب سے بات چیت بہت کم کر دی تھی۔ پیشہ ورانہ تعلقات کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید فرقان اس سے بول چال بالکل ہی ختم کر دیتا۔ فرقان کی عاقب سے ناراضگی بے جا نہ تھی۔ اس نے ایک کمزور اور بے آسرا لڑکی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ عاقب اب بینک کی اس برائچ میں نہیں تھا البتہ فرقان وہیں تھا اور ترقی پا کر برائچ منیجر بن چکا تھا۔

آفریدہ سے شادی سے قبل جب عاقب سے اس کے گھر والوں کی بات چیت چل رہی تھی۔ آفریدہ سمیت تمام اہل خانہ عاقب کے سامنے بڑی تہذیب اور نہایت شرافت کے ساتھ پیش ہوتے رہے۔ شادی کے بعد ان کا اصل روپ کھلا۔ آفریدہ سمیت اس کے گھر کے تمام افراد اسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھے جس سے فرقان علی کی بھی وابستگی تھی۔ آفریدہ کا ایک بھائی اس پارٹی کا نامی گرامی کارکن تھا اور اس کی پارٹی راہنما تک براہ راست رسائی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ تم کسی کو دھوکا دے کر یہ مت سمجھو کہ وہ کتنا بے وقوف تھا بلکہ یہ سوچو کہ اسے تم پر اعتبار کتنا تھا۔

☆ لوگوں کو اتنی ہی اہمیت دو جتنی وہ تمہیں دیتے ہیں۔ اگر کم دو گے تو مغرور کہلاؤ گے اور زیادہ دو گے تو گر جاؤ گے۔

☆ اپنی زبان کو کسی کے عیوب بیان کر کے آلودہ نہ کرو۔ اس لیے کہ عیب تو تم بھی رکھتے ہو اور زبان دوسروں کے پاس بھی ہے۔

☆ جو لوگ صرف اپنے کام کے وقت آپ کو یاد کرتے ہیں ان کے کام ضرور آیا کرو کیونکہ وہ اندھیروں میں روشنی ڈھونڈتے ہیں اور ان کے لیے وہ روشنی آپ ہو۔

☆ اگر تم اپنے سر کو ٹھنڈا اور اپنے پاؤں کو گرم رکھو گے تو تمہیں پوری زندگی کسی طیب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ انسان کی اصل موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کے دل اور دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

تھی۔ شادی کے بعد عقدہ کھلا کہ آفریدہ کی بھی یہ پہلی نہیں دوسری شادی تھی حالانکہ شادی سے قبل اس کے گھر والوں نے عاقب پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ غیر شادی شدہ تھی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ آفریدہ کے پہلے شوہر نے اسے دو وجوہ کی بنا پر طلاق دی تھی۔ اولاً وہ نہیں چاہتا تھا کہ آفریدہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے کام کرے۔ دوم اس کا بانجھ ہونا۔

آفریدہ سے شادی کے بعد اس کی اور اس کے گھر والوں کی اصل حقیقت کھلنا عاقب کے لیے صیاد کے اپنے ہی دام میں آجانے کے مترادف تھی۔

ماہ نور کے برعکس آفریدہ معمولی شکل و صورت کی حامل تھی۔ نہ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ گھر سنبھالنے کا قرینہ۔ دن بھر فون پر سیاست کرتی رہتی۔ ابھی ایک سے بات تو ابھی دوسرے سے راز و نیاز۔ عاقب کے بارے میں اسے چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑبولا آدمی ہے۔ پہلے اس نے اپنی زبان و رازی سے اس کے بڑبولے پن کی منڈیا مروڑی پھر اپنے اور اپنے گھر والوں بالخصوص بھائی کے سیاسی اثر و رسوخ کا ہوا دکھا کر اسے اپنے نکووں تلے لگایا۔ عاقب بیوقوف اور عاقبت نا اندیش ایسا کہ اس نے شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں آفریدہ کو ماہ نور سے اپنے تعلق کی داستان اول تا آخر سنا دی تھی۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے اس سے کہتی۔ ”مجھے ماہ نور مت سمجھنا۔ میں تو تمہاری ہڈیوں کا شور باہنا کر پی جاؤں گی مگر اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔“

عارف صاحب مرحوم نے یہ گھر بڑے ارمانوں سے اپنے تینوں بیٹوں کے لیے بنوایا تھا۔

آفریدہ کے گھر والوں کی رال تو اس گھر پر اسی دن لپک پڑی تھی جب وہ شادی سے قبل عاقب کی دعوت پر اس گھر میں آئے تھے۔

”اتنا بڑا لان ہے آفریدہ کہ تو پورے خاندان کو بھی دعوت پر بلائے گی تو کافی ہوگا۔“ آفریدہ کی ماں نے اس سے کہا تھا۔

”اور خالی گھر..... نہ ساس تندوں کا جھنجٹ نہ کسی دیورانی جیٹھانی کا دم چھلا۔“ آفریدہ کی بھابی بولی۔

”دو منزلیں ہیں گھر کی جیسا نیچے ویسا ہی اوپر..... بھی آفریدہ میں تو جب آؤں گا اوپر ہی بیٹھا کروں گا..... پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اوپر سے۔“ آفریدہ کے باپ کی نندیدگی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

”اللہ پھوپھو بچن، ہاتھ رومز، بیڈ رومز سب ہی بہت اچھا ہے۔“ آفریدہ کی بیٹی نے جو اپنے ماں باپ، چھ بہن بھائیوں اور بوڑھے دادا کے ساتھ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ کی رہائش تھی عاقب کے گھر سے ہو کر آنے کے بعد نہایت رشک سے اپنی پھوپھی آفریدہ کو اس گھر کا احوال دیتے ہوئے کہا۔

”اور پھوپھو گھر میں کوئی بھی نہیں سوائے اٹکل کے..... آپ اکیلی کیسے رہیں گی اتنے بڑے گھر میں..... آپ کے ساتھ میں رہوں گا۔“ بیٹی نے اپنی خدمات پیش کیں۔

شادی کے بعد آفریدہ نے عاقب سے پہلی فرمائش تو یہ کی کہ اسے گھر کے کام کرنے کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ کی سہولت فراہم کی جائے پھر اس نے کھانے پینے کے لیے نئی چیزوں کی فرمائش شروع کی، آئے دن نئے کپڑوں،

جوتوں اور کاسٹیکس کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جوتی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے سیکے پہنچا دیتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلا دیتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تان بالآخر اس بات پر ٹوٹتی۔ ”مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں..... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔“ عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹیویٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی رونمائی کرا دیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہر حال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑ وہیں لکھا تھا، کون ٹال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ”واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی..... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو..... ایسا گھر تو اپن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔“

آفریدہ اور اس کے گھر والوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹرخانے کو کہا۔ ”گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہو جائے گا۔“

”گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ کچھری جاؤ لکھت پڑھت کراؤ..... اللہ اللہ خیر سلا۔“ آفریدہ کی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی..... کر لیں گے۔“ عاقب نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھر والوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ”یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”مرنے والے مر گئے اب کسی کا کوئی حصہ حصہ نہیں۔“ آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچاتا عاقب کے سامنے آیا۔

”یہ میں نہیں کہہ رہا..... شریعت کہہ رہی ہے قانون

کہہ رہا ہے۔“ عاقب نے تڑپ کا پتا پھینکا۔
”ارے چلو چلو..... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم..... قانون کو بھی دیکھ لیں گے..... لوگوں کے زندہ ہوتے ان کی جائیدادیں دوسروں کے نام ہو جاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔“ حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

”حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ وراثت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام ورثا کو بلائیں گے..... قانون بہر حال قانون ہوتا ہے۔“

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مرچیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں..... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کروانا میری فیس داری۔“

”یار! بھابھیاں اور ان کے بچے آکر میرا گریبان پکڑ لیں گے۔“

”اپن کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا جہیں۔“
”نہیں حمید میں تیروں کے حق پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“

سیدھی انگلیوں سے کھی ٹکلتے نہ دیکھ کر حمید نے تیور بدل لیے۔ ”عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو فی الفور پار کر دیتا ہوں میں۔“ اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ گو وقت اور تجربے نے اسے گرگ دیدہ بنا دیا تھا مگر اندر سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے تیور بدلے تو اس کا پتا پانی ہونے لگا۔ وراثت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ”یہاں سب کچھ ہو جاتا ہے۔“
قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری ہینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ کچھری میں بیٹھے گرگوں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کروالیا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہو گیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنالیا۔ طرح طرح کے لوگ دندناتے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ”گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔“

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”دیکھو عاقب

”کبھی سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تمہارے ساتھ؟“ فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔
اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ ”آپ بھی کہیں گے ماماہ نور کی وجہ سے۔“
”تو کیا غلط کہوں گا؟“ فرقان نے کہا۔
”فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔“ عاقب بولا۔
”تو کیا اب جڑ گئے۔“

عاقب نے سر جھکا لیا۔
”اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کر دی یار..... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، تنگی، تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا..... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔“
عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔
”عاقب بھائی اور عاقب بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ نور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔“

”اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟“
فرقان کے لہجے میں کئی تھی۔ ”معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں..... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”انجام؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی اولاد گنوائی تو ان کی اپنی اولاد میں باپ کے رہ گئی..... یار! رب سو ہنا بندوں کی خطاؤں پر لٹھ لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرنا ہے..... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس..... انسان کو کبھی بھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے..... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل..... کیا سمجھے؟“

”جی فرقان بھائی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔
”مہر کے دولاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تھا کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا..... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پختہ سی ضائع کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟“
عاقب اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگا۔
”وہ دوبارہ ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔“
عاقب چونکا۔

بھائی! اپن سے پنگا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو گے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا..... نظر بگاڑی تو ٹائیکس ٹائیکس فٹ! کیا سمجھے۔“
”شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔“
عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔
”بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔“ حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔
”کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟“

”پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی بیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔“
”کوئی احسان نہیں کیا..... میری بیگم تمہاری بہن بھی ہے۔“
”ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!“
”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔“
”وہ تو آئیں گے..... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔“
”دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔“

”آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا..... گھریاجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں.....“ حمید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔
سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔
حمید اپنے ہاتھ پاؤں دن بہ دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی ”گرل فرینڈ“ کے ساتھ رہائش اختیار کر لی اور ایک حصے کو سیاسی بیٹھک بنا لیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنا دی تھی اور اب اس کی مدد کا طالب تھا۔

جوتوں اور کاسٹیکس کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جوئی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے میکے پہنچا دیتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلا لیتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تان بالآخر اس بات پر ٹوٹتی۔ ”مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں..... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔“ عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹوٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی رونمائی کرا دیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہر حال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑ وہیں لکھا تھا، کون ٹال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ”واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی..... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو..... ایسا گھر تو اپن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔“

آفریدہ اور اس کے گھر والوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹر خانے کو کہا۔ ”گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہو جائے گا۔“

”گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ کچھری جاؤ لکھت پڑھت کراؤ..... اللہ اللہ خیر سلا۔“ آفریدہ کی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی..... کر لیں گے۔“ عاقب نے انہیں نالنے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھر والوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ”یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”مرنے والے مر گئے اب کسی کا کوئی حصہ حصہ نہیں۔“ آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچاتا عاقب کے سامنے آیا۔

”یہ میں نہیں کہہ رہا..... شریعت کہہ رہی ہے قانون

کہہ رہا ہے۔“ عاقب نے تڑپ کا پتا پھینکا۔
”ارے چلو چلو..... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم..... قانون کو بھی دیکھ لیں گے..... لوگوں کے زندہ ہوتے ان کی جائدادیں دوسروں کے نام ہو جاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔“ حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

”حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ وراثت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام ورثا کو بلائیں گے..... قانون بہر حال قانون ہوتا ہے۔“

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مرچیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں..... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کروانا میری فیس داری۔“

”یار! بھابھیاں اور ان کے بچے آکر میرا گریبان پکڑ لیں گے۔“

”اپن کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا نہیں۔“
”نہیں حمید میں قیوں کے حق پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“

سیدھی انگلیوں سے کھی نکلتے نہ دیکھ کر حمید نے تیور بدل لیے۔ ”عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو فی الفور پار کر دیتا ہوں میں۔“ اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ گو وقت اور تجربے نے اسے گرگ دیدہ بنا دیا تھا مگر اندر سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے تیور بدلے تو اس کا ہتا پانی ہونے لگا۔ وراثت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ”یہاں سب کچھ ہو جاتا ہے۔“
قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری بینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ کچھری میں بیٹھے گرگوں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کر دیا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہو گیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنالیا۔ طرح طرح کے لوگ دندنا تے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ”گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔“

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”دیکھو عاقب

”کبھی سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تمہارے ساتھ؟“ فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔
اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ ”آپ بھی کہیں گے نامہ نور کی وجہ سے۔“
”تو کیا غلط کہوں گا؟“ فرقان نے کہا۔
”فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔“ عاقب بولا۔
”تو کیا اب جڑ گئے۔“
عاقب نے سر جھکا لیا۔

”اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کر دی یار..... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، تنگی، تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا..... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔“
عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔
”عاقب بھائی اور عاقب بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ نور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔“

”اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟“
فرقان کے لہجے میں تنگی تھی۔ ”معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں..... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”انجام؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی اولاد گنواؤ تو ان کی اپنی اولاد بن باپ کے رہ گئی..... یار! رب سوتا بندوں کی خطاؤں پر لٹھ لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرتا ہے..... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس..... انسان کو کبھی بھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے..... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل..... کیا سمجھے؟“

”جی فرقان بھائی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔
”مہر کے دولاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تھا کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا..... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پریکٹس خالص کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟“
عاقب اسے اب بھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگا۔
”وہ دوبارہ ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔“
عاقب چونکا۔

بھائی! اپن سے پنگا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو گے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا..... نظر بگاڑی تو ٹائیں ٹائیں فٹ! کیا سمجھے۔“
”شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔“
عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔
”بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔“ حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔
”کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟“

”پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی بیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔“
”کوئی احسان نہیں کیا..... میری بیگم تمہاری بہن بھی ہے۔“
”ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!“
”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔“
”وہ تو آئیں گے..... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔“

”دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔“
”آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا..... گھر باجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں.....“ حمید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔
سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔

حمید اپنے ہاتھ پاؤں دن بہ دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی ”گرل فرینڈ“ کے ساتھ رہائش اختیار کر لی اور ایک حصے کو سیاسی پیشک بنا لیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنا دی تھی اور اب اس کی مدد کا طالب تھا۔

”اور یہ شاید اس کی اس غلطی کی سزا ہے جو اس بے وقوف لڑکی نے اس رات اپنی خالہ کے گھر سے تمہارے گھر آکر اور اپنے خاندان کی ناموس کو داؤ پر لگا کر کی تھی۔“

عاقب گو گو کیفیت سے دو چار دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی حائل رہی اور فرقان اسے تنکھیں سے کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس کے بولنے کا منتظر ہو پھر اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ”تم نے یہ نہیں پوچھا مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔“

عاقب نے پہلو بدلا اور اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ ”جی..... میں یہی پوچھنا چاہتا تھا مگر.....“

”بہت نہیں ہوئی۔“ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

”مرد ہو تو فرد جرم کا سامن کرنے کی ہمت رکھنی چاہیے۔“ فرقان کی بات عاقب کو گالی کی طرح لگی۔

”تمہارے گھر سے نکالے جانے کے بعد اس کا اپنے ضرروالوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہ کئی دن ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی رہی..... کبھی کسی مسجد کے خواتین کی نماز کے لیے وقف حصے میں دن گزارا تو کبھی کسی اسپتال کی راہداری میں پڑ کر رات بسر کی۔ کبھی رفاہی اداروں کا رخ کیا اور اندر جائے بغیر ہی گھبرا کر پلٹ آئی۔ ایک روز دن کے وقت مسجد میں بھی کہ کئی دن سے تعاقب کرتا شیطان اس پر حملہ آور ہوا۔ ہراساں ہو کر بھاگی اور اس نے میری والدہ کے پاس آکر دم لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے ایک ماں کے سائے میں پناہ لی ورنہ فرشتہ ہونے کا دعویٰ تو میں بھی نہیں رکھتا۔“

عاقب نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں یار..... شیطان تو ہر آدمی کے اندر بستہ ہے۔“

فرقان نے بے لاگ کہا۔

”پھر؟“ عاقب اتنا ہی کہہ سکا۔

”پھر اس نے والدہ کو وہ سب کچھ بتایا جو اس کے ساتھ تمہارے گھر میں ہوتا رہا..... کچھ عرصہ وہ ہمارے گھر رہی پھر والدہ نے کوشش کر کے اس کا نکاح اپنے دور پار کے ایک رشتہ دار سے کرادیا جس کی بیوی مرچکی تھی اور اسے اپنے تین بچوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔“

عاقب کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”خوش ہے؟“

”تم خوش ہو؟“ فرقان نے انسا سوال داغا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا..... شکست

خوردگی سے۔ فرقان نے ایک گہری اور لمبی سانس کھینچی پھر بوجھل آواز میں بولا۔ ”ہم سب اپنے اپنے بوائے کی فصل کاٹتے ہیں عاقب..... گو میں پارٹی معاملات سے آج کل لا تعلق ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی تمہارے سارے کو لگام دلوانے کی کوشش کروں گا..... کوشش کروں گا، اسے وعدہ مت سمجھنا..... اور کوشش بھی اس لیے کہ تمہارا بھائی عاقب میرا بہت اچھا دوست رہا۔“

”تھینک یو ویری مچ فرقان بھائی۔“

عاقب جانے کو اور فرقان اسے رخصت کرنے کو اٹھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر عاقب ٹھنک گیا اور ہچکچاتے ہوئے نہایت دل گرفتگی سے بولا۔ ”بہت بے سکون ہوں فرقان بھائی..... آپ کی کبھی اس سے ملاقات ہو تو کہیے گا مجھے معاف کر دے..... بلکہ انہیں بھی جو اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اوکے..... موقع ملا تو کہہ دوں گا۔“ فرقان نے کہا۔

”میں نے اس کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی۔“

عاقب سر جھکا کر ندامت سے بولا۔ ”بہت پچھتا رہا ہوں اب۔“

فرقان نے ایک لمبی اور گہری سانس کھینچی۔ ”یہ تمہارا نہیں ہم انسانوں کا مشقہ کہ ایسے ہے..... جب چیزیں ہماری دسترس میں اور لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم اکثر ان کی قدر نہیں کرتے..... انہیں کھو کر پچھتاتے ہیں۔“

”پتا نہیں خدا مجھے معاف کرے گا یا نہیں۔“ عاقب کی آواز بھرا رہی تھی۔

”یار! یہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ خدا اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا..... فقط امید ہے اس کی رحمت کی جو ہمارے دل کو اس وقت بھی سہارا دیے رکھتی ہے جب تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔“ فرقان نے ایک پل کو توقف کیا پھر کہا۔ ”مگر توبہ اور معافی سچے دل کے ساتھ مشروط ہے۔“

عاقب نے ایک نظر فرقان کو دیکھا۔ فرقان کو اس کی نگاہوں میں پچھتاوا، دکھ اور شرمندگی کے ساتھ کشمکش کی وہ کیفیت نظر آئی جو نتیجے کا انتظار کرتے اس طالب علم کی نگاہوں میں دکھائی دیتی ہے جس کے پرچے اچھے نہ ہوئے ہوں فقط محنت کی مہربانی کی اس ہو۔

”چلتا ہوں فرقان بھائی۔“ اس نے بوجھل آواز میں کہا لیکن جانے سے پہلے اس کا سر جھک گیا۔ اتنا کہ عرق ندامت کے قطرے اس کے گریبان پر ٹپکنے لگے۔



اسماء الحسنیٰ - کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ہاشمی گذشتہ 22 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعہ روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ اب کے پروگرام اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں برادرا اس سے بدریغہ خدمت اور ملاقات راد نمائی لے سکتے ہیں۔

اولاد دین کی طلب

○ میرے دونوں بیٹے پیدائش کے بعد تین ماہ نہ رہے اور فوت ہوئے۔
اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ پائش صحیح سلامت ہیں اللہ ان کی حیاتی رکھے لیکن اولاد دین کی پڑنی خواہش ہے۔ آپ کے روحانی علاج کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار و اتانہ اور سیدنا غوث الاعظمؒ کی بڑی عنایت ہے آپ اسماء الحسنیٰ بھی تلقین کیجئے اور روحانی علاج بھی تجویز کر دیجئے مجھے آپ سے ملنے کا بھی بے حد اشتیاق ہے۔ فیس بک پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ آپ کا نامہ اور خانہ بد میں نسیم اختر شیخ پورہ، لاہور اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ جب وہ اپنا نامہ یہ اسلام کو پہنچے تو بس میں اودھنا کر ملتا ہے تو آپ کو عطا کر اس کے لئے کیا ممکن ہے۔ اپنا ایمان قائم رکھئے ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف پڑھا جسکی پڑھ کر دعا کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر علاج در عظیم اولاد دین کے لئے ارسال کیا جا رہا ہے۔ آپ برہنہ اولاد محفل درود شریف میں آئیے دعا کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

ڈپریشن - والدہ کی بے بسی

○ رات رات بھر جاتی ہوں لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سونے میں سوسائٹ ہے۔ دل والا دوسب حاصل ہے لیکن دل بالکل مردہ ہے۔ ڈپریشن، غصہ، ناکامی، اداسی جیسی کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کئی حکیموں، ماہر نفسیات کو دکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ دوائیں کھا کھا کر اسرکی مریش، دھچکی ہوں کیا میری اس بے بسی کا علاج ہے؟ نصرت آمد کراچی

○ بہن! آپ کی بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز استخارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دہلا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے، آپ کا انتظار کرتے

کرتے اس جہاں سے گزرتی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی۔ آپ کی والدہ نے، مجھے، فیصد یقین ہے کوئی بد حادثہ ہوئی ہوگی لیکن ان کے بعد اور بے بسی نے آپ کو جتر لیا ہے۔ آپ ان کے لئے ایسا سال ثواب کریں، ممکن ہو تو ان کی قبر پر جا کر ہر قدر دعا مانگیں۔ "سورہ الملک" پڑھ کر ان کو بہت کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی دعائیں سمیٹے والا بنائے۔ (آمین)

ہر بار - مزید قرضدار

○ گزشتہ کئی برسوں سے جو کاروبار بھی کرتا ہوں وہ شروع میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے نقصان میں آ کر ختم ہو جاتا ہے اور میں مزید قرضدار ہو جاتا ہوں، پہلے بیگم کا زیور، پھر پلاٹ، آخر میں گھر اور گاڑی بھی بک گئی اور ہم ڈھائی سو گز سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آ گئے ہیں، ہزار ہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ بہت کم دیا تک ہوتا ہے جو دوسروں کو دیتا ہوں وہ ہٹ ہو جاتا ہے جو خود کرتا ہوں پٹ جاتا ہے، کوئی کہتا ہے چادو ہے تو میرے کیا کروں۔ آپ کے متعلق بہت سنا ہے، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے۔ دعا گو رہوں گا۔ نصیر احمد - کراچی

○ بھیا ادو باتیں ہیں آپ بہت اچھے منتظم اور اچھے پلانر ہیں لیکن آپ کا جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے۔ آپ اپنے کاروبار کی بجائے کسی بڑے ادارے میں جاب کے لئے اپلائی کیجئے دوسرے آپ کی ناکامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے ابس پہلے پیار ہوئے تھے۔ اس کا جسمانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ جسمانی طور پر تو صحت مند ہو گئے لیکن بد اثرات کے دائرے سے نہیں نکل پائے۔ آپ "سورہ یٰسین" سات مہینے والی بعد نماز عشاء پر معنی شروع کر دیں معاملات اچھے ہو جائیں گے۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لون مشنری برائے کامیابی

یہ چار (4) صفحات اشتہار پر مشتمل ہیں۔ ان صفحات کے متن اور مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق ہے، نہ ادارے پر اس بارے میں کوئی ذمہ داری ہے اس ضمن میں ادارے سے کوئی خط کتابت نہ کی جائے۔

اور روپے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

حالات اچھے تھے۔ تو بھول گیا

O میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔ اس نے سارا لین دین عملاً اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔ چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے۔ ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کر دئے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیرہ چیک بھی تھے۔ پھر اچانک تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بھیجا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھر بار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ کھڑا ہے۔ کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حوالات کی سرکرتا ہوں۔ عزیز رشتے دار منہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔ بچے بری طرح سہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔ وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نکل گیا ہو۔ کیا کروں کبھی تو دل چاہتا ہے خود کشی کر لوں۔ کیا ایک بار پھر ظہر کرم نہیں کریں گے۔ دعا کا طالب۔ محمد طالب حسین۔ حیدر آباد

O اچھے میاں! ہمارا تارا خلتی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔ میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔ ”سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم“ کثرت سے پڑھا کرو۔ بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بجے تا 4 بجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کرو پیر خانے میں بھی دعا ہوگی۔ تمام بہن بھائی جو کسی وجہ سے آسکیں یا بیرون ملک / شہر ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بجے تا 4 بجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔ تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

معاملہ ختم۔ صحت بحال

O میری بیٹی ماشاء اللہ خوبصورت قدیمت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔ مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے

چہرے کی رنگت خجڑ جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ چہرے پر پانی والے دانے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکن اسپیشلسٹ، ماہر نفسیات سب کو دکھایا، لیکن افادہ نہیں ہوتا۔ مگر جو فی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال ہوتا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تعویذ کا اثر ہے۔ اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجئے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بہن دعا گو ہیں اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشویشناک ہے۔ آپ کی صاحبزادی آپسی کیفیت کا شکار ہیں۔ شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔ اسی لئے شریعت نے قضائے حاجات کے لئے مسنون دعائیں تلقین کی ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ کو نظر بد، جن اور آپسی معاملات کے لئے ایک درود پینے کے غسل کے، جلانے کے تعویذ بذریعہ ذاک بھیجے جارہے ہیں۔ اس پر پابندی سے عمل کیجئے۔ انشاء اللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔ نہ میاں نہ

O بیرون ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہزاروں روپے ایجنٹوں کے چکر میں برباد کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ والد صاحب کا کہنا ہے کہ یہیں کوئی کام کر لو مگر میری بھی یہی ضد ہے کہ کام باہر ہی کروں گا۔ اس وجہ سے لبا بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے مدد و حانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔ رضوان محمود۔ نواب شاہ

O نہ میاں نہ! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ ایجنٹوں کا چکر چھوڑیں جو با کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب لبا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرون ملک کے لئے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے آپ کی بے حد فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

شادی۔ ورنہ خود کشی

O کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مطلب یہ کہ شادی ملے ہے۔ مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزینہ بی سے شادی کرے گا۔ دو مرتبہ خود کشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچا لیا۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ بہو اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

☆ بیٹی جیتی رہو! تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساس کتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہذا ان کا فائدہ اٹھا کر تفحیک کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ ہرگز خودکشی کا نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ ”درود شریف تاج“ پڑھ کر ان کا تصور کر کے دم کر دیا کرو خصوصاً جب ”دافع البلاء والوباء والقطر والمرض والالام“ تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص اور نقوش دعفران ارسال کئے جا رہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

○ میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ بس کی وجہ سے میرا کچھ چین غارت ہو گیا ہے، میں اپنے گھر، بیوی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر پہل مذاب ہو گیا ہے ہم میر پور خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے تبادلے کے ساتھ یہاں آ گئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہو گئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقعہ مل گئے پچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک سکول فیلو سے ہو گئی تھی، سچی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی، مگر جب انہوں نے طوایا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی سریل سی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب وہ ایک بھرپور خاتون تھی، ملاقات چائے، کھانے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

ضروری نوٹ

اپنا مختصر مسئلہ اپنے نمبر نامہ والدین اور تاریخ پیدائش کے ساتھ ارسال کریں۔ اس کالم میں جواب باری آئے پر دیا جاتا ہے۔ براہ راست جواب کے لئے اپنا پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجئے۔ فون پر مسئلہ نہیں سنا جاتا ہے، خط لکھیں یا ملاقات کریں۔ بیرون شہر سے آنے والے وقت لے کر تشریف لائیں۔ بیرون ملک مقیم خواتین و حضرات اپنا مکمل پتا ارسال کریں۔

پیر شاہ محمد قادری 382-A/2، جوہر ٹاؤن،

نزد محمد علی چوک، کالج روڈ۔ لاہور۔ تعطیل بروز جمعہ المبارک

0302-5555967

ہو جاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلمیٰ پروین۔ راولپنڈی

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ و مامون رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 14 مرتبہ ”یا کریم یا سلام یا حامدی یا مانع“ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ بیٹی کے امتحانات میں کامیابی کے لئے لوح عطار ارسال ہے۔

آیا امتحان۔ ہو گئی چڑچڑاہٹ

○ میری بیٹی اور بیٹا نویں، دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست، بے چین ہو جاتی ہے چڑچڑاہٹ ہو جاتی ہے خیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پتا نہیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کر دیجئے۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

☆ بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ ”سورۃ الم نشرح“ پانی پر دم کر کے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور دباؤ سے گریز کریں۔ دنوں کو 7 بار اسموں پر ”یا علیم یا قوی“ 100 مرتبہ دم کر کے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطار ارسال کی جا رہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے بے شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

○ میری شادی کو 9 برس ہو گئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ میاں عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہوتا ہے۔ چاہے غلط ہو یا سنی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب مجھے بہن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو، مگر میری کوئی اوقات ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک لو کرانی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساس ذلت سے سلگ جاتا ہے، نہ نماز نہ روزہ اوپر سے دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گمراہی معاملات میں صفر، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا تصور اگر باپ کی شفقت نہیں ملتی تو ماں کی متا سے کیوں محروم

محفل درود شریف علیہ السلام

ہر اتوار دوپہر 2 بجے تا 4 بجے منعقد ہوتی ہے

الحمد للہ آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ پر محفل درود شریف باقاعدگی سے گزشتہ کئی برسوں سے ہو رہی ہے جس میں سرکار دو جہاں سرور انبیاء حضور اکرم نور مجسم محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور درود شریف کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اور اختتام پر زندگی میں پیش آنے والے جملہ مسائل کے لئے اجتماعی دعا کی جاتی ہے خواتین کے لئے علیحدہ انتظام ہوتا ہے تمام عاشق رسول ﷺ خواتین و حضرات کو شرکت کی تاکید ہے۔

تصانیف پیر شاہ محمد قادری

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ، عملیات اسماء الحسنیٰ، خواب اور تعبیر، بچوں کے خوبصورت نام، عملیات سے تصوف تک، ہاتھوں میں تقدیر، سینا غوث الامم، چادو اور جنات، ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں۔

ختم گیارہویں شریف

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ میں ہر مہینے کی پہلی اتوار کو صبح 10 بجے 25 بجے ختم گیارہویں شریف محفل نعت کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ محفل کے اختتام پر پیر شاہ محمد قادری خصوصی طور پر مریدین، عقیدت مند ان اور ملک و ملت کی خوشحالی، حفاظت اور سلامتی کے لئے دعا کراتے ہیں۔

نوٹ: وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔ خواتین کے لئے باپردہ اہتمام ہوتا ہے۔ شرکاء کے لئے لنگر کا اہتمام ہوتا ہے۔

ملاقات: صبح 11 تا 7 بجے شام

آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ پیر شاہ محمد قادری

382-A/2، جوہر ٹاؤن، نزد محمد علی چوک، کالج روڈ - لاہور

042-35168036

042-35167842

0302-5555967

0335-2911117

گئی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کروں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

ہذا عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی مددے کا رد عمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوکھی مرل سی لڑکی کو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاذبیت نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ تو ہے آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی حل یہ ہے آپ رات سونے سے قبل بکثرت ”ایک نعبہ وایاک نستعین بعد العصر الطائستقیم“ پڑھا کریں۔ آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت۔ گرفتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو جج کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں عابانہ آپ کی مرید ہوں میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہو گئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کنال پر ہے، اس سے آپ اندازہ لگا لیں، مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کر لیا ہے۔ مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں افور غوث نہیں کر سکتا اس پر توجہ دیتا ہوں اور توجہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کر دیا ہے، میں کیا کروں کہاں جاؤں؟ دن رات ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کریں۔ نوشاہ۔ شہرہ معلوم

ہذا کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جسم کے ضلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زاویہ درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجئے، زندگی آسان ہو جائے گی، آپ کے لئے لوح زحل ارسال کی جا رہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لئے اپنے والدین کے ہمراہ آئیں۔